برِّصغیر میں
بیداریٔ ملّت
کی تحریکیں

ڈاکٹر سید اسعد گیلانی

برصغیر میں

بیداریِ ملّت کی تحریکیں

ڈاکٹر سید اسعد گیلانی

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

بار اوّل ---------- ۱۹۹۲ء

مطبع — فیروز سنز لاہور

مجلّد

969 0 01074 3 —

"تحریک ایک تبلیغی مدت ہوتی ہے۔ سارے تعصبات کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی چیز اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر جگہ ہر طرف نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کر لیتی ہے بے سروسامانی میں سے سامان نکلتا آتا ہے۔ مادی قوتیں اس کا راستہ روکنے سے عاجز ہو جاتی ہیں ———"

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ملتِ اسلامیہ کی قوت کا ناقابلِ تسخیر سرچشمہ اس کا اتحاد اور بیداری ہے

عزائم کو سینوں میں بیدار کردے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کردے

(حضرت علامہ اقبالؒ)

فہرست تحریکات

"ـــــ مسلمانوں اور اسلام کے لیے حریت و استقلال سب سے زیادہ ضروری چیز ہے اپنی آزادی کو کھو دینے کے بعد مسلمانوں میں انسانیت کی اس اعلیٰ خدمت کو ادا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی جسے ادا کرنے کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں ـــــ"

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

حرفِ اوّل

(۱)

چند صدیوں سے ملتِ اسلامیہ زوال و انحطاط سے دوچار ہے جس کے سبب اس کے درد ملت رکھنے والے افراد میں سخت مایوسی اور دلگرفتگی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ حالی نے مسدس لکھ کر ملت کے اس دردمند گروہ کی بہترین نمائندگی کی ہے بلاشبہ مسلمان ملت کی شوکتِ دیرینہ کا تصور بھی دورِ حاضر کی ملت کے زبوں حالات پر نظر رکھنے والے شخص کے لیے عظیم صدمے کا باعث ہے۔ جو ملت معمولی سے دینی شعائر کی بے حرمتی بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔ اس کے سامنے دین کی پوری عمارت گری پڑی ہے اور وہ اس حالت میں اپنے اور اقامتِ دین کے لیے کچھ بھی کر نہ سکنے پر آزردہ اور افسردہ ہے۔ ملت کو اس حالت میں اس کے رہنما طبقات نے پہنچایا ہے۔ علماء کی بڑی تعداد نے اسے ٹکڑے کر دیا ہے۔ حکام کے ظلم و ستم نے اسے لاچار اور افسردہ کر دیا ہے اور امراء کی سنگدلی اور بے حسی نے اسے بے یار و مددگار کر دیا ہے۔

مایوسی کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں جب ہم ملت کے اندر برپا ہونے والی ان تحریکوں کو دیکھتے ہیں جو بعض اعلیٰ مقاصد کی تکمیل یا کسی بڑے منکر کے انہدام یا کسی بہت بڑے ملی نقصان کے ازالے کے لیے پرجوش انداز میں ملت کے اندر برپا ہو جاتی ہیں اور ان مقاصد کو حاصل کر لیتی ہیں جو ملت کو مطلوب ہوتے ہیں تو تاریخ ملت کے مورخ کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھتا ہے اور اسے توانائی اور بیداری کے اس مظاہرۂ عظیم میں ہمیشہ تنظیم، ایمان اور اتحاد کا سرچشمۂ قوت ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس سرچشمۂ قوت کی نشاندہی اور عظیم معجزاتی کارفرمائی کے اظہار کے لیے ہم برصغیر میں برپا شدہ نو بڑی تحریکوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کی قوت اور کامیابی میں مسلم عوام کی شرکت اور تنظیم، ایمان اور اتحاد کی صفات نے سب سے زیادہ موثر کردار ادا کیا ہے۔

سید اسعد گیلانی

منصورہ لاہور
۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء

بیداری اور اتحاد: سرچشمۂ قوت

دنیائے انسانیت کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ملت اسلامیہ جس کے پاس فلاحِ انسانیت کا خدا کی طرف سے عطا کردہ نسخہ ہے وہ خود گم کردہ راہ ہو کر زندگی کی تنگ گھاٹیوں میں بھٹک رہی ہے۔ خدا نے فرمایا تھا کہ

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف....

لیکن یہ بہترین گروہ آج دنیا کا معتوب ترین گروہ ہے۔

اتنے شاندار منصب پر فائز ہونے والے گروہ کا اب اپنا یہ حال ہے کہ وہ خود پوری دنیا میں نیکیوں سے عاری، برائیوں میں مبتلا اور اللہ کے کلمہ کی سربلندی سے لاچار اور بے پروا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر غور و فکر کرنے والا ذہن حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔ دنیائے انسانیت اس المیہ پر حیران ہے۔ مسلمان اس کی مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں۔ عالم اسلام کے مفکرین اس پر مذاکرات اور سمپوزیم منعقد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سوال صرف عالم اسلام کا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا مشترکہ سوال ہے۔ آخر مسلمانوں کو یکایک یہ کیا ہو گیا ہے۔ جنہوں نے یورپ کو علوم عمرانی و اجتماعی سے منور کیا تھا۔ ان کی اپنی بستیاں کیوں تاریک اور گم کردہ راہ ہیں۔

اس سوال کا ایک جواب رسول اکرمؐ نے اپنی امت مسلمہ کے آنے والے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلے سے دے رکھا ہے جب آپ نے فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئیگا جب مسلمانوں پر دنیا کے لوگ ایسے جھپٹیں گے جیسے بھوکے لوگ دسترخوان دیکھ کر اس پر جھپٹتے ہیں۔ صحابہ کرام نے اس پر حیرت کا اظہار کیا اور اسے مسلمانوں کی تعداد کی قلت اور ذرائع و وسائل کی کمی کا سبب ظاہر کیا لیکن اُن کی حیرت کی حد نہ رہی جب حضور اکرمؐ نے فرمایا

کہ اس وقت تمہاری تعداد آسمان کے تاروں کی مانند بے شمار اور تمہارے اندر ذرائع و وسائل کی ریل پیل ہو گی۔ چنانچہ صحابہ کرام نے حیرت سے اس کا سبب معلوم کیا تو حضور اکرمؐ نے فرمایا: "موت کا خوف اور دنیا کا لالچ"

بلاشبہ آج سارا عالم اسلام اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ جہاد مسلمانوں میں سے مفقود ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے بے شمار ممالک میں سے ۴۶ ممالک آزاد اور خود مختار ہیں لیکن وہ خود اسلامی نظام زندگی لانے سے قاصر ہیں۔ کفار کی یلغار کے سامنے وہ بے بس اور لاچار ہیں ان کی کوئی متعین مشترکہ منزل نہیں ہے وہ سب کفار کے مختلف کیمپوں میں ان کے اجیر اور ہوا خواہ بن کر تقسیم ہیں۔ وہ خوفزدہ ہیں اور کسی نہ کسی بڑی کافر طاقت کا سہارا لیے ہوئے ہیں۔

○

آج ملت مسلمہ سب سے زیادہ تعداد میں ہے سب سے زیادہ فطری وسائل کی مالک ہے لیکن سب سے زیادہ مظلوم درماندہ اور کمزور ہے۔ دنیا کے اڑھائی کروڑ مہاجرین میں دو تہائی تعداد ہماری ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں کفار ہمارا چوہوں اور گیدڑوں کی طرح شکار کرتے ہیں۔ دنیا کے عالمی وسائل میں سب سے زیادہ وسائل ہمارے ہیں۔ ہمارے بے شمار علاقے کفار نے دبا رکھے ہیں۔ پوری ملت پر موت کا خوف طاری ہے۔ البتہ معیارِ زندگی کی دوڑ میں ہم ہر جگہ بدترین حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے جرائم کی آماجگاہ بن کر رہ گئے ہیں اور ہمارا دنیا میں کوئی وقار باقی نہیں رہا ہے۔

ہم جب ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے دعوت اسلامی کے علمبردار بن کر اٹھے تھے تو بے وسیلہ اور قلیل التعداد تھے لیکن ہماری یلغار کے آگے دنیا مفتوح ہوتی چلی گئی تھی لیکن آج صورتحال بالکل الٹ گئی ہے۔

آخر یہ صورتِ حال کیوں ہے!

○

اجتماعیات کے اصولوں کی روشنی میں ہم غور کریں تو ہمارے سامنے اس کا تجزیہ یہ آتا

ہے کہ مسلمانوں کو اس پستی کے مقام تک پہنچانے کا کام ان کے رہنماؤں نے ہی سرانجام دیا ہے۔ قومیں اپنے رہنماؤں کی قیادت میں ہی زندگی کا سفر طے کرتی ہیں۔ پھر جہاں وہ انہیں پہنچانا چاہتے ہیں۔ اپنی قیادت میں انہیں وہاں پہنچا دیتے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق جب کوئی شخص کوے کو اپنا رہنما بناتا ہے تو وہ اسے کوڑے کے ڈھیر تک پہنچا کر چھوڑتا ہے آج مسلمان ملت بھی دنیا بھر میں جس مقام تک پہنچی ہے اسے اس کے رہنماؤں نے ہی وہاں پہنچایا ہے۔

ہر معاشرے کے اندر اس کے رہنما طبقات ہوتے ہیں جو اپنے مقام اور منصب کی حیثیت سے اس معاشرے کی قیادت کرتے ہیں۔ آج مسلمان معاشرے کے رہنما یہ تین گروہ ہیں۔

۱۔ علماء

۲۔ امراء

۳۔ حکام

آج مسلمان پستی کے جس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں وہ ان تین طبقات کی رہنمائی میں ہی اس جگہ پہنچے ہیں وہ یہاں خود بخود نہیں پہنچ گئے ہیں۔ علماء کی ہوسِ دنیا، امراء کی ہوسِ زر اور حکام کی ہوسِ اقتدار یہ تین قسم کی ہوس مسلمانوں کے لیے دنیا میں جہنم کا ایندھن ثابت ہوئی ہے۔

ہمارے اکثر علماء کوتاہ نظر اور تفرقہ باز ہیں اور اسی تفرقہ میں انہوں نے اپنی قیادت، مشیخیت اور معیشت کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔ اس لیے ان کے وجود کا انحصار ہی اب تفرقہ بازی پر ہے۔ ہمارے امراء عیش پرست، ہوسکار اور بے فیض ہیں وہ معاشرے کے کمزوروں اور ضعیفوں کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھ سے کسی مسلمان معاشرہ میں رفاہِ عامہ کا کوئی ایک بھی کام سرانجام نہیں پاتا ہے اور ہمارے حکام ظالم، رشوت خور اور غیروں کے ذہنی غلام ہیں۔ انہوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے ان کے ذریعے کسی معروف کو سربلند اور کسی منکر کو نہیں مٹایا جا سکتا۔ وہ مجسم شر و فساد ہیں

اور مسلمانوں کے لیے ان سے زیادہ ظالم روئے زمین پر دوسرا کوئی گروہ نہیں ہے۔

ان تین طبقات کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ امراء اور علماء کے طبقات کو بھی حکام کا طبقہ اپنے پیچھے لگا لیتا اور اپنے اقتدار سے مرعوب اور مفادات سے فیض یاب کرکے اپنا تابع عمل بنا لیتا ہے۔ چنانچہ علماء کی کثیر تعداد اور امراء تمام کے تمام حکام کے رنگ میں ہی رنگ جاتے ہیں۔

○

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کرام نے جو نظام عدل و رحمت قائم کیا تھا۔ اس کے بگاڑ کا آغاز بھی حکام کے ہاتھوں سے ہی ہوا۔ اگر حکام قرآن و سنت اور اسلام کے نظریاتی معیار کے مطابق قائم رہتے اور ان میں تغیر پیدا نہ ہوتا تو یقیناً علماء اور امراء میں بھی بگاڑ پیدا نہ ہوتا اس لیے مسلمانوں کے بگاڑ کا حقیقی اور بنیادی سبب ان کے بگڑے ہوئے حکام ہی ہیں اور حکام کو درست کرنے اور رکھنے کا طریقہ احتساب اور جہاد ہی ہے اس لیے کہ ملت مسلمہ کا یہ گروہ اگر درست ہو جائے اور اسلام کے مقرر کردہ معیار کے سانچے میں ڈھل جائے تو مسلمانوں کے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کی داستان کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ حکام کی اصلاح اور علاج درحقیقت پوری ملت مسلمہ کی اصلاح اور علاج ہے۔ ضرورت ہے کہ ملت کے مصلحین اس بنیادی اصلاح کی طرف توجہ دیں۔ یورپ نے اس کا علاج جمہوریت کا استحکام اور انتخابات کا تسلسل تجویز کیا ہے۔ ہم اس میں اخلاقی صفات کا اضافہ کرکے اسے زیادہ موثر اور اسلامی بنا سکتے ہیں۔

○

ملت کے ان تینوں طبقات کی اکثریت اگر کسی ملی مسئلے پر متحد ہو جائے تو ملت کے جملہ افراد اپنے تمام اختلافات بھلا کر متحد و متفق ہو جاتے ہیں اور اس اتحاد پر بے حد اطمینان و مسرت محسوس کرتے ہیں۔ گویا وہ غیر فطری اور غیر مطلوب حالت سے نکل کر ایک فطری مطلوب حالت میں آ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ملت کی اصلیت اتحاد و اتفاق ہے۔ انتشار و

تشتت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اس امر کی طالب رہتی ہے کہ کوئی قوی تر عنصر ابھر کر اس ملت کے اختلافات مٹا دے اور اسے اس کی اصل اخوت و محبت کی حالت میں لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملت مسلمہ کے دل میں سب سے زیادہ گہرا نقش خدا کی خوشنودی کے حصول کا جذبہ اور رسول اکرمؐ سے گہری قلبی محبت کا ولولہ ہے۔ جب کبھی کوئی چیز ان دو چیزوں کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس ملت میں وقتی طور پر ایثار و قربانی، جانبازی اور جاں سپاری کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تحریکیں فکر کی یکجہتی۔ کردار کی ہم آہنگی اور جذبات کی طوفان آشنا فراوانی سے پیدا ہوتی ہیں اور قدموں کے بڑے بڑے کام تحریکوں سے ہی سرانجام دیے جا سکتے ہیں۔ جن کے پیچھے ملت کا دل و دماغ اور جذبہ یکسوئی کے ساتھ موجود اور ہم آہنگ ہو۔ اپنی ملت کے نبض شناس اقبال نے بالکل صحیح کہا تھا کہ

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ جو شخص شدید محنت کر کے اس ملت کے دماغ میں کسی بات کی حقانیت بٹھا دے اس کے دل میں اس حقانیت کے لیے مر مٹنے کی تڑپ پیدا کر دے اور اس کے جذبۂ صادق کو اپنی دردمندانہ نوازی سے مشتعل کر دے وہ اس منجمد ملت کی عظیم اور اتھاہ قوت کو حرکت میں لا کر لافانی کام سرانجام دے سکتا ہے حرکت میں آتے ہوئے اس ملت کو یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ وہ صحیح سمت میں حرکت کر رہی ہے۔ اُٹھتے ہوئے اس ملت کو یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ وہ دین کی خاطر اٹھ رہی ہے۔ سینے پر گولی کھاتے ہوئے اس ملت کو یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ وہ خدا کی خوشنودی اور رسول اکرمؐ کی محبت کی خاطر یہ گولی کھا رہی ہے۔ یہ تین اطمینان اسکو حاصل ہو جائیں تو یہ ملت ہمیشہ عظیم کارنامے سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

(۹)

میں اس ملت میں عظیم کارنامے سرانجام دینے کی قوت اور صلاحیت دیکھتا ہوں اسلیے میں اس کی طرف سے مایوس نہیں ہوں کم کوش تو ہے لیکن بے ذوق نہیں

ماہیٔ عالمی سطح پر پھیلی ہوئی اس ملت کا ریکارڈ مختلف سرزمینوں کے ثقافتی اور علمی ورثوں میں موجود ہے لیکن میں نے اس کتاب میں صرف برصغیر میں اس ملت کے عمل و حرکت کے ذریعے عظیم الشان کارنامے سرانجام دینے کی قوت اور ریکارڈ کو دیکھا ہے اور اس میں سے چند عظیم ملی تحریکوں کا انتخاب کیا ہے جن کی مجمل تفصیلات کو میں نے ان صفحات میں درج کیا ہے۔

ملت کا اجتماعی ضمیر خدا کی خوشنودی کا ہمیشہ طلب گار رہا ہے۔ ملت کا اجتماعی ذہن ہمیشہ اسلام کا وفادار رہا ہے۔ ملت کا اجتماعی دل ہمیشہ رسولِ خدا کی محبت سے سرشار اور بھرپور رہا ہے۔ لیکن اس اجتماعی ضمیر اور دل و دماغ کو حرکت میں لانے کے لیے جس شدید محنت ریاضت۔ للہیت ۔ ایثار و قربانی اور جاں فشانی کی ضرورت ہے۔ وہ اس کے رہنما بروئے کار لانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اقبال نے ملت کے رہنماؤں کی اس عمومی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

دیا اقبال نے ہندی مسلمان کو پیام اپنا
یہ اِک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

ظاہر ہے کہ جب علمِ قرآن و سنت نایاب ہو جائے گا۔ فہمِ دین دھندلا جائے گا تو احساسِ بے چارگیٔ دین بھی مضمحل اور افسردہ ہو جائے گا۔ ایسے بوجھل سنگین جمود کو توڑنے کے لیے چند کلماتِ نصیحت اور چند پند کافی نہیں ہو سکتے اس کے لیے بانگِ اسرافیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور بانگِ اسرافیل پیدا کرنے کے لیے شدید ریاضت اور جان لیوا محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ملت کی بہتری، اصلاح اور تحفظ کی تحریکیں بالعموم دورِ زوال میں ہی اُٹھتی ہیں۔ ملت کو جب تک غلبہ قوت اور تسلط حاصل رہتا ہے اور اجزائے دین اپنی اپنی جگہ صحیح حرکت و عمل کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس پر کسی فطری اضطراب کی حالت نہیں ہوتی بلکہ اطمینان

انشراح اور آسودگی کی کیفیت ہوتی ہے لیکن جب دین میں غیر معمولی تحریک یا اس کے نفاذ میں غیر معمولی رکاوٹ یا غلبۂ ملت میں غیر معمولی انحطاط کی کیفیت رونما ہوتی ہے تو کسی نہ کسی طاقتور عامل کی قوت سے اضطراب، حرکت اور بیداری کا عمل وجود میں آتا اور ملت اپنے دین کے تحفظ یا اپنی ذات کی سلامتی کے لیے بیدار ہو جاتی ہے۔ میں نے ملت کی بیداری کے ان اوقات کے تعین کے لیے پہلے تو صرف برصغیر کو منتخب کیا ہے جو میرے لیے معلومات کے حصول کا آسان دائرہ ہے۔ اس کے بعد بیداری کی اولین تحریک کے طور پر حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک کو سب سے پہلے لیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے قبل برصغیر میں ملت کو غلبہ حاصل تھا اور دین کے اجراء اور اس کے تقاضوں پر عمل درآمد کے بارے میں بھی کوئی واضح رکاوٹ موجود نہ تھی۔ مسلمانوں کے غلبے کے ساتھ دین کا غلبہ خود بخود شمار ہوتا تھا اور اس کے وجود کو مادی یا معنوی کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ لیکن مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں اس کی جہالت، علم دین سے بےخبری قوت وطاقت اور ذرائع و وسائل کی فراوانی کا خمار غیر مسلم بت پرستوں کی شب و روز کی صحبت و مشاورت اور جہاں بانی کے غیر اسلامی اطوار کے رواج کے ساتھ دین میں تحریف کا سلسلہ چل نکلا۔ یہاں تک کہ دین اسلام کی بجائے اکبری دربار نے ایک دین الٰہی رائج کر لیا جو اسلام کے مقابلے میں خالص کفر و الحاد کا راستہ تھا۔ اس وقت اسلام کے تصور اور حقیقت کو خطرہ تھا۔ جب مجدد الف ثانی نے اپنی تحریک تجدید و احیائے دین کا آغاز کیا۔ انہوں نے ملت کے تمام طبقات کو متاثر کیا۔ فوجی سرداروں۔ مملکتی روساء۔ امراء۔ حکام۔ عوام سب کے اندر اس تحریک نے نفوذ کیا۔ انہیں قید و بند سے بھی دو چار ہونا پڑا لیکن ملت کے اجتماعی ضمیر کی شرکت سے مجدد الف ثانی نے یہ جہادِ حریتِ اسلام جیت لیا۔ اس جہاد تجدید و احیائے دین کی پوری تفصیل آج کتابوں میں موجود ہے۔ میں نے اس کا مجمل تذکرہ کر کے صرف ملت کی زندگی اور اس کی جدوجہد کا مشاہدہ اپنے قارئین کو کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس تحریک تجدید و احیائے دین کا نتیجہ تھا کہ مغل خاندانوں میں ہی اورنگزیب جیسا درویش صفت عالم فاضل حکمران پیدا ہوا۔ جس نے اسلامی قوانین کے نفاذ کا

اہتمام کیا ہے اور خود ایک درویش بادشاہ کی حیثیت سے زندگی گزار دی۔

لیکن جب ایک طرف مغل خاندان غلبۂ مسلمین قائم رکھنے میں معذور ہوتا گیا اور دوسری طرف ان کے ذریعے مزید دین کی خدمت اور ملت کے تحفظ کا امکان بھی ختم ہوگیا تو دہلی اور بریلی سے تحریکِ مجاہدین اٹھی جس کے ذریعے ملت نے مسلمانوں کے غلبے اور اسلام کے احیاء کی کوشش بذریعہ جہاد کرنے کی کوشش کی چنانچہ سیّد احمد شہید کی تحریک کو جس فراوانی اور فراخدلی سے مسلم ملت نے امداد بہم پہنچائی' اس کی تفصیلات کتابوں میں درج ہیں۔ مسلم ملت کے دینی عناصر نے اپنا مال اور اپنے جگر گوشے اس تحریک کے حوالے کیے تاکہ وہ بذریعہ جہاد برصغیر میں مسلمانوں کے غلبے اور اسلام کے نفاذ کی جدوجہد کریں۔ دیندار مسلم عوام نے اس تحریک کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور وہ تحریک اس قابل ہوئی کہ انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز صوبہ سرحد کے پہاڑوں کی طرف سے کرے تاکہ ان کی پشت پر پہاڑ اور مسلمان پٹھان ہوں اور ان کے سامنے سکھوں کی ظالم ترین حکومت ہو۔ اس طرح سب سے پہلے سرحد اور پنجاب کی کثیر مسلم آبادیوں کو سکھوں کے مظالم سے نجات دلائی جائے اور اس کے بعد دہلی کی طرف زیادہ قوت کے ساتھ پیش قدمی کرکے برصغیر سے انگریزوں کو نکال کر دوبارہ مسلمانوں کا غلبہ اور اسلام کا اجراء کیا جاسکے۔

برصغیر میں جب ملت مسلمہ کی یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی تو پھر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے براہِ راست جنگِ آزادی برپا کی جس کا مرکز بیشتر وسطی ہندوستان تھا۔ اس جنگِ آزادی میں انگریزوں سے نجات حاصل کرنے اور مسلمانوں کے سیاسی غلبے کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے مسلم ملت نے جو قربانیاں دیں اُن کی پوری روداد ۱۸۵۷ء کے غدر اور جنگِ آزادی کی تفصیلات میں موجود ہے۔ اگرچہ اس جنگ آزادی میں ہندوؤں نے بھی حصہ لیا۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ انگریز غیر ملکی سامراجی قوت بن کر آئے تھے اور

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت مقامی باشندوں کی حکومت تھی جس میں مناصب کے ہر مقام پر ہندو اور دوسرے مقامی باشندے برابر کے شریک تھے۔ مسلمانوں کی حکومت فی الحقیقت باشندگان ہندوستان کی حکومت تھی۔ جس میں مذہب کی بناء پر کوئی امتیاز برتا نہیں جاتا تھا۔ فی الحقیقت مغل حکومت ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ مقامی حکومت تھی۔ اسی لیے اس حکومت کو بحال رکھنے کے لیے اور انگریزوں سے نجات پانے کے لیے ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ مسلم ملت اس جنگ کو غلبۂ ملت کی آخری کشمکش سمجھتی تھی۔ اس لیے اس نے بے پناہ قربانیاں دیں۔

جنگِ عظیم اول کے نتیجے میں جب اتحادی قوتوں نے اپنے مخالفین کو شکست دے دی تو اتحادیوں کے مخالف لڑنے والی شکست خوردہ قوتوں میں خلافتِ عثمانیہ بھی شامل تھی۔ جس کے ذریعے مسلمانوں کو عالمی سطح پر ایک مرکزیت حاصل تھی۔ انگریزوں نے خلافتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کا فیصلہ کیا تو برصغیر میں ملت اسلامیہ نے ۱۹۲۲-۲۱ء میں تحریکِ خلافت برپا کی۔ مقصد یہ تھا کہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی جو مرکزیت موجود ہے جس کا مسلمان ملکوں میں خطبہ دیا جاتا ہے۔ یہ مرکزیت برقرار رہے۔ یہ تحریک اتنی زوردار اور بھرپور تھی کہ ہندوؤں کی قومی جماعت انڈین نیشنل کانگریس بھی اس تحریک کا ساتھ دینے اور مسلمانوں کے ملی کاز میں ان کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس تحریک میں مسلمان ملت نے دامے درمے سخنے قدمے تعاون کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور ایثار و قربانی اور ہم آہنگی و یکجہتی کی نادر مثال قائم کر دی لیکن بدقسمتی سے انگریزوں نے نہیں بلکہ مصطفےٰ کمال پاشا ترک رہنما نے خود ہی خلافت کا منصب ختم کر کے ترکی کو یورپین طرز کی ایک قومی ریاست قرار دے دیا اور اس کی مذہبی اور نظریاتی حیثیت کو ختم کر دیا۔ اس تحریکِ خلافت میں بھی برصغیر میں ملت اسلامیہ کی بیداری بے مثال اور اس کا ایثار و قربانی تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ جس کا تذکرہ ہم نے بیداری ملت کی

تحریک کے لحاظ سے کیا ہے۔

○

جنگ عظیم دوم کے بعد جب برٹش سامراج کے لیے اپنی مشرقی نوآبادیوں کو سنبھالنا ممکن نہ رہا اور اس نے تدریجاً برصغیر کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اس نے یہاں اپنے سیکولر جمہوریت کے نظام کو رائج کرکے ملک کی اکثریتی پارٹی کو حکومت دینے کا راستہ اختیار کیا۔ ویسے بھی دورِ غلامی میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے مقابلے میں انگریزوں کے زیادہ بہتر اور وفادار غلام ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اور انگریز مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں سے زیادہ ذہنی اور قلبی قربت رکھتے تھے۔ سیکولر جمہوریت کا اکثریتی پارٹی والا نظام یورپ میں تو منشور کی حامل پارٹیوں کے ذریعے اپنے اندر حکومتوں اور پارٹیوں کے بدلتے کا راستہ رکھتا تھا لیکن ہندوستان میں جہاں مذہبی بنیاد پر اکثریتی اقلیتی گروہ تھے وہاں تو اکثریتی قوم کے لیے ہمیشہ کی حکومت اور اقلیتی قوم کے لیے ہمیشہ کی غلامی کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ پورے ہندوستان میں اکثریتی ہندو قوم کی غلامی میں پوری مسلم قوم کے چلے جانے کے مقابلے میں ملت مسلمہ کے ضمیر میں یہ احساس و شعور بیدار ہوا کہ تحریکِ پاکستان کے ذریعے مسلم ہندوستان کے اکثریتی علاقوں کو کیوں نہ جداگانہ مملکت کی صورت دے دی جائے جس میں مسلمان ملت کا زیادہ حصہ آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر اسلامی زندگی اختیار کر سکے اور ملت کے باقی ماندہ حصے کی آزادی اور حقوق کے لیے اسی مملکت کے پلیٹ فارم سے جدوجہد جاری رکھے جو اقلیتی آبادیوں میں رہ کر غیر مسلم ہندوستان کی غلامی پر مجبور ہو جائے۔ یہ خیال جو ملت کے ضمیر کی آواز تھی۔ علامہ اقبال نے پیش کیا اور دوسرے بھی متعدد مفکرین نے اسے آخری چارہ کار کے طور پر پیش کیا۔ لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فخر قائداعظم محمد علی جناح اور ان کی جماعت کل ہند مسلم لیگ کو حاصل ہوا۔ اس طرح برصغیر کی ملت مسلمہ کی تحریکِ پاکستان نے شمال مغربی ہندوستان اور مشرقی ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں کو ہندو کی غلامی سے بچا لیا۔ یہ تحریکِ پاکستان ایک ایسی تحریک ہے جس کے ذریعے دورِ غلامی کی بے بسی میں بھی برصغیر ہند کی مسلم

ملت کو ایک نیا ملک تخلیق کرنے اور اسے حاصل کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ قومیں بالعموم اپنے دورِ عروج میں ملک فتح کرتی ہیں اور دورِ زوال میں کھو دیتی ہیں لیکن ملت اسلامیہ ہند نے اپنے دورِ غلامی میں بھی ایک ملک بے سروسامانی کے باوجود اپنے اتحاد اور عزم کے بل پر حاصل کیا۔ یہ تحریکِ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی برپا کردہ تحریکوں میں ایک منفرد قسم کی تحریک ہے جو کامیابی کے ساتھ اپنی سیاسی منزل کو پہنچی۔ البتہ ابھی اسے اپنی نظریاتی منزل تک پہنچنا باقی ہے جو فریضہ اب ظاہر ہے کہ اس خطے کے مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے جس خطے پر پاکستان محیط ہے۔

○

پاکستان بن جانے کے بعد برصغیر کی ملت مسلمہ کے سامنے اس کی حقیقی منزل اسلامی نظام کا قیام تھا لیکن اس کے ہمسائے بھارت نے اس کی جداگانہ مملکت کی تشکیل کو کبھی دل سے قبول نہ کیا۔ کبھی بد دیانتی اور قوت سے اس کے حصے کے بعض علاقوں پر بجبر اقبضہ کر لیا جیسے جوناگڑھ، مانادر، حیدرآباد اور کشمیر اور مشرقی پنجاب اور مشرقی پاکستان کے بعض اکثریتی مسلم آبادی کے علاقے اور کبھی اپنی اکثریت اور قوت کے زعم میں اس پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارتی حملہ پاکستان کی ہستی کو مٹانے کے عزم کا حملہ تھا جسے ملت نے اپنی ہستی کے خلاف ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور اپنی جداگانہ مملکت کو بچانے کے لیے جس نوعیت کی غیر معمولی حرکت۔ عزم۔ ایثار و قربانی۔ توانائی اور عزیمت کا اظہار کیا اسے اہم تحریک دفاعِ پاکستان کے نام سے ہی منسوب کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریک بیداریٔ ملت کو بھی ہم نے ملت کی بیداری کی تحریکوں میں ایک تحریک کی حیثیت سے شامل کیا ہے۔

○

پاکستان کا بنیادی تصور ایک خالص اسلامی نظریاتی ریاست کا تصور تھا۔ جسے جمہوری خلافت کے ذریعے پورا ہونا تھا۔ اس میں پوری ملت کی شرکت اور مشاورت کا اہتمام لازم تھا۔ اس میں مواقع اور حیثیت کی مساوات یقینی تھی اس میں کسی کی کسی چیز

پر اجارہ داری کا کوئی تصور نہ تھا لیکن مغرب زدہ طبقہ نے اس تصور کو مختلف حیلوں بہانوں سے مٹانے کی کوشش کی اور کمانڈر انچیف ایوب خاں نے مارشل لاء لگا کر تو ملت کے مجموعی تصوراتی خوابوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہ ملک کسی شخص کی ملوکیت اور آمریت قائم کرنے کے لیے نہیں بنایا گیا تھا لیکن ایوب خاں نے فوج کے ذریعے پورے ملک پر مارشل لاء مسلط کر کے ملک کے ضمیر اور اعتماد کو شدید دھچکا لگایا چنانچہ ملت نے اس کی کسی کارروائی کو کبھی دل و جان سے قبول نہیں کیا۔ صرف ۶ ستمبر کا جہاد دفاع پاکستان اس کی قیادت میں لڑا کہ جہاد ملت کی ناگزیر ضرورت ہے اور ہر نوعیت کے مسلم کمانڈر کی قیادت میں لڑا جا سکتا ہے لیکن قومی قیادت کے لیے ملت کے ضمیر نے ایوب خان کو کبھی قبول نہ کیا۔ بالخصوص اس کی آمریت جو مسلمانوں کی آزادی اور ضمیر کو محدود کرتی تھی اس سے مسلمان ملت کو ہمیشہ نفرت رہی اسی لیے جیسے ہی اس نے اپنے اقتدار کا دس سالہ جشن مسرت منایا۔ ملت نے اسکے خلاف اظہار نفرت و بیزاری کے لیے احتجاج کا راستہ اختیار کر لیا اور ملک کی بیشتر جمہوری جماعتوں نے متحد ہو کر اس کے خلاف تحریک جمہوریت کا آغاز کر دیا جس نے اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ایک ایسی قومی اور جاندار تحریک تھی جس نے ظالم کے اقتدار کو اکھاڑ کر پھینک دیا اور ملت نے ثابت کر دیا کہ وہ اس ملک میں آمروں کی آمریت اور جابروں کا جبر برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے بلکہ اپنے نصب العین کی طرف پیش رفت کے لیے سیاسی آزادی اور ضمیر کی آواز کے مطابق زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ ہم نے ملت کی اس تحریک کو بھی بیداریٔ ملت کی تحریکوں میں شامل کیا ہے

(۱۸)

ہم نے سب سے آخر میں تحریک نظام مصطفٰے کو لیا ہے۔ یہ تحریک اگرچہ ایک ایسے آمر کے خلاف تھی جو عوام سے ووٹ لے کر آیا تھا لیکن بعد میں آمر بن بیٹھا تھا لیکن اس کے عزائم کا رُخ اور جرائم کی کثرت بتاتی تھی کہ وہ اپنے مداری پن سے قوم کو دھوکا دے کر اسے اس کی حقیقی منزل سے بھی دور لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے اسلام کے لیے حاصل کئے گئے ملک میں سیکولر جمہوریت کو اپنے کھلے مسلک کے طور پر اپنایا۔ مملکت کے اندر مجموعی

اسلامی فضا، اخوت اور بھائی چارے کو نقصان پہنچا کر ملت کو دو متصادم ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ملک کی معیشت میں سوشلزم کا پیوند لگا کر ریاستی سرمایہ داری کا راستہ نکالا۔ آزاد تجارتی اداروں کو ریاستی قبضے میں لے کر اپنی جبری آمریت کو مزید مضبوط کیا اور حق کے لیے بلند ہونے والی ہر آرزو کو دبا کر صرف اپنی آواز کو دوسری ہر آواز پر حاوی اور مسلط کرنے کی ناروا کوشش کی۔ پھر کرپشن، بد دیانتی، غنڈہ گردی، بدمعاش، علاقائی تعصبات، لسانی فسادات اور مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ کا بازار گرم کر دیا اور جمہوریت کے نام سے قتل کروانے اور دوسروں کے جلسے اکھاڑنے اور آواز دبانے کا ظالمانہ بے محابا راستہ اختیار کیا۔ ملت نے اسے شناخت کرتے ہی اس کے خلاف احتجاجی تحریک چلائی اور اگرچہ وہ احتجاجی تحریک تھی لیکن خود ملت نے بھی اس کا نام تحریک مصطفےٰ رکھا اس لیے کہ ملت کا ضمیر یہ بات واضح کرنا چاہتا تھا کہ یہ ملک اسلامی نظام کے لیے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ ملک محمد مصطفےٰ کی امت کا ملک ہے۔ کسی مارکس، سٹالن یا چرچل کی امت کا ملک نہیں ہے۔ یہاں اگر کوئی نظام نافذ ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد مصطفےٰ کا لایا ہوا نظام ہی نافذ ہو سکتا ہے۔ کسی سوشلزم، کیپٹل ازم، سیکولر ازم، نیشنلزم یا بھٹو ازم کے لیے یہاں کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ چنانچہ یہ تحریک جو دلوں میں دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے دن سے ہی ابل رہی تھی۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں پورے ملک میں بھونچال کی طرح پھٹ پڑی اور جولائی ۱۹۷۷ء تک بے مثال قوت و توانائی اور ہمہ گیر غلبے کے ساتھ پورے ملک میں چلتی رہی۔ یہاں تک کہ معتوب ملت شخصیت کو اس کی مضبوط کرسی پر سے نیچے دھکیل دیا گیا اور فی الحقیقت اس ملت کا سینہ اسی روز ٹھنڈا ہوا جب وہ شخص کیفر کردار کو پہنچا۔ جس نے اس ملت کو ورغلا کر نظام مصطفےٰ سے نظام ابلیس کی طرف لے جانے کی ناپاک جسارت کی تھی۔ ہم نے بیداری ملت کی ان تحریکوں میں اس تحریک کو بھی شامل کیا ہے۔

ان تحریکوں کے تجربے سے جو بات مشترک نظر آتی ہے وہ ملت کا اتحاد اور اخوت کا مظاہرہ ہے۔ ہر تحریک کے وقت ملت میں اخوت اور اتحاد کا عظیم جذبہ نمودار ہوا ہے اور جب یہ جذبہ کمزور ہوا ہے تو تحریک بھی کمزور ہو کر فنا ہو گئی ہے۔ اس لیے فی الحقیقت اس ملت کی قوت کا حقیقی سرچشمہ اتحاد ملت ہے۔ جب اتحاد نمودار ہوتا ہے توانائی اور قوت کا عظیم سرچشمہ پھوٹ پڑتا ہے اور جب افتراق و انتشار اور تفریق پیدا ہوتی ہے تو یہ ملت ٹکڑوں میں بٹ کر ضعیف، بے بس، کمزور اور ناتواں رہ جاتی ہے یہ بات ہم پر بھی منکشف ہے اور ہمارے دشمنوں پر بھی آشکارا ہے لیکن ہمارے دشمن ہمیں ٹکڑوں میں بانٹنے میں بالعموم کامیاب ہوتے ہیں۔ جب کہ جس قدر اتحاد و اشتراک کی اقدار اس ملت کے پاس ہیں اور کسی گروہ کے پاس نہیں ہیں۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک قرآن، ایک دستور العمل، ایک پیمانۂ خیر و شر، ایک معروف و منکر کا تصور، ایک جوابدہی کا تخیل۔ ایک والدین کی نسل کا یقین۔ اور ایک انجام جنت و دوزخ پر ایمان۔ اس میں اختلاف کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ آزادانہ رائے تو انسان کا فطری حق ہے اور اس کی حدود بھی اسلام نے مقرر کر دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت وحدت ملت ہے۔ جب تک مسلمانوں میں اتحاد تھا۔ وہ دنیا میں سربلند رہنما اور بارعب ملت تھے اور جب سے ان میں انتشار و افتراق پیدا ہوا ہے۔ ان کے لیے ذلت و رسوائی اور پس ماندگی مقدر ہو کر رہ گئی ہے۔

مسلمانوں سے زیادہ دنیا کی کسی قوم کے پاس بھی اتحاد ملت کی بنیادیں کثیر اور مضبوط نہیں ہیں۔ زندگی کے تمام بنیادی اصولوں میں مسلمان اتفاق کرتے ہیں اور معمولی فروعات میں اختلافات درحقیقت ملت کی ترقی اور حالاتِ حاضرہ کے ساتھ مطابقت کے لیے ضروری ہیں لیکن بدقسمتی سے فروعات کا یہ اختلاف اصولی اختلاف بنا دینے سے ہی افتراق و انتشار کا یہ عظیم فساد رونما ہوا ہے۔ آج بھی مسلمان اگر فروعات میں رواداری

اصولوں میں مضبوطی اور پائیداری کا طریقہ اپنالیں تو تعداد اور وسائل کی کثرت اور اعلیٰ اخلاق اصولوں کی پیروی سے کردار کی بلندی انھیں ترقی و امامت کے بلند ترین مقام تک پہنچا سکتی ہے۔

آج کے اس دور میں ایک طرف ہم نے مذہبی امور میں فروعات کے اختلاف کو انتہائی شدت سے پیش کرنے کا طرزِ عمل اپنایا ہے۔ جس کے نتیجے میں جب مذہبی مسائل میں اختلاف رونما ہوتا ہے تو مذمت اور مخالفت کے لیے بھی مذہبی اصطلاحات ہی استعمال ہوتی ہیں اور بلا دریغ ایک دوسرے کو خارج از اسلام کافر و زندیق اور گمراہ قرار دے دیا جاتا ہے اور جب کبھی کسی سے سیاسی اختلاف ہوتا ہے تو سب و شتم کے ساتھ کردار کشی کے لیے مختلف حربے استعمال ہوتے ہیں اور یہ بالکل احساس نہیں کیا جاتا کہ کردار کشی خالص ایک غیر اسلامی طرزِ عمل ہے اور اسلام اس کی مذمت کرتا ہے۔ مسلمانوں کے طرزِ زندگی میں کسی کی کردار کشی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مغرب کی ملعون سیاست ہے۔ جو کردار کشی کو روا رکھتی بلکہ اسے فن بنا کر پیش کرتی ہے۔ اسلامی اجتماعیت میں کردار کشی جرم قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہے۔

○

مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع ان کا نظامِ زندگی ہے جو اسلام پر مبنی ہے۔ فی الحقیقت یہ اس کی غیر موجودگی کا ہی سبب ہے کہ مسلمان ٹولوں میں بٹ کر اور متحارب پارٹیوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ فرقہ مسلمانوں میں ایک فقہی مکتبِ فکر کا نام ہے اور یہ خالص ایک علمی مسئلہ ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں مسائل کی تعبیر کے لیے دلائل مختلف ہو سکتے ہیں اور مختلف دلائل کی بنا پر مختلف مکاتبِ فکر وجود میں آ سکتے ہیں۔ لیکن مختلف مکاتبِ فکر تو زندگی کے ہر شعبے میں ہوتے ہیں۔ کسی مسئلے کی تعبیر میں اہلِ علم دیانت داری سے باہمی اختلاف کر سکتے ہیں اور ان کا باہمی دلائل کی بنا پر اختلاف کرنا ایک علمی طرزِ عمل ہے اس میں کفر سازی اور باہمی دشنام طرازی کی کسی حد تک بھی گنجائش نہیں ہے اور یہ طرزِ عمل کسی حد تک بھی علمی اور عقلی نہیں ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی نظام زندگی کو قائم رکھنا مسلمانوں کا اجتماعی فرض ہے جو ایک اسلامی تحریک کی موجودگی کے بغیر ممکن نہیں ہے تاکہ مسلمان فرقہ و طبقہ کے امتیاز سے بالا ہو کر ایک اسلامی تحریک میں شریک ہوں اور سب سے پہلے اسلامی نظام حیات کو برپا کریں۔ صحابہ کرامؓ میں اختلاف رائے کے باوجود کوئی فرقہ وارانہ طبقہ سازی موجود نہ تھی اس لیے کہ ایک اسلامی تحریک موجود تھی۔ جس میں وہ سب شامل تھے اور اس میں شامل ہو کر وہ اسلامی نظام زندگی قائم کرنے میں مسلسل مصروف تھے۔ جب تک وہ اسلامی نظام زندگی موجود رہا ان میں کوئی قابلِ ذکر اختلاف فقہی بنیادوں پر نظر نہ آیا لیکن جیسے ہی اسلامی نظام زندگی ان کی اجتماعی زندگی سے غائب ہوا ان کے اندر فرقوں کا فساد اور اختلافات کا طوفان جاری وساری ہو گیا۔ گویا یہ سارے اختلافات اسلامی نظام کی غیر موجودگی کے سبب ہیں۔

یہ تو حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد کے بغیر کوئی اسلامی نظام برپا نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کی وحدت کے بغیر نظام باطل کو شکست دے کر انسانیت کی فلاح کا راستہ نہیں کھولا جا سکتا۔ مسلمانوں کی وحدت ہی اسلام کی سربلندی کا واحد راستہ ہے۔ لیکن اس وحدت میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے فرقے ہی حائل ہیں۔ اس کمزوری کے نتیجے میں خارجی طور پر باطل طاغوتی قوتوں نے مسلمانوں کے معاشروں میں اپنے آہنی پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ان کی معاشیات، سیاسیات، تعلیمات، سماجیات اور خارجی تعلقات کو وہ کنٹرول کرتی ہیں اور داخلی طور پر یہ فرقے مسلمانوں کو آپس میں پھاڑتے، کاٹتے، لڑاتے اور ٹکڑے ٹکڑے کرتے رہتے ہیں۔ درحقیقت اس امت کو ان فرقوں نے ہی تیمہ قیمہ کر دیا ہے۔ حزب اللہ کا یہ گروہ جو دنیا کی قیادت کے لیے اٹھایا گیا تھا فرقہ بندی کے سبب سرنگوں اور خوار و زبون ہو کر رہ گیا ہے دنیا کی باطل قوتوں نے اسے اپنا اور باطل کا آلۂ کار بنا لیا ہے مسلمانوں کا کوئی ملک بھی آج باطل قوتوں کے شکنجے سے آزاد نہیں ہے۔

○

اب ہم کو فرقہ پرستی کا یہ شکنجہ توڑنے کی ضرورت ہے۔ اب ملت مسلمہ کو لاشتہ

لاشریکہ کا نعرہ لگاکر اسلامیہ اسلامیہ کا علم بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک وحدت کی پکار اور نظام اسلامی کی حقانیت کی اذان ہے جبکہ پورے عالم اسلام پر طاغوتی قوتوں نے ہر چہار طرف سے یلغار کر رکھی ہے تاکہ ملت کے اتحاد کی ہر آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے اور مسلمان کی شب تاریک کو کبھی سحر نہ ہونے دیا جائے۔ بدقسمتی سے سب سے پہلے مسلمان ہی ملت کی تباہی کے درپے اور عصبیتوں کا شکار ہیں اور جو کام غیر مسلموں کو کرنا تھا اسے خود مسلمان سرانجام دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

پچھلے دنوں روس نے افغانستان میں جارحیت کرکے افغان مجاہدین کے ہاتھوں جو مزہ چکھا ہے اور افغان مجاہدین نے روس کو جو ناکوں چنے چبوائے ہیں اس سبب سے بھی غیر مسلم قوتیں مسلم اقوام کے خلاف براہِ راست جارحیت سے بالعموم کتراتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑوا کر ہی اپنا کام نکالنا چاہتی ہیں اور انہیں مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے مسلمان آسانی سے مل بھی جاتے ہیں۔

○

ایسے حالات میں مسلمانوں کی قوت کا سرچشمہ خدا کی توفیق وتائید کے بعد صرف اتحاد وحدتِ ملت میں ہی پوشیدہ ہے۔ درحقیقت اتحاد اور وحدت ہی ملت کے تمام دکھوں کا مداوا ہے۔ اتحاد ہی ہماری قوت اور اتحاد ہی ہمارا ہتھیار ہے۔ جو گروہ بھی اسلامی تحریک کا علمبردار ہو گا۔ وہ لازماً۔ عالم اسلام کے اتحاد کا علمبردار ہو گا اور جو اسلام کی دعوت لے کر اٹھے گا، وہی افتراق وتشتت کی قوتوں کا سب سے بڑا نشانہ بھی بنے گا۔ یہ تو صدیوں سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اسی صورتِ حال میں ہمارے زوال وانحطاط کا راز پوشیدہ ہے۔

بلاشبہ ہمارا مسلم معاشرہ مجموعی طور پر ہمیشہ اتحاد چاہتا ہے لیکن وہی معاشرہ گلی کوچوں میں، مساجد میں، کاروبار اور برادریوں کے اجتماعات میں، قومی ادارات اور سماجی تنظیمات میں ہر کہیں شدید انتشار کا شکار ہے اور پیہم باہمی دست وگریبان رہتا ہے۔ ہماری ہماری معاشیات میں طبقات ہیں، سیاسیات میں اجارہ داریاں ہیں۔ سماجیات میں اونچ نیچ

اور برادریاں ہیں، اختلافات میں بیچ رنگی زندگیاں ہیں۔ تنظیمات میں دھڑے بندیاں اور گروپ ہیں، مساجد میں فرقے اور کاروباروں میں رقابتیں ہیں، غرض انتشار پر ہم عمل پیرا ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں اتحاد کا نعرہ ہمیشہ بلند ہوتا رہتا ہے۔ مجموعی طور پر ہم ہمیشہ اتحاد چاہتے ہیں اور متفرق طور پر ہم ہمیشہ دست و گریبان رہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اتحاد کی ضرورت کا احساس ہمیشہ رہا ہے۔ اس کے لیے کوششیں بھی بہت کی جاتی رہی ہیں اور اس کی افادیت اور ضرورت سے انکار بھی کسی نے آج تک نہیں کیا ہے لیکن یہ شے ہمارے ہاں ہمیشہ عنقا ہی رہی ہے۔

○

بلاشبہ اتحاد ایک مطلوب شے ہے اس سے غالباً کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوگا لیکن یہ کیسے ہو! اور اگر ہو جائے تو کیا پھر یہ قائم بھی رہ سکتا ہے! یہی وہ معاملہ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن پاک نے بڑی وضاحت سے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامیں رکھیں اور تفرقہ نہ کریں۔ لیکن اس ہدایت پر شاید ہی مسلمانوں نے کبھی عمل کیا ہو۔ اس کی بے شمار وجوہ ہیں اور جب تک ان تمام اسباب و علل کا تجزیہ اور ان کا مداوا نہ ہو، مصنوعی طور پر جب لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ چند دن متحد رہ کر پھر بکھر جاتے ہیں اور بکھرنے کے الزامات ایک دوسرے پر لگا کر اپنے اختلافات میں مزید اضافہ کر لیتے ہیں۔ میرے خیال میں آج بھی ہمارے موجودہ اختلافات کا بحرِ بے کران اتحاد ہی کی مختلف کوششوں کا نتیجہ ہے اور فرقوں کی کثرت مسلمانوں کو نئے نئے پلیٹ فارموں پر جمع کرنے کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔

یہ مسلمان قوم کچھ اصولوں کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آئی تھی۔ وہ اصول بہت ہی معروف اصول ہیں اور دنیا کی غیر مسلم اقوام بھی ان اصولوں سے بڑی حد تک واقف ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان اصولوں پر اعتقاد اور عمل میں کمزوری پیدا ہوتی چلی گئی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ انحطاط ہوتا ہے اس سے کسی کو مفر نہیں ہے جو قومیں اصول کی

بنیاد پر بنتی ہیں وہ جب انحطاط کا شکار ہوتی ہیں تو بالعموم اصولوں کو نظر انداز کرنے اور فروعات میں انہماک کے سبب ہی انحطاط و خلفشار کا نشانہ بنتی ہے۔ اس صورتحال سے عہدہ برآ ہونے اور اپنے تشخص کو قائم رکھنے کے لیے وہ اپنی تاریخی عظمت کا سہارا لیتی ہیں اور یہ تاریخ ان کے اندر انگیس آرزوئیں ماضی کی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی تڑپ پیدا کرتی ہے۔ ان کے خون کو گرم رکھتی ہے اور وہ جد وجہد میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اصولوں کی پابندی میں اگرچہ کمزوری رونما ہو جاتی ہے لیکن اصولوں کی محبت اور کھوئی ہوئی عظمت کے حصول کی جدوجہد ان کے اندر یگانگت خیر خواہی اور اولوالعزمی کا جذبہ قائم رکھتی ہے اور اس طرح وہ متحد ہو کر کوئی کام کر سکتی ہیں لیکن اپنے ماضی سے محبت کے مقام سے گرنے کے بعد قومیں دبوپن کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان کے اندر انفعالیت پیدا ہو جاتی ہے وہ ہر طاقت کے سامنے جھکنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اپنے اصولوں، اپنی تاریخ، اپنے کردار اور اپنے طرزِ عمل کے متعلق بھی وہ بے یقینی میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور ان کا اندازِ فکر معذرت خواہانہ بن جاتا ہے۔

○

آپ اپنی موجودہ مسلمان قوم کا جائزہ لیجیئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اصولوں کے معاملے میں اس کے اندر کمزوری صدیوں پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے بہت آغاز میں ہی ملوکیت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ اس نے دنیا کے دوسرے فلسفوں سے نظریات قبول کرنے اور تہذیب و تمدن میں دوسروں کی نقالی کرنے کی استعداد بھی پیدا کرنی شروع کر دی تھی وہ اپنے خیر وشر کے پیمانے بدلنے کے لیے تو تیار نہ ہوئی لیکن شر کو قبول کرنا اور خیر کو بربنائے مصلحت ترک کرنا بھی اس نے شروع کر دیا تھا۔ سخت کوشی سے تن آسانی اور تن آسانی سے عیش و عشرت، پھر عیش و عشرت سے لالچ اور لالچ سے حرام خوری تک کی منزلیں طے کرنا بتدریج آسان ہوتا چلا گیا۔ اس انحطاط سے اس کا نصب العین سے تعلق کمزور ہو گیا۔ یکسوئی بھی ختم ہو گئی اور یہ قوم اپنی حرص بڑھوا کو پورا کرنے کے لیے بے شمار حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ہر حصے کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور اپنے مقاصد کو

حاصل کرنے کے لیے مذہب کو استعمال کرنا پڑا اور اس طرح دین کی بے شمار تعبیریں سامنے آتی چلی گئیں۔ ہر تعبیر ایک خاص گروہ کے نقطۂ نظر اور مفاد کے پیش نظر کی گئی۔ اس لیے اس گروہ کے لیے صرف وہی تعبیر معتبر قرار پائی اور باقی تعبیریں مردود ٹھہریں۔ اس طرح ملت مسلمہ فرقہ در فرقہ بٹتی چلی گئی۔ پھر ہر فرقے نے بڑی محنت و جانفشانی سے قرآن و حدیث سے اپنے مخصوص تصورات کے مطابق دلائل جمع کر کے اپنے گرداگرد ایک مخصوص علم کلام کی باڑ لگا دی اور اپنے تحفظ کی خاطر دوسروں پر حملے شروع کر دیئے ان حملوں سے باہمی فاصلے اور دوریاں مزید بڑھ گئیں۔

○

اب مصیبت یہ بن گئی ہے کہ جب کوئی اللہ کا بندہ مسلمانوں کو اصل نصب العین کی طرف پلٹنے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یکسوئی اور اتحاد کا واحد طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنی نظریاتی بنیاد کو مستحکم کیا جائے تاکہ یہ عمارت مضبوط ہو اور وہ مخالفین اور دشمنوں کے حملوں، جھٹکوں اور دھماکوں کا مقابلہ کر سکے تو اس پر فوراً یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ شخص بھی فرقوں کی مارکیٹ میں ایک نئی دکان چمکانا چاہتا ہے۔ یہ شبہ کرنے والوں میں نیک نیت لوگ بھی شامل ہوتے ہیں اور بدنیت لوگ بھی۔ پھر تمام موجودہ فرقوں کے علم کلام کے ماہرین اپنے اپنے اسلحہ خانے سے بڑے تیز و تند ہتھیار نکال کر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیتے ہیں اور اس نئے داعیٔ اتحاد کو شکست دینا، اسے رُسوا کرنا، اسے دین کا سب سے بڑا دشمن قرار دینا، اسے ایک عظیم مذہبی فتنہ ثابت کرنا ان کے اندر "قدر مشترک" بن جاتا ہے۔ پھر ایک نیا علم کلام معرض وجود میں آ جاتا ہے جس میں صریح جھوٹ خیالی الزامات اور جھوٹے اندازے شامل ہوتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے بزرگان دین کی پیش گوئیوں کو سان پر چڑھا کر اس اللہ کے بندے پر منطبق کی جاتی ہیں اور اسلام کو بازیچۂ اطفال بنا دیا جاتا ہے اور اتنا کیچڑ اچھالا جاتا ہے کہ پہلے سے موجود فرقے اور اتحاد اور دین کی دعوت دینے والے فرد اور گروہ تمام کے تمام الزامات کے گندے کیچڑ سے لت پت ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ایک بڑی

تعداد اسلام اور مذہبی لوگوں سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ لوگ اسلامی نصب العین سے اور بھی دور ہو جاتے ہیں۔

مذہبی لوگوں کے اس طرزِ عمل، فرقوں کے اپنے اپنے علم کلام، مدافعانہ حملوں اور دینی تعلیم کے فرقوں کی بنیاد پر تدوین نے رفتہ رفتہ عام مسلمانوں کے اندر اس غلط تصور کو رائج کر دیا ہے کہ صرف مذہب ہی اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتا بلکہ اتحاد کے لیے مذہب کے ساتھ کچھ دوسری عصبیتوں کا جوڑ لگانا بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں کے اندر یگانگت پیدا کی جا سکے ظاہر ہے کہ اس تصور کے جڑ پکڑنے کے بعد مذہب کی بنیاد کمزور ہو جاتی ہے جو مذہب مسلمانوں کو جوڑنے کا بہترین ذریعہ ہے وہی جوڑنے کی بجائے توڑنے اور لڑانے کا کام کرنے لگتا ہے۔ مذہب کا یہ تصور اسلام کے تصورِ یگانگت اور ملتِ واحدہ سے ٹکراتا ہے اور اسلام نے اپنے ایسا مذہب ہونے سے برأت کا اظہار کیا ہے۔ کاش مسلمان ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کے کاروبار سے بچ سکتے اور تعبیرِ دین میں اختلاف رائے رکھنے کے باوجود بھی قرآن و سنت کی مشترکہ بنیاد پر متحد رہ سکتے۔ قرآن و سنت ہی اتحاد کی واحد متفق علیہ بنیاد ہے۔ اس پر متحد رہتے ہوئے ہر گروہ کو اپنے دائرے میں قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی تعبیر اور اپنا عمل کرنے کی آزادی دینے میں ہی اتحاد کی منزل پوشیدہ ہے۔ جب تک دین اسلام کی اپنی عدالت قائم نہ ہو جائے۔ کفر سازی کا مشغلہ ترک کر کے بھائی چارے اور اخلاق کا راستہ اختیار کرنے میں ہی مسلمانوں کی فلاح پوشیدہ ہے۔ اگر مسلمانوں میں باہمی افتراق یونہی موجود رہا تو مسلمانوں نے عالم کفر کی چند صدیوں کی غلامی کے بعد جو دوبارہ آزادی حاصل کی ہے وہ اس کا بھی تحفظ نہ کر سکیں گے۔ اسلام کی سربلندی کا راز عالم اسلام کے اتحاد میں ہی پوشیدہ ہے جبکہ عالم کفر مسلمانوں اور ان کے دین کے مقابلے میں پہلے سے زیادہ متحد جارحیت پر آمادہ نظر آتا ہے۔

مسلمانوں کے اس باہمی افتراق و انتشار پر اکابر ملت اسلامیہ ہمیشہ رنجیدہ پریشان اور

غور و فکر میں مبتلا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری حالیہ تاریخ کے ایک نامور اسکالر اور مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی نگارشات میں اس صورت حال کا تجزیہ بھی کیا ہے اور مملکتِ پاکستان کے حالات کے پس منظر میں اپنی وہ تجاویز بھی پیش کی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے ہم اپنے درمیان اختلاف و افتراق کو اس کے فطری حدود میں رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اختلاف بلاشبہ ایک فطری عمل ہے اور اس سے قومیں ترقی کرتی اور زندگی کی جدوجہد میں آگے بڑھتی ہیں۔ خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں یہ اختلاف اپنی فطری حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی تشکیل کے بعد سے ہر روز اختلافات میں ترقی اور اضافے کا روز بن کر آتا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم اپنی ہستی اور اپنے ملک کی سلامتی تک کے بارے میں مشکوک و متردد ہو چکے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہمیں ٹھہر کر اپنے بہی خواہوں کے مشوروں پر بھی غور کرنا چاہیئے۔

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

* ہمارے ہاں اختلافات کی فصلِ بہار آئی ہوئی ہے۔ فکر و نظر کے اختلافات، اغراض اور خواہشات کے اختلافات، گروہوں اور ٹولیوں کے اختلافات، علاقوں اور صوبوں کے اختلافات نت نئی شان سے ابھرتے رہتے ہیں اور ابھرتے چلے آرہے ہیں جو کچھ ایک بنانا چاہتا ہے۔ دوسرا اس میں مزاحم ہو جاتا ہے اور دوسرا جو کچھ بنانا چاہتا ہے۔ کوئی تیسرا اس کو بگاڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس صورتحال نے ہر پہلو میں تعمیر روک رکھی ہے اور تخریب آپ سے آپ اپنا کام کر رہی ہے۔ خواہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دل سے خواہاں نہ ہو۔

اگر ہم اپنے دشمن آپ نہیں ہو گئے ہیں تو ہمیں اختلافات اور مخالفت و مزاحمت کے اس اندھے جنون سے افاقہ پانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اپنے ذہن کو اُن بنیادوں کی تلاش میں لگانا چاہیئے جن پر سب، یا کم از کم باشندگانِ پاکستان متفق ہو سکیں جن پر متفق ہو کر ہماری قومیں اپنی تخریب کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ سکیں۔

ایسی بنیادیں تلاش کرنا درحقیقت مشکل نہیں ہے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے ذہن "وجوہِ نزاع" کرید کرید کر نکالنے کے بجائے اساساتِ اتفاق ڈھونڈنے کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ذرا سا زاویہ بدل جائے تو ہم باآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اساساتِ اتفاق ہمارے قریب ہی موجود ہیں ہم انہیں اپنے مذہب میں پا سکتے ہیں۔ دنیا کے تجربات میں پا سکتے ہیں اور عقلِ عام کی صاف اور صریح رہنمائی میں پا سکتے ہیں۔

اولین چیز جس پر ملک کے تمام مختلف الخیال گروہوں اور اشخاص کو اتفاق کرنا چاہیئے وہ صداقت اور باہمی انصاف ہے۔ اختلاف اگر ایمانداری کے ساتھ ہو دلائل کے ساتھ ہو اور اسی حد تک رہے۔ جس حد تک فی الواقع اختلاف ہے تو اکثر حالات میں یہ مفید ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس طرح مختلف نقطہ ہائے نظر اپنی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں اور لوگ انہیں دیکھ کر خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ ان میں سے کس کو قبول کریں تاہم اگر وہ مفید نہ ہو تو کم سے کم بات یہ ہے کہ مضر نہیں ہو سکتا لیکن کسی معاشرے کے لیے اس سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس میں جب بھی کسی کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ "جنگ میں سب کچھ حلال ہے" کا ابلیسی اصول اختیار کر کے اس پر ہر طرح کے جھوٹے الزامات لگائے۔ اس کی طرف جان بوجھ کر غلط باتیں منسوب کرے۔ اس کے نقطۂ نظر کو قصداً غلط صورت میں پیش کرے، سیاسی اختلافات ہوں تو اسے غدار اور دشمنِ وطن ٹھہرائے۔ مذہبی اختلاف ہو تو اس کے پورے دین و ایمان کو ختم کر ڈالے اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے اس طرح پڑ جائے کہ گویا اب مقصدِ زندگی بس اسی کو نیچا دکھانا رہ گیا ہے۔ اختلاف کا یہ طریقہ صرف اخلاقی لحاظ سے ہی معیوب اور دینی حیثیت سے گناہ نہیں ہے بلکہ عملاً بھی اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی بدولت معاشرے کے مختلف عناصر میں باہمی عداوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اس سے عوام دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں اور اخلاقی مسائل میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اس سے معاشرے کی فضا میں وہ تکدر پیدا ہو جاتا ہے جو تعاون و مفاہمت کے لیے نہیں بلکہ صرف تصادم و مزاحمت ہی کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ اس میں کسی شخص یا گروہ کے لیے عارضی

منفعت کا کوئی پہلو ہو تو ہو مگر بحیثیت مجموعی پوری قوم کا نقصان ہے. جس سے بالآخر وہ لوگ خود بھی نہیں بچ سکتے جو اختلافات کے اس بے ہودہ طریقے کو مفید سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہمیں کسی سے خواہ کیسا ہی اختلاف ہو ہم صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اس کے ساتھ ویسا ہی انصاف کریں جیسا ہم خود اپنے لیے چاہتے ہیں۔

دوسری چیز جو اتنی ہی ضروری ہے۔ اختلافات میں رواداری، ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش اور دوسروں کے حق رائے کو تسلیم کرنا ہے. کسی کا اپنی رائے کو حق سمجھنا اور عزیز رکھنا تو ایک فطری بات ہے لیکن رائے رکھنے کے جملہ حقوق اپنے ہی لیے محفوظ کر لینا انفرادیت کا وہ مبالغہ ہے جو اجتماعی زندگی میں کبھی نہیں نبھ سکتا پھر اس پر مزید خرابی اس مفروضے سے پیدا ہوتی ہے کہ "ہماری رائے سے مختلف کوئی رائے ایمانداری کے ساتھ قائم نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جو بھی کوئی دوسری رائے رکھتا ہے وہ لازماً بے ایمان اور بدنیت ہے" یہ چیز معاشرے میں ایک عام بدگمانی کی فضا پیدا کر دیتی ہے، اختلافات کو مخالفتوں میں تبدیل کر دیتی ہے اور معاشرے کے مختلف عناصر کو جنہیں بہر حال ایک ہی جگہ رہنا ہے۔ اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر کسی مفاہمت و مصالحت پر پہنچ سکیں. اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ مدتِ دراز تک معاشرے کے عناصر ترکیبی آپس کی کش مکش میں مبتلا رہیں اور اس وقت تک کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے جب تک ایک عنصر باقی سب کو ختم نہ کر دے یا پھر سب لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں اور خدا کسی دوسری قوم کو تعمیر کی خدمت سونپ دے. بدقسمتی سے ناروا داری اور بدگمانی اور خود پسندی کا یہ مرض ہمارے ملک میں ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے بہت کم لوگ بچے ہوئے ہیں حکومت اور اس کے "ارباب اقتدار" اس میں مبتلا ہیں، مذہبی گروہ اس میں مبتلا ہیں. اخبار نویس اس میں مبتلا ہیں، حتیٰ کہ بستیوں اور محلوں اور دیہات کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں تک اس کے زہریلے اثرات اتر گئے ہیں اس کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ جو اپنے اپنے حلقوں میں نفوذ و

اثر رکھتے ہیں اپنی ذہنیت تبدیل کریں اور خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو تحمل و برداشت اور وسعت ظرف کا سبق دیں۔

تیسری چیز جسے تمام ان لوگوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے جو اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں کام کرتے ہوں، یہ ہے کہ ہر شخص اپنی قوتیں دوسروں کی تردید میں صرف کرنے کی بجائے اپنی مثبت چیز پیش کرنے میں صرف کرے اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات کسی چیز کے اثبات کے لیے اس کے غیر کی نفی ناگزیر ہوتی ہے مگر اس نفی کو اس حد تک رہنا چاہیئے جس حد تک ناگزیر ہو اور اصل کام اثبات میں ہونا چاہیئے نہ کہ نفی میں۔ افسوس ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے۔ یہاں زیادہ تر زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ دوسرے جو کچھ کر رہے ہیں، اس کی مذمت کی جائے اس کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کر دی جائے۔ اکثر لوگ تو اس منفی کام سے ہی دلچسپی رکھتے ہیں۔ سرے سے کوئی مثبت کام کرتے ہی نہیں اور کچھ دوسرے لوگ اپنے مثبت کام کے فروغ کا انحصار اس پر سمجھتے ہیں کہ میدان میں ہر دوسرا شخص جو موجود ہے اس کی اور اس کے کام کی پہلے مکمل نفی ہو جائے۔ یہ ایک نہایت غلط طریق کار ہے اور اس سے بڑی قباحتیں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے تعصبات ابھرتے ہیں اس سے عام بے اعتباری پیدا ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے عوام کو تعمیری طرز پر سوچنے کے بجائے تخریبی طرز پر سوچنے کی عادت پڑتی ہے۔

یہ روش خصوصیت کے ساتھ موجودہ حالات میں تو ہمارے ملک کے لیے بہت ہی زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس وقت ہماری قومی زندگی میں ایک بڑا خلا پایا جاتا ہے جو ایک قیادت پر سے اعتماد اٹھ جانے اور دوسری قیادت پر نہ جمنے کا نتیجہ ہے۔ اس خلا کو اگر کوئی چیز بھر سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اپنا جو کچھ اور جیسا کچھ بھی مثبت کام اور پروگرام رکھتی ہیں وہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملے کہ کون کیا کچھ بنا رہا ہے، کیا کچھ بنانا چاہتا ہے اور کس کے ہاتھوں سے کیا بننے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہی چیز آخر کار ایک یا چند جماعتوں پر قوم کو مجتمع کرسکے گی اور اجتماعی طاقت سے کوئی

تعمیری کام ممکن ہو گا لیکن اگر صورتحال یہ ہے کہ ہر ایک اپنا اعتماد قائم کرنے کے بجائے دوسروں کا اعتماد ختم کرنے میں لگا ہے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ کسی کا اعتماد بھی قائم نہ ہو سکے گا اور ساری قوم بن سری ہو کر رہ جائے گی۔

ایک اور بات جسے ایک قاعدہ کلیہ کی حیثیت سے سب کو مان لینا چاہیئے۔ یہ ہے کہ اپنی مرضی دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے جو کوئی بھی اپنی بات دوسروں سے منوانا چاہتا ہے وہ جبر سے نہیں دلائل سے منوائے اور کوئی اپنی تجویز کو اجتماعی پیمانے پر نافذ کرنا چاہتا ہو تو وہ بزور نافذ کرنے کی بجائے ترغیب و تلقین سے لوگوں کو راضی کرے۔ محض یہ بات کہ ایک شخص کسی چیز کو حق سمجھتا ہے یا ملک و ملت کے لیے صحیح اور مفید خیال کرتا ہے۔ اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اٹھے اور زبردستی لوگوں پر اس کو مسلط کرنے کی کوشش شروع کر دے۔ اس طریق کار کا لازمی نتیجہ کشمکش مزاحمت اور بدمزگی ہو گا۔ ایسے طریقوں سے ایک چیز مسلط تو ہو سکتی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ کامیابی کے لیے لوگوں کی قبولیت اور دلی رضامندی ضروری ہے۔ جن لوگوں کو کسی نوع کی طاقت حاصل ہوتی ہے خواہ وہ حکومت کی طاقت ہو یا اثر و نفوذ کی وہ بالعموم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی بات منوانے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رضائے عام کے حصول کا لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس طاقت ہی کافی ہے لیکن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہی زبردستیوں نے بالآخر قوموں کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ ملکوں کے نظام تہہ و بالا کر دیے ہیں ان کو پرامن ارتقاء کے راستے سے ہٹا کر انقلابات کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے حکمران و رہنما اگر واقعی اپنے ملک کے خیر خواہ ہیں تو انہیں دھونس کے بجائے دلیل سے اور جبر کے بجائے ترغیب سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیئے اور اس طرح پاکستان کے عام باشندے بھی اگر اپنے بدخواہ نہیں ہیں تو انہیں اس بات پر متفق ہو جانا چاہیئے کہ وہ یہاں کسی کی دھونس اور زبردستی نہیں چلنے دیں گے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی عصبیتوں کو ختم کرکے مجموعی

طور پر پورے ملک اور ملت کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے سوچنے کا خوگر ہونا چاہیئے۔ ایک مذہبی فرقے کے لوگوں کا اپنے ہم خیال لوگوں سے مانوس ہونا یا ایک زبان بولنے والوں کا اپنے ہم زبانوں سے قریب تر ہونا یا ایک علاقے کے لوگوں کا اپنے علاقے والوں سے دلچسپی رکھنا تو ایک فطری بات ہے اس کی نہ تو کسی طرح مذمت کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا مٹ جانا کسی درجے میں مطلوب ہے۔ مگر جب اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنی محدود دلچسپیوں کی بنا پر تعصب اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے گروہی مفاد یا مقاصد کے لیے معرکہ آرائی پر اتر آتے ہیں تو یہ چیز ملک اور ملت کے لیے سخت نقصان دہ بن جاتی ہے اس کو اگر نہ روکا گیا تو ملک پارہ پارہ ہو جائے گا اور ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ جس کے برے نتائج سے خود یہ گروہ بھی نہیں بچ سکتے۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جس فرقے، قبیلے، نسل، زبان یا صوبے سے اس کا تعلق ہو۔ اس کے ساتھ اس کی دلچسپی اپنی فطری حد سے تجاوز نہ کرنے پائے یہ دلچسپی جب تعصب کی شکل اختیار کرے گی تو تباہ کن ثابت ہوگی۔ ہر تعصب لازماً جواب میں ایک تعصب پیدا کرتا ہے اور تعصب کے مقابلے میں تعصب ہمیشہ کش مکش پیدا کرتا ہے پھر بھلا اس قوم کی خیر کیسے ہو سکتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی آپس میں برسر پیکار ہوں۔

ایسا ہی معاملہ سیاسی پارٹیوں کا بھی ہے۔ کسی ملک میں سیاسی پارٹیوں کا وجود اگر جائز ہے تو صرف اس بنا پر کہ ملک کی بھلائی کے لیے جو لوگ ایک خاص نظریہ اور لائحہ عمل رکھتے ہوں انہیں منظم ہو کر اپنے طریقے پر کام کرنے کا حق ہے لیکن یہ حق دو ضروری شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع نیک نیتی کے ساتھ ملک کی بھلائی کے خواہاں اور کوشاں ہوں اور دوسری شرط یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی مسابقت یا مصالحت اصول ہو اور معقول اور پاکیزہ طریقوں تک محدود رہے۔ ان میں سے جو شرط بھی مفقود ہوگی۔ اس کا فقدان پارٹیوں کے وجود کو ملک کے لیے مصیبت بنا دے گا۔

اختلافات سے باز رکھنے والی ان موثر تجاویز کے علاوہ ہمیں ایک اور پہلو سے بھی سوچنا چاہیئے۔ کیا ہمارے دشمن ہمارے درمیان فرقوں اور گروہوں کی بنا پر کوئی امتیاز کرتے ہیں۔ یا صرف مسلمان ہونے کے جرم کی سزا دینے کے لیے ہی وہ ہمارے خلاف برسرپیکار ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ہمیں صرف مسلمان سمجھ کر اسلام قبول کرنے کی سزا دیتے ہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم بھی صرف مسلمان ہی بن کر رہیں اور اسی صورت میں ہم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن سکتے ہیں فرقہ کو اختلاف اور عصبیت کا ذریعہ نہ بنائیں فرقہ بندی سے بچنے کی موثر تدابیر اختیار کریں۔ اتحادِ ملت میں ہی فلاحِ ملت مضمر ہے۔ مسلمانوں کے بنیادی عقائد ان کے درمیان متفق علیہ ہیں۔ ان میں کسی فرقے کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلافات کا آغاز ان عقائد کی تشریحات سے ہوتا ہے۔ جن کے لیے مختلف لوگوں کے مختلف دلائل ہیں اور ظاہر ہے کہ دلائل کی بنا پر اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس سے کسی کا ایمان غیر معتبر نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اگر مندرجہ ذیل امور کو بھی بنائے اتحاد بنایا جائے تو تھوڑے ہی عرصے میں مسلمانوں کے اندر اتحاد و یگانگت کی ایمان افروز فضا پیدا ہو سکتی ہے۔

- مسلمانوں کی تمام مساجد فرقوں کی بجائے صرف اللہ کی مساجد شمار ہوں۔ ان کا فرقوں سے انتساب ختم کر دیا جائے۔
- ہر مسجد میں ہر مسلمان نماز ادا کرنے کا حق رکھے کوئی مسجد کسی مسلمان کے لیے بند نہ ہو۔ البتہ ہر مسلمان کو پیش امام کے پیچھے اپنے فقہی مسلک کے مطابق نماز ادا کرنے کا حق حاصل ہو۔
- مسلمانوں کے اسلاف باہمی سب کے لیے محترم ہیں۔ کوئی گروہ کسی کے اسلاف کے بارے میں نازیبا زبان استعمال نہ کرے۔ یہی قرآن کی ہدایات ہیں۔
- جس آبادی میں جس مسلک کے مسلمان اکثریت میں ہوں۔ وہاں کا پیش امام اسی مسلک کا ہو اور دوسرے مسلک کے مسلمان اس کے پیچھے نماز پڑھیں اگر ان چار امور کا التزام کر لیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ دو چار سال کے عرصے میں مسلمانوں کے فقہی مسالک کی

بنا پر جو باہمی تلخی ہے وہ کم ہو جائے اور مسلمان بتدریج فرقہ بندی کے متفرق پلیٹ فارموں سے اٹھ اٹھ کر ملت واحدہ کے متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔

اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں میں گروہ بندی کا آغاز نظام اسلامی کے انحطاط اور خاتمے کے ساتھ ہوا ہے گویا مسلمانوں کے لیے بنائے اتحاد قیام نظام اسلامی ہے اور بنائے اختلاف انہدام نظام اسلامی ہے۔ اگر مسلمان اپنی امت کا اتحاد چاہتے ہیں تو انہیں اسلامی نظام کی بحالی اور قیام کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ میرے نزدیک اتحاد ملت کا یہی مفید ترین نسخہ ہے اور اسی میں ملت مسلمہ کا اسلامی تشخص اور مستقبل محفوظ ہے۔

(۱)

تحریکِ تجدید و احیائے دین

۱۵۶۴ء تا ۱۸۲۶ء

مسلمانوں کے طریقِ حکومت و مملکت میں طرزِ ملوکیت کبھی پسندیدہ طرزِ حکومت شمار نہیں کیا گیا۔ اسلام نے مسلمانوں کو شورائی طرزِ حکومت کی تعلیم دی ہے اور یہ تعلیم بھی ان ایام میں دی گئی۔ جب سارے جہاں میں بادشاہت اور ملوکیت کا سکہ رواں تھا اور کوئی شخص اپنے طور پر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملوکیت کے سوا کوئی دوسرا طرزِ حکومت بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلام نے حکومت کے لیے یہ تعلیم دی ہے کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

ترجمہ:۔ انہیں امورِ مملکت میں شوریٰ میں شریک کریں۔

مسلمانوں کی بدقسمتی سے جب وہ یہ نظامِ مملکت کھو بیٹھے تو ان پر ان کے ملوک مسلط ہو گئے جن میں سے اکثریت جب اسلام کے مشاورتی اصول کو پامال کر کے وراثت کے اصول پر بادشاہتوں پر متمکن ہوئی تو ان میں سے اکثریت ہی اسلام کی تعلیمات پر مثالی عمل کرنے سے گریزاں رہی۔

لیکن بعض حکمران تو قوت و شوکت اور مطلق العنانیت اور دولت و ثروت سے اتنے بدمست ہوئے کہ وہ اپنی اصل کو بھی فراموش کر گئے۔ جس امت سے ان کا واسطہ تھا اس امت کی روایات و عقائد کو بھول گئے اور نشہ حکمرانی اور حکمتِ جہانبانی کے ایسے نمونے پیش کیے جو شاید ملتِ کفار نے بھی پیش نہ کیے ہوں گے۔

طاغوتِ وقت

ان نام نہاد مسلمان حکمرانوں میں مغل بادشاہوں کے سلسلے میں سے ایک جلال الدین اکبر بھی ہے جس نے بادشاہت اور ملوکیت کے نشے میں اپنی سلطنت کی مضبوطی کی حکمتِ عملی اختیار کرنے میں دین ایمان۔ شرافت۔ اسلامی روایات۔ عقل ودانش اور فہم فراست سب کو خیرباد کہہ کر ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس کی ہمیشہ اسلامی دنیا میں مذمت کی جائے گی۔ اس نے اپنی سلطنت قوت اور بادشاہت کو کفار کے ساتھ مل کر اسلام کی جڑیں اکھاڑنے اور مسلمانوں کو کافر و زندیق بنانے پر صرف کر دیا۔ ملت اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر رہتی دنیا تک اس کی مذمت کرتا رہے گا۔ اور کفار ہمیشہ اس کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہیں گے اس لیے کہ اس نے مسلمانوں کی ہوئے اسلام کو اکھاڑنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے کفر کو جمانے اور کفار کا غلبہ قائم کرنے میں اپنی ساری زندگی لگا دی۔

جب مسلمانوں پر ابتلاء کا ایسا دور آئے تو ہمیشہ ملت اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر کروٹ لیتا ہے اور اس کے اندر روحِ توحید بیدار ہو کر صحیح سمت کی طرف پیش رفت کا سامان کر دیتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمان ملت تاریخ کے بدترین ادوار میں سے گزرنے اور دین کے صراطِ مستقیم سے انحراف کے بے شمار مراحل طے کرنے کے باوجود اس قابل رہی ہے کہ صحیح سمت کی طرف ہٹ سکے۔ اس کے اندر ایسے ایسے عظیم الشان رجال قدرت الٰہی سے پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے نفوس قدسیہ سے ملت کا مرجھایا ہوا پودا تاریخ کے مختلف ادوار میں بار بار سرسبز و شاداب ہوتا رہا ہے۔ باطل کی سرگرانی کے دور میں اس کا ابطال اور حق کی مظلومیت کی فضا میں اس کا احقاق کرنے والے نفوس قدسیہ اس ملت کی گود میں پرورش پاتے اور اپنا فریضۂ شہادت حق سرانجام دیتے رہے اس راستے میں اگر آزمائشیں آئیں تو انہوں نے بسر و چشم گوارا کیں اور اگر قربانیوں کا مرحلہ آیا تو انہوں نے بے دریغ قربانیاں دے کر بدعت کی آلودگیوں سے دامن ملت کو

دھویا اپنا خون بہا کر ملت کو سرخرو کیا اور اپنے نعرۂ حق سے ملت کے افسردہ دلوں میں سنت کی پیروی اور حریت پسندی کا مقدس جذبہ بیدار کیا۔

انہیں انفاس قدسیہ اور ملت اسلامیہ کی گرانقدر مقدس متاع میں سے ایک رجل رشید شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ہیں۔ جن کی گیارھویں صدی ہجری میں اٹھائی ہوئی تحریک تجدید و احیائے دین سے برصغیر میں ملت اسلامیہ کا چہرہ روشن ہے۔ حق تعالیٰ نے انہیں اس وقت استقامت عطا فرمائی جب ہندوستان میں ملت اسلامیہ کا چہرہ خود اس کے ایک ناخلف اور منحرف فرزند کے ہاتھوں مسخ اور تاراج ہو رہا تھا۔

کفر و بدعت کا ماحول

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی[1] وہ ظلم و جبر، خدا سے غفلت اور دین کی صراط مستقیم سے دُوری کا ماحول تھا۔ مسلمان عقلیت، تصوف منحرف تشیع اور علماء سو کے جدلی مباحثوں اور مناظرہ بازیوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ اکبر کا دربار تمام فتنوں کو ہوا دے رہا تھا۔ وہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی انفرادیت مٹا کر مذاہب کی مشترک اور مخلوط بنیادوں پر وطنی قومیت اور متحدہ کلچر کو فروغ دینا چاہتا تھا اس کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملت اسلامیہ جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی، کسی شائستہ اور مہذب قوم کے لیے یہ تعلیمات موزوں نہیں ہیں۔ نبوت، وحی، حشر و نشر، جنت ودوزخ ہر چیز کا مذاق اڑایا جا رہا تھا، قرآن کا کلام الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً ناممکن مرنے کے بعد ثواب و عذاب غیر یقینی البتہ تناسخ ممکن اور قرین قیاس معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا تھا۔ ذات نبوی پر اعتراضات کیے جاتے تھے۔ آپ کی ازواج کی تعداد اور آپ کے غزوات و سرایا پر کھلم کھلا حرف گیریاں کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمدؐ سے

---

[1] استفادہ از تاریخ دعوت و جہاد مرتبہ مولانا عبداللہ فہد فلاحی شائع کردہ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور۔

بھی بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا چنانچہ جن لوگوں کے ناموں میں یہ الفاظ شامل تھے۔ ان کے نام بھی بدلے جانے گئے۔ علمائے سوء نے اپنی کتابوں میں نعت کے بجائے تبرا شروع کر دیا بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجال کی نشانیاں ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چسپاں کرنے لگے۔ العیاذ باللہ دیوانِ خانۂ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے ابوالفضل نے روزہ، نماز، حج اور دوسرے دینی شعار پر سخت اعتراضات کیے اور ان کا مذاق اڑایا۔

اس کفر ساز ماحول میں بالآخر جاہل اکبر بادشاہ نے اپنے حواریوں کے مشورے سے ایک نئے مذہب دین الٰہی کی بنیاد رکھی۔ اس کے خلیفہ اول شیخ ابوالفضل تجویز کیے گئے یہ اکبر کی ذہنی اختراع اور جدت کی انتہا تھی۔ اس دین کے اصول و عقائد فرنگیوں، پارسیوں اور ہندوؤں سے لیے گئے تھے۔ اس کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ قرار پایا۔ سلام مسنون کے بجائے اللہ اکبر اور جل جلالہٗ کا شعار اختیار کیا گیا۔ بیعت کے وقت عوام اپنا سر اکبر کے پاؤں پر رکھ دیتے۔ انہیں تعلیم دی جاتی کہ اخلاص چار گانہ کا خاص خیال رکھیں یعنی ترک مال، ترک جان ترک ناموس اور ترک دین۔ دربار شاہی میں تمام ہندوانہ رسوم و رواج رائج کیے گئے اور ایک ایک کر کے اسلامی شعار کو رخصت کر دیا گیا۔

حلال و حرام کی نئی شریعت وضع کی گئی۔ سود اور جوا حلال کر دیا گیا اور خود ریاست کی سرپرستی میں قمار خانہ قائم ہوا۔ قمار خانوں کو ریاست کے شاہی خزانوں سے سودی قرض دیا جاتا تھا۔ شراب بھی طبی استعمال کے پردے میں جائز ہو گئی۔ عائلی توانین بدل دیئے گئے۔ ہندوؤں کے قاعدے کے مطابق چچا، ماموں اور خالہ وغیرہ کی بیٹیوں سے شادی حرام قرار دے دی گئی۔ سولہ سال سے کم عمر لڑکے اور چودہ سال سے کم عمر لڑکی کا نکاح ناجائز قرار دے دیا گیا۔ عزت و ناموس اور غیرت و حمیت سے بیگمات کو عاری کرنے کے لیے مینا بازار لگوائے گئے جس میں شاہی گھرانوں کی خواتین کو سیر و تفریح کے لیے دعوت دی جاتی۔ بادشاہ خود اس میلے میں شریک ہوتا، عورتوں کے جھگڑے چکاتا اور لڑکے لڑکیوں کے بر منتخب کرتا۔ شیر اور بھیڑیے کا گوشت حلال ٹھہرایا گیا اور گائے بھینس، گھوڑا بھیڑ بکری

اور اونٹ کے گوشت کی تحریم کا قانون نافذ کیا گیا۔ سور کو پاک جانور کہا گیا اور یہ فلسفہ تراشا گیا کہ یہ ان دس مظاہر میں سے ہے جن میں خدا نے حلول کیا ہے۔ اوقاف پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ منبر و محراب اور خانقاہوں سے حق کا کلمہ بلند نہ ہو سکے۔ جمعہ، عیدین اور اسلامی تقریبات کا اہتمام بھی اکبر نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

شرعی ثبوت کے بغیر عید کا اعلان کر دیا جاتا اور لوگوں کے روزے تڑوا دیئے جاتے، عربی پڑھنا اور عربی جاننا عیب قرار پایا اور فقہ و تفسیر اور حدیث کے پڑھنے والے مردود اور مطعون گردانے گئے۔ اعلان کیا گیا کہ عربی علوم کا پڑھنا پڑھانا ترک کیا جائے اور علوم نادرہ یعنی نجوم، حساب، طب اور فلسفہ کے سوا اور کوئی علم نہ پڑھا جائے۔[۱]

علمائے سو کا طرزِ عمل

اس بدبختی اور دین سے انحراف کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ علمائے سو کی ایک بڑی تعداد نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ مثال کے طور پر زعفران اور لال کپڑے کے جواز کا فتویٰ حاجی ابراہیم سرہندی نے دیا۔ بادشاہ کو سجدہ کرنے کا فتویٰ قاضی خان بدخشانی نے دیا اور ملّا عالم کابلی کو اس بات کا افسوس رہا کہ ہائے یہ مجھے کیوں نہ سوجھا۔ ڈاڑھی منڈانے کی حدیث ملا ابوسعید نے نکالی۔ اسلام کے ساتھ ہندو مذہب کا جوڑ، کلام پاک اور پُران کی تطبیق شیخ تاج الدین اجودھنی دہلوی نے کی۔ شیعی عالم ملا شریف آملی نے تموری عہد کے ایک مصنف محمود بسخوانی کی ایک کتاب سے یہ شہادت پیش کی کہ نو سو نوے ہجری میں باطل کا مٹانے والا ایک شخص صاحب دینِ حق پیدا ہوگا۔

ابوالفضل نے لکھا کہ "جب بنی نوع انسان کی خوش نصیبی سے ایسا وقت آ جاتا ہے کہ حق پرستی کا دور دورہ ہو تو بادشاہ دوراں ہی کو پیشوائی جہاں بخش دی جاتی ہے جو جلوہ زار کثرت میں سیدھا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ ملا عبداللہ سلطان پوری نے حج کے

---

[۱] علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد اول ص ۷۰ تا ۷۴، مولانا سید محمد میاں صاحب

اسقاطِ فرض کا فتویٰ اس استدلال کی بنیاد پر دیا تھا کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ قزلباشوں کی ترکتازیوں سے پُرخطر ہو گیا ہے اور سمندر کے راستے میں فرنگیوں سے پروانۂ راہداری لینے کی ذلت گوارا کرنی پڑتی ہے جس پر حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی تصویریں چھپی ہوتی ہیں اور یہ بت پرستی کے مترادف ہے بنا بریں حج کے دونوں راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ اختلافِ مذاہب مٹانے اور اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرنے اور ان سب کو ملا کر ایک جدید معجونِ مرکب تیار کرنے کا سبق بھی انہی علماء سو نے دیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبری الحاد و زندقہ کی پشت پر نفس پرست قائدین اور متصوفین کی بھی ایک فوج ظفر موج موجود تھی، یہ کس قدر دشوار اور مشکل تھا لیکن حضرت مجدد نے سرکش گردنوں کو مروڑنے اور طاقتِ وقت کا سر کچلنے کے لیے کمر ہمت کس لی۔

تطہیرِ افکار و تعمیرِ کردار کی جدوجہد

شیخ مجدد نے سب سے پہلے اسلامی نظریات کے صحیح خدوخال کو نمایاں کرنے اور غلط عقائد و نظریات کی بیخ کنی کا آغاز کیا۔ اکبری الحاد میں گمراہ کن شیعہ اثرات کا بھی بہت زیادہ دخل تھا چنانچہ آپ نے "رد روافض" کے نام سے ایک رسالہ لکھا، اپنے مکتوبات میں اس فرقے کی مخالفت کی اور اس کے تار و پود بکھیر دیئے ابو الفضل اور فیضی جیسے لوگ توحید اور رسالت کے سلسلے میں ملحدانہ خیال رکھتے تھے چنانچہ "اثبات النبوت" نامی رسالہ لکھ کر ملحدین کے اقوال کی تردید کی اور ختم نبوت اور نبوتِ محمدی کو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا۔

تصوف میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور "ہمہ اوست" کا جو اشراقی اور ہندی تصور پھیل گیا تھا اس کے مقابلے میں "ہمہ از اوست" کا تصور پیش کیا۔ شریعت اور طریقت میں تطبیق پیدا کی اور واضح لفظوں میں اس حقیقت کی تبلیغ کی کہ اگر صوفیاء کے حال، وجد، علوم، معارف، رموز اور اشارات شریعت کے مطابق ہوں تو بہتر ورنہ سراسر خرابی اور عذابِ ربانی کا سرمایہ ہیں۔ اس طرح آپ نے مدارِ فضیلت اتباعِ سنت کو قرار دیا اور بتایا کہ اہلِ ریاضت کے تمام مجاہدے اور ریاضتیں اگر سنتِ مطہرہ کے مطابق نہ ہوں تو بے کار اور بے سود ہیں۔

آپ نے درباری امراء اور سرداروں سے خود تعلقات قائم کیے، ان سے خط و کتابت کی اور ان کی اصلاح احوال اور تعمیر کردار کی کوشش فرمائی۔ اس وقت جو اعتقادی و عملی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان پر تبصرہ کیا اور خدا کی ذات و صفات، شریعت کی ابدیت اور سنت اور تصوف میں تطابق، دنیا اور زخارف دنیا کی ناقدری اور بے وقعتی خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کی توقیر و اتباع، وغیرہ کے بارے میں ان کی اُلجھنوں کو صاف کیا۔

اور ملاقاتوں۔ خط و کتابت۔ تعلیم و تلقین۔ وعظ و نصیحت اور جرأت و ہمت سے اس طوفان گمراہی کا مقابلہ کیا۔ اس طرح انہوں نے تربیت فکر و شعور اور تطہیر کردار و عمل کا زبردست کارنامہ سرانجام دیا۔ اسلام کی صحیح تعلیمات عوام اور امراء تک پہنچائیں، تصوف و طریقت اور تشیع والحاد کی بیخ کنی کی، اسلام سے محبت اور اس پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ پیدا کیا معروفات کو اپنانے اور منکرات سے بچنے کا داعیہ ابھارا اور دعوت و اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین بنایا اور یہ کام بڑے پیمانے پر تمام ارباب اقتدار و رسوخ کو استعمال کر کے سرانجام دیا۔

نفاذِ شریعت کی کوشش

اس کے ساتھ انہوں نے تنسیخ بدعات اور نفاذ شریعت کا مہم چلائی۔ عام مسلمانوں کے اندر تو ہمیشہ اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے وابستگی اور والہانہ عقیدت موجود رہی ہے انہوں نے اپنی ساری کوتاہیوں اور خرابیوں کے باوجود اسلام کے خلاف خطرات اور فتنوں کا ہمیشہ مقابلہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبری الحاد و زندقہ کو ختم کرنے کے لیے بھی متعدد بار مسلح بغاوتیں ہوئیں اور اس کا تختہ اُلٹنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ ملا محمد یزدیؒ نے ۱۵۸۰ء کے شروع میں اکبر کے خلاف فتویٰ دیا، شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادے شیخ بدرالدین نے دین جدید کے رسوم و شعائر کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور کو ۱۵۸۰ء کے اوائل میں مخالفت کے جرم میں جبراً حج پر بھیج دیا گیا اور بلا اجازت واپس آنے پر پابندی لگا دی گئی۔ قاضی جلال الدین ملتانی نے اکبری الحاد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ چنانچہ

ان کے خلاف جعلی مقدمہ چلا کر اکبر نے انہیں دکن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ اکبر کے رضاعی بھائی خانِ اعظم نے ہر خطرہ مول لے کر ان خرافات سے اسے روکنے کی پوری کوشش کی۔ امیر قطب الدین محمد خاں اٹکہ نے اس دین کی شدید مخالفت کی امیر شہباز خاں کنبوہ نے اپنی حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں اور دوسرے بہت سے امراء اور مسلمان اس دینِ الٰہی سے بغاوت کرتے رہے۔

لیکن یہ ساری کوششیں بھی ایک محدود دائرے کے اندر رہیں روز بروز انکا دائرہ تنگ ہوتا جارہا تھا اور مزاحمت کمزور پڑتی جارہی تھی۔ چنانچہ ان پر آشوب حالات میں حضرت مجدد نے اقتدار کا رخ بے دینی سے موڑنے اور اکبر کے دینِ جدید کو ختم کرنے کی جدوجہد کی۔ آپ کے ارادت مندوں میں اکبر کے متعدد درباری بھی تھے آپ نے ان کے نام متعدد خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی غربت و بے کسی کو ختم کرنے اور شریعت کی ترویج واشاعت اور اقامت دین کی دعوت دی۔ ان کے دلوں میں دین کی غیرت وحمیت کی آگ روشن کی اور پھر انہی کے ذریعہ حالات کا دھارا موڑنے کی بھرپور کوشش کی۔

دینی جدوجہد کے خوشگوار نتائج

آخر کار حضرت مجدد کی ان کوششوں اور مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق کو فتح ملی اور باطل کو ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ جہاں جہانگیر جیسا شراب کا متوالا شریعت اسلام کا معتقد ہوا اور ترویج شریعت کے سلسلے میں اس نے متعدد اقدامات کیے۔ خود لشکر شاہی اور امرائے دربار میں ایسا دیندار عنصر پیدا ہوا جس نے آگے چل کر مملکت کے نظام کو اسلامی شریعت میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف ہندو مسلم تہذیب کا معجون مرکب جو تیار ہو رہا تھا اور بھگتی تحریک کے اثرات اپنا رنگ لارہے تھے وہ سب آپ کی کوششوں سے نیم جان ہوگئے۔ اور رفتہ رفتہ غیر مسلم اثرات مسلمانوں کے ذہن و فکر سے زائل ہوتے گئے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو برگ و بار لانے کا موقع ملنے لگا۔

اس تحریک کا نتیجہ تھا کہ جہانگیر کے مقابلے میں شاہجہان زیادہ دیندار فرماں روا تھا اور شاہجہان کے مقابلے میں محی الدین اورنگزیب عالمگیر تو دین اسلام کا پوری طرح پابند حکمران تھا جس نے اپنے دور میں فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کے لیے علماء حق کا ایک بورڈ بنایا اور ان کے مشورے کے لیے متفقہ طور پر فقہ اسلامی کی تدوین کر کے اسے پورے ملک میں نافذ کر دیا۔ شریعت کے نفاذ کا جرم ہی ہے جس کے سبب غیر مسلموں نے عالمگیر کو آج تک معاف نہیں کیا۔

مجدد الف ثانی کا مختصر تعارف

ان کا تعارف ہم وطنوں سے زیادہ اس جرأت ایمانی کے حوالے سے ہے جو رب العالمین نے انہیں حیرت انگیز حد تک عطا فرمائی تھی جس کے بل پر انہوں نے مغل شہنشاہیت کے مقابلے میں دین کا علم بلند کیا۔ اس کا ایک منظر ملاحظہ کیجئے۔

"مغل شہنشاہ جہانگیر کا شاندار دربار[1] لگا ہوا تھا شہنشاہ ایک عالی شان طلائی تخت پر جو قیمتی پتھروں سے آراستہ تھا جلوہ افروز تھا۔ اس کے دونوں جانب وزراء اور عمائدین سلطنت دورویہ اپنی اپنی نشستوں پر قرینے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں کسی شخص کا انتظار تھا اور ان کی نگاہیں دروازہ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس دن شہنشاہ نے ایک خطرناک قسم کے مذہبی مصلح کو طلب کیا تھا۔ مقررہ وقت پر ایک کمزور اور ناتواں شخص جو درویشوں کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھا۔ دربار میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا تخت کی جانب بڑھا۔ سارے درباریوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ یہاں تک کہ جب وہ تخت کے سامنے پہنچا تو کورنش نہیں بجا لایا اور اس نے شہنشاہ کے سامنے سجدہ نہیں کیا۔ اس پر وزیر نے جو شہنشاہ کے سامنے کھڑا تھا چلا کر کہا: "کورنش بجا لاؤ تم جلالت مآب شہنشاہ جہانگیر کے روبرو ہو۔"

---

[1] استفادہ از "ایک سو ایک برگزیدہ مسلمان" مرتبہ خواجہ جلیل احمد ص ۲۲۳ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا" اجنبی نے قطعی آواز میں جواب دیا۔ "یہ سر جو صرف خدائے قدوس کے سامنے جھکتا ہے کسی فانی بندہ کے سامنے جھک نہیں سکتا۔"

سارے دربار میں ہلچل مچ گئی۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں آخر کار چند سوالات کے بعد شہنشاہ نے حکم دیا کہ اجنبی کو جو حضرت مجدد الف ثانیؒ تھے گوالیار کے قلعہ میں محبوس کر دیا جائے۔

سرہند کے شیخ احمد فاروقی عوام الناس میں مجدد الف ثانیؒ اور امام ربانی کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ شیخ احمد فاروقی جو حضرت عبداللہ بن عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے تھے ۱۵۶۴ء میں سرہند (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد مدینہ منورہ سے کابل اور وہاں سے ہجرت کر کے ریاست پٹیالہ میں سمانا میں آباد ہوئے تھے ان کے والد شیخ عبدالاحد ایک متقی قسم کے عالم دین تھے۔ شیخ احمدؒ ان کے چوتھے بیٹے تھے۔ جنہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم لاہور اور سیالکوٹ میں حاصل کی سیالکوٹ میں انہوں نے دینی تعلیم مشہور علماء مولانا کمال الدین کشمیری اور مولانا یعقوب کشمیری سے حاصل کی انہوں نے ایک دوسرے بڑے عالم دین قاضی بہلول بدخشانی سے فقہ، سیرت اور تاریخ پڑھی۔

سترہ سال کی عمر میں دنیوی اور مذہبی تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہوں نے روحانی تعلیم کے حصول کی جانب توجہ دی۔ ان کے والد اور بعد ازاں شاہ سکندر نے انھیں صوفیا کے قادریہ سلسلہ میں داخل کیا۔ ۱۰۰۸ھ ہجری میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ دہلی کے اکابر صوفی بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے دائرہ ارادت میں داخل ہو گئے جنہوں نے شیخ احمد فاروقیؒ کو سرہند شریف میں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔

شیخ احمد فاروقیؒ اپنے پیر کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تصنیف میں تحریر کیا ہے "یہ میرا عقیدہ ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ ایسے صاحب دل کی صحبت اور نبی کریمؐ کے زمانے کی تعلیم و تربیت ہمارے عہد میں مفقود ہے۔ اگر چہ یہ میری تقدیر میں نہیں تھا کہ میں رسول اکرمؐ کے زمانے میں پیدا ہوتا لیکن پھر بھی خوش قسمتی سے میں حضرت

باقی باللہؒ کی صحبت سے محروم نہیں رہا؟

پھر عرصے بعد وہ اکبر آباد (آگرہ) منتقل ہو گئے۔ جو اس زمانے میں مغلیہ سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ اکبر آباد کے دوران قیام میں شیخ احمدؒ نے دربار اکبری میں غیر اسلامی رسومات اور کفر و الحاد کی ترویج و ترقی کو بچشم خود ملاحظہ کیا اور انہوں نے اس کے جواب میں عربی و فارسی میں متعدد کتابچے تحریر کیے اور تجدید دین کی تحریک کا آغاز کیا۔

ان کی شادی تھانیسور کے امیر کبیر شیخ سلطان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کے جہیز سے ایک عالی شان مسجد تعمیر کی۔ ان کے سات بیٹے ہوئے اور ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو ان کا انتقال ہوا اور سرہند میں مدفون ہوئے۔ ان کا مقبرہ آج بھی زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

عہد جہانگیری کے ابتدائی زمانہ میں شیخ احمدؒ کو بڑی دشواریوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہی افواج اور عمائدین سلطنت میں شیخ کی مقبولیت نے شہنشاہ کو خوفزدہ کر دیا تھا جس میں مذہب سے بے گانہ درباری اور بھی اضافہ کرتے رہتے تھے اور شہنشاہ کو شیخ کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے۔ آخر کار جہانگیر کو مشورہ دیا گیا کہ وہ شیخ کو دربار میں طلب کر کے ان کے عقائد سے متعلق استفسارات کرے۔ شیخ کو دربار میں طلب کیا گیا اور ان کے جوابات کو تسلی بخش نہ پاتے ہوئے شہنشاہ جہانگیر نے شیخ کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ شہزادہ خرم (شاہجہان) نے جو شیخ کا معتقد تھا حضرت شیخ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ شہنشاہ جہانگیر کے سامنے کورنش بجا لائیں لیکن شیخ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جو سَر خدائے قدوس کے سامنے جھکتا ہے وہ کسی بندے (فانی انسان) کے سامنے نہیں جھک سکتا۔

شیخ احمد گوالیار کے قلعے میں ایک سال مقید رہے۔ ان کی مثالی زندگی نے قلعہ میں محبوس دیگر قیدیوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا اور انہیں سچا مسلمان بنا دیا۔ بقول سر ٹامس آرنلڈ، انہوں نے اپنی قید کے دوران سیکڑوں محبوس کافروں کو دائرہ اسلام میں داخل کر دیا؟

شیخ احمدؒ کے قول کے مطابق ان کی قید تنہائی ان کے لیے خدا کی رحمت ثابت ہوئی جس نے انہیں غور و فکر اور استغراق کا موقع دیا جس سے انہیں روحانی بالیدگی عطا ہوئی۔ آخر کار مغرور مغلیہ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی غلطی محسوس کی اور بڑی عزت و احترام کے ساتھ اس نے شیخ احمدؒ کو رہا کر دیا۔ جہانگیر نے اپنی "توزک جہانگیری" میں تحریر کیا ہے۔

"میں نے شیخ احمد کو اپنے پاس بلایا اور آزاد کر دیا۔ میں نے انہیں خلعت اور ایک ہزار روپے دیے اور انہیں اس بات کا اختیار دیا کہ چاہے وہ دربار میں ٹھہریں (وابستہ ہو جائیں) یا اپنے گھر چلے جائیں۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ قید و بند کی زندگی ان کے لیے مفید ثابت ہوئی"۔

شہنشاہ جہانگیر نے حضرت شیخ احمدؒ کے زیر اثر دین الہٰی کو ممنوع قرار دے کر شریعت اسلامیہ کو مملکت میں دوبارہ رواج دیا۔ مذہبی امور میں حضرت شیخ احمدؒ مغل شہنشاہ کے مشیر تھے۔ انہیں عوام الناس اور شاہی افواج میں اسلامی شریعت کی تبلیغ کرنے کی پوری اجازت تھی۔ ان کی تعلیمات سے شاہی افواج اور درباری اسلام سے قریب تر آ گئے اور انہوں نے اپنی زندگیوں کو اسلامی سانچے میں ڈھال لیا۔

مغل شہنشاہ جہانگیر نے بذات خود شیخ سے درخواست کی کہ وہ شاہی افواج کو شعائر اسلام سے متعارف کرائیں جس کی وجہ سے شاہی افواج کا اخلاقی اور اپنے فرائض سے متعلق معیار بہت بلند ہو گیا۔

شیخ احمد سرہندیؒ ایک عظیم دینی مصلح تھے جنہوں نے اسلام کو ان غیر اسلامی رسومات سے پاک کیا جو غیر مسلموں کے اتصال اور صوفیوں کی تعلیمات سے اس میں داخل ہو گئی تھیں۔ ان کے والد شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خلیفہ تھے اور چشتیہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بعد یہ خلافت حضرت شیخ احمد کو ملی لیکن شیخ احمد نے جو شریعت اسلامی کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں مروج "سماع" کو پسند نہیں کیا تصوف میں انہوں نے ابن العربی کے نظریہ "وحدت الوجود" کی سخت مخالفت کی۔

ابن العربی کا نظریہ "وحدت الوجود" جس نے صوفیا کرام کو بہت متاثر کیا تھا اسلامی شریعت سے ٹکراتا تھا اس لیے شریعت کے علما نے اس کی مخالفت کی۔ شیخ احمدؒ بھی انہیں مخالفین میں شامل تھے انہوں نے اس معاملہ میں حضرت باقی باللہؒ کے "وحدتِ شہود" سے رہبری حاصل کی اور اس نظریہ کی انہوں نے بڑے عالمانہ طریقہ سے وضاحت اور تبلیغ کی۔

امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنی ساری زندگی اسلامی شریعت کی تبلیغ اور ترویج پر صرف کی اور ہندی مسلمانوں کو اکبری اور جہانگیری الحاد سے نجات دلائی۔ انہوں نے مسلم عوام کو مذہب سے قریب تر لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اور علما اور صوفیاء کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو بہت کم کر دیا۔

شیخ احمد سرہندیؒ نے جو ایک پرجوش مذہبی مصلح تھے متعدد کتابچے شاہی افواج اور درباری امراء کے لیے تحریر کیے اور انہیں اکبر کے کفر و الحاد سے متعلق اثرات کو ختم کر دینے پر زور دیا۔ انہوں نے قانون شریعت کی مکمل ترویج کی تلقین کی۔ ان کی تعلیمات کو تین جلدوں میں محفوظ کیا گیا ہے۔

۱۔ دار المعرفت۔
۲۔ دار الخلائق۔
۳۔ معرفت الحقائق

شیخ احمد سرہندی کے انتقال کے بعد ان کی تعلیمات اور اثرات عرصۂ دراز تک قائم رہے جنہوں نے حق کے متلاشیوں اور آزادی کے متوالوں کو راہ دکھائی۔ ہر سال ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے لاکھوں زائرین حضرت شیخ احمد سرہندی کو جنہوں نے اسلامی ہند کے سب سے خطرناک دور میں کفر و الحاد کی قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا خراج تحسین پیش کرنے کے لیے سرہند شریف جاتے ہیں ان کے جانشینوں نے ان کے بلند پایہ مشن کو جاری رکھا اور نامور مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر ان کے بیٹے خواجہ محمد معصومؒ کا مرید تھا۔

حضرت شیخ سرہندیؒ مجددیہ سلسلہ کے بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "کلمات طیبہ" میں شریعت اسلامی کو رواج دینے سے متعلق اہم کردار ادا کیا ہے۔ امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے شیخ احمد سرہندیؒ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی خدمات کو بہت سراہا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے مجدد الف ثانی کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

بلاشبہ برصغیر میں ملت اسلامیہ نے اپنے انتہائی مشکل حالات میں شیخ احمد سرہندیؒ کی صورت میں ایک ایسے مرد مجاہد کو پیدا کیا جس نے شہنشاہوں کا مقابلہ کرکے بدعات کی سرکوبی کی اور احیائے سنت کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔

---

(۲)

تحریکِ مجاہدین

۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۱ء

مجدد الف ثانی کی تحریک تجدید و احیائے دین نے گمراہ مغل ملوکیت کو اسلام کے ساتھ معاندانہ روش سے ہٹایا اور اسلام کے لیے اس کی تائید اور معاونت حاصل کی، اسلام میں جاہلیت کی باتیں داخل کرنے کی جملہ ناپاک کوششوں کو ناکام کیا اور اسلام کا پاکیزہ اور مصفّٰی چہرہ قرآن و سنت کے آئینے میں نکھار کر مسلم معاشرے کے سامنے پیش کیا۔

لیکن اورنگزیب کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ تیزی سے بکھرنے لگا۔ اورنگزیب کی لائی ہوئی اصلاحات خطرے میں پڑ گئیں۔ ان کی حفاظت اور نفاذ کا اہتمام کرنے والی ملکی قوت انتشار کا شکار ہو گئی۔ مغلوں کی اجتماعیت بکھرنے لگی اور مسلمانوں کی قوت سلطنت کی سطح پر بے جان ہو گئی۔ اورنگزیب کے جانشین نالائق، کمزور اور بے صلاحیت افراد ثابت ہوئے، جس کے سبب سلطنت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ یہ اس آرام طلبی اور عیاشی کے مرض کا نتیجہ تھا جو قوموں کو بے مقصد نظریہ حکومت کرنے کے بعد لاحق ہو جایا کرتا ہے۔

اسی دور میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے عالمانہ قلم اور اپنی مصلحانہ جدوجہد سے مسلمانوں میں شعور حیات پیدا کرنے کی بھرپور مجاہدانہ کوشش کی۔ جب برصغیر میں ملت اسلامیہ کو یہ احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ سے سلطنت نکلی چلی جا رہی ہے تو اس کے اندر جہاد کی ایک تحریک نمودار ہوئی اس لیے کہ ملت اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر یہ جانتا ہے کہ جہاد ہی مسلم ملت کی توانائی اور صحت مندی کا واحد ذریعہ ہے اور جہاد سے ہی اس نے

اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

اس تحریکِ جہاد کا مقصد ایک طرف پژمردہ اسلامی سلطنت کو جہاد کے ذوق شہادت سے زندگی عطا کرنا تھا۔ دوسرے مملکت کی باگ ڈور عیاش شہزادوں کی بجائے جفاکش مجاہدین کے ہاتھ تھما دینا تھا۔ تیسری طرف پنجاب اور سرحد کے اکثریتی مسلمان علاقوں کو سکھوں کی ظالمانہ دست برد سے نجات دلا کر انہیں ہندوستانی مسلم مملکت کی بحالی کی جدوجہد میں اس کی پشت پر کھڑا کرنا تھا۔ فی الجملہ یہ تحریک جہاد پہلے مرحلے میں مسلمانانِ سرحد اور پنجاب کو سکھوں کے ظلم وستم سے نجات دلانا چاہتی تھی اور اپنی کامیابی کے دوسرے مرحلے میں ہندوستان کو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرے سے نجات دلا کر ہندوستان میں ایک نظریاتی اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتی تھی۔

یہ تحریکِ جہاد اس وقت اٹھی جب مسلم دنیا اپنے ضعف کی انتہاء کو پہنچ چکی تھی اور مرہٹوں پر عظیم الشان فتح حاصل کرنے کے باوجود ملت اسلامیہ کے پاس کوئی ایسا مدبر قابل موجود نہ تھا جو اس فتح سے فائدہ اٹھا سکے اور اس کے ثمرات کو سمیٹ کر ملت اسلامیہ کی جھولی میں ڈال سکے۔

غرض ملت اسلامیہ کے اجتماعی ضمیر نے ایک مسلم مملکت کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر آخری چارہ کار کے طور پر اپنی نظریاتی مملکت کو برپا کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اندر سے ایک ایسی تحریک جہاد کو نمودار کیا جو اپنے کردار اور قربانی کے اعتبار سے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کراتی تھی۔ یہ تحریک مجاہدین تھی۔ اس تحریک کے ساتھ برصغیر کے نیک دل دیندار مسلمانوں نے جان مال سے تعاون کیا۔

شاعر نے خوب کہا تھا کہ

ے بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں نظریاتی اسلامی جہاد کو برپا ہوئے صدیاں ہی بیت گئی تھیں اور زمانہ ان مردانِ حق آگاہ کا پھر منتظر تھا جو اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ

لگانے کے لیے اٹھیں، ایک منظم اور اجتماعی کوشش کر کے اسلام کے نظام کی منہدم عمارت کو پھر اس کی اصل بنیادوں پر کھڑا کر دیں۔ ملک ہند میں مدتوں سے جنگیں ہو رہی تھیں لیکن جہاد ملتوی تھا۔ ملک فتح ہوتے آئے تھے۔ لیکن اللہ کے حدود کے تسلط کا کسی نے بیڑا اٹھایا تھا۔ تلواریں نیاموں سے نکلتیں اور چمکتی تھیں لیکن راہِ حق کی بازی کھیلنے کا جذبہ کہیں موجود نہ تھا۔

زمانے کو شہیدوں کے مقدس خون کے چھینٹوں سے سرخروئی کی ضرورت تھی۔

آغازِ کار و تشکیل

بالآخر ۱۲۳۳ھ میں سید احمد شہید کے ہاتھ پر دہلی کے تاریخی مقام پر اللہ کے تین بندوں نے اس مقصد کے لیے عہدِ رفاقت و اطاعت باندھا وہ تھے:

۱: مولانا عبدالحیٔ داماد شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی

۲: مولانا محمد اسماعیل ابن شاہ عبدالغنی برادر شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی

۳: مولانا محمد یوسف پھلتی پوتے شاہ اہل اللہ برادر شاہ ولی اللہؒ دہلوی

ان تین آدمیوں کے اجتماع اور عہد و پیمانِ رفاقت پر وہ تنظیم وجود میں آئی جس نے دورِ صحابہ کا نقشہ پیش کیا۔ جس نے حق کو اپنے خون کے چھینٹوں سے نکھارا جنہوں نے باطل پر پیہم ضربیں لگائیں۔ جنہوں نے اللہ کی اطاعت کے لیے طاغوتِ وقت سے بغاوت کی اور جنہوں نے زمانے کی لوح پر اپنے لیے حیاتِ جاوداں کو لکھ دیا۔

مقصد و نصب العین

اس تنظیم کا جو اس عہد و رفاقت و اطاعت یعنی بیعت سے وجود میں آئی، اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا کہ مکمل اسلامی نظام کو اس کے تمام اخلاقی اور دینی، معاشرتی اور سیاسی، شورائی اور نظریاتی خد و خال کے ساتھ قائم کیا جائے۔ یہ تحریک تجدید و احیائے دین کی ایک منظم مدلل اور مسلح کوشش تھی اس مقصد کو سید صاحب نے جو اس تحریک کے راہنما تھے

خود بیان کیا۔ فرمایا :

میری اس کے سوا کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو۔ ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ انسانی بلکہ تمام ممالک میں رب العلمین کے احکام جن کا نام شرعِ متین ہے۔ بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں ؎۱

یہ الفاظ خود بول بول کر بتا رہے ہیں کہ اس تحریک کا قائد کوئی ایسا شخص نہیں ہے۔ جس نے مذہب و سیاست کی تقسیم کے اصول کو موضوعہ کے طور پر تسلیم کر کے مسجد میں مذہبی عبادت و رسوم کو ہی کل متاعِ اسلام سمجھ لیا ہو بلکہ یہ ایک ایسا شخص ہے۔ جو اسلام کے جہاں کشا تصور کو اپنے دل و دماغ میں لیے ہوئے ہے۔ اس کی تحریکی قوت سے واقف ہے۔ اس کی جہانی اپیل سے آگاہ ہے اور وہ جانتا ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین کا مشن یہی تھا کہ حکومتِ الٰہیہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر قائم ہو۔ اور اپنی تمام صفات و خصوصیات کے ساتھ برپا ہو۔

اس دعوت کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام شاہ ولی اللہؒ دہلوی پورے طور پر سرانجام دے گئے تھے۔ اور اس کام کی پیاس مسلمان قوم کے اجتماعی ضمیر میں پہلے سے ہی پوری طرح موجود تھی۔ بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال تو یہ ہے کہ اس تحریک کا بیج مسلمان قوم کے ضمیر میں مجدد الف ثانیؒ ہی بو کر گئے تھے اور وہی بویا ہوا بیج "شہیدین" کے خون سے تناور درخت بن کر اٹھا۔ اور اس نے اپنے برگ و بار سے اپنا شجرِ طیبہ ہونا ثابت کر دیا۔

پہلا دور۔ دعوتِ اصلاحِ رسوم

دعوت کے آغاز قیام اور وضاحت نصب العین کے بعد جس کام کی ابتدا کی وہ اصلاحِ رسوم اور رد بدعات سے کی گئی جاہلانہ رسوم نے پورے مسلمان معاشرے کو اس بیل کی طرح گھیر لیا تھا جیسے تناور درخت کو آکاس بیل

؎۱ سیرت سید احمد شہید، صفحہ ۱۱۱-۱۱۰ از مولانا ابوالحسن علی ندوی

مسلمان ملت کا کارواں چلتے چلتے بیسیوں ٹولیوں میں بٹ گیا تھا۔ بیسیوں پگڈنڈیوں پر گامزن ہو گیا تھا اور اعتدال کی راہ بڑی حد تک ہر گروہ سے ہٹ گئی تھی۔ ایک منظم، متحرک مضبوط اور بامقصد معاشرہ اب سینکڑوں قسم کے اعتقادی اور عملی امراض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ قبر پرستی، پیری مریدی، تعویذ گنڈے، شرک کی جلی اور خفی صورتیں، غیر اللہ سے توکل اور امیدیں، غیر اللہ کو نفع و نقصان کا مختار سمجھنا، شفاعت کا غلط تصور، تعظیم و آداب کے جاہلی مراسم، برادری قبیلہ اور نسل پرستی، کھیتی باڑی اور جانور مویشی میں جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم نجومیوں اور ساحروں کا زور، شگون اور فال، غرض بیسیوں بیماریاں تھیں، جن میں ملت کا عضو گرفتار تھا۔ ان کے علاوہ باہمی پیکار اور مناظرے اور مجادلے تھے۔ جو ملت اللہ کے دین کی گواہ بن کر اٹھی تھی۔ اس کی گمراہی پر ساری دنیا گواہ ہو رہی تھی۔ سید صاحب، شاہ صاحب اور مولانا عبدالحئی نے ان خرابیوں کی اصلاح کے لیے دعوتِ عام کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ پہلے ہی سے انفرادی طور پر یہ حضرات جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن اب یہ ایک منصوبے کے تحت انجام پانے لگا۔

توسیع دعوت

آغازِ دعوتِ اصلاح کا لازمی نتیجہ مخالفت اور توسیع دعوت تھا۔ چنانچہ دعوت ایک ایسی جگہ سے اٹھی جو علم و ادب اور دین و شریعت کے علوم کا مخزن تھا۔ اب اس آواز کی گونج دور دور تک سنائی دینے لگی۔ ہر طرف سے تبلیغ کے لیے دعوت نامے آنے لگے۔ اب توسیع دعوت کے وہ امکانات کھل کر سامنے آ رہے تھے۔ جو ایک تحریک کے لیے از بس ضروری ہوتے ہیں۔

تھوڑے ہی دنوں بعد تبلیغی دوروں کا ایک وسیع سلسلہ جاری ہو گیا۔ مسلمان قوم کے غیر متحرک اور ساکن بحر حیات میں زندگی کی حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ اور عرصے کے بعد ایک ایسا کام ہو رہا تھا۔ جس کی حقانیت پر دماغ گواہ اور جس کی آمد کے دل منتظر تھے۔ یہ ہندوستان میں منظم طریقے سے وسیع پیمانے پر پہلی دعوتِ اصلاح و تبلیغ تھی جس کے پاس کارکنوں کی

ایک منظم جماعت تھی اور ان کے آمد و رفت کے حسابات اجتماعی طور پر رکھے جاتے تھے۔

چنانچہ تبلیغی دوروں کا آغاز ہوا تو شہرت و مقبولیت نے بھی آگے بڑھ کر قدم چوم لیے۔ سب سے پہلا تبلیغی سفر دہلی سے سہارن پور تک کیا گیا۔ اس دورے میں تحریک کے ذمہ دار لوگوں نے ایک طرف مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کی کوشش کی اور دوسری طرف آئندہ جہاد کی منازل آنے پر مسلمانوں کے دل و دماغ اور احساسات و شعور کا مطالعہ کیا اس لیے یہ پہلا جائزہ تھا۔ جو ہندوستان میں مسلمان قوم کا جہاد کے نقطۂ نظر سے لیا جا رہا تھا۔ اس دورے میں چھ ماہ صرف ہوئے اور تقریباً ۲۲ اہم مقامات کا دورہ کیا گیا اس کے علاوہ لاتعداد غیر معروف مقامات کا بھی جائزہ لیا گیا۔ اس دورے میں کم و بیش بیس افراد سید صاحب کے ساتھ شریکِ سفر رہے۔

اس دورے سے واپسی کے بعد سفرِ حج تک اصلاح و تبلیغ کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ مسلمانوں کو مشرکانہ عقائد سے اسلام کی خالص توحید کی طرف پھیر لانے کی کوششیں مسلسل ہوتی رہیں۔ جس کے نتیجے میں مسلمان قوم میں سے صالح عنصر چھٹ چھٹ کر تحریک کے ہمدردوں کی صف میں داخل ہوتا رہا۔

تربیتِ متاثرین

جیسے جیسے لوگ تحریک سے متاثر ہوتے رہے۔ ان کی اخلاقی تربیت کا اہتمام بھی کیا جاتا رہا۔ عموماً زیادہ فعال لوگ جماعت کے ذمہ دار لوگوں کے ساتھ تبلیغی دوروں میں شریک رہتے۔ ان کے مواعظ سنتے۔ ان کی صحبت اٹھاتے۔ ان سے اپنے شکوک و شبہات رفع کرتے۔ اگرچہ پیری مریدی کے مروجہ مراتب حلِ مسائل کے لیے پوری کشادگی نہ رکھتے تھے۔ لیکن تحریک کے ذمہ دار لیڈروں کا رویہ خود نئے متاثرین کو تربیت دے دیتا تھا۔ ان تبلیغی دوروں میں بھوک پیاس کی مشکلات بھی سامنے آتی تھیں۔ اور موسم کی سختیوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا۔

چنانچہ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ دو دن تک ایک دانہ بھی حلق سے نیچے

نہ اتھا۔ بارش کا تسلسل ایسا کہ بس آسمان کے پٹ کھل گئے تھے۔ بھوک کی حالت میں نیند نہ آتی تھی۔ لیکن سید صاحب اور ان کے رفقاء پر صبر و اطمینان کا عالم طاری تھا۔

جماعت میں تہجد کا عام اہتمام کیا جاتا تھا۔ ذکر و فکر کا چرچا رہتا۔ قرآن و حدیث کے درس ہوتے اور جماعتی فضا خشیت الٰہی سے معمور رہتی۔ ایسی فضا میں جو داخل ہوتا وہ اسی رنگ میں ڈھل جاتا۔ پورا لشکر تہجد خوان تھا۔ سید صاحب تہجد کے لیے اٹھتے۔ تو سب اٹھ جاتے یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کا سب سے بڑا دشمن ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر یہ اقرار کرنے پر مجبور نظر آتا ہے کہ

"یہ بات، بہر حال یقینی ہے کہ وہابی مبلغ اپنی نوعیت کے واجب الاحترام، خدا ترس اور مقدس لوگ ہوتے ہیں۔"

دوسرا دور۔ سفرِ حج

اب فریضۂ اقامت دین کے آخری مرحلے جہاد میں قدم رکھنے سے پہلے فریضۂ حج کی ادائیگی کی طرف پوری تحریک کی توجہ پھر گئی۔ اس کے کئی ایک اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن دو ایسے سبب ہیں جن پر دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ تحریک اقامت دین کی اس داعی جماعت کے قلب کو انہی اسباب نے متاثر کیا ہو گا۔

پہلا یہ کہ اب وہ مرحلہ سامنے تھا۔ جب حضورِ حق میں نقد جان کا ہدیہ پیش کرنے کا وقت آ رہا تھا۔ یہ مومن کی دنیوی زندگی کا آخری کامیاب ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے مالک کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور بیع کے معاملے کی تکمیل کرتا ہے۔ کون جانے اس راہ میں کون جان ہار کر آخرت جیت لے۔ اس لیے ہر دل میں اس تمنا کا جاگ اٹھنا فطری تھا۔ کہ اس تحریک کے اس میدانِ اولین کی زیارت بھی کی جائے۔ اللہ کے گھر کی مہمانی سے قبل اس کے گھر کا طواف بھی کر لیا جائے۔ اور اس کے محبوبؐ اور دنیا کے واحد رہنما کی چوکھٹ پر اپنی عقیدت کے پھول بھی نچھاور کر دیے جائیں گے۔ جس کی راہ میں جانیں دینی ہیں، اس کے گھر کا پہلے دیوانہ وار طواف کریں کہ شمع کے گرد جانباز پروانے ایسے ہی کرتے ہیں۔

اور جس کے اسوہ پر چلیں اس کی گلی کی خاک کو سر آنکھوں کو لگائیں کہ منزل عشق اسی طرح آسان ہو سکتی ہے اور جذب دل یونہی بیدار ہو سکتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے علماء نے بحری سفر میں ہلاکت کے خطرے کو پیش نظر رکھ کر اسقاطِ فرضیتِ حج کا فتوی دے دیا تھا۔ اب جو تحریک احیائے دین کو نصب العین قرار دے کر اٹھی تھی۔ وہ اس فتنے کو کس طرح پنپنے دے سکتی تھی کہ مسلمانوں کا اپنے مرکز سے تعلق ہی منقطع ہو جائے، چنانچہ تحریک کے ذمہ دار راہنماؤں نے اس رکن دین کو دوبارہ ثابت و قائم کرنے کا عزم کر کے اعلان ارادۂ حج کر دیا۔ اس لیے کہ فتنے کا یہ دروازہ اگر کھل جاتا تو پھر دین کی پوری عمارت جو بچی کچھی رہ گئی تھی قطعی طور پر منہدم ہو کر رہ جاتی۔

تحریک اقامت دین کے داعی نے اس خطرے کو بھانپ کر جہاد سے پہلے سفر حج کا ارادہ کر لیا۔ پھر یہ ارادہ خود ہی نہیں کیا بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے جانے کا اعلان کیا پھر دوسروں کو دو چار کی تعداد میں ہی لے جانے کا اعلان نہ کیا بلکہ پورے ہندوستان میں کھلا اعلان تھا کہ جو شخص چاہے حج کے لیے ان کے ساتھ آجائے۔ تحریک اس کے اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ دار تھی۔ افلاس، تنگدستی، مالی عسرت، اور وسائل کی کمی کے ساتھ یہ کھلا اعلان صرف وہی دے سکتا تھا جو اللہ اور اس کے رسول کے دین کو پورے کا پورا قائم کرنے اٹھا تھا۔ اور جس کے لیے کسی معمولی سنت کا ترک بھی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ سید صاحب کے اس جرأت مندانہ اعلان نے ان کی تحریک کا تعارف بیک وقت پورے ملک کے مسلمانوں سے کرا دیا۔ اور اس تعارف نے دیندار مسلمانوں کے دل میں گھر کر لیا۔ یہ اعلان وقت کی آواز تھا۔ اور اس سے تحریک کے ساتھ ہمدردیاں دور دور تک پھیل گئیں۔ سید صاحب کا یہ اعلان اسلامی قیادت کی عمدہ مثال ہے۔ مسلمانوں کا تحریک پر اعتماد بڑھ گیا۔ اور وہ اسے ایک موثر سہارا سمجھنے لگے۔

بحری سفر میں ہلاکت کے خطرے کے پیشِ نظر اسقاطِ فرضیت حج کے فتویٰ کو ختم کرنے کے لیے یہ اس تحریک کا جرأت مندانہ اقدام تھا چار سو افراد پر مشتمل قافلۂ حج تیار ہو گیا۔ جو شوال

۱۲۳۶ھ کو رائے بریلی سے روانہ ہوا۔

نہ برگ و بار کی پروا نہ انتظارِ رفیق

یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

پورے ملک میں لوگوں کو اپنے ساتھ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے لے جانے کا کھلا اعلان ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک کسی بیرونی ملک کی امداد کے بل پر ہو۔ لیکن دیانت، امانت، اخلاص اور عزیمت کی دولت کا جو شعور رکھتے ہیں، وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ دین کی گرتی ہوئی عمارت کی تعمیرِ نو کے لیے یہ کتنا بڑا اقدام تھا جو سیم و زر کے بل پر نہیں بلکہ دولتِ ایمانی کے بھروسے پر ہی انجام دیا جا سکتا تھا چنانچہ جس مالک کے بھروسے پر یہ اعلان کیا گیا تھا اسی کے آگے انہوں نے ہاتھ پھیلا دیے۔ سید صاحب نے ننگے سر کھڑے ہو کر دعا کی:

"اے کریم کارساز! اتنی مخلوق اس ناچیز کے ہمراہ ہو گئی ہے۔ تو مجھ ناچیز پر اپنا لطف فرما۔ اپنے الطاف و اکرام کی برکت سے ان سب کو بطریقِ احسن منزلِ مقصود پر پہنچا۔"

اور اسی طرح ان کے ساتھیوں کا یہ عالم تھا کہ اگر راہ چلتے کوئی پھسل کر گر پڑتا تو مالکِ حقیقی کا شکر ادا کرتا ہوا اٹھتا کہ "باری تعالیٰ! تیرے احسان کے قربان جاؤں کہ تیری راہ میں گرا اور تو نے کمال مہربانی سے اپنی راہ میں گرنے کی توفیق عطا فرمائی۔"

چنانچہ کریم کارساز نے کرم فرمایا اور چاروں طرف سے اعانتیں آنا شروع ہو گئیں۔ اور فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے لوگ جمع ہونے لگے۔ روانگی کے وقت کلکتہ سے جب بحری جہازوں کا انتظام ہوا تو دس جہاز کرائے پر لیے گئے اور تیرہ ہزار آٹھ سو آٹھ روپے صرف کرائے کے ادا کیے گئے اور جب ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ مطابق ۲۹۔ اپریل ۱۸۲۴ء کو وطن واپس ہوئے تو اندازاً ایک لاکھ روپیہ صرف ہو چکا تھا اور ابھی بیت المال میں دس ہزار روپے مزید باقی تھے۔

دعوت جہاد

حج سے واپسی کے بعد باقاعدہ جہاد کی دعوت شروع ہو گئی۔ تبلیغی دورے پھر جاری ہو گئے۔ تنظیم کو ٹھوس بنیادوں پر اٹھایا جانے لگا اور ایک سال دس مہینے کی قلیل مدت میں مجاہدین فی سبیل اللہ کی ایک منظم جماعت تیار ہو گئی۔

دعوت تبلیغ میں ہجرت اور جہاد دونوں پر زور دیا جاتا۔ مشکلات سے آگاہ کیا جاتا اور اللہ کے ہاں انعام کا ذکر کیا جاتا۔ چونکہ حج سے قبل اپنے مفصل اور وسیع دوروں میں تحریک کے لیے زمین ہموار کر چکے تھے اور ایک جذبہ اور تاثر پوری طرح ہر طرف پھیل گیا تھا اس لیے اس مرحلے میں نہ زیادہ مدت صرف ہوئی اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جب کچھ لوگ اس بات پر تیار ہو گئے کہ وہ اللہ کی راہ میں گھر بار، مال و دولت، بیوی بچے، اعزہ و احباب کو ترک کر کے نکل کھڑے ہوں تو تحریک کے اہل حل و عقد نے سرحد کو جہادی سرگرمیوں کے لیے موزوں ترین سمجھ کر مرکز کو وہاں منتقل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تاکہ جہاد کی ابتدا ہو جائے ساتھ ہی یہ انتظام بھی کیا گیا کہ کچھ لوگ ہندوستان میں رہ کر مجاہدین کو مال کی فراہمی اور مجاہدین کی بھرتی سے مسلسل امداد پہنچاتے رہیں۔
اس طرح ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے استقلال اور اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کا آغاز سرحد میں جہاد کی ابتداء سے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سرحد اور پنجاب کی فتح کے بعد باقی ماندہ ہندوستان اور دہلی میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم کرنا پروگرام کا حصہ تھا چنانچہ سرحد میں جہادی سرگرمیوں کے آغاز کے لیے ہجرت لازمی تھی۔

تیسرا دور۔ ہجرت

۷۔ جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ۔ مطابق ۱۷۔ جنوری ۱۸۲۶ء کو مجاہدین کے پہلے قافلے نے راہ ہجرت میں قدم رکھا۔
یہ قافلہ تقریباً ساڑھے پانچ سو مجاہدین پر مشتمل تھا۔ صرف پانچ ہزار روپے کی رقم

ان کے ساتھ تھی۔ اور ان دیکھے حالات اور حوادث سامنے تھے جن کو چھوڑا جا رہا تھا ان سے دوبارہ ملنے کی امید نہ تھی۔ اور رشتہ و ناطے کے تعلقات سوت کے کچے تاگوں کی طرح راہِ حق میں ٹوٹ ٹوٹ کر پیچھے چھوٹ رہے تھے۔

یہ قافلہ انتہائی کس مپرسی کے عالم میں رائے بریلی سے روانہ ہوا لیکن پھر بھی نظم و ضبط کے لحاظ سے وہ کوئی بھیڑ نہ تھی۔ بلکہ فوجی ضابطہ کا پابند قافلہ تھا۔ یہ فوجی قافلہ جماعتِ خاص، مقدمۃ الجیش، میسرہ، میمنہ اور ساقۃ الجیش، پانچ حصوں پر مشتمل تھا۔

ہجرت کا یہ سفر اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑا صبر آزما اور پر از مصائب تھا۔ بھوک پیاس بیماری، ریگ کے طوفان، سنگلاخ پہاڑیوں کی رکاوٹیں، لق و دق صحرا، جل تھل دریا، سبھی کچھ ان کے راستے میں دیواریں بن بن کر آیا۔ لیکن وہ اللہ کے بندے اور راہِ حق کے دیوانے ان سب رکاوٹوں کو پھاندتے چلے گئے۔ کوئی روک ان کے لیے روک نہ بنی اور کسی آفت نے ان کا راستہ نہ روکا۔ رائے بریلی سے اجمیر، گوالیار، ٹونک، پالی، حیدرآباد پیر کوٹ، شکار پور، جاگن، خان گڑھ، بھاگ، ڈھاور، کوئٹہ، قندھار، غزنی، کابل پشاور، اور پھر چارسدہ یہی وہ آخری منزل تھی۔ جہاں سے جہاد کا آغاز ہونے والا تھا۔

مرکزِ جہاد

ہجرت کا یہ سفر دس مہینے میں طے ہوا جو سینکڑوں میلوں پر مشتمل تھا اور ایسے ایسے دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا جن کا عبور نا قابلِ فہم تھا۔ یہ راستہ اس لیے اختیار کرنا پڑا تھا۔ کہ پنجاب کا راستہ سکھوں کی حکومت کی وجہ سے بند تھا۔

سرحد کو مرکز بنانے کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں:

۱: جہاد کی ابتداء سکھوں سے کرنا مقصود تھا۔ اس لیے کہ ظلم و ستم میں وہ ہر انسانی اور اخلاقی حد کو پھاند گئے تھے اور پنجاب کے مظلوم مسلمانوں کی ان کے پنجۂ ظلم سے رہائی ضروری تھی۔

:: سرحد میں ننانوے فیصدی مسلمانوں کی آبادی تھی۔ جن سے امداد و تعاون کی امید تھی۔

:: سرحد کے مرکز کی پشت پر مسلمانوں کی ریاستیں ہونے کی وجہ سے دشمن سے صرف سامنے سے مقابلہ ہوتا۔ پشت حملے کے خطرے سے بالکل محفوظ رہتی۔

:: پٹھان جو جنگ جو اور اسلام پسند قوم تھی۔ اسے مسلح امداد کی توقع بہت زیادہ تھی۔ اور یہ بھی خیال تھا کہ اسلامی جذبہ رکھنے کی وجہ سے وہ شرعی حدود کی پابندیاں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خوش دلی سے برداشت کرلیں گے۔

:: کفر جب چاروں طرف پھیل رہا تھا تو اس کے وسط میں بیٹھ کر اس کے خلاف جہادی سرگرمی شروع کرنے کی بجائے ایک محفوظ مقام پر مرکز بنا کر پورے علاقۂ کفر کو سامنے رکھنے سے کم فوجی طاقت کو بھی زیادہ مفید طریق سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

:: ہندوستان کے اندر کسی مقام کو مرکز بنا کر کام شروع کرنے سے چاروں طرف سے کفر کی یلغار کا خطرہ تھا۔ اور سرحد میں یہ امکان بظاہر بالکل نہ تھا۔

:: سرحد کے لوگ اس وقت ملک کی ظالم ترین قوم سکھ سے بہت نالاں تھے اور اُمید تھی کہ وہ اس ظلم و ستم سے بچنے کے لیے بھی اس تحریک کے ساتھ خلوص سے منسلک ہو جائیں گے۔

:: سرحد کی طرف سے پنجاب پر پیش قدمی کرنے سے امید تھی کہ پنجاب کے مظلوم مسلمان بھی اس تحریک کا ساتھ دیں گے۔

:: سرحد کے دشوار گزار راستوں اور پہاڑیوں میں دشمن کی تیز رفتار پیش قدمی ممکن نہ تھی اور اس سے بچنے کے لیے پہاڑوں کا سلسلہ بہت کارآمد ہو سکتا تھا۔

اطاعتِ امیر

یہ مختصر سی جماعت جو ایک خوفناک ظالم اور کثیر دشمن کے سامنے جاکر ڈٹ گئی تھی۔

تو اس کی وجہ تہور یا کوتاہ اندیشی نہیں۔ بلکہ فریضۂ اقامت دین کے ایمان فروز احساس کے ساتھ ان میں ایسی خوبیاں بھی تھیں۔ جن کے ساتھ ایک قلیل گروہ کثیر گروہ پر غالب آجایا کرتا ہے۔ عبادات میں انہماک توکل علی اللہ تعلق باللہ، خلوص اور احساس آخرت نے ان کو عام دنیوی قومی گروہوں پر بہت فوقیت دے دی تھی۔ نظم و ضبط کی پابندی اور اطاعتِ امیر کا جذبہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ اور میدان جہاد میں اطاعت امیر ایک ایسی قوت ہے۔ جو منتشر انسانوں کے گروہوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیتی ہے۔ امیر سے ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ :

"سیدؒ صاحب کے پلنگ کے ارد گرد اکثر لوگ بیٹھ کر آپ کی باتیں سُنا کرتے تھے اور لوگوں ایسی کثرت ہوتی کہ کسی کا سر، کسی کا پیر، کسی کا پیٹ، اور کسی کی پیٹھ، کسی کو کسی بات کا تکلف نہ ہوتا۔"[1]

اور جب مولانا عبدالحی جیسے بزرگ عالم کا آخری وقت آیا تو اپنے امیر سے درخواست کی اور بار بار اصرار کیا کہ اپنا پاؤں ان کے سینے پر رکھ کر کہہ دیں۔ کہ انہوں نے اطاعت کا حق ادا کیا۔ تاکہ وہ ان کے لیے پروانۂ آخرت بن جائے۔ غرض مجاہدوں کی یہ جماعت امیر کے حلقۂ جماعت فی المعروف کے تار میں اس طرح پروئی ہوئی تھی کہ امیر کا اشارۂ چشم و ابرو بھی جماعت کے ہر ہر فرد کے لیے جان کی بازی لگا دینے کا حکم رکھتا تھا۔ چنانچہ بالاکوٹ کے میدان میں جب تقدیر کے قاضی نے خون سے ان کا فیصلہ لکھ دیا تو سید صاحب کے ساتھی ایسی بے قراری اور اضطراب کی حالت میں ان کی تلاش کر رہے تھے۔ کہ جیسے زندگی کی سب سے بڑی متاع کھو گئی ہو۔ چنانچہ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کا یہ حال تھا کہ رائفل کندھے پر ڈالے اور ننگی تلوار لیے سید صاحب کو تلاش کر رہے تھے۔ پیشانی کے زخم سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ کسی سے پوچھا: "امیر المومنین کہاں ہیں؟" کسی نے ہاتھ کے اشارے سے اس ہجوم کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں تلوار چل رہی تھی۔ مولانا اسی طرف جھپٹے اور تلواروں کی باڑھ میں گھستے چلے گئے

---

[1] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۴۲) از مولانا ابوالحسن علی ندوی

اور وہیں شہید ہو گئے۔

للّٰہیت

اس جماعت کے سامنے اگر کوئی مقصدِ واحد تھا تو یہ کہ انہیں دنیا میں اللہ کا حکم بلند کرنے کی سعادت اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حالات کا سرسری سا مطالعہ بھی آدمی کو ان کی بے نفسی و بے غرضی اور اخلاص کا پورا پورا معترف بنا دیتا ہے۔ چنانچہ سید صاحب نے اپنی بیشتر دعاؤں کی طرح اپنی ایک دعا میں اس جماعت کے حقیقی مقصد کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

"اے ہمارے پروردگار! تو خوب جانتا ہے۔ کہ یہ سب لوگ محض تیری خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے اپنے گھر بار، خویش و تبار، اہل و عیال اور مال و منال چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ اور صرف تیری راہ میں انہوں نے اپنی جانیں صرف کیں۔ ان کے گناہوں کو اپنے دامنِ رحمت میں چھپالے، فردوس میں ان کو جگہ دے اور ان سے راضی ہو۔ ہم جو چند ضعفا اور غربا تیرے عاجز بندے باقی ہیں۔ ان کو بھی اپنی رضامندی اور خوشنودی کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کی توفیق عطا فرما۔"[1]

اسی طرح ایک سکھ جرنیل کو اس کے جاسوس کی معرفت یہ پیغام کہلوایا:

"بھائی، بدھ سنگھ سے جا کر کہہ دے کہ جس طرح تو اپنے آقا رنجیت سنگھ کا فرمانبردار ہے۔ اور اس کے حکموں کی تعمیل میں لگا ہوا ہے۔ اسی طرح ہم بھی اپنے مالک حقیقی کے فرماں بردار اور اس کے حکموں کے پابند ہیں۔"[2]

ایک جنگ میں سرحدی سرداروں کی غداری کی وجہ سے شکست ہوئی۔ جس کی وجہ

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۲۲۸ مولفہ مولانا غلام رسول مہر

[2] سید احمد شہید صفحہ ۲۰ جلد دوم مولفہ مولانا غلام رسول مہر

مجاہدین پر عسرت و مصیبت کا ایک شدید دور آیا۔ سید صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہوئے کہا۔

"یہ جو کچھ ہم پر اور ہمارے سب بھائیوں پر گزرا ہے، کچھ جناب الٰہی میں ہم لوگوں سے ضرور خطا اور بے ادبی ہوئی ہے۔ اس کا یہ بدلہ ہے۔"[1]

ایک موقعہ پر ایک مولوی صاحب سے جو نئے نئے ہندوستان سے مجاہدین کے کیمپ میں تشریف لائے تھے اور بار بار سید صاحب پر اعتراضات کر رہے تھے اور جماعت میں تنقیص اور افتراق کی ایک مہم چلا رکھی تھی اور خود سید صاحب کی امارت پر بھی انھیں شدید اعتراضات تھے۔ ان سے سید صاحب نے فرمایا:

"بھائی یہ بارگراں مجھ پر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے نزدیک میں اس کے قابل نہیں تو آپ عالم ہیں، سید ہیں، مہاجر ہیں۔ یہ کام خود سنبھال لیں۔ مجھے سرداری کی خواہش نہیں، صرف اس کام کا انصرام مطلوب ہے، خواہ مجھے کوئی حیثیت دی جائے۔"[1]

پھر ایک موقع پر رفقاء کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"جو لوگ کمال اخلاص سے خدائے ذوالجلال کی اطاعت میں جان و مال فدا کرنے پر آمادہ ہوں اور اس کو دارین میں سرخروئی کا باعث سمجھیں، وہ کم ہوں یا زیادہ، انہی کو مجاہدین ابرار کا درجہ حاصل ہو گا۔ اور انہی سے نصرتِ دین کا کار اہم سرانجام کو پہنچے گا۔"[2]

ایک بار مولانا شاہ اسمٰعیل بیماری کے بعد سخت کمزور تھے، اور بار بار کی جنگوں اور پُر صعوبت زندگی نے جسم کو گھلا دیا تھا۔ اور پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے بار بار تھک جاتے تھے آخر ایک پتھر پر بیٹھ کر فرمایا۔

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۲۰۸ جلد دوم مولفہ مولانا غلام رسول مہر

[2] سید احمد شہید صفحہ ۵۵۔ مولفہ غلام رسول مہر

"بھائیو! خیال کرو، اگر ہم کسی رئیس یا امیر کے نوکر چاکر ہوتے۔ اور وہ اپنے کسی کام کے لیے ایسے دشوار گزار راستے سے بھیجتا تو ہلا عذر جانا اور سارا رنج راہ اٹھانا پڑتا۔ لیکن وہ نوکری صرف گزران دنیا کے لیے ہوتی۔ الحمدللہ! آج ہم کسی کے نوکر نہیں ہیں۔ بلکہ محض اپنے پروردگار کی خوشنودی ورضامندی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اور خوشی خوشی یہ سب محنتیں اور مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اگر ہماری نیتیں خالص ہیں تو اللہ تعالیٰ آخرت میں بڑا درجہ دے گا۔"[1]

ایک موقع پر سید صاحب نے فرمایا،

"خدا کے سوا ہر چیز کی طرف سے میں نے آنکھیں اور کان بند کیے ہیں۔ دنیا ومافیہا سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اور محض لوجہ اللہ علم جہاد بلند کیا ہے۔ مال ومنال، جاہ وجلال، امارت وریاست اور حکومت وسلطنت کی طلب سے کاملاً الگ ہو چکا ہوں۔ خدا کے سوا کسی کی جستجو نہیں رہی۔"[2]

باہمی طرزِ عمل اور روحِ تنقید

پھر ان کے باہمی تعلق، طرزِ عمل اور جماعتی زندگی کی شان بالکل ہی نرالی نظر آتی ہے۔ تنقید ہے تو خدا ترسی اور انصاف کا دامن تھامے ہوئے۔ تنقید کی برداشت ہے تو پورے صبر وتحمل اور جذبۂ اخلاص کے ساتھ تعلقات ہیں تو بھائیوں سے بڑھ کر اس لیے کہ ہر رشتہ ٹوٹتا ہے تو اس سے رشتہ جوڑتا ہے۔ اور سب رشتوں سے بڑھ کر اللہ سے رشتہ ہے چنانچہ سید صاحب کا واقعہ ہے۔ کہ ان کے ہاں بچی ہوئی۔ لیکن ماں کا دودھ نہ تھا۔ اپنے قدیم خادم کی اہلیہ سے دودھ پلانے کے لیے کہا۔ اس نے خود اپنے بچے کے لیے دودھ کی کمی کا

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۲۶۵ جلد دوم مولفہ غلام رسول مہر

[2] مکاتیب سید احمد شہید صفحہ ۱۰۸

عذر پیش کیا۔ لیکن سید صاحب نے اصرار کیا۔ جس پر وہ بادل نخواستہ آمادہ ہوگئی۔ لیکن ایک دو روز بعد ہی سید صاحب کو محسوس ہو گیا کہ عبادت میں پہلی سی لذت نہیں رہی اور نہ اللہ کے ساتھ قلبی تعلق کا وہ حال رہا ہے۔ اچانک بچی کے دودھ والا معاملہ ذہن میں آ گیا۔ گھر کی چند مستورات کو ساتھ لے کر اس خاتون کے پاس گئے۔ اور گڑگڑا کر معافی چاہی اور اس کی دلجوئی کے لیے اپنی اہلیہ کو ہدایت کی۔

جماعت کے بعض رفقاء نے تنقیدیں کیں تو انہیں صبر و تحمل سے سنا۔ کسی نے غصے سے بات کہی۔ تو سید صاحب پی گئے۔ ہندوستان سے بعض نووارد علماء نے بے جا اعتراضات کیے تو صبر کیا اور اپنی پوزیشن کی وضاحت کی۔

ایک موقع پر عورتوں کو میدانِ جنگ میں خطرے کے حالات میں محسوس کر کے سید صاحب نے کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دینے کا ارادہ کیا تو شاہ اسمٰعیل صاحب نے صاف کہہ دیا کہ:

"اگر عورتوں خصوصاً آنجناب کے حرم محترم کو امب سے نکال کر تھانہ بھیجنے کے باعث شوکتِ اسلام کو نقصان پہنچا تو اس کے لیے خدا کے پاس آپ جوابدہ ہوں گے۔"[1]

ایک دوسرے موقع پر جبکہ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید نے دشمن کے ساتھ اس شرط پر صلح کرلی تھی۔ کہ غازی قصبے میں داخل نہ ہوں گے بلکہ باہر ٹھہریں گے۔ سید صاحب اس معاہدے سے بے خبری کی وجہ سے قصبے کے دوسری طرف سے داخل ہو گئے۔ اس لیے کہ شاہ صاحب کے بھیجے ہوئے پیغامات ان کو نہ ملے تھے۔ بلکہ کسی نے کہا کہ انہیں قصبے میں بلایا گیا تھا۔ جب مولانا اسمٰعیل شہید کے پاس یہ رپورٹ پہنچی تو پاسِ عہد کے جذبے سے بے تاب ہو کر ان کے پاس پہنچے اور کہا:

"جنابؐ خود خلافِ شرع امر کے مرتکب ہوئے۔ لشکر اسلام میں سے ایک

---

[1] اقتباس از منظورہ صفحہ ۸۲۲

[2] سید احمد شہید صفحہ ۲۶۵ مولفہ غلام رسول مہر

آدمی کے عہد کا ایفا بھی امام اور پورے لشکر پر واجب ہو جاتا ہے۔ آپ نے مجھے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا، لیکن آپ نے میرے عہد کا بھی خیال نہ رکھا اور قصبے میں داخل ہو گئے۔ یہ لشکر ہے، اسے میدان میں ٹھہرنا چاہیے پیرزادوں کا قافلہ نہیں کہ قصبے میں گھس آئے؟"

اور اس سخت کلامی کا امیر کی طرف سے جواب تھا:

"مجھ سے کہا گیا تو آیا، ورنہ کاہے کو آتا۔ میں ابھی جاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر قصبے سے نکل گئے اور ندی کے کنارے توت کے درختوں کے سائے میں جا بیٹھے۔

سرحد میں جب سید صاحب نے شادی کی تو ایک صبح کی نماز میں صرف اتنی تاخیر ہوئی کہ دوسری رکعت میں شریک ہوئے۔ اس پر مولانا عبدالحی صاحب نے تنبیہاً کہا کہ "کیا آپ سے پہلے آج تک کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی؟"

غرض ایک ایسی جماعت جو صرف اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابند ہو اس کے نقش و نگار پوری طرح ان میں پاتے تھے۔ بھوکے ہے تو سب رہے۔ نہ کوئی امتیاز نہ شان۔ نہ باہمی شکر رنجی نہ جھگڑا۔ دن کو میدانِ جنگ کے شہسوار اور راتوں کو اللہ کے حضور میں زاری کرنے والے۔ ایسا تھا وہ گروہ جو اللہ کی راہ میں سرحد کی پہاڑیوں میں کفر و طغیان کے خلاف جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔

اس اخلاق، اس کردار اور اس نظم و ضبط کی وہ جماعت تھی جو سید صاحب کی معیت میں ہزاروں کوس طے کر کے سرحد میں اس غرض سے آئی تھی کہ اپنی طاقت کو ایک جگہ مجتمع کرکے کفر کے خلاف ایک جاں گسل کشمکش کرے اور اس کا زور توڑ دے۔

جنگیں اور خوانین کی غداریاں

چنانچہ دسمبر ۱۸۲۶ء مطابق جمادی الاول ۱۲۴۲ھ میں جب یہ جماعت ہجرت کی منزلیں طے کرتی کراتی نوشہرے پہنچی، تو سکھ جرنیل بدھ سنگھ سے اکوڑہ میں آمنا سامنا ہوا۔ یہ میدان

جہاد میں خالص کفر کے ساتھ خالص اسلام کا صدیوں کے بعد پہلا آمنا سامنا ہوا۔

بس اس کے بعد یہ کشمکش شب و روز کا فریضہ بن گئی۔ زندگی کے لیل و نہار اس رنگ میں ڈھل گئے۔ جن کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

:: اکوڑہ میں شبخون مار کر سید صاحب نے بدھ سنگھ کے لشکر کو شیدو تک ہٹا دیا۔

:: ہنگ بازار میں چند مجاہدین کے دستے نے ایک دستے کو مار بھگایا۔

ان جنگوں میں سرحدی لوگوں نے لوٹ مار کا مظاہرہ کیا۔ جسے مجاہدین نے سخت ناپسند فرمایا۔

:: جنگ شیدو سکھوں کے خلاف ہوئی۔ اس میں ایک سرحدی سردار نے سید صاحب کو زہر دے دیا۔ اور غداری کرکے عین حالتِ جنگ میں اپنی فوج ہٹا لے گیا۔ مجاہدین کو شکست ہوئی۔

:: ڈمگلہ میں ہری سنگھ نلوہ اور پھول سنگھ کے لشکر سے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے رفقا کا مقابلہ ہوا۔ شاہ صاحب نے شبخون مارا اور دشمن کو سخت نقصان پہنچایا۔

:: شنکیاری میں مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کا سکھوں کی ایک جمعیت سے مقابلہ ہوا۔ سکھوں کو ہزیمت ہوئی۔

:: جلالہ کے مقام پر غدار درانی سرداروں سے مقابلہ پیش آیا۔ درانی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایک درانی سردار نے آکر معذرت پیش کی تو سید صاحب نے فرمایا۔ " خان بھائی! مجھے آپ کے بیٹے یا کسی دوسرے شخص کی کوئی پروا نہیں۔ میرے لیے میرا خدا کافی ہے۔"

:: اہل مانیری افغانوں کے خلاف تادیب کے طور پر ایک دستہ بھیجا جس سے وہ لوگ اپنی حرکات سے باز آگئے۔

:: پنجتار پر سکھوں کا جرنیل وانتورا لشکر کشی کرکے آیا۔ سید صاحب سے مراسلت ہوئی لیکن غازیوں کے شبخون کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ فوج کے ساتھ واپس چلا گیا۔

: اٹک پر چھاپہ مارا لیکن قلعدار کو قبل از وقت اطلاع ہو جانے کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔

: پنجتار پر دوبارہ سکھوں کے جرنیل ونتورا نے بعض سرحدی سرداروں کی مدد سے حملہ کیا۔ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پامردی سے مقابلہ کیا۔ ونتورا مشکلات کو دیکھ کر واپس چلا گیا۔

: ہنڈ کے مقام پر ایک غدار اور سرکش سرحدی سردار سے صاحب کا مقابلہ ہوا۔ سرحدی سردار کو شکست ہوئی اور وہ قتل ہوا۔

: زیدہ کے مقام پر ایک باغی سرحدی سردار سے مجاہدین کا مقابلہ ہوا۔ جس میں سرحدی سردار نے شکست کھائی۔ اور مارا گیا۔

: تہکال کے مقام پر سکھوں کے ساتھ مجاہدین کی ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی۔

: ہنڈ پر ایک سرحدی سردار نے حملہ کر کے سید صاحب کی غیر موجودگی میں چند مجاہدین کو جو قلعہ کے محافظ تھے۔ نکال دیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔

: اسب کے مقام پر ایک باغی سرحدی سردار سے مقابلہ ہوا۔ وہ شکست کھا کر بھاگ گیا

: پھلڑہائی پر بھی اسی سرحدی باغی سردار سے مقابلہ ہوا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اور پھلڑہائی سے محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

: پھولڑہ کے مقام پر مجاہدین کے ایک دستے اور سکھ فوج میں مقابلہ ہوا۔ مجاہدین کی قلت اور سکھ فوج کی کثرت کی وجہ سے تمام مجاہد شہید ہوئے۔

: جنگ مردان مجاہدین اور سرحدی باغی سرداروں کے درمیان ہوئی۔ مجاہدین کو فتح ہوئی۔

: جنگ مایار مجاہدین اور درانیوں کے درمیان ہوئی۔ درانیوں کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ بہت سخت معرکہ ہوا۔ بہت سے غازی شہید ہوئے۔ درانیوں کو شکست ہوئی اور وہ سینکڑوں لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

شہادت گہِ الفت

" جنگ بالاکوٹ سکھوں اور مجاہدین کے درمیان ہوئی۔ جس میں قافلے کے دونوں سالار جہانِ فانی کی زندگی میں کامیاب ہو کر اپنے رب کے پاس پہنچ گئے۔ اور میدان میں فتح سکھوں کو حاصل ہوئی۔ اس طرح تحریک مجاہدین کا جہادی دور ختم ہو گیا۔

جنگ بالاکوٹ کے ساتھ یہ جہادی تحریک اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہو گئی۔ بلاشبہ ان کا نقشہ کار تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ سرحد اور پنجاب سے سکھوں کو بے دخل کرنے کا کام مکمل نہ ہوا اور نہ ہی فرنگی طاقت کے خلاف جنگ آزما ہو کر اسے مسلم مملکت پر قبضہ سے روکا جا سکا۔ اس طرح ملت اسلامیہ کی یہ کوشش بظاہر کامیاب نہ ہوئی لیکن یہ تحریک جہاد مسلمانوں میں جذبہ حرکت توانائی اور بیداری کی عظیم وراثت اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔

(۳)

تحریک آزادیٔ ہند

۱۸۵۷ء

تحریکِ مجاہدین برصغیر میں ملت اسلامیہ کی ایک مثالی اسلامی تحریک تھی جس نے سنتِ نبوی کے ایک ایک نقش قدم کی پیروی کی۔ سب سے پہلے مسلمانوں کی اخلاقی اور دینی حالت کو سدھارنے اور انہیں معیاری مسلمان بنانے کی جدوجہد کی۔ اس جدوجہد سے لاکھوں کو متاثر کیا اور ہزاروں کو اپنے ساتھ شامل کیا۔ انہیں انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارا۔ انہیں راہِ خدا میں جانیں دینے کی ترغیب دی۔ ان میں جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت پیدا کیا پھر ان کو ایک دینی فریضۂ حج کو ادا کرنے اور اس ترک شدہ فریضہ کو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے از سر نو بحال کرنے پر خود اپنی مثال سے آمادہ کیا اور تمام خطرات کو انگیز کر کے اسے بحال کیا۔ پھر ایک طویل ہجرت میں سے گزر کر سرحد کے علاقے میں جاکر جہاد کا آغاز کیا اور جہادی سرگرمیوں کو خاص کفار کے خلاف جاری کیا۔ اپنی جماعت مجاہدین میں صحابہ کرام کا سا ایثار و قربانی جذبہ اور عبادت کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ گویا تحریک مجاہدین ملتِ اسلامیہ میں ایک معیاری اور مثالی اسلامی جدوجہد تھی۔

جب یہ مثالی جدوجہد بعض قدرتی اور مادی موانع کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکی اور مسلمانوں کی سلطنت جس کے ذریعے مسلمانوں اور اسلام کو برصغیر میں بالاتری حاصل تھی بتدریج زوال و انحطاط کا شکار ہوتی ہی چلی گئی اور بظاہر یہ مایوسی انتہا کو پہنچ گئی کہ اب یہ سلطنت بچنے والی نہ تھی۔ دارالخلافہ دہلی کے احکام و انصرام میں بھی سات سمندر پار سے آئے ہوئے غیر ملکی غیر مسلموں کا عمل دخل انتہا کو پہنچ گیا اور اندازہ ہو گیا کہ برصغیر میں شاید

اب مسلمانوں کا غلبہ خاتمے تک پہنچ گیا تھا اور بحالاتِ موجودہ انگریز کسی وقت بھی وہاں پر اپنے مکمل قبضے اور مسلم مغل سلطنت کے خاتمے کا اعلان کر دیں گے تو ملت اسلامیہ کے ضمیر نے ایک آخری مایوس کن جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اقتدار کی بحالی کے لیے آخری جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کوئی متفقہ اجتماعی فیصلہ نہ تھا۔ یہ فی الحقیقت ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کی ایک آخری جدوجہد تھی۔

ظاہر ہے کہ جس جدوجہد کا سربراہ فرد مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھا اور جو وہاں کی سربراہی میں اٹھی تھی اور جس کی مرکزی رہنمائی اور قیادت مغل شہزادوں کو حاصل تھی اور جس کے نتائج کا سب سے زیادہ ملبہ مغل خاندانوں اور مسلمانوں پر ہی گرا تھا۔ اس کی سو فیصدی ذمہ داری مسلمانوں کی ہی تھی۔ بلاشبہ اس میں ہندوؤں کی تعداد بھی بہت تھی لیکن ان کی حیثیت وہی تھی جو مغل سلطنت کے چلانے میں ہندو ملازموں اور کارکنوں کی تھی۔ چونکہ ہندوؤں کو مغل سلطنت میں بے شمار مراعات حاصل تھیں اور مسلمان ہندوستان کے ہی باشندے تھے۔ ان کی بڑی تعداد انہیں ہندوستانی ہندوؤں میں سے مسلمان ہوئی تھی اور ان کی سلطنت دراصل ہندوستان کی مقامی سلطنت ہی تھی اس لیے جہاں ایک طرف یہ تحریک آزادی ہند مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کی آخری کوشش تھی وہاں اسے بحال کرنے کی جدوجہد میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔

۱۸۵۷ء کا جہاد

یہ تحریک[1] مسلمانوں نے اس لیے چلائی تھی تاکہ غیر ملکی اقتدار سے نجات پا کر اسلامی تہذیب و تمدن کا احیاء کیا جا سکے۔ جس زمانے میں کانگریس اور قومی تحریکات کا وجود نہ تھا۔ ہندو اور دوسری قومیں انگریزوں کی گود میں سو رہی تھیں یا ان کی سرپرستی میں معاشی و سماجی تحفظات حاصل کر رہی تھیں، مسلمان مجاہدین نے سر دھڑ کی بازی لگا کر

---

[1] استفادہ از تاریخ دعوت و جہاد از عبداللہ فہد فلاحی ص ۱۶۷ تا ۱۶۳

انگریزی اقتدار کو چیلنج کیا اور سن ستاون کا ہنگامہ ظہور پذیر ہوا جو اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے بڑا دُور رس ثابت ہوا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ میں گو مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم تھی لیکن جان و مال کی قربانیوں سے وہ تاریخ آزادی پر اپنے نقوش ثبت کر گئے۔ یہ کوئی عارضی اور وقتی ہنگامہ نہ تھا بلکہ اس کی تہ میں مسلمانوں کے دیرینہ عزائم کام کر رہے تھے۔ بہت سے قائدین عوام کے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کی ذاتی زندگی میں اسلام رچا بسا تھا اور جو انگریزی عملداری ختم کر کے مسلمانوں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو سہارا دینا چاہتے تھے۔

ان میں مولوی احمد شاہ مدراسی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا رحمت اللہ اور دوسرے بزرگان دیوبند خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی احمد شاہ مدراسی ایک زبردست مقرر تھے۔ چنانچہ عوام میں وعظ و نصیحت کے لیے پر جوش تقریریں کیا کرتے تھے اور ان کی تقریروں میں ہزاروں آدمی ہندو اور مسلمان جمع ہوتے تھے چنانچہ آگرہ کی تقریروں میں دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔[1] ان کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک موقع پر مجسٹریٹ کے حکم سے پولیس تک نے انہیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔

آپ سن ستاون کے ان ممتاز مجاہدین میں سے ہیں جن سے سخت دشمنی کے باوجود انگریزوں نے ان کی بے حد تعریف کی۔ میلی سن لکھتا ہے:

> "اگر محبِ وطن اسے کہتے ہیں جو اپنے وطن کی برباد شدہ آزادی کے حصول کے لیے سازشیں کرے اور لڑے تو یقیناً مولوی ایک سچا محبِ وطن تھا۔ اس نے اپنی تلوار کو (میدانِ جنگ سے باہر) قتل کے داغ سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ اس نے قتل کے کسی بھی واقعہ سے چشم پوشی گوارا نہ کی وہ ان اجنبیوں

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۴۲، مفتی انتظام اللہ شہابی۔

کے خلاف بلند ہمتی اور استقامت سے میدانِ جنگ میں ڈٹا رہا جو اس کے
وطن پر مسلط ہو گئے تھے اور اس کی یاد تمام قوموں کے مخلصوں اور بہادروں
کی جانب سے عزت و احترام کی مستحق ہے۔"[1]

مولانا فضل حق خیرآبادی مولوی احمد اللہ کا ذکر اپنی کتاب میں اس طرح کرتے ہیں :

"اس موقعہ پر تسلطِ نصاریٰ کے خلاف لڑنے کے لیے ایک اور ہمت کا
حامل اٹھ کھڑا ہوا اس نے خیرات و مبرات اور سعادات و حسنات کا
خاصا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی و
پرہیزگار، بہادر رسول طاہر اور نبی مراحم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام تھا۔
اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی ہلے میں شکست دے دی۔"[2]

مولانا فضل حق خیرآبادی نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ مرتب کرایا جس پر علمائے دہلی
سے دستخط لیے گئے اور یہی فتویٰ مولانا کی گرفتاری کا سبب بنا اور آپ کے لیے حبسِ دوام کا
حکم صادر ہوا اور ان کی کتابیں، جائداد، مال و متاع، اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر شے
ضبطی میں آگئی اور بقول خود

"انہیں قید میں ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ
ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے تھے اور ان کا شمار علمائے اسلام میں
ہوتا تھا اور اس سے انگریزوں کا مقصد نشانِ درس و تدریس کو مٹانا اور
علمِ دین کے جھنڈے کو نیچے گرانا تھا۔"[3]

انگریزوں کے ان مظالم اور استحصال کا مقصد عوام کے دلوں سے مذہب اسلام سے محبت و
یگانگت کو ختم کرنا تھا، چنانچہ مولانا موصوف خود لکھتے ہیں کہ :

---

[1] ۱۸۵۷ء کے مجاہدین ص ۸۲، مولانا غلام رسول مہر۔
[2] باغی ہندوستان ص ۲۰۷، مولانا فضل حق خیرآبادی۔
[3] باغی ہندوستان ص ۲۵۴، علامہ فضل حق خیرآبادی۔

"یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ سب لوگ انہی کی طرح ملحد و بے دین ہو کر ایک ہی ملت پر جمع ہو جائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہو گا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔"

منشی جیون لال نے جو روزنامچہ ترتیب دیا ہے اس سے بھی علامہ خیر آبادی کی انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ منشی جی لکھتے ہیں :

"۱۶۔ اگست ۱۸۵۷ء مولوی فضل حق شریکِ دربار ہوئے۔ انہوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۲۔ ستمبر ۱۸۵۷ء بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے، مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجالائے۔

۶۔ ستمبر ۱۸۵۷ء، مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷۔ ستمبر ۱۸۵۷ء بادشاہ دربار خاص میں بیٹھے، حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں مولوی فضل حق، بدر الدین خاں اور دیگر تمام امراء و رؤسا شریک دربار ہوئے" [1]

جب علامہ پر مقدمہ چلا اور جہاد کے فتوئی کی عدالت میں تصدیق و توثیق چاہی گئی تو مولانا نے کھل کر کہا کہ ہاں فتوئی میرا ہی مرتب کیا ہوا ہے اور آج بھی میری رائے وہی ہے۔

---

[1] غدر کی صبح و شام، روزنامچہ منشی جیون لال ص ۲۱۷، ۲۲۰، ۲۲۶، ۲۲۷۔

مولوی رحمت اللہ کیرانوی عیسائیت کے خلاف شمشیر براں اور ایک زبردست مناظرہ باز تھے۔ ایک مناظرہ میں عیسائی پادری کو رسواکن شکست دے چکے تھے چنانچہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان ہوا تو کیرانہ میں مجاہدین کی فوج کے سالار یہی تھے۔ مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

"مجاہدین کیرانہ میں مسلمان گوجروں کی اکثریت تھی اور ان کی قیادت چوہدری عظیم الدین کر رہے تھے لیکن تمام احکام مولوی رحمت اللہ ہی سے حاصل کیے جاتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا جس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو جاتے پھر اعلان ہوتا: "ملک خدا کا حکم مولوی رحمت اللہ کا" اس کے بعد جو کچھ بتانا ہوتا بتا دیا جاتا۔"[1]

مولوی ذکاء اللہ دہلی کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ باہر سے جو پلٹنیں ہتھیاروں کے بغیر آتی تھیں انہیں دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے :

"مولوی رحمت اللہ اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے وہ بڑے عالم و فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا۔"[2]

مولانا کی گرفتاری کا اعلان ہوا تو پہلے سے مکہ ہجرت کر گئے لیکن ادھر ان کی جائداد جو لاکھوں روپیہ کی تھی ڈیڑھ ہزار روپیوں میں نیلام کر دی گئی اور زرعی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔[3]

---

[1] ۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۱۵۸، ۱۵۹۔ مولانا غلام رسول مہر

[2] تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاء اللہ دہلوی ص ۶۷۵۔

[3] روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۹ء

ان کے علاوہ عظیم اللہ خاں، جنرل بخت خان، شہزادہ فیروز، مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں، نواب علی بہادر اور نواب تفضل حسین وغیرہ مجاہدین کا نام آتا ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا اور جان و مال کی قربانیاں دیں تاکہ ملک آزاد ہو اور اسلامی تہذیب و تمدن کا احیاء ہو سکے۔

جنگِ آزادی کی یہ کوشش ناکام ہو گئی تو انگریزوں کے قہر و غضب کا نشانہ بھی خاص طور پر مسلمان ہی بنے۔ جس ہلاکت خیزی اور سفاکی کا مظاہرہ کیا گیا اور لاکھوں مرد و عورت، بچے اور بوڑھے گولیوں کا نشانہ بنے، ہزاروں افراد کو پھانسی دی گئی یہاں تک کہ لارڈ رابرٹ کے بقول دہلی شہر کا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور لرزہ خیز تھا کہ گھوڑے بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے کیونکہ پوری فضا بیماری اور بدبو سے لبریز تھی، اس میں مسلمانوں پر مظالم کا تناسب کہیں زیادہ تھا اس لیے کہ انگریز اس بغاوت کو اسلامی جہاد تصور کرتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ اس جنگ کے بانی اور رہنما مسلمان ہی ہیں۔ ایک انگریز مصنف کہتا ہے:

> "اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہو گئی کہ یہ ایک اسلامی بغاوت تھی۔"[۱]

ایک معاصر مورخ لکھتا ہے:

> "ایک انگریز کا شیوہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا۔ ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان۔ جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا۔"[۲]

ہنری ہلنٹن اپنی کتاب (ہندوستانی بغاوتیں اور ہماری مستقبل کی پالیسی) میں جو جنگ

---

[۱] ماخوذ از ۱۸۵۷ء، غلام رسول مہر۔

[۲] عروج سلطنت انگلشیہ ص ۶۱۲ منشی ذکاء اللہ

آزادی کے صرف ایک سال بعد یعنی ۱۸۵۸ء میں لکھی گئی ہے، کہتا ہے :

• میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصل محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھلانے کی کوشش کروں گا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر وہ اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ (مسلمان) خلیفہ اول کے وقت سے لے کر موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ مغرور، غیر رواداراور ظالم رہے ہیں، ہمیشہ ان کا مقصد یہ رہا ہے کہ جس ذریعے سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشوونما ہو، مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لیے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں[1]۔

چنانچہ مسلمانوں پر انگریزوں کا نزلہ سب سے زیادہ گرا اور وہی ان مظالم کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ ایک معاصر مؤرخ لکھتا ہے :

• ستائیس ہزار اہلِ اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتلِ عام رہا اس کا تو کوئی حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسلِ تیموریہ کو نہ رکھا۔ مکمل مٹا دیا۔ بچوں تک کو مار ڈالا عورتوں سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے[2]۔

جو لوگ زندہ بچ رہے ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لیے مقدماتِ سازش قائم کیے گئے۔ ان میں مجاہدینِ آزادی کو طرح طرح کی جسمانی و روحانی اذیتیں دی گئیں۔ مسلمانوں کو حکومت کے کلیدی اور اہم مناصب سے ہٹا دیا گیا۔ ان پر معاش کے دروازے بند کیے

---

[1] ماخوذ ہندوستانی مسلمان ص ۱۶۴، ۱۶۵، ابو الحسن علی ندوی

[2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۰۴، سید کمال الدین حیدر۔

گئے۔ ان کے اوقاف اور جائدادوں کو ضبط کیا گیا اور انہیں معاشی وسیاسی حیثیت سے ذلیل وخوار بنانے کی تمام ممکن کوششیں کی گئیں لیکن یہ ساری کوششیں ناکام رہیں اور مسلمان اپنی تہذیب وثقافت اور مذہب وایمان سے علیحدہ ہونے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

جہادِ حریت میں مسلمانوں کی قیادت

اس حقیقت سے انکار کوئی مورخ بھی نہیں کرتا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی سربراہی اور قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں کی سلطنت ختم ہو رہی تھی۔ انہیں کا غلبہ ہندوستان سے ختم ہو رہا تھا۔ انہیں سے انگریز سلطنت چھین رہے تھے۔ جنگِ آزادی کے بعد انہیں کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کو ہندوستان بدر کرکے رنگون جلاوطن کیا گیا تھا۔ انہیں کی جائیدادوں پر قبضہ۔ ان کے لال قلعہ دہلی پر قبضہ اور ان کے تختِ سلطنت پر قبضہ کیا گیا تھا۔ اس لیے یہ حقیقت ہے کہ جنگِ آزادی ہند میں نہ صرف مسلمانوں کا حصہ غالب تھا بلکہ یہ جنگ ان کی ہی برپا کردہ تھی اور ہندو اُن کے ممدو معاون تھے۔ اس وقت تک ہندو مسلمانوں کے بارے میں اتنی اچھی رائے رکھتے تھے کہ وہ ان کی سلطنت کی بحالی کے لیے ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کر رہے تھے۔

درحقیقت ہندوستان[۱] کی تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ قدرتی طور پر بہت ممتاز ونمایاں رہا ہے اور انہوں نے جنگِ آزادی میں قائد اور رہنما کا پارٹ ادا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ایک ایک صوبہ اور ریاست ان کے زیرنگیں آنے لگی اس وقت مسلمان ہی ہندوستان کے فرمانروا تھے۔ سب سے پہلا شخص جس کو اس خطرہ کا احساس ہوا وہ میسور کا بلند ہمت اور غیور فرمانروا فتح علی خان ٹیپو سلطان (۱۲۱۳ھ ۱۷۹۹ء) تھا جس نے اپنی بالغ نظری اور غیر معمولی ذہانت سے یہ بات محسوس کرلی کہ انگریز اس طرح ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست ہضم کرتے رہیں گے اور اگر کوئی

---

[۱] ہندوستانی مسلمان اور ان کی جدوجہد ص ۱۳۷ تا ۱۵۰۔ از مولانا ابوالحسن علی ندوی

منظم طاقت ان کے مقابلہ پر نہ آئی تو آخر کار پورا ملک ان کا لقمۂ تر بن جائے گا، چنانچہ انہوں نے انگریز سے جنگ کا فیصلہ کیا اور اپنے پورے ساز و سامان، وسائل اور فوجی تیاریوں کے ساتھ ان کے مقابلہ میں میدان میں آ گئے۔

ٹیپو نے ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کو انگریزوں سے جنگ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اس مقصد سے انہوں نے سلطان ترکی سلیم عثمانی، دوسرے مسلمان بادشاہوں اور ہندوستان کے امراء اور نوابوں سے خط و کتابت کی اور زندگی بھر انگریزوں سے سخت معرکہ آرائی میں مشغول رہے، قریب تھا کہ انگریزوں کے سارے منصوبوں پر پانی پھر جائے اور وہ اس ملک سے بالکل بے دخل ہو جائیں مگر انگریزوں نے جنوبی ہند کے امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا اور آخر کار اس مجاہد بادشاہ نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگا پٹم کے معرکہ میں شہید ہو کر سرخروئی حاصل کی۔ انہوں نے انگریزوں کی غلامی اور اسیری اور ان کے رحم و کرم پر زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دی، ان کا مشہور تاریخی مقولہ ہے کہ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے" جب جنرل "ہارس" کو سلطان کی شہادت کی خبر ملی تو اس نے ان کی نعش پر کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے۔

"آج سے ہندوستان ہمارا ہے"۔

ہندوستان کی تاریخ سلطان ٹیپو سے زیادہ بلند ہمت، بالغ نظر مذہب و وطن کے فدائی اور غیر ملکی اقتدار کے دشمن سے آشنا نہیں، انگریزوں کے لیے ٹیپو سلطان سے زیادہ مہیب اور قابلِ نفرت شخصیت کوئی نہ تھی، بہت عرصہ تک وہ اپنے دل کی آگ بجھانے اور آزادی و جہاد کے اس ہیرو کی تذلیل و توہین کے لیے اپنے کتوں کو سلطان ٹیپو کے نام سے پکارتے تھے۔

جنگِ آزادی کا متحدہ محاذ

انگریزی حکومت و اقتدار انگریزوں کے تکبر، ملک کی دولت کے استحصال اور

اہل ملک کے مذہبی عقائد اور جذبات کی مسلسل بے حرمتی برداشت کرنے کے بعد ہندوستان کی فوجوں نے مئی ۱۸۵۷ء میں ان کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا، اس اعلان نے خرمن پر آگ کا کام کیا، اور فوراً ہی اس شورش نے عوامی جنگ کی شکل اختیار کر لی جس میں ہندو مسلمانوں نے دوش بدوش حصہ لیا، سپاہیوں نے دہلی کی طرف کوچ کیا جو مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی قیام گاہ تھی، اور ان کو اس جنگ کا قائد اور رہنما، متحدہ حب الوطنی اور عوامی جدوجہد کا نشان، ہندوستان کا قانونی بادشاہ اور نامور مغل بادشاہوں کا وارث اور جانشین قرار دیا، ہندوستان کے کونہ کونہ میں ان کے نام پر اور ان کے جھنڈے کے نیچے جنگ کی گئی، لوگ ان کو مذہبی اور قومی جنگ کا ہیرو سمجھتے رہے اور دہلی کو آزاد ہندوستان کا پایہ تخت، کسی کو بھی اس سے اختلاف نہ تھا، اس جنگ کے اکثر قائدین مسلمان ہی تھے۔

اس تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں سے ایسا خوفناک انتقام لیا کہ جیسے انگریز قوم رحم، انصاف اور انسانیت کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہو۔ اس کے نتیجہ میں ایسی ہلاکت خیزی اور تباہی پھیلی اور ایسی سفاکی کا مظاہرہ کیا گیا جس نے چنگیز و ہلاکو کی یاد تازہ کر دی، انہوں نے بادشاہ کے تین نوجوان لڑکوں کو قتل کیا، باوجود اس کے کہ وہ اس سے پہلے ان کو امان دے چکے تھے، اور ایسی درندگی اور بربریت کے ساتھ شاہی خاندان کے ۲۴ افراد کو قتل کیا گیا جن میں مریض بوڑھے اور اپاہج بھی شامل تھے۔ انہوں نے بادشاہ کی تذلیل کی اور انتہائی توہین آمیز طریقے سے ان پر مقدمہ چلایا، وہ چاہتے تھے کہ ان کو بھی قتل کر دیں لیکن چونکہ ایک فوجی افسر نے ان کی زندگی کی ضمانت لی تھی اس کے لیے ان کو زندگی بھر کے لیے "رنگون" میں جلا وطن کر دیا گیا، جہاں بہت کس مپرسی، بے کسی اور تنگی و پریشانی کی حالت میں ان کا انتقال ہوا۔

جب انگریزی افواج دہلی میں داخل ہوئیں تو اس آیت کی تفسیر سامنے آ گئی کہ "جب بادشاہ کسی ملک میں جاتے ہیں تو اس کو تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں اور اس کے معزز

لوگوں کو ذلیل ورسوا کرتے ہیں۔"

فوجوں کو تین روز تک دہلی کو لوٹنے کی عام اجازت دے دی گئی اور انہوں نے انتہائی ہیبت ناک طریقہ پر اس اجازت کا استعمال کیا۔

جان لارنس نے انگریزی کمانڈر کو دسمبر ۱۸۵۷ء میں لکھا:

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریقہ پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے اس کے لیے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل حق بجانب ہو گا۔"

تین روز تک دہلی میں قتل وغارت گری کا بازار گرم رہا۔ سر تن سے جدا ہوتے رہے خون بہتے رہے اور گولیاں مجرم اور بے گناہ کی تمیز کیے بغیر سنسناتی رہیں۔ گھروں کو لوٹا گیا جو بھاگ سکا وہ اپنی آبرو لیے اور اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر دہلی سے بھاگ گیا اور آخر کار وہ شہر جو ایک زمانہ میں عروس البلاد کہلانے کا مستحق تھا اور ہندوستان کا دارالسلطنت تھا بالکل ویران ہو گیا۔ اب وہاں گرے ہوئے مکانات، ملبہ، سڑی ہوئی لاشوں اور پھٹے ہوئے خیموں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا شہر کی تصویر ایک انگریز کمانڈر لارڈ رابرٹ نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا، لال قلعے کے لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے، دہلی حقیقتاً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی، ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری تھیں، ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے تاکہ انسانیت کے دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے، جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوئیں۔ وہ بڑے ہی سخت اخراج تھے کہیں کوئی کتا کسی نعش کا

برہنہ عضو جھنجھوڑ کر کھا رہا تھا کہیں کوئی گدھ، ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑپھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا تھا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے، کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی کسی کو اشارہ کر رہا ہو، دراصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں آسکتا، معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا اس لیے کہ وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے، پوری فضا ناقابل تصور حد تک بھیانک تھی جو بڑی متعفن اور بیماری اور بدبو سے لبریز تھی۔"

اس قتل عام کا نشانہ مسلمان خاص طور پر بنائے گئے تھے، اس لیے کہ بہت سے ذمہ دار انگریز یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک اسلامی جہاد تھا اور مسلمان اس بغاوت کے بانی، قائد اور رہنما ہیں، ایک انگریز مصنف نے لکھا:

"اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جاسکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہوگئی یہ تو ایک اسلامی بغاوت تھی۔"[1]

ایک مورخ لکھتا ہے:

"ایک انگریز کا شیوہ یہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا۔ ہر ایک سے پوچھتا تو ہندو ہے یا مسلمان۔ جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا تھا۔"[2]

تحریک آزادی کے خاتمہ پر پھانسیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عام شاہراہوں اور سڑکوں

---

۱ ماخوذ از ۱۸۵۷ء، غلام رسول مہر۔

۲ عروج سلطنت انگلشیہ ص ۲۱۲۔

پر پھانسی کے تختے لگا دیے گئے اور یہ جگہیں انگریزوں کی تفریح و دلچسپی کا مرکز بن گئیں جہاں انگریز وہ پھانسی پانے والوں کے سسکنے اور دم توڑتے کے وقت کا لطف لیتے، سگریٹ کے کش لگاتے اور آپس میں ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے رہتے۔ جب پھانسی کا کام پورا ہو جاتا اور مظلوم شخص آخری سانس لیتا تو ہنسی اور مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتے۔ ان بدنصیبوں میں بڑے بڑے ذی وجاہت اور اشراف تھے دہلی میں بعض مسلم محلے تو اس طرح تہ تیغ کر دیے گئے کہ وہاں ایک فرد بھی باقی نہ بچا۔

ایک مورخ لکھتا ہے:

"ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتلِ عام رہا اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموریہ کو مکمل طور پر مٹا دیا گیا۔ بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا گیا وہ بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے بھی دل دہل جاتا ہے"[1]

ایک انگریز میلی سن خود لکھتا ہے:

"ہمارے فوجی افسر ہر قسم کے لوگوں کو مارتے پھرتے تھے وہ کسی درد و تاسف کے بغیر انہیں پھانسیاں دے رہے تھے، گویا وہ کتے تھے یا گیدڑ یا نہایت ادنیٰ قسم کے کیڑے مکوڑے تھے۔

سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ تھی کہ مجرم کو توپ سے اڑا دیا جائے یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا تھا۔ ان حالات میں ہم احتیاط پر کاربند بھی نہیں ہو سکتے، ہمارا مقصد تو ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے"

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۵۴۳ سید کمال الدین حیدر

اس جہادِ حریت کی سب سے بڑی قیمت مسلمانوں کو ادا کرنا پڑی۔ انگریزی حکومت کے ذمہ دار سیاستدان، مفکرین اور مصنفین یہی سمجھتے رہے کہ دراصل مسلمان ہی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ذمہ دار ہیں اور ان کی آئندہ نسلوں تک کو اس کا خمیازہ بھگتنا چاہیئے۔

پورے برصغیر ہند کو اکٹھا رکھ کر مسلمانوں کی بالاتری اور آزادی کی حفاظت کے لیے یہ آخری جدوجہد تھی جو ملت اسلامیہ نے کی اس کے بعد غلامی کا وہ دور شروع ہوا جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا

؎ افسردہ اسے کر گئی دو صدیوں کی غلامی
وارو کوئی ڈھونڈ اس پریشان نظری کا

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

(علامہ اقبالؒ)

(۴)

تحریک خلافت

۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۲ء

تحریکِ آزادیٔ ہند کے ذریعے برِصغیر میں ملتِ اسلامیہ کی آزادی، حریت اور اسلامی کردار کو بچانے کی جدوجہد کی ناکامی نے ملت کو گوناگوں آزمائشوں سے دوچار کر دیا۔ فرنگی سامراج یہ خوب سمجھتا تھا کہ ہم نے ہندوستان کن سے چھینا ہے اور کس گروہ نے تحریکِ آزادی میں اس کے پاؤں اکھاڑنے کی عملی کوشش کی ہے اور یہ کہ آئندہ اپنے پاؤں جمانے کے لیے اسے کس گروہ کو دبانا چاہیئے۔

پس منظر

چنانچہ تحریکِ آزادی کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں کو اعتماد میں لینے اور مسلمانوں کو دبانے۔ تباہ کرنے محتاج اور بے معاش کرنے کی پالیسی کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے غیر معمولی پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تاکہ ان کی عسکری قوت کا خاتمہ ہو۔ پھر انہیں غیر مسلح کیا گیا اور مسلمان زمینداروں اور جاگیرداروں کی تمام زمینیں اور جاگیریں ضبط کر کے ان کے ہندو منشیوں اور کارندوں کو دے دی گئیں۔ مسلمانوں نے خود بھی ایک مدت تک انگریزی سامراج کے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا۔ انگریزوں نے بھی بڑے بڑے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی جدید فرنگی حکومت کے انتظامی ڈھانچہ میں چپراسی چوکیدار اور پنکھا قلی سے زیادہ ملازمت دینے سے انکار کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہر قسم کے اہم سرکاری عہدوں سے محروم رکھنے کی پالیسی اپنائی۔ چنانچہ بنگال۔ بہار۔ یوپی اور ہندوستان

کے طول و عرض میں زیادہ تر بڑے بڑے زمیندار مسلمان اپنے ہی ہندو منشیوں اور کارندوں کے محتاج ہو کر ٹکڑے ٹکڑے کو ترسنے لگے۔ وہ قوم جو ہندوستان کے وسیع و عریض علاقے پر راس کماری سے خیبر تک حکمران رہی تھی جس نے ایک عظیم متحدہ ہندوستان کا تصور اپنی سلطنت کے ذریعے پیش کیا تھا۔ وہ قوم اب پورے ہندوستان میں تعلیم سے بے بہرہ، روزگار سے تہی دست اور اثر و رسوخ سے محروم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس طرح برصغیر میں مسلمانوں کے لیے تاریخ میں پہلی بار ایک غیر مسلم حکومت کی غلامی کا دور شروع ہو گیا۔ غلامی کا تجربہ ہندو قوم کو تو گذشتہ کئی صدیوں سے تھا لیکن مسلمان قوم کو ایسا تجربہ بالکل نہیں تھا۔ اس لیے یہ غلامی مسلمانوں کے لیے غیر معمولی بھاری تھی۔ وہ ثریا سے تحت الثریٰ میں گر پڑے تھے۔ وہ تختِ حکومت سے گر کر غلامی کی دلدل میں پھنس گئے تھے۔ ان کے لیے یہ صورتِ حال غیر متوقع طور پر غیر معمولی تھی۔ انہوں نے جنگیں بھی کی تھیں اور ان میں فتوحات کے ساتھ شکستیں بھی کھائی تھیں لیکن یہ باتیں تو ان کے لیے باہمی رد و بدل اور تبادلہ اقتدار کی تھیں۔ خلجیوں، لودھیوں، سوریوں، غزنویوں، اور دوسروں کے درمیان تخت سلطنت بدلتے رہے تھے لیکن وہ ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان ہی رہتے تھے جو ان کے ہم عقیدہ، ہم مسلک اور ہم قدم تھے البتہ یہ پہلا موقع تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے حصے میں کفار کی غلامی آئی تھی۔ اس صورتِ حال نے انہیں ایک طویل عرصے تک متحیر اور مذبذب رکھا کہ وہ اس صورتِ حال سے اپنی پوری تاریخ میں کبھی دوچار نہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان میں مسائل کے حل کے لیے اور ملت کی فلاح اور پیش رفت کے لیے لائحہ عمل کی تیاری کا مسئلہ تھا چنانچہ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ کوئی انگریزوں سے تعاون اور کوئی ان سے عدم تعاون کی باتیں کر رہا تھا۔ غرض لائحہ عمل مرتب کرنے میں بے شمار رکاوٹیں تھیں اور خود لائحہ عمل کی بھی بے شمار سمتیں تھیں۔ کفار کا مقابلہ کفار کے ساتھ مل کر کرنے کی تجاویز بھی تھیں اور آزادانہ حریت پسندی کی جدوجہد کا راستہ بھی تھا۔ ہندوستان کے دارالکفر بن جانے کے بعد کسی دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جانے کے فتوے بھی تھے اور کسی مسلمان ملک کی مدد سے

انگریزوں سے چھٹکارا پانے کی تجاویز بھی تھیں۔ مسلمان غلامی کے گرداب میں اپنی تاریخ میں پہلی بار پھنس گئے تھے۔

انہیں دنوں جنگِ عظیم اول نے انگریزوں کو سلطنت عثمانیہ کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ سلطنت عثمانیہ خلافت اسلامی کی حامل اور مسلمانوں کی اجتماعیت کا نشان تھی۔ جنگِ عظیم میں جو فریق ہار گیا تھا۔ اس میں سلطنتِ عثمانیہ بھی شامل تھی۔ جس کے یورپین اور ایشیائی تمام علاقوں میں انگریزوں کی سازشوں سے بغاوتوں کے علم بلند ہو گئے تھے۔ اب اس امر کا خطرہ موجود تھا کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا آخری نشان خلافتِ اسلامی کو بھی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ ہی ختم کر دیا جائے گا۔ خلافت اسلامی کا خطبہ ہر جگہ مساجد میں پڑھا جاتا تھا اور برصغیر کے مسلمان یہ بالکل برداشت نہ کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے اسلامی اجتماعیت کا آخری نشانِ خلافت بھی نکل جائے۔ اس خطرے کے تحت ہندوستان کے مسلمانوں نے پورے برصغیر میں ایک عظیم الشان تحریک چلائی۔ اس تحریک کا نام تحریکِ خلافت ہے۔ یہ گویا برصغیر میں مسلمانانِ عالم کی اسلامی اجتماعیت کو بچانے کی آخری بھرپور کوشش تھی جس کے علمبردار برصغیر کے مسلمان تھے۔

برطانوی حکومت کے قول و فعل میں ہمیشہ بڑا تضاد رہا ہے۔ اس نے ایک طرف شریف حسین مکہ کا ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کروا دیا اور دوسری طرف اسرائیلیوں کی تنظیم سے یہ وعدہ کر لیا کہ برطانوی حکومت فلسطین میں اسرائیلیوں کے لیے قومی مملکت قائم کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔ اور تیسری طرف ترکی کے جنگ سے دستبردار ہو جانے اور اتحادیوں سے ہنگامی معاہدہ صلح کرنے کے باوجود موصل اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور چوتھی طرف یونانیوں کو ابھار کر سمرنا میں ان کی فوجیں داخل کر دیں تاکہ ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے اور خلافت کو جو عالم اسلام کا روحانی مرکز ہے ختم کر دیا جائے۔

برطانیہ کی اس بد دیانتی کا برصغیر کے مسلمانوں پر شدید رد عمل ہوا۔ انگریزی حکومت کے تشدد کے باوجود مسلمانوں کا دینی جوش اور جذبہ غیر معمولی بڑھ گیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی ایسے لیڈروں کو مقدمہ چلائے بغیر

جیلوں میں بند کر دیا گیا اور ان حالات میں بہت سے پر جوش اور جذبۂ جہاد سے سرشار مسلمان خفیہ طور پر ملک سے باہر نکل گئے تاکہ میدانِ جنگ میں پہنچ کر ترکوں کی حمایت میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ مولانا محمود حسن پرنسپل دارالعلوم دیوبند حجاز اور مولانا عبیداللہ سندھی کابل چلے گئے۔ یہ دونوں راہنما برصغیر سے باہر رہ کر انگریزی حکومت کے خلاف برصغیر میں انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔

تحریکِ خلافت کا قیام

ان حالات میں ترکی کے مستقبل کے بارے میں خطرات کی بنا پر برصغیر کے مسلمانوں کا اضطراب بڑھ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ہمت اور اولوالعزمی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک تحریک شروع کی جو تحریکِ خلافت کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کی قیادت خلافت کمیٹی کے ہاتھ میں تھی۔ خلافت کمیٹی کے بڑے مقاصد یہ تھے۔

ا۔ ترکی کی خلافت قائم رکھی جائے۔

ب۔ مسلمانوں کے مقدس مقامات ترکوں کی حفاظت میں رہیں۔

ج۔ ترکوں کی سلطنت کی حدود وہی رہنے دی جائیں جو جنگ سے پہلے تھیں۔

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی کے مقام پر بنگال کے مولوی فضل الحق کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں باقاعدہ دعوت پر مسٹر گاندھی کے علاوہ کانگرس کے کچھ اراکین نے بھی شرکت کی۔ اجلاس میں طے پایا کہ مسلمان جشنِ فتح میں شرکت نہیں کریں گے اور اگر ان کے مطالبات منظور نہ ہوئے تو وہ حکومت سے ترکِ موالات کریں گے۔ نیز انگلستان کی مصنوعات کا مقاطعہ کریں گے۔ کانگرس نے بھی اس تحریک کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

تحریکِ خلافت کی جدوجہد

انگریزوں کی صریح دھاندلی کے سبب برصغیر پاک و ہند کے اندر ایسے واقعات رونما ہوئے

کہ ہر طرف سیاسی ہیجان پیدا ہو گیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد حکومت نے سیاسی تحریکوں کو کچلنے کے لیے ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ پاس کیا جس کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے ہوئے اور ہڑتالیں کی گئیں۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہروں نے پنجاب میں تشدد کی صورت اختیار کر لی۔ لاہور میں ہجوم پر گولی چلائی گئی۔ پھر ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ (امرتسر) کا سانحہ پیش آیا جس میں نہتے ہجوم پر بے دریغ فائرنگ کی گئی۔ اس سے پنجاب کی صورتِ حال اور خراب ہو گئی اور صوبے میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخری ہفتے میں مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس بیک وقت امرتسر میں منعقد ہوئے۔ علی برادران مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی چھندواڑہ جیل سے رہا ہو کر ۲۱ دسمبر کو سیدھے امرتسر پہنچے جہاں ان کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں نے خلافت کے تحفظ کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم صمیم کیا۔ خلافت کے اجلاس میں مولانا شوکت علی کی زیرِ صدارت یہ فیصلہ کیا گیا کہ خلافت کے سوال کی وضاحت کرنے کے لیے ایک وفد انگلستان روانہ کیا جائے۔ لیکن وفد کی روانگی سے قبل وائسرائے ہند کو خلافت اور ترکی کے بارے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا جائے۔ نیز دس لاکھ روپیہ کا فنڈ جمع کیا جائے۔

۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو اٹھارہ لیڈروں پر مشتمل ایک وفد نے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کی اور خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کے بارے میں برصغیر کے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ وائسرائے نے وفد سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ ترکی کی قسمت کا فیصلہ صرف انگلستان کے دائرہ اختیار میں نہیں بلکہ یہ اتحادیوں کا مشترکہ مسئلہ ہے۔

وائسرائے کا جواب سخت مایوس کن تھا۔ چنانچہ ۲۰ جنوری کو خلافت کمیٹی کی ایک اور میٹنگ ہوئی جس میں آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے پایا جو یہ تھا۔

۱۔ ترکِ خطابات اور حکومت کے تعلیمی اداروں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔

۲۔ سول، پولیس اور فوج کے علاوہ حکومت کے تمام محکموں سے استعفے دلوائے جائیں۔

۳۔ پولیس اور فوج سے علیحدگی اختیار کی جائے۔

۴۔ ٹیکسوں کی ادائیگی سے انکار کیا جائے مگر اس پروگرام کے لیے عدم تشدد اور اعلیٰ نظم وضبط کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

مارچ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں ایک وفد مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں انگلستان روانہ ہوا۔ اس میں محمد علی جوہر کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی، سید حسین اور حسن محمد حیات شامل تھے۔ مولوی ابوالقاسم، شیخ شبیر حسین قدوائی، محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی جو پہلے ہی انگلستان میں موجود تھے، بھی اس وفدِ خلافت میں شامل ہو گئے۔ راستے میں وینس کے مقام پر لندن کے ایک اخبار کی خبر سے معلوم ہوا کہ ترکی کی قسمت کا فیصلہ عنقریب ہونے والا ہے۔ چنانچہ وفد عجلت سے لندن پہنچا اور انگلستان کے نامور سیاستدانوں سے ملاقاتیں ہوئیں لیکن وفد کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ تعصب اور لاعلمی کے باعث لندن کی فضا ترکی کے سخت خلاف ہے۔ تاہم ۱۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو وفد انگلستان کے وزیراعظم لائیڈ جارج سے ملا۔ لائیڈ جارج نہایت متعصب اور اسلام دشمن عیسائی تھا۔ اس نے نہایت بے حیائی کے ساتھ برطانیہ کی طرف سے کئے گئے وعدوں کو پورا کرنے اور وفد کے مطالبات تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا:

"آسٹریا سے انصاف ہو چکا، جرمنی سے بھی ہو چکا۔ کیسا خوبصورت اور بھیانک انصاف اب ترکیہ اس سے کیوں بچے"

وزیراعظم سے مایوس ہو کر وفد کئی ایک اور لوگوں سے ملا۔ تقاریر کیں۔ پریس میں بیانات دیئے مگر کچھ کامیابی نہ ہو سکی، برطانوی پریس نے وفد سے قطعاً کوئی تعاون نہ کیا۔ بہرحال وفد نے مایوس کن حالات کے باوجود اپنا مشن جاری رکھا۔ اس نے پارلیمنٹ کے ممبروں، سیاسی جماعتوں کے لیڈروں اور اہلِ قلم ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن ہر جگہ سے جواب نفی میں پایا۔ وفد نے متعدد جلسوں سے بھی خطاب کیا جن میں مولانا محمد علی جوہر نے "اپنے نقطہ نگاہ کی وضاحت کے لیے اپنا سارا زورِ خطابت صرف کیا" بالآخر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں آٹھ نو ماہ کے بعد وفد انگلستان سے ناکام واپس لوٹ آیا۔

اس کے بعد ۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو اتحادیوں نے معاہدہ سیورے کی رو سے ترکی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور اس کے حصے بخرے کر دیئے۔ صوبہ حجاز شریف حسین حاکم مکہ کو دے دیا گیا۔ فلسطین عراق اور اردن کو برطانیہ اور شام کو فرانس کی سرپرستی میں دے دیا گیا۔ آرمینیا کو آزاد عیسائی حکومت بنا دیا گیا۔ جنوب اناطولیہ کو اٹلی کی زیر نگرانی تسلیم کر لیا گیا۔ ایڈریا نوپل، گیلی پولی، امراس، سمرنا اور ٹینڈرس یونان کے حوالے کر دیئے گئے۔ درۂ دانیال اور خلیج باسفورس کو بین الاقوامی قرار دیا گیا۔ ترکی پر بھاری تاوانِ جنگ بھی عائد کیا گیا اس کے علاوہ ترکی کے بحری جہاز ضبط کر لیے گئے۔ ہوائی فوج رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ بری فوج کی تعداد کم کر دی گئی اور فوجی اسکول بند کر دیئے گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکی کے قومی وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی اتحادیوں کی سازش کامیاب ہو گئی ہے۔ یہ سارے علاقے چھن جانے کے بعد محدود سے حصے ترکی میں انقرہ کے مقام پر مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کی قیادت میں ایک نئی حکومت قائم کی گئی۔ جس سے سلطنت عثمانیہ کے سارے علاقے اور مقبوضات چھین لیے گئے۔

ترکِ موالات

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں انگلستان سے مولانا محمد علی جوہر کی واپسی پر تحریکِ خلافت کی جمعیت میں پھر ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی نے ملک کے کونے کونے کا طوفانی دورہ کر کے رائے عامہ کو ترکِ موالات کے لیے خوب بیدار کیا۔ جمعیت العلماء نے ایک فتویٰ جاری کیا جس میں مسلمانوں کو الیکشنوں، سرکاری ملازمتوں، سرکاری سکولوں، کالجوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے اور خطابات واپس کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اس فتویٰ پر ۹۲۵ علماء نے دستخط کیے۔ بعد ازاں مزید ۷۰ علماء نے اپنے دستخط ثبت کیے۔

۱۹۲۱ء میں ترکِ موالات اور عدم تعاون کی تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ ترکِ موالات پر ہر جگہ عمل ہو رہا تھا اور قومی رضاکار خوشی خوشی جیلوں میں جا رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر ہی تحریکِ خلافت کے قائد تھے۔

جب حکومت برطانیہ کی جانب سے تحریک پر کسی قسم کے ردِ عمل کا مظاہرہ نہ ہوا تو بعض علماء نے ایک فتویٰ کے ذریعے مسلمانوں کے لیے پولیس اور فوج کی ملازمت کو شرعاً حرام قرار دے دیا۔

اس کے بعد ۸۔ جولائی ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی جوہر کی زیرِ صدارت خلافت کمیٹی کا تاریخی اجلاس کراچی کے مقام پر منعقد ہوا جس میں ترکِ موالات کے ضمن میں متعدد علماء کا جاری کردہ فتویٰ پڑھ کر سنایا گیا۔ جس کی حاضرینِ اجلاس نے پر زور حمایت کی۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر نے ایک قرارداد پیش کی۔ جسے اتفاقِ رائے سے منظور کیا گیا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ

"آل انڈیا خلافت کمیٹی کا یہ اجلاس غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک اور انقرہ کی قومی حکومت کی شاندار فتوحات اور کامیابی پر اسے دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور یہ اجلاس اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ ترک بہت جلد ٹرکش ایمپائر کی سرزمین سے اتحادیوں کی افواج کو کلی طور پر نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"یہ اجلاس واضح طور پر اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ موجودہ حالات میں ایک مسلمان کیلئے برطانوی فوج میں ملازمت جاری رکھنا یا فوج میں بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا ہر لحاظ سے مذہباً و شرعاً ناجائز ہے۔"

اجلاس میں یہ بھی واضح طور پر کہا گیا کہ اگر برطانوی حکومت نے حکومت انقرہ سے جنگ کی تو برِصغیر پاک و ہند کے مسلمان سول نافرمانی شروع کر دیں گے اور مکمل آزادی کا اعلان کر دیں گے۔

گرفتاریاں

انگریزی حکومت نے ستمبر ۱۹۲۱ء میں علی برادران اور خلافت کمیٹی کے اجلاس کراچی میں شریک دوسرے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔

کراچی کے خالق دینا ہال میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں پر مقدمہ چلایا گیا

جس میں مولانا محمد علی جوہر نے بڑی بے باکی سے بیان دیتے ہوئے مکمل خود اعتمادی اور وضاحت کے ساتھ کہا:

"اب ہم بادشاہ (شاہِ انگلستان) کو اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کرتے۔ ہم کسی ایسے انسان کی وفاداری کا دم نہیں بھر سکتے جو ہمیں خدا سے وفاداری سے محروم کر دے۔ میں بادشاہ کے خلاف کوئی لفظ نہیں کہوں گا، نہ ہی شاہی خاندان کے خلاف کوئی لفظ بولوں گا۔ مگر جہاں حکومت کے مقابلے میں خدا کا سوال سامنے آجائے تو میں ایسی حکومت کی اطاعت سے انکار کر دوں گا جو مجھ سے یہ مطالبہ کرے کہ میں خدا اور اس کے قانون کا احترام نہ کروں۔"

مولانا محمد علی نے اپنے نقطۂ نگاہ کو زیادہ مضبوطی اور اعتماد کے ساتھ دہراتے ہوئے کہا!-

"اگر کوئی بیرونی مسلم طاقت ملک گیری کی خاطر ہندوستان پر حملہ آور ہو تو میں اس کی مزاحمت کروں گا۔ لیکن اگر وہ تحفظِ خلافت کے مقصد کی خاطر برطانیہ کے خلاف جہاد کرے اور اس سلسلے میں برطانیہ کے مقبوضہ علاقے ہندوستان پر حملہ کرے تو میرے لیے نہ صرف اس کے خلاف لڑنا حرام ہے، بلکہ پوری قوت کے ساتھ اس کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔"[1]

عدالت نے تحریکِ خلافت کے لیڈروں کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی جس سے سارے برصغیر میں حکومت کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی۔

تحریکِ خلافت کا خاتمہ : سول نافرمانی کے نئے پروگرام کا آغاز ہونے

---

[1] افضل اقبال "مولانا محمد علی کی تقریریں اور تحریکیں"۔

والا تھا کہ ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو چورا چوری (ضلع گورکھپور) میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ اچانک تحریکِ خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ ۵ فروری کو چورا چوری کے ایک عوامی جلوس کا پولیس کے ساتھ تصادم ہو گیا۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لیے فائرنگ کی۔ پولیس کے پاس گولیاں کم تھیں۔ یہ ختم ہو گئیں تو پولیس نے پسپا ہو کر تھانے میں پناہ لے لی۔ مشتعل ہجوم نے تھانے پر دھاوا بول دیا اور اسے آگ لگا دی۔ جس سے ۲۱ سپاہی جل کر مر گئے۔ اس واقعہ کا کانگریس پارٹی نے اس قدر سنگین نوٹس لیا کہ کانگریس کے صدر حکیم اجمل خاں اور سیکرٹری ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کیے بغیر سول نافرمانی کی تحریک کو گاندھی نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ چونکہ عدم تعاون اور ترکِ موالات کی تحریک عدم تشدد پر کاربند نہیں رہی۔ اس لیے اس کو ختم کر دینا ضروری ہے۔ یہ تحریک ۱۸۵۷ء کے بعد مشترکہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی پہلی اور آخری انقلابی تحریک تھی جسے گاندھی نے بغیر مشورے کے ختم کر دیا۔ اس کے خاتمے کے ساتھ ہی نہ صرف ملک میں ہندو مسلم اتحاد کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور دونوں قوموں کے درمیان اختلافات پہلے کی نسبت زیادہ شدت اختیار کر گئے بلکہ تحریکِ خلافت بھی خود بخود ٹھنڈی پڑ گئی۔ بالآخر ۲۔ مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکی کی نئی حکومت نے مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کی زیرِ قیادت خود خلافت کا خاتمہ کر دیا اور ترکی کو لادینی ریاست قرار دیدیا۔ اس سے تحریکِ خلافت کا وجود بھی برصغیر میں ختم ہو گیا۔

تحریکِ خلافت کی روح مولانا محمد علی جوہر

تحریکِ خلافت کی روح مولانا محمد علی جوہر تھے۔ جذبہ و جوش و اخلاص کا پیکر تھے۔ اسلام کے فدائی تھے۔ ان کے بارے میں دورِ جدید کی اسلامی تحریک کے بانی مولانا مودودی نے فرمایا تھا کہ مجھے آج تک مسلمانوں میں کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آیا جو سیاسی بصیرت کے ساتھ گہرا دینی جذبہ بھی رکھتا ہو اور اپنی دینداری سے اپنی تحریک کے کارکنوں میں بھی دینی روح پھونک سکتا ہو:

"محمد علی کا سا عظیم غلام آباد ہندوستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا۔ وہ گدائے بے نوا تھا، لیکن آغا خاں اور مہاراجہ محمود آباد اس کے حضور میں جھک کر آتے تھے۔ وہ اقلیت کا ایک فرد تھا، لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر اس کی جیب میں تھا اور پٹیل، موتی لال، جواہر لال، راجندر پرشاد وغیرہ تو اس سے دوسرے ہی درجے پر تھے۔ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا، لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے انگریزی دور میں کم از کم وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کا ممبر تو بن ہی سکتا تھا لیکن ان مناصب عالیہ پر اس نے کبھی نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا گوارا نہ کیا اس کی زندگی کا مقصد منہاج خلافتِ راشدہ پر خلافت کا قیام تھا وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا، پابندی سے روزے رکھتا تھا اور ذات رسالت مآب سے اس کے عشق اور شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ —— جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آوے، اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے تھی، اور دشمنی بھی اللہ کے لیے۔ اسی لیے وہ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بناتا رہتا تھا وہ بغاوت کے جرم میں جیل بھی گیا اور اس جرم میں پھانسی کا مشتاق بھی رہا، خود ہی کہتا ہے ؎

دستِ وارد کو حکم نظر بندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

مولانا محمد علی خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کیا مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ بنئے بن جائیں، کیا اقتصادی حالت درست ہونے سے مسلمانوں کی حالت سدھر جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کفر آموز حالت میں مبتلا رہو، مگر اصل چیز جو توجہ کے قابل ہے وہ روحانی اور دینی تربیت ہے۔ جب اسلام کی تنظیم سیکھ گئے تو بنئے تو کجا کیا، یورپ اور امریکہ کے تجار بھی تمہاری ٹھوکریں کھائیں گے۔

طریقۂ تجارت اسلامی ہونا چاہیئے یعنی سنتِ محمدیہ کی متابعت کرنی چاہیئے نہ کہ سنتِ مالویہ کی، میں بائیکاٹ کا سخت مخالف ہوں مگر ایک بائیکاٹ کا زبردست حامی ہوں وہ سود کا بائیکاٹ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مسلمان ایک پیسہ بھی کسی سے سود نہ لے اور اس طرح ایک کوڑی بھی کسی کو نہ دے۔"

ایمان کے تقاضوں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ کچھ خاص نظریات اور عقائد میں ایمان رکھے اور ان کے مطابق زندگی گزارے ــــ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جبر کو استعمال کیے بغیر ہر ممکنہ قوت اس امر کے لیے استعمال کرے کہ دوسرے لوگ بھی انہی تصورات کے مطابق زندگی گزاریں۔ قرآن پاک میں اس چیز کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول سے تعبیر کیا گیا ہے اور نبی اکرمؐ کی بہت سی احادیث بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ ایک مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے بھائیوں پر ذمہ دار نہیں ہوں اس لیے کہ خود اس کی اپنی نجات کا انحصار اس امر پہ ہے کہ وہ دوسروں کو اتباعِ حق کی ترغیب دے، نیکی کا حکم کرے اور ان کو برائی سے روکنے کی جدوجہد کرے۔"[1]

قرآن کے اصولِ تبلیغ اور احکامِ اسلام کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں کہتا ہوں اور سب لوگ اس کو سمجھ لیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور جو اس سے ذرہ برابر بھی ہٹا وہ گمراہ ہوا۔ اس میں کسی کی تخصیص نہیں خواہ مہاتما گاندھی ہوں یا مولانا شوکت علی ہوں، خواہ مصطفےٰ کمال ہوں جو لادینیت اور لاطینیت پھیلا رہے ہیں یا شاہ امان اللہ اور ان

---

[1] مقدمہ کراچی میں بیان۔

کی ملکہ ثریا ہوں جو پردہ کو اُٹھا رہے ہیں اور ہاتھ کھلے رکھنے کا فیشن اختیار کر رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہندوستان اسلام کے جھنڈے کے نیچے آجائے گا اور سب لوگ مسلمان ہوں گے لیکن جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ اس قسم کی تبلیغ سے جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کرنے کا حکم ہوا تھا وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اور یہی بہتر ہے۔ آج جو لوگ ہمارے دشمن ہیں، کل وہ دوست ہو سکتے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد بھی یہی ہے۔[1]

ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں!

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
پیغام ملا تھا جو حسین ابنِ علیؓ کو — خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا غم ہے جو ہے ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
روزِ ازل سے ہے یہی اِک مقصدِ حیات — جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا
مطلب فرات سے ہے نہ آبِ حیات سے — ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

اب ہم یہاں اس مردِ مجاہد مولانا محمد علی جوہر کا وہ بیان بطور نمونہ درج کرتے ہیں جو انہوں نے کراچی کے مقدمہ میں شہادت کا جواب دیتے ہوئے خالق دینا ہال کراچی میں منعقد عدالت کے سامنے دیا تھا۔

عدالت میں مولانا محمد علی کا بیان

---

[1] از قولِ حق، مطبوعہ ہمدرد دہلی ۲۶ دسمبر ۱۹۲۸ء۔

انہوں نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

ایک تارکِ موالات کی حیثیت سے میں نے عدالت کی کارروائی میں اس کے سوا اور کوئی حصہ نہیں لیا کہ جس صورت میں یہ مقدمہ ہر روز پیش ہوتا رہا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ استغاثے کی طرف سے جو شہادتیں ہمارے خلاف گزری ہیں۔ میں نے ان پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور نہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آیا جو شہادتیں ہمارے خلاف پیش کی جا رہی ہیں۔ وہ واقعی مقدمہ سے تعلق رکھتی بھی ہیں یا نہیں اور یہ کہ عدالت ان کو سننے کی مجاز بھی ہے یا نہیں۔ اور پھر آپ کا اپنا جو شہادت کا قانون ہے، اس کی رو سے جو کارروائی ہوتی رہی، اور جب سرکاری وکیل گواہوں سے اپنی حسب مرضی بیان نہ لے سکا اور اس کے لیے اس نے گواہوں پر مزید سوالات کیے، تو میں نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ترکِ موالات پر عامل ہونے کی حیثیت سے اپنے خلاف کسی عدالتی کارروائی میں جو تھوڑا بہت حصہ لینا ہم اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں، وہ صرف اسی حد تک ہے کہ اصل معاملہ جو زیرِ سماعت ہو۔ اس کے بارے میں عدالت میں ایک بیان پیش کر دیں۔ اور وہ بھی اپنی صفائی کی غرض سے نہیں بلکہ محض زیرِ بحث واقعات کی تشریح کے خیال سے۔ تاکہ جو شخص ان واقعات سے پوری طرح واقف نہیں وہ کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جائے۔ لیکن جہاں تک اس مقدمے کا تعلق ہے، مجھے اپنا بیان دینے کی صرف اس لیے ضرورت پڑی کہ عدالت کو بعض بے ضرورت گواہوں کو بلانے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ بے ضرورت اس لیے کہ ان گواہوں کو ایک واضح بات ثابت کرنے کے لیے طلب کیا جا رہا ہے اور ڈر یہ ہے کہ ان کی کوششوں کا نتیجہ کہیں یہ نہ ہو کہ ایک بات جو واضح تھی، ان گواہوں کی وجہ سے غیر واضح ہو جائے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنے بیان سے ان بے ضرورت گواہوں کی کوششوں کا جن سے اکثر جرم پر پردہ پڑنے کا امکان ہوتا ہے، نعم البدل پیش کر دوں۔

میں اور میرا بھائی اور میرے ساتھی بے شک کراچی آئے۔ میں واقعتہً کنیا پاٹ شالے میں ٹھہرا۔ میرے ساتھ بارہ شخص اور تھے۔ پاٹ شالے کے زمانۂ قیام میں ہزار ہا آدمی وہاں

آتے جاتے تھے۔ زیادہ تر لوگ دن کو آتے اور بعض دفعہ آنے والے رات کو بھی آجاتے تھے مجھے اور میرے بھائی کو اس سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ پاٹ شالے میں ہمارے اس قیام کو اور ہمارے پاس لوگوں کے اس طرح آنے جانے کو آپ کانفرنس سے تعبیر کرنا چاہیں تو کر لیجئے۔ پاٹ شالہ جیل خانہ تو تھا نہیں۔ اس لیے میں وہاں سے باہر بھی آتا جاتا تھا۔ بعض دفعہ میرے بھائی میرے ساتھ ہوتے۔ اور اکثر میں تنہا ہی ہوتا اور کبھی میرے دوست ڈاکٹر کچلو، جو بظاہر ہر وقت اپنے صوبے اور مقامی معاملات کو طے کرنے میں مشغول رہتے تھے، اپنی ایک جماعت کے ساتھ میرے ہمراہ ہو لیتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کبھی ڈیڑھ بجے رات کو واپس نہیں آیا، جیسا کہ ایک غریب گواہ کا بیان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بے چارے نے یہ محض اس لیے کہا ہو کہ وہ پاٹ شالے کی نگرانی پر بارہ بجے شب سے متعین تھا۔ اور اسے میرے خلاف یہ ثابت کرنا تھا کہ میں آدھی رات کے وقت اپنے بھائی کے ساتھ جبکہ وہ نیند میں خراٹے بھر رہے ہوتے تھے اور میں بھی اس معاملہ میں ان کا ہم نوا ہوتا تھا سازش کرتا تھا۔ آپ یقین کریں ہمارا مقصد دفعہ ۱۲۰ ب توڑنے کا نہیں تھا۔ ہم نے جو بھی سازش کی ہے، وہ روزِ روشن کی طرح ہر شخص پر عیاں ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ خلافت کانفرنس کراچی کی میں نے صدارت کی اور وہ قرارداد جس میں ترکی کی انقرہ حکومت کے خلاف برطانیہ کی طرف سے عداوت پیدا ہونے کے اندیشہ کا اظہار کیا گیا تھا اس کانفرنس میں پیش ہوئی۔ اور اسی مضمون کی ایک قرارداد بلگام کی ڈسٹرکٹ خلافت کانفرنس میں بھی پیش ہو چکی ہے مجھے اقرار ہے۔ کہ اس قرارداد کو میں نے پڑھ کر سنایا۔ اور میں نے ہی ان صاحب کی تجویز کو جن کو میں اپنا آقا، سردار اور بزرگ کہنا اپنے لیے فخر سمجھتا ہوں کانفرنس کے سامنے پیش کیا تھا۔

یہ بزرگ مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدنی ہیں۔ میں نے اس قرارداد کو سناتے وقت بیچ بیچ میں کچھ کلمے بھی کہے تھے اور میں نے باآواز بلند حاضرین سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ کون کون اس تجویز کی تائید کرتے ہیں۔ اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو لوگ سچے دل سے اس قرارداد کی تائید کرتے ہیں، وہ کھڑے ہو جائیں اور اس کا اقرار کریں، لیکن یہ بات بالکل

غلط ہے، اور ہر گواہ نے جھوٹ بولا ہے کہ صرف اسی قرارداد پر لوگوں کو کھڑا ہونے کو کہا گیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام قراردادیں جن کا اعلان اخبارات میں ہوا ہے، سب کی سب اسی طرح حاضرین سے منظور کروائی گئی تھیں۔ معلوم نہیں گواہوں نے یہ بے فائدہ جھوٹ کیوں بولا۔ یوں عمداً جھوٹ گھڑنا اور اس پر حکومت کا انصاف شاہانہ کا دعویٰ۔ اس گھڑی ہوئی شہادت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا مقصد یہ ہے کہ جان بوجھ کر ایسی غلط فہمیاں پیدا کرے اور اس قسم کی قرارداد کی اشاعت کرکے خود اپنی فوج پر اس کا برا اثر ڈالے۔ تاکہ اس طرح وہ میرے خلاف مقدمہ دائر کر سکے۔ اس سے پہلے کئی بار اس طرح کی کوششیں میرے خلاف وائسرائے کو ورغلانے کے سلسلہ میں کی جا چکی ہیں۔ جس سے کہ غرض مجھ پر مقدمہ چلانے کے لیے زمین کو ہموار کرنا تھا۔

ہر شخص جانتا ہے اور اس بارے میں میں کچھ زیادہ کہنا بھی نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں اسلام کو حکومت نے کھلم کھلا چیلنج دیا ہے اور اب اسلام مجبور ہے کہ اپنی حفاظت کے لیے جو کچھ وہ کر سکتا ہے کرے۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ گوگا اور کراچی خلافت کانفرنس میں مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ اسلام کے محافظین اور مسلمانوں کے خلیفہ کے خلاف جن کو تباہ کرنے میں برطانیہ نے گذشتہ جنگ عظیم میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اب پھر علانیہ دشمنی کا سامان کیا جا رہا ہے۔ اور ان سے لڑنے اور ان کو برباد کرنے کے لیے برطانیہ نے بڑی چالاکی سے ایک تیسری طاقت یعنی یونان کو کھڑا کر دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان حکومت کو وقتاً فوقتاً صاف صاف اس صورتحال سے متنبہ کر چکے ہیں۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اس لیے ہندوستان میں بدامنی کا اندیشہ ہے۔

اس حکومت سے اپنے مذہبی فرائض اور خلافت کے تحفظ کے سلسلہ میں شکایت کرنا بے فائدہ ہے۔ مسلمان پریشان تھے اور بے صبر۔ ہم نے یہ کیا کہ اس پریشانی اور بے صبری میں تمام مسلمانوں کو خدا کی مدد پر بھروسہ کرنے کو کہا اور حکومت کے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ ہم نے حکومت کو متنبہ کر دیا ہے کہ اگر وہ اپنی اس اسلام دشمن پالیسی سے باز نہیں آئے گی تو اول تو ہم کانگرس کے تحت سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں گے، اور دوسرے

آئندہ دسمبر میں کانگرس کے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر ہندوستان کی آزادی اور جمہوریت کا اعلان کر دیں گے۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن سے واقعی حکومت سے علانیہ دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اب ان باتوں کو ہم کھلم کھلا کہیں، یا خفیہ براہ راست برطانیہ کو سنائیں یا جس طرح برطانیہ یونان کے ذریعہ ترکوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ ہم بھی کسی واسطے سے کام لیں۔ آج ملک کا ہر اخبار خواہ وہ موالاتی ہو یا غیر موالاتی، ہندوستان کی مجوزہ جمہوریت پر بحث کر رہا ہے۔ البتہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ ان میں سے کسی نے ہندوستانی فوج کے متعلق کوئی اس طرح کی بات لکھی ہے۔ جس کا ذکر کانفرنس کی قرارداد میں تھا اور جن کو کہ آج بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔

ہر شخص کو معلوم ہے کہ کئی ماہ ہوئے ہندوستان کے بڑے بڑے علمائے اسلام نے ترک موالات کی مذہبی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے صاف طور پر اعلان کر دیا تھا کہ حکومت کی قانون ساز کونسلوں میں شرکت کرنا، اس کی عدالتوں میں وکالت کرنا، سرکاری مدرسوں میں تعلیم پانا، حکومت کے خطابات حاصل کرنا، اس کی نوکری کرنا، خواہ وہ فوجی ہو یا سول سب ناجائز ہیں۔ علماء کے اس فتوے کے بعد اگر ہم نے کراچی کانفرنس میں خطاب پانے والوں کو ڈانٹا جنہوں نے کہ اپنی عزت بیچ کر خطابات خریدے ہیں تو ہمارے خلاف یہ الزام کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ہم نے خطاب یافتوں کے خلاف سازش کی۔ میں یہاں خطاب یافتوں کے بارے میں اس سلسلہ میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتا۔

اس مقدمے کے دوران میں حکومت کی طرف سے وفادار ہندوستانی سپاہیوں کو داد دینے میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں کی گئی۔ ایک لامذہب حکومت کا اس طرح داد وفاداری دینا مجھ جیسے مذہبی آدمی کو متاثر کیے بغیر نہیں رہا۔ اگر یہ داد واقعی سچی تھی، تو میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ہماری انتہائی بدنصیبی ہے اور یہ نتیجہ ہے ہماری بدکرداریوں اور اپنے غریب فوجی بھائیوں کی طرف سے ہماری غفلت کا جس کا خمیازہ ہم اس وقت بھگت رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ہم اس آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔ یہ تو جو ہونا تھا ہوا، آئندہ ہم اپنے غلط زدہ بھائیوں سے غفلت نہیں برت سکتے۔ اس سلسلہ میں میں نے کانفرنس میں جو کچھ کہا اس وقت

تک میں ان اشتہارات سے بالکل ناواقف تھا جو مسلمان فوجیوں اور افسروں کے نام جیسا کہ ہمیں یہاں بتایا گیا ہے بھیجے گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ علماء کی جماعت نے ایک عرصہ کی غفلت کے بعد احکامِ خداوندی کو ہندوستانی فوج میں پہنچانا شروع کر دیا ہے۔ میں یہاں اس غلطی کی اصلاح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ جمعیت العلمائے ہندوستانی فوجوں میں ان اشتہارات کو پہنچانے کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ فوجوں میں اس قسم کے اشتہارات بھیجنے کا یہ طریقہ عنقریب واقعی صورت اختیار کرکے رہے گا۔

میں یہاں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ۱۸۵۸ء میں غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے پہلی مرتبہ جب اس ملک کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی تو لوگوں کے غصے کو ٹھنڈا کرنے اور عوام کو مطمئن کرنے کے لیے ایک اعلان کیا گیا تھا۔ اس اعلان کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ بیان کرنے کے قابل ہے۔ برطانوی فرمانرواؤں کے شاہی خطابات میں سے ایک خطاب محافظِ مذہب کا بھی ہے۔ اس زمانے میں برطانیہ کے جو وزیر اعظم تھے شاید وہ ایسے ہی تھے جیسے کہ موجودہ وزیر اعظم ہیں۔ ان کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس مشہور و معروف اور حیرت انگیز خطاب کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں "تمام مذاہب کے محافظ" ہو سکتا ہے۔ لیکن اس موقعہ پر ایک برطانوی مدبر نے بتایا کہ محافظ مذاہب کا یہ خطاب ہندوستانی ذہن اور ہندوستانیوں کے خیالات کے لیے کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے قومی و ملکی دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی۔ اس وقت لارڈ ڈربی پر زور دیا گیا تھا کہ اس خطاب ہی کو ترک کر دیا جائے لیکن جب ملکہ سے مشورہ لیا گیا تو ملکہ نے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس خطاب شاہی کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن اعلان کے پہلے ہی فقرے میں ملکہ کی طرف سے مذہبی آزادی کے سلسلہ میں ان مراعات کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو اس اعلان میں موجود ہیں۔ اعلان میں ہے کہ ملکہ معظمہ ارشاد فرماتی ہیں کہ خدا کی مہربانی اور برکت سے ہم اپنے مذہب کے احکام کو وفادارانہ پورا کریں گے۔ نیز یہ کہ اپنے عیسائی مذہب پر سچائی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اور اپنے مذہب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم اپنی رعایا پر ان کے عقائد کے متعلق کسی قسم کی سختی یا پابندی

نظہارِ خیال کرتے ہیں۔

مذہب کی آزادی کے بارے میں ملکہ کا یہ اعلان اور اس کے باوجود استغاثے کی طرف سے گذشتہ دو روز سے برابر اس امر کی کوشش کہ دوسروں پر مذہب کے ایسے عقائد اور ایسی پابندیاں عاید کی جائیں جو معلوم نہیں کس مذہب کی ہیں۔ لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ یہ عقائد اور یہ پابندیاں مسلمانوں کے مذہب کی تو ہرگز نہیں ہیں۔

ملکہ نے اپنے اعلان میں یہ کہا تھا کہ کسی شخص کو مذہب کے معاملے میں مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ کسی مذہب میں مداخلت کی جائے گی۔ ہر شخص قانون کی نظر میں برابر ہو گا۔ اور اس کی حفاظت میں امن کے ساتھ رہنے کا مستحق ہو گا۔ نیز اعلان میں یہ کہا گیا تھا کہ جو لوگ ہماری طرف سے ملکی انتظامات کے ذمہ دار ہیں۔ ہم ان کو سختی سے تاکید کرتے ہیں کہ وہ کسی کے مذہبی اعتقادات اور اس کی مذہبی عبادات میں مداخلت نہ کریں۔ ورنہ ہم ان سے سخت ناراض ہوں گے۔

اس اعلان میں ملکہ کے جن انتظام کرنے والوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں کا پہلا ذمہ دار شخص گورنر جنرل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کے اتفاق رائے سے ستائے گئے ہیں۔ اور ہم کو ہمارے مذہبی عقاید ہی کی وجہ سے اس مقدمے میں گھسیٹا گیا ہے۔ دوسرے الزامات جن کی اس ضمن میں ہمارے خلاف تراشنے کی تلاش ہو رہی ہے۔ وہ تعزیرات ہند میں سے بہت سے نکل سکتے ہیں۔ ملکہ کے اس تاریخی اعلان کا آخری فقرہ خود ملکہ کا اپنا تجویز کردہ ہے، اس میں ملکہ نے ہندوستانیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے، تمہاری خوشحالی سے ہماری قوت ہے تمہاری خوشحالی ہمارے استحکام کی دلیل ہے۔ تمہاری خوشی ہی ہمارے لیے سب سے بڑا انعام ہے۔ خدا ہماری طاقت کو تمہارے لیے اور نیز ان کے لیے جو ہماری طرف سے تم پر حکومت کر رہے ہیں۔ خیر و برکت کا باعث بنائے۔ ہماری عین خوشی ہے کہ ہماری رعایا خوش رہے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے استحکام کے لیے ملکہ کے اس اعلان کو اتنا اہم سمجھا گیا تھا کہ اس کے پچاس سال بعد ملکہ کے بیٹے اور جانشین ایڈورڈ ہفتم کی طرف سے

اسی مضمون کا ایک اور اعلان کیا گیا۔ جس میں بتایا گیا کہ اب ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے۔ اور اس اعلان اور ملکہ کے مشہور اعلان کے درمیان نصف صدی کا جو عرصہ گزرا تھا، اس اعلان میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہم نے گذشتہ صدی کے اپنے کاموں اور تجربوں پر غور کیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس عرصہ میں ہماری رعایا میں سے کسی شخص نے بھی اپنے مذہب عقیدے اور عبادت کی وجہ سے تکلیف نہیں اٹھائی اور ہر شخص قانون کی حفاظت میں امن سے زندگی بسر کرتا رہا اور قانون پر بغیر اس کے کہ کسی کے مذہب عقیدے اور تمدن میں دخل اندازی ہوتی برابر عمل درآمد ہوتا رہا۔ اسی طرح جب موجودہ برطانوی فرمانروا تختِ شاہی پر بیٹھے تو انہوں نے ہندوستان کے راجے نوابوں اور ہندوستانی رعایا کے نام ایک پیغام دیا تھا جس میں گذشتہ دو شاہی اعلانوں میں مذہب کی آزادی کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا۔

بحیثیت ایک مسلمان کے فرض کرو اگر میں غلطی کروں اور راہِ راست سے ہٹ جاؤں تو میری غلطی کی اصلاح کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مجھ کو قرآن احادیث نبوی کا کوئی فیصلہ اور گذشتہ و موجودہ اکابرِ اسلام جن کی زندگی قرآن و حدیث کے مطابق رہی ہو۔ ان کا کوئی مسلمہ فتویٰ دکھایا جائے لیکن اس قرارداد کے متعلق جو خلافت کانفرنس کراچی میں میں نے پیش کی تھی، مجھے پورا یقین ہے کہ میں غلطی پر نہیں ہوں۔ کیونکہ تمام معتبر مذہبی پیشوا اس مقدمے کو جو مذکورہ قرارداد کو پیش کرنے کی وجہ سے مجھ پر حکومت کی طرف سے جو شیطان کہلانا پسند نہیں کرتی متعلقات سے دیکھتے ہیں۔

جب خدا کی طرف سے کسی فعل سے غفلت کرنا گناہِ عظیم ہو، اور ملکی قانون کی رو سے اس فعل سے غفلت نہ کرنا جرم سمجھا جائے تو اس صورت میں میں ایسے ملک میں کیسے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یا تو میں خدا کا گنہگار ہوں گا۔ اور یا حکومتِ وقت کا مجرم۔ اسلام میں صرف ایک ہی حقیقی بادشاہ ہے۔ اسی کی طاقت تمام پر حاوی ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ قرآن مجید کے بارہویں پارے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر ہے۔ جب وہ قید خانے بھیجے گئے تو انہوں نے اپنے ساتھی قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اے میرے قید خانے کے رفیقو! کیا جدا جدا خدا بہتر ہیں یا وہ ایک زبردست قادرِ مطلق۔ تم سوائے اس وحدہٗ لاشریک کے کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ . . . . . روئے زمین پر سوائے ایک خدا کے کسی کی حکومت نہیں ہے اور اسی کا یہ حکم ہے کہ اس کے سوا تم کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرو، اور یہی سچا مذہب ہے۔" حضرت یوسف نے اپنے رفیقوں کو جو کہا تھا، میرا خیال ہے کہ یہ بات اس زمانے سے زیادہ آج کے اس زمانے میں صادق آتی ہے۔ جبکہ ایک غریب صوبیدار میجر کو اس کا کمانڈنگ افسر یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے اس فرض سے جو خدا کی طرف سے اس پر عاید ہوتا ہے۔ اس سے غفلت کرے۔

خدا کی یہ بادشاہت وقتاً فوقتاً پیغمبروں کے ذریعہ مختلف قبیلوں اور قوموں کو ملتی رہی ہے۔ اور جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس دنیا سے، بحیثیت ایک نبی آخر الزمان کے رحلت فرمائی۔ اور وہ خدا کا آخری پیغام تمام بنی آدم کو پہنچا چکے تو ان کی جگہ خلفائے اسلام ان کے جانشین ہوئے جن کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانشینی کا یہ سلسلہ آج کے دن تک قائم رہا۔ مسلمانوں کے موجودہ امیر المومنین اہل سنت کی رو سے سلطان ترکی ہیں۔ ہر ایک مسلمان خواہ وہ فوجی ہو یا غیر فوجی، خواہ اسلامی حکومت میں ہو یا غیر اسلامی حکومت میں امیر المومنینؓ کا فرمانبردار ہے۔ قرآن مجید کا صاف اور صریح حکم ہے کہ "اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور ان کی جو تم میں سے تمہارے اوپر حاکم ہوں۔" اور آخر الذکر سے مراد یہاں امیر المومنین ہے۔ لیکن یہ اطاعت مشروط ہے۔ خدا اور رسول کی اطاعت سے جیسے کہ قرآن مجید سے صاف ظاہر ہے۔

اسلام کا اصل الاصول کلمۂ وحدانیت یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ محمد رسول اللہ ہے۔ وحدانیت کا یہ اصول کسی ریاضی داں کا بنایا ہوا ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے کسی مشکل پسند نے کسی دوسرے مشکل پسند کے لیے بنایا ہو۔ یہ ہر مسلمان کا ایک روز مرہ کا عام اعتقاد ہے۔ خواہ وہ مسلمان پڑھا ہوا ہو یا اَن پڑھ۔ ایک روز حضرت عمرؓ نے جو اسلام کے سب سے بڑے فاتح اور خلیفہ راشد تھے، اہل مجلس سے پوچھا کہ اگر میں تم کو کسی ایسے کام کا حکم دوں جو قرآن اور حدیث کے خلاف ہو تو تم کیا کرو گے؟ اس کا جواب حضرت علیؓ نے اسی مناسب

طریقے سے دیا جو ایک مسلمان کو دینا چاہیئے تھا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے جن کے ہاتھ پر وہ بیعت کر چکے تھے کہا کہ اگر آپ احکام الٰہی کے خلاف ہم سے کوئی کام کرانا چاہیں تو میں بلا تامل آپ کی گردن اڑا دوں گا۔ میرے خیال میں اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ ہندوستان میں نہیں بلکہ خاص انگلستان میں ہو چکا ہے۔ جب کہ انگلستان کے ایک بادشاہ کا سر اس بناء پر کاٹ دیا گیا تھا کہ وہ اس امر پر زور دیتا تھا کہ اس کا حق بادشاہی اللہ کی طرف سے ہے۔

مسلمان اس سے پیشتر بھی غیر مسلم حکومتوں کے ماتحت امن اور چین سے بستے رہے ہیں۔ لیکن اسلامی شریعت کبھی بدلی نہیں۔ مسلمان حکومت کے صرف انہیں قوانین اور احکام کی پابندی کر سکتے ہیں، جن سے خدا اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ یہ شرط صرف غیر مسلم حکومتوں کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ خود خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی بھی کسی مسلمان کو احکام خداوندی کے خلاف اطاعت پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں میں یہاں چند اصول احادیث نبویؐ سے پیش کرتا ہوں[1]۔

ایک مسلمان کسی حکم کو سن کر یہ عذر کر سکتا ہے کہ وہ حکم اس کے لیے قابل تسلیم ہے یا نہیں۔ اور اگر یہ حکم خلاف شریعت ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ اس حکم کو تسلیم نہ کرے۔ بلکہ اسے سنے ہی نہیں۔ اس صورت میں مسلمان کے لیے احکام خداوندی کے خلاف کسی حکم کا ماننا لازم نہیں آتا۔ البتہ حق کی اطاعت لازم ہے۔ یہی اصول ایک دوسری حدیث میں ان الفاظ میں کہ کسی مخلوق کی اطاعت احکام خداوندی کے خلاف واجب نہیں ہے پیش کیا گیا ہے۔

خلافت اور اسلام کے خلاف برطانوی وزیر اعظم (لائڈ جارج) کی حکومت نے جو

---

[1] یہاں پر مولانا محمد علی کو مجسٹریٹ نے ٹوکا اور کہا کہ آپ نے بہت دیر لگا دی۔ آخر آپ کب تک تقریر کریں گے۔ مولانا نے فرمایا تقریباً دو گھنٹے مجسٹریٹ نے کہا کہ یہ وقت بہت زیادہ ہے۔ مولانا نے فرمایا سزائے جلاوطنی اور حبس دوام کے مقابلے میں یہ وقت کچھ بھی زیادہ نہیں ہے۔

روش اختیار کی اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بے چین کر دیا تھا۔ اس روش سے آگے چل کر جو خطرناک نتائج نکل سکتے تھے، ان کے بارے میں ہندوستان کے وفد نے جس کے صدر ہونے کی عزت مجھے حاصل تھی تحریری اور زبانی خود انگلستان جا کر برطانوی حکومت کو آگاہ کر دیا تھا۔ اب ہمارے سامنے دو فرض ہیں، ایک خدا کا اور دوسرا حکومت کے قانون کا۔ جب احکام خداوندی کا تصادم شاہی احکام سے ہو گا تو اس صورت میں ہم صرف خدا کے احکام کی پابندی کریں گے۔[1]

---

[1] یہ مولانا محمد علی کی تقریر کا ایک طویل اقتباس ہے۔ (ا۔ گ)

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(علامہ اقبالؒ)

(۵)

تحریک پاکستان

۱۹۲۱ء تا ۱۹۴۷ء

پس منظر

۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد برصغیر کے مسلمانوں پر مایوسی اور قنوطیت کے دور کا آغاز ہوا۔ گویا ان کا ہدف ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور جس منزل کی طرف انہوں نے سفر شروع کیا تھا۔ وہ منزل آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ مسلمان اپنے ملک میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ناکامی کے بعد عالم اسلام کی ترقی اور خوشحالی کے لیے اب صرف اسلامی خلافت کے استحکام پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ جمال الدین افغانی کی تحریک پان اسلام ازم اور عالمی اسلامی اتحاد میں بھی انہوں نے دلچسپی محسوس کی تھی لیکن اب کسی عالمی اسلامی تحریک سے ہم آہنگی میں ان کی غلامی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

انہوں نے مسلمانوں کو اپنے موجودہ حالات کے اندر بحال کرنے کے لیے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کی سرپرستی کی اور انہوں نے مسلمانوں میں دینی تعلیم کو تازہ دائم رکھنے کے لیے دیوبند کی دینی علمی تحریک کی بھی حمایت کی۔ لیکن وہ سیاسی تحریک جو ان کے دین کے تشخص کو ریاستی سطح پر بحال کر سکے۔ ان کے دینی قوانین کے نفاذ کے لیے طاقت فراہم کر سکے۔ اس کے امکانات سے ان کے تصورات معدوم سے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے ماحول میں عوامی سطح پر کام کرنے والی جماعت انڈین نیشنل کانگریس تھی لیکن اس پر ہندو رنگ کا بے حد غلبہ تھا اور مسلم لیگ نوابوں، مہاراجوں اور جاگیرداروں کی مجلس مباحثہ تھی جسے مسلمان عوام سے کوئی براہ راست

تعلق نہ تھا۔ اور مسلمان عوام بھی اس سے کچھ زیادہ امیدیں نہ رکھتے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کا وہ زمانہ ایک سیاسی خلاء کا سا دور تھا۔

ہندوستان کے اندر سیکولر مغربی جمہوریت کے نفاذ کا راستہ انگریز اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں مل کر ہموار کر رہے تھے۔ انگریز اس لیے مجبور کر رہا تھا کہ اس کے پاس اس کے سوا دوسرا کوئی طرز حکومت موجود نہ تھا۔ جسے وہ ہندوستان کی آزادی کا نام دے سکے یا جس سے یہاں کے باشندوں کے ساتھ سیاسی انصاف ہو سکے۔ انڈین نیشنل کانگریس اس لیے اس راستے پر چل رہی تھی کہ مغربی جمہوریت کے نفاذ کے ذریعے ہندو کی مستقل اکثریت کے باعث ہندو کے مستقل غلبے اور دوسرے باشندوں کی مستقل غلامی کی ضمانت اس جمہوریت کے ناقص نظام میں موجود تھی۔ اس نام نہاد جمہوری نظام کی ایسی غیر منصفانہ ضمانت کے سبب ہی گاندھی نے یہ بات کھل کر کہہ دی تھی کہ اس جدوجہد میں مسلمان ہمارا ساتھ دیں یا نہ دیں ہم بہرحال اسی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ مسلمان اس لیے سیکولر مغربی جمہوریت کو ہو بہو قبول کرنے میں مذبذب تھے کہ اس کے ذریعے ان کی جدوجہد کا نتیجہ ان کے لیے آزادی نہیں بلکہ مستقل ہندو کی غلامی میں نکلنے والا تھا۔ اس بات کو علامہ اقبال بھی سمجھتے تھے، قائداعظم محمد علی جناحؒ بھی سمجھ گئے تھے اور ہر صاحب بصیرت آدمی سمجھتا تھا کہ انگریزوں سے آزادی کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کا راستہ صرف ہندو کی آزادی کا راستہ ہموار کرتا تھا۔ اس سیکولر جمہوریت میں مسلمان کی قسمت میں غلامی ہی لکھی تھی۔ چنانچہ برصغیر کے مسلمان ہندوستان میں اس سیکولر جمہوریت کی طرف جانے سے گریزاں تھے۔ تحریک خلافت ناکام ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ نوابوں اور نواب زادوں کی پارٹی تھی۔ علامہ اقبال مسلم فلسفی اور نظریاتی اسلامی مفکر تھے لیکن عملی سیاستدان نہ تھے۔ محمد علی جناح کانگریس کی مسلم دشمنی مسلمانوں کے انتشار اور مسلم لیگ کی غیر فعالیت سے مایوس ہو کر لندن میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔

یہ وقت تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو قنوطیت، مایوسی اور بے مقصدیت سے نکالنے کیلئے علماء کرام میدان میں تشریف لائے۔ ان پر قوم کو ہمیشہ اعتماد رہا تھا۔ مسلمانوں کی قیادت ہمیشہ دینی رہنماؤں کے ہاتھ میں رہتی تھی اور مسلمانوں کا ضمیر ان کی قیادت میں ہمیشہ اطمینان محسوس کرتا تھا۔

کہ وہ اپنے دین کے راستے سے دور کبھی نہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے اکبر اور جہانگیر کی بے دینی کے خلاف تحریک تجدید و احیائے دین چلائی تھی تو مسلمان عوام نے ان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لیے تحریکِ جہاد و مجاہدین چلائی تو مسلمان عوام نے بڑھ چڑھ کر دامے درمے قدمے سخنے علماء کرام کا ساتھ دیا۔ انہوں نے تحریک آزادی ہند میں آگے بڑھ کر حصہ لیا تو مسلمان عوام نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے ترکی کی خلافت کی بحالی کے لیے برصغیر میں تحریک خلافت چلائی تو مسلمان عوام نے ان کا ساتھ دیا لیکن جب مسلمان عوام کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ آزاد ہندوستان میں لادینی خوابی جمہوریت کے تحت سب کے سب ہندو کے مستقل غلام بن کر رہیں یا کچھ مسلمانوں کو حق خود ارادیت کے نام پر اکثریتی آبادی کے علاقے میں ہندو کی غلامی سے بچا لیا جائے تو علماء نے رہنمائی دینے سے انکار کر دیا اور جو رہنمائی دی وہ مسلمانوں کے ضمیر کو اپیل نہ کرتی تھی۔ یہی رہنمائی گاندھی بھی دے رہا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن تھا۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ جس تدبیر پر ملت کا ضمیر مطمئن نہ ہو اور اس کا اجماع نہ ہو رہا ہو۔ اس تدبیر کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ شاید اس کا سبب علماء کرام کی سیاسی تربیت کی کمی ہو لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ سیاسی میدان میں قابلِ ذکر معروف علماء کرام اور ان کی جمعیت نے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیا جس کی جدوجہد کا نتیجہ ہندو کا مستقل غلبہ اور مسلمانوں کی مستقل مغلوبیت اور غلامی تھی۔ اگرچہ بعض معروف غیر سیاسی علماء کرام اور بعض غیر معروف سیاسی علماء کرام نے مسلمانوں کی آرزوؤں کا ساتھ دینے کے لیے اس وقت مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کا ساتھ دیا لیکن انہیں قیادت کا مقام حاصل نہ ہو سکا اس لیے کہ وہ سیاسی طور پر غیر معروف اور معروف طور پر غیر سیاسی علماء تھے۔

معروف سیاسی علماء کرام کی تدبیر کی یہی غلطی تھی۔ جس نے تاریخ میں پہلی بار مسلمان عوام کو غیر علماء کی قیادت کے پیچھے چلنے پر آمادہ کر دیا۔ اس سے پہلے مسلمان عوام کبھی قرآن و سنت سے بے بہرہ قیادت کے پیچھے نہ چلتے تھے۔ امام حسین اور امام ابو حنیفہ سے لے کر شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کی تحریکوں تک صدیوں مسلمان عوام نے اپنے اجتماعی و انفرادی مسائل میں ہمیشہ علماء کرام کی قیادت پر اعتماد کیا تھا۔ لیکن تاریخ میں پہلی بار مسلم عوام کو مجبور ہو کر غیر علماء اور

قرآن وسنت کے علوم سے بے بہرہ قیادت پر اعتماد کرنا پڑا اس لیے کہ معروف علماء کرام کی قیادت نے مسلم عوام کے ضمیر اور بصیرت کے مخالف روش اپنا کر انہیں مستقبل کے بارے میں گوناگوں خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ برصغیر میں ہندو کے ساتھ متحدہ قومیت کے علمبردار حضرات آج تک مسلمان عوام کو اپنے موقف پر مطمئن نہیں کر سکے اور خود ہندو راہنماؤں اور عوام کے طرز عمل نے بھی اب تک یہی ثابت کیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ متحدہ قومیت کا تصور مسلمانوں کے لیے عقیدے کے اعتبار سے ملت اسلامیہ سے انحراف کے اعتبار سے ایک دھوکا اور فریب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس فریب میں اپنے مصالح کے سبب مبتلا رہ سکتے ہیں لیکن ہندوؤں نے ہزار در ہزار فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی معاشی اور معاشرتی مظالم کر کے اس فریب کا پردہ ہمیشہ چاک کیا ہے کہ مسلم کی کافر کے ساتھ متحدہ قومیت کے تصور کی اسلام اور فطرت انسانی میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔

مسلمانوں کا حقیقی مسئلہ

مسلمانوں کا حقیقی مسئلہ وطن کی آزادی اور قومی وطن بنانے کے لیے زمین حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ نفاذ اسلام اور ملت کی آزادی تھا۔ افسوس کہ کانگریس سے وابستہ علمائے کرام نے اس فرق کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی۔ جب ملت اسلامیہ نے یہ محسوس کیا کہ الکفر ملت واحدہ کے اصول کے تحت ہندوستان میں انگریز وہی نظام لائیں گے جو وہ جانتے ہیں۔ یعنی سیکولر جمہوریت جس میں بندوں کو گنا جاتا ہے۔ تولا نہیں جاتا تو گنتی کے اعتبار سے مسلمان کے مقابلے میں ہندو تین گنا تھے اس لیے آنے والے نظام آزادی میں ہندو کا مقام مستقل حکم کا مقام تھا اور انگریز نے یہی مقام دینا چاہتا تھا اور مسلمان کا مقام مستقل محکوم اور غلام کا تھا اور انگریز اور ہندو دونوں اسے یہی مقام دینا چاہتے تھے۔ اب یہ مسلمان رہنماؤں کی بصیرت کا امتحان تھا کہ وہ مسلمانوں کو اس گہری کھائی اور گہرے سمندر کے درمیان کی خطرناک پوزیشن سے نکالنے کی صورت نکالیں۔

کانگریس علماء نے کہا کہ اپنے آپ کو ہندو اکثریت کے گہرے سمندر کے حوالے کر دو۔

اس میں تمہارے لیے شاندار مستقبل ہے لیکن مسلمان بہ حیثیت ملت اس پر تیار نہ تھے۔ اس وقت فلسفی اقبال اور سیاستدان محمد علی جناح نے مسلمانوں کی اکثریت کو بچا لینے اور اقلیت کو ہندو کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس لیے کہ پوری ملت کو بچا لے جانے کا کوئی راستہ عملی سیاسیات میں ان کے سامنے نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مضبوط اسلامی پاکستان ہندوستان میں رہ جانیوالے مسلمانوں کا تحفظ بھی کرے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریز کے لیے یہ ممکن نہ رہا تھا کہ وہ مشرق بعید میں اپنے مقبوضات کو حسب سابق رکھ سکے۔ اس لیے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک دوسری جنگ عظیم میں جس قدر مار انگریزی سامراج کو پڑی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ ہندوستان پر اپنے غاصبانہ قبضے سے دست بردار ہو جاتے۔ اس دستبرداری کے لیے اس نے مغرب کی سیکولر جمہوریت کا راستہ اختیار کیا اور ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبوں میں انتخابات کروا کر صوبائی حکومتیں منتخب اسمبلیوں کے حوالے کر دیں۔

بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد کو چھوڑ کر سارے صوبوں پر ہندو قابض ہو گئے۔ اس قبضے کے دوران ہندو حاکمیت کا مکروہ جابرانہ چہرہ مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیا۔ چنانچہ مسلم لیگ کو اپنے لاہور سیشن میں ایک قرارداد کی صورت میں پاکستان کو اپنا نصب العین بنانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ———

اسوقت تک ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اسلامی مملکت قائم کرنے کے تصور کو پیش کیے ہوئے علامہ اقبال کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ آزاد مملکت کا مطالبہ اٹھانے کی تجویز برابر اور مسلسل پیش کرتے رہے تھے۔ وہ اسی کو ہندو مسلم مسئلے کا واحد حل بتاتے تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی ۱۹۳۸ء میں علیحدگی کے تین خاکے پیش کیے تھے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے بھی اسی طرز کی تجاویز پیش کی تھیں۔ بعض دوسرے لوگ بھی اس طرز پر مختلف تجاویز پیش کر چکے تھے اور پاکستان کے سیاسی تصور کو فکری میدان میں کافی تعارف حاصل ہو چکا تھا۔ غرض یہ چرچا مسلمانوں میں عام پھیلا ہوا تھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کا واحد حل اب علیحدہ اسلامی مملکت کے سوا دوسرا اور کوئی

نہیں ہے۔ لیکن پاکستان کا تصور پیش کرنے میں علامہ اقبالؒ کے بعد پھر کسی کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ انہیں کی بات تھی جسے بعد میں مختلف لوگ اپنے ہی دل کی آواز سمجھ کر دہراتے رہے ہیں۔

قائداعظم کوئی مفکر اور فلسفی انسان نہ تھے۔ وہ ایک صاحب تدبیر مدبر اور صاحب فہم و بصیرت سیاستدان تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک مخلص اور عملی سیاستدان تھے۔ بہت بڑے بیرسٹر ہونے کے باوجود وہ ڈرائنگ روموں کی آرام کرسی والی سیاست کے قطعاً قائل نہ تھے بلکہ آرام و راحت اور محض جوڑ توڑ کی سیاست کا سرے سے ان کے ہاں کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ وہ انگریزی ڈپلومیسی کے ماہر تھے۔ وہ پارلیمانی سیاست کی رگ رگ سے آگاہ تھے۔ وہ ہندو کی مکاریوں اور چالبازیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ وہ قوم کے مخلص اور حقیقی بہی خواہ اور وفادار رہنما تھے۔ ان کو اپنی قوم پر اعتماد تھا اور اسی اعتماد کی قوت سے انہوں نے قوم میں اعتماد کی روح پھونک دی تھی۔

ناقابلِ شکست قائد

قائداعظم مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ ان کو نہ خریدا جا سکتا تھا۔ نہ دھوکا دیا جا سکتا تھا۔ نہ ڈرایا جا سکتا تھا اور نہ جھکایا جا سکتا تھا۔ وہ دلیل سے بات کرتے تھے۔ ان کے ٹھنڈے استدلال میں بھی جوش و قوت اور ناقابلِ شکست عزم کی آمیزش ہوتی تھی۔ ان کو مل کر ہر شخص ان کے اخلاص کا قائل ہو جاتا تھا۔ اور ان سے بات کرکے ہر شخص سمجھ لیتا تھا کہ ہندوستان میں مسلم قوم کے مفاد کے لیے یہ شخص لوہے کی لاٹ اور پتھر کی چٹان کی مانند ہے جسے اِدھر سے اُدھر سرکایا نہیں جا سکتا۔ انہیں ایک ہی جنون تھا کہ مسلمان قوم کو انگریز کے بعد نمودار ہونے والے تنگ ظرف اور تنگ ذہن خونخوار۔ برہمنی سیاہ سامراج سے بچایا جائے اور مسلمان قوم کے لیے اس کا ایک آزاد وطن حاصل کیا جائے جس میں وہ اپنی تہذیب و قانون و تصور زندگی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکے۔ اسی بیش بہا اور عظیم الشان نصب العین کے لیے قائداعظم نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

۱۱ مسلمانوں کے لیے علیحدہ ایک آزاد خطۂ زمین کا حصول۔

۱۱ اسلامی مملکت میں اپنی پسماندہ قوم کے لیے اسلام کے حیات بخش تہذیب و تمدن، قانون، تعلیم و تصور زندگی کا اجراء و قیام۔

قائداعظم کے پیشِ نظر یہی مشن تھا جس کے لیے انہوں نے اپنی آخری عمر کو وقف کر دیا تھا انہوں نے پہلے اپنے آپ کو اپنی قوم کی اس ضرورت کے لیے تیار کیا۔ ذہنی، جسمانی، فکری اور مالی طور پر تیاری کی اور پھر اپنے آپ کو اس مشن کی جنگ میں جھونک دیا۔ یہ جنگ صلیبی جنگوں سے زیادہ خوفناک تھی۔ جس کے کئی محاذ تھے۔ اگر قائداعظم جیسے لوہے کے اعصاب کا انسان نہ ہوتا تو وہ اس چومکھی لڑائی میں ہمت ہار جاتا یا گوشہ گیری اختیار کر لیتا۔ لیکن قائداعظمؒ مسلمانوں کے وقت کی ضرورت تھے اور قدرت نے انہیں اس کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ بلاشبہ اس انتخاب میں علامہ اقبال کی چشم بصیرت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

قائداعظم کا سابقہ انگریز کی حکمت عملی سے تھا جس کی تمام تر نظرِ کرم اول روز سے ہندو کی طرف تھی کیونکہ وہ ہندو قوم کو اپنے لیے سود مند اور سازگار سمجھتا تھا۔ جو قوم ہمیشہ بہت زیادہ وفاداری سے انگریز کی اطاعت و خدمت میں مصروف رہی تھی۔ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کی نفسیات بھی کام کرتی تھیں۔ انگریز نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے لی تھی اس لیے وہ مسلمانوں کو اپنا حریف بھی سمجھتا تھا۔ غرض مسلمانوں کو انگریز کے پورے دور میں، مجموعی طور پہ انگریز کی شقاوت قلبی۔ مخالفت۔ دنائت اور کینہ طرزِ عمل کی چکی میں مسلسل پسنا پڑا۔ اس میں بہادر شاہ ظفر کے دور کی تحریکِ آزادی اور بغاوت سے لے کر تحریک مجاہدین تک کی دشمنیاں شامل تھیں۔ یوں بھی برطانوی سامراج کے پنجۂ استبداد میں دنیا میں سب سے زیادہ مسلم ممالک ہی تھے اس لیے وہ مسلمانوں کے ساتھ خصوصی مخاصمت رکھتا تھا اور انہیں قابو اور بے بس رکھنے کے لیے ان پر سیاسی اور معاشی جبر کرتا تھا۔ انگریز کے بعد ہندو قوم تھی جو مکاری، چالبازی، کینہ پن دنائت، سیاسی اور معاشی ظلم و ستم میں انگریز سے بھی آگے تھی اور مسلمان اس کے حقیقی روپ کو حکومت کھو دینے کے بعد اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ جو درحقیقت مسلمانوں کے علیحدہ وجود کی ہی دشمن تھی اور اس کا طریقِ کار مسلمانوں کو بتدریج اپنے اندر جذب کر لینے اور اسلامی ثقافت سے

منحرف کرکے کلیتہً ختم کر دینے کا تھا۔ پھر نادان اور پُرجوش نیشلسٹ مسلمانوں کا بھی ایک گروہ تھا جو جنگِ آزادی اول کے بعد انگریز کے شدید مظالم کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا جس کے اکابر کے ساتھ انگریز کے ظلم وستم نے ایسے ایسے مظالم روا رکھے تھے کہ ان مظالم کے ردعمل کے طور پر وہ عقل وخرد سے ماوراء ہو کر صرف اور محض انگریز دشمنی میں ہی مبتلا ہو گیا تھا اور اس سلسلے میں وہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انگریز کو نکالنے کے لیے بقول ان کے اگر خنزیروں اور کتوں سے بھی تعاون کرنا پڑے تو ان سے بھی تعاون کرنے کو تیار تھا۔ ان کے اس بے شعورانہ طرزِ عمل کو دیکھ کر قائداعظمؒ نے اپنے ایک خطبے میں اپنے ان گم کردہ راہ مسلمان بھائیوں کے بارے میں کہا تھا۔

> "کانگریسی خیال کے مسلمان اس بات کی اشاعت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو غیر مشروط طور پر کانگریس کے حلقے میں آجانا چاہیئے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہے اگر مسلمان اس فریب کا شکار ہوگئے تو سمجھ لیجئے کہ ان کی قومی ہستی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔"

لیکن کانگریس نے تو اپنے نام کے ساتھ "نیشنل" اور "قومی جماعت" کا لیبل لگا کر مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو اپنے دام میں پھانس رکھا تھا اور اسے یہ دھوکا دے رکھا تھا کہ وہ جماعت انگریز کو ہندوستان سے اس لیے نکالنا چاہتی تھی تاکہ سارے ہندوستان کے باشندے مساوات کے اصول پر آزاد زندگی گزار سکیں۔ یہ نادان اور پُرجوش گروہ بھی اکثر اوقات قائداعظمؒ کو کانگریس کا نقاد اور مخالف دیکھ کر غصے اور فتوے سے لے کر گالی گلوچ تک جا پہنچتا تھا۔ پھر جس پلیٹ فارم سے قائداعظم نے جو کھلی لڑائی چھیڑ رکھی تھی اس کی طرف غریب اور مخلص افرادِ ملت اور اسلام کے شیدائی کارکنوں کے سوا دوسرا کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا اور یہ غریب مخلص اور اسلام پسند کارکن اثر و رسوخ اور دولت دنیا دونوں سے محروم تھے۔ صرف اسلام کے لیے مرمٹنے کا جذبۂ والہانہ ہی رکھتے تھے۔ یہ ۳۳۔۳۴ء کا دور تھا۔ اس وقت تک مسلم لیگ ایک لاشۂ بے روح تھی اور قائداعظمؒ نے اس میں جان ڈالنے کیلئے

کام کا آغاز کیا تھا۔ پھر جب شدید محنت کے نتیجے میں مسلم سیاست کا پانسہ قائداعظمؒ کی شب و روز کوششوں سے ذرا لیگ کی طرف جھکتا ہوا محسوس ہوا تو انگریز کے کاسہ لیسوں مفاد پرستوں۔ سوشلسٹ جاگیرداروں۔ نوابوں اور انگریز کے جدی پشتی دیرینہ خادموں اور خطاب یافتوں کا ایک ٹڈی دل اقتدار کی پرچھائیں اس طرف منڈلاتے دیکھ کر قائداعظم کی مسلم لیگ پر ٹوٹ پڑا اور اس کے حقیقی کردار کو کمزور اور داغدار کر دیا۔ اسی چیز کو دیکھ کر قائداعظم نے اپنی آخری عمر میں انتہائی حسرت سے فرمایا تھا کہ میری دونوں جیبوں میں کھوٹے سکے بھرے ہیں۔ یہ بے کردار مفاد پرست لوگوں کی طرف اشارہ تھا۔ ایسے لوگوں کی کردار کی منڈی میں کوئی مانگ نہ تھی اور ان کا واحد مسلک و مذہب مفاد پرستی تھا۔

پھر مسلمان عوام تھے جو اپنی ناخواندگی اور دینی قدروں سے بے خبری کے ساتھ معاشی چکی میں پس رہے تھے۔ شکستہ دل تھے اور ظلم و ستم کا شکار تھے۔ جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

ع دل توڑ گئی اس کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی ڈھونڈ اس کی پریشاں نظری کا

غرض سیکولر جمہوریت کی لڑائی میں قائد تحریک کے ہاتھ میں یہی ایک ہتھیار تھا جسے وہ تدبیر و حکمت سے ہی استعمال کر سکتا تھا۔ تاکہ اس کا بھرم بھی رہے اور اس سے کام بھی لیا جا سکے۔ ایسے لوگوں کو کسی آزمائش میں ڈالنا سخت خطرناک کھیل تھا۔

پاکستان کے حصول کے لیے قائداعظم علامہ اقبال کے منتخب کردہ آدمی تھے۔ بصیرت اقبالؒ نے ان کے ہاتھوں میں مسلمان قوم کی مسیحائی دیکھی تھی۔ مسلمان قوم کو ناقابلِ شکست رہنمائی کی ضرورت تھی۔

علامہ اقبال ایک مردم شناس انسان تھے۔ مفکر تھے۔ فلسفی تھے۔ ان کی نگاہ سالوں سے گزر کر صدیوں پر اور انسانوں کی صورتوں سے گزر کر ان کی سیرتوں تک جاتی تھی۔ انہوں نے ایک بیرسٹر میں مسلمان قوم کا مسیحا تلاش کر لیا تھا۔ وہ شخص جو کانگریس میں بھی ہندو مسلم اتحاد کا حامی تھا۔ اس کی اتحادی کوششوں کے اعتراف کے طور پر کانگریس کا تعمیر کردہ جناح

حال بھی عروس البلاد بمبئی میں موجود تھا۔ انہوں نے کانگریس کو قریب سے دیکھا تھا۔ ہندو کو بھی بہت قریب سے دیکھا تھا اور دونوں کو قریب سے دیکھنے کے بعد اس سیاسی شیوا جی کی آستین میں مسلمانوں کے لیے بچشم خود ایک دشنۂ پنہاں بھی دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بددل اور مایوس ہو کر سیاسیات سے الگ ہو گیا تھا۔ اتنے اعلیٰ مقاصد کے اتنے اونچے دعوے اور اتنے گھناؤنے عزائم اور اتنے سیاہ کردار۔ تاریک چہرے اور خوبصورت لبادے۔ قائداعظم نے کانگریس کے بھیس میں بھی ہندو مہاسبھا کو ہی دیکھا اور گاندھی جیسے انسانیت کے علمبردار کے لبادے میں بھی انہیں مونجے اور ہیڈگیوار کے مکروہ چہرے ہی دکھائی دیئے تھے۔ یہ انڈین نیشنل کانگریس کو پہلا صدمہ تھا جو مسٹر محمد علی جناح کی طرف سے اسے برداشت کرنا پڑا اور قائداعظم کو بھی اپنی سیاسی زندگی کے تجربات میں یہ تلخ ترین تجربہ تھا کہ جن کے ساتھ مل کر برسوں کام کیا تھا وہ مسلمان قوم کے بارے میں ایسے عزائم رکھتے تھے اور ان کے اندرونی چہرے اتنے بھیانک تھے۔ اس صدمے کے بعد ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ خاموشی سے ملک سے باہر چلے جائیں اور یکسوئی کے ساتھ اپنی قوم کے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کریں اور حالات سے نپٹنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔

مفکرِ پاکستان

لیکن لاہور میں بیٹھ کر سارے عالم اسلام پر نظر رکھتے ہوئے غور و فکر کا کام ایک اور شخص بھی کر رہا تھا اور وہ ملت اسلامیہ کے رمز شناس علامہ اقبال تھے۔ جن کی نگاہ پوری قوم کے افراد پر تھی۔ انہوں نے درہ خیبر سے راس کماری تک دیکھا اور کراچی سے آسام تک نظر ڈالی اور انہیں اپنا مطلوبہ ناخدائے ملت لندن میں بیٹھا ہوا نظر آیا جس کے عزم و ارادے اور تدبیر و بصیرت اور اخلاص و جذبے سے وہ خوب اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے اپنے خطوط اور لندن کی ملاقاتوں کے ذریعے اس ناخدائے ملت کو واپس اپنی قوم کی طرف آنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ حالانکہ قائداعظم کا مایوسانہ احساس ان دنوں یہ تھا کہ

"میں نہ ہندوستان کی مدد کر سکتا تھا۔ نہ ہندو کی ذہنیت بدل سکتا

تھا اور نہ مسلمانوں کو ان کی نازک حالت کا یقین دلا سکتا تھا۔ میرے اندر یہ احساسِ بے چارگی اس قدر بڑھا کہ میں لندن میں ہی اقامت گزیں ہو گیا۔"

لیکن یہ اقبال کا دلِ دردمند تھا کہ جس کی کوشش انہیں لندن سے واپس اپنے مسلمان بھائیوں کے درمیان لے آئی اور بالآخر انہیں ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی کا ناخدا بنا دیا۔

۱۹۳۴ء میں قائدِ اعظم لندن سے واپس ہندوستان آ گئے اور اب وہ ہٹو بچو اور زندہ باد کے نعروں کی توقع پر نہیں بلکہ اپنی قوم کو جگانے اور مسلم لیگ کے تنِ مردہ کو زندہ کر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنانے کے لیے آئے تھے۔ تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کی بگڑی بنا سکیں اور انہیں کانگریس اور ہندو کے خوفناک خونیں جبڑوں سے نجات دلا سکیں۔

علامہ نے قائدِ اعظم کے سامنے جو پروگرام رکھا وہ متحدہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کے لیے ایک متحدہ آزاد وطن حاصل کرنے اور اس میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا پروگرام تھا۔ علیحدہ وطن کی دلیل یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان قومیت کی ہر تعریف کی رو سے ہندوستان میں ایک علیحدہ قوم تھے اور ان کی قومیت کی بنیاد ان کا مذہب اسلام تھا۔

دورِ حاضر میں علیحدہ وطن حق خود ارادیت کی دلیل علیحدہ قومیت ہے اور جب تک قومیت کی علیحدگی متعین اور ثابت نہ ہو علیحدہ وطن کے لیے کوئی جواز فراہم نہیں ہوتا۔ دنیا میں قومیں نسل زبان۔ علاقہ۔ قبیلہ۔ رنگ اور کلچر کے اشتراک سے بنتی ہیں۔ مغربی سیاسی تصورات انہیں دلائل سے قوموں کا وجود تسلیم کرتے ہیں اور ہندوستان میں ہندو کی بالاتری کا صرف یہی ایک جواز تھا کہ مغربی طرز کے اس تصورِ قومیت کو جو سیکولرازم پر مبنی ہو اور مغربی جمہوریت کے اس طریق حکومت کو جو سروں کو گن کر اقتدار اکثریتی گروہ کو منتقل کرتا ہو تسلیم کر لیا جائے اور اس کے بعد سارے کا سارا اقتدار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے پاس چلا جائے چونکہ ان کے پاس ایک ناقابلِ تغیر اکثریت تھی جو سیاسی تدابیر پروگرام یا اختلافِ رائے کی بنا پر نہیں بلکہ مذہبی اختلاف کی بنا پر وجود میں آئی ہوئی تھی اور جس کے تحلیل ہونے یا دلیل کے ذریعے

پروگرام کے بدل جانے سے کسی دوسری ہیئت میں ڈھل جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

اس طرح ہندوستان میں مشترکہ اور متحدہ قومیت کی بنا پر ہر قومیت کی آزادی درحقیقت ہندو کے سوا ہر کسی کی غلامی تھی اور غلامی بھی ایسی جو ابدالآباد تک کے لیے تھی جس سے نجات کا کوئی راستہ نہ تھا اور جو ایک ایسی تنگدل اور تنگ ظرف قوم کی غلامی تھی جس کے مقابلے میں موت بھی ایک خوش آئند و خوشتر چیز تھی۔ مسلمانوں کا مالدار اور صاحبِ اثر طبقہ انگریز کا خادم و وفادار تھا اور مسلمانوں کا صاحبِ علم و دیندار طبقہ بیشتر ہندو کانگریس کے ساتھ تھا اور مسلمان قوم چکی کے ان دونوں پاٹوں میں دوہری محرومی اور غلامی سے دوچار تھی۔ اس صورتِ حال میں ۱۹۳۴ء کا سال آیا۔

۱۹۳۴ء کا سال ہندوستانی مسلمانوں کی جدید سیاسی تاریخ میں اس لحاظ سے عہدآفرین سال ہے کہ اسی سال علامہ اقبال کے تقاضے پر قائداعظم محمد علی جناح انگلستان سے واپس ہندوستان تشریف لائے۔

اس وقت تک مسلم لیگ ایک جسدِ بے روح تھی۔ اگر ملک کی فضا میں اسلامی ریاست کا کچھ غلغلہ باقی تھا تو وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور اس کے صدر محترم کی وجہ سے تھا۔ اسی سال قائداعظم محمد علی جناح اپنی خلوتِ انگلستان میں چار سال گزارنے کے بعد ہندوستان میں وارد ہوئے تھے اور مسلم لیگ کی جدید طرز پر تنظیم میں مصروف ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان میں جدید آئین نافذ ہو گیا اور پھر اس آئین کے تحت نئے انتخابات بھی سر پہ آ گئے۔ اب اگر ملک بھر میں مسلمانوں کو منظم نہ کیا جاتا تو ان مساعی کے رائیگاں ہو جانے کا خطرہ تھا جو اکابرینِ ملت سال ہا سال سے مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کے لیے سرانجام دے رہے تھے۔ اس لیے قائداعظم محمد علی جناح نے ملک بھر کا دورہ شروع کر دیا۔ لیکن انہیں اول اول اگر کچھ کامیابی حاصل ہوئی تو وہ صرف انہیں صوبوں تک محدود تھی جن میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اکثریت کے صوبوں کی کیفیت نرالی تھی۔ پنجاب میں سر فضل حسین، آسام میں سر سعد اللہ اور سرحد میں سر عبدالقیوم نے اپنی اپنی علاقائی اور مقامی جماعتیں انتخابی مقاصد کے لیے بنا رکھی تھیں۔ علامہ اقبال قائداعظم

محمد علی جناح کے لیے بلاشبہ پنجاب میں کام کر رہے تھے اور ان کے دست و بازو تھے لیکن اکثریتی مسلمان صوبوں میں مسلم لیگ کا حال بہت پتلا تھا۔ اگر چہ اکثریت والے صوبوں کے کارکن قائداعظم کو بار بار یقین دلاتے تھے کہ ہم لوگ مسلمانوں کے حقوق کے معاملے میں قطعی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ ہمیں اپنے اپنے صوبوں میں انتخابات کا میدان جیتنے کے لیے جو جو تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔ ہمیں ان کی اجازت دی جائے، چاہے مسلم لیگ کے قواعد بظاہر اس کی اجازت نہ دیں لیکن علامہ اقبال جو مسلم لیگ کے لیے ذہنی رہنمائی کا کام کر رہے تھے اور عملی طور پر بھی صوبہ مسلم لیگ پنجاب کے صدر تھے۔ اس بات پر بضد تھے کہ مسلمانوں کا ایک ہی آل انڈیا سیاسی پلیٹ فارم ہونا چاہیئے اور وہ مسلم لیگ کے بغیر دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وفاداریوں کو تقسیم کرنے کے وہ قائل نہ تھے۔ یہی مضبوط موقف قائداعظم محمد علی جناح کا بھی تھا لیکن ان کی عملی مجبوریاں بھی تھیں۔ چنانچہ انہیں مجبوریوں کے سبب قائداعظم محمد علی جناح نے پنجاب میں میاں فضل حسین کو مسلم لیگ صوبائی پارلیمنٹری بورڈ بنانے کی دعوت دی۔ لیکن چونکہ میاں صاحب ایک غیر فرقہ وار یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ جس میں ہندو، مسلم، سکھ سب زمیندار شامل تھے اور انہیں اس پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا تھا، لہٰذا میاں صاحب نے قائداعظم کی پیشکش مسترد کر دی۔ قائداعظم نے یہ کام علامہ اقبال کے سپرد کیا جو اس زمانے میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنی علالت کے باوجود لبیک کہی۔ چنانچہ ۲۰ مئی ۱۹۳۶ء کو پنجاب لیگ کونسل کا جلسہ طلب کیا گیا جس میں علامہ دوبارہ صدر اور خان غلام رسول خاں بیرسٹر جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں پنجاب کے دیہات اور ان کے زمیندار یونینسٹ پارٹی کے قبضے میں تھے اور شہری مسلمان مجلس احرار اور مجلسِ اتحادِ ملت کے جلسوں کی زینت ہوا کرتے تھے۔ مسلم لیگ زیادہ تر کس مپرسی کے عالم میں تھی اور سارے جاگیردار اور وڈیرے یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تھے۔

جدوجہد

علامہ اقبالؒ اب ضعف اور علالت کے باعث تقریباً مستقل طور پر صاحب فراش ہو

چکے تھے۔ بینائی روز بروز جواب دے رہی تھی۔ لیکن وہ دن رات پیش نظر مقاصد کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نام علامہ کے جو خطوط بہت مشہور ہیں، اسی زمانے میں لکھے گئے تھے۔ وہ جہاں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے لیے شبانہ روز محنت کرتے تھے، وہاں لیگ کو بھی عوامی جماعت بننے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو انہوں نے قائداعظم کو لکھا:

"لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ آیا وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ جماعت بن کر رہے گی یا ایسے عام مسلمانوں کی جماعت بنے گی جنہوں نے ابھی تک معقول وجہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ شخصی طور پر میں یقین کرتا ہوں کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کے لیے کوشاں نہ ہو۔ عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔"[1]

انہوں نے قائداعظم کو جتنے خطوط لکھے، ان کا مقصد یہی تھا کہ مسلم قانونِ شریعت اور ثقافت کی برتری ثابت کی جائے۔ مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنایا جائے۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل کو حل کیا جائے۔ مسلم صوبوں اور مسلم ریاستوں کے علیحدہ وفاق کا قیام انتہائی ضروری ہے۔ علامہ کے قائداعظم پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ایک یادگار خط میں تحریر فرمایا:

"آج ہندوستان میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں۔ جس کی ذات سے مسلمان قوم اس طوفانِ بلا میں صحیح و محفوظ رہنمائی کی توقع رکھ سکتی ہے جو شمال مغربی ہندوستان بلکہ شاید ملک بھر کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔"[2]

اس خط میں ہندو اور مسلمانوں کی خانہ جنگی۔ توہینِ مذہب کے واقعات اور مسلمانوں

---

[1] لیٹرز ٹو جناح۔

[2] لیٹرز ٹو جناح۔

کی لاعلاج معاشی تنگدستی کا ذکر کرنے کے بعد پھر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "ایک پُرامن ہندوستان حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ مذہبی عقائد اور جداگانہ قومیت کی بنا پر ملک کو از سرِ نو تقسیم کر دیا جائے۔"

انہیں اصرار تھا کہ شمال مغربی ہندوستان کا علاقہ مسلمانوں کا وطنی علاقہ ہے۔ اسے علیحدہ مملکت بننا چاہیئے وہ لکھتے ہیں:

"ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمان کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا پڑے گا۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا مفاد اسی طریقہ کار کے اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ اسی لیے لیگ کا آئندہ اجلاس مسلم اقلیت کے کسی صوبے میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہو گا۔"

۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں بھی انہوں نے تقسیم ملک پر زور دیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال قائدِ اعظم محمد علی جناح کو پاکستان کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ چنانچہ ۲۱ جون کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریقِ عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیئے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار اختیار کرنا ہی پڑے گا۔"

۱۱ اگست کو پھر دوبارہ لکھا:

"واقعات نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ لیگ کو اپنی تمام تر مساعی کو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مرتکز کر دینا چاہیئے اور میں آپ سے مکرر درخواست کرتا ہوں کہ لیگ کا اجلاس اکتوبر کے وسط یا آخر

۱؎ اقبال لیٹرز ٹو جناح

میں لاہور میں منعقد کیا جائے۔ پنجاب میں لیگ کے لیے روز افزوں سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور مجھے شبہ نہیں کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں باب اور عوام کو لیگ سے مربوط[1] کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوگا۔"

علامہ کا خیال تھا کہ اکثریتی صوبوں میں مسلم حکومتیں قائم کی جائیں۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی پالیسی اکثریتی صوبوں سے علیحدہ ہونی چاہیئے۔ فرقہ وار فیصلے کی شدید حمایت کی جائے۔ تاکہ بعض شرپسند لوگ محض اپنے ہندو حمایتیوں کو خوش کرنے کے لیے ملت کے مفاد کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ کانگرس نے "رابطہ مسلم عوام" کی جو تحریک جاری کر رکھی ہے، اس کا جواب دینے کے لیے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانا اور مسلم عوام کے معاشی مسائل کو حل کرنا اشد ضروری ہے۔ ان تمام مسائل کے متعلق علامہ نے قائداعظم کو بار بار توجہ دلائی۔[2]

اس سلسلے میں ان میں اتنا تیقن اور جوش و خروش پایا جاتا تھا کہ اپنے ۷، اکتوبر کے خط میں انہوں نے مسئلہ فلسطین پر اظہار خیال کیا تو اس میں بھی یہی کہا کہ رابطہ عوام کا یہ ایک نادر موقع ہے۔ فلسطین کے مسئلے پر لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کرکے کوئی ایسی راہ تجویز کریں، جس میں عوام بہت بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں۔ پھر یہاں تک لکھا کہ:

"ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو، جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی فوجی اڈے کی تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے ایک خطرہ ہے۔[3]"

۱؎ اقبال لیٹرز ٹو جناح

۲؎ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں جب قرارداد پاکستان لاہور میں پاس ہو گئی تو مسلمان تدریجاً مسلم لیگ کے ساتھ مل گئے۔

۳؎ اقبال کے خطوط جناح کے نام۔

قائدِ اعظم علامہ کی اس رہنمائی کے بے حد معترف اور مداح تھے چنانچہ انہی خطوط کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

"جون ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے قیام سے لے کر اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ تک کا زمانہ مسلم ہند کی تاریخ کا ایک پُر از واقعات زمانہ ہے۔ اگر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا قیام مسلم لیگ کی جانب سے عوام کو ایک پرچم تلے متحد کر کے صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابات میں حصہ لینے کی ایک عظیم کوشش تھی، تو لکھنؤ کا اجلاس مسلم لیگ کو عوامی بنیادوں پر منظم کر کے مسلمانانِ ہند کا واحد نمائندہ ادارہ بنانے کی طرف پہلا قدم تھا۔

یہ دونوں مقاصد اسی وقت حاصل ہوئے جب مجھے سر محمد اقبال اور انہیں جیسے مخلص دوستوں کی مخلصانہ کوششوں اور بے غرض سرگرمیوں کی بدولت نہایت بیش قیمت امداد حاصل ہوئی۔"

مسلمان عوام تو بے خبر تھے کہ مصورِ پاکستان علامہ اقبال اس وقت بسترِ علالت پر ہی پڑے پڑے اسلامی ہند کی کس قدر صحیح رہنمائی اور بلند مفید خدمات سرانجام دے رہے تھے لیکن جاننے والے تو خوب جانتے تھے۔ چنانچہ قائدِ اعظم جناح فرماتے ہیں:

"مسلم لیگ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی قیادت کو مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ سر محمد اقبال نے لیگ کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا۔ اگرچہ ان کا یہ کارنامہ عوام کے سامنے اس وقت نہیں آسکا تھا۔"[1]

قائدِ اعظم کی وسیع النظری خود اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ علامہ اقبال نے صرف تصور اور نظریۂ پاکستان دینے کی حد تک ہی کام نہیں کیا۔ بلکہ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے

---

[1] دیباچہ خطوط اقبال بنام جناح۔

اور اس نظریہ کو حاصل اور غالب کرنے کے لیے عملی سیاسیات میں بھی حصہ لیا۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنانے کے لیے زبردست جدوجہد کی۔ قائدِ اعظم کو مسلمانوں کا واحد اور حقیقی رہنما تسلیم کروانے اور اس مقامِ قیادت پر کھڑا کرنے میں بڑی خدمات سرانجام دیں اور درحقیقت ان کا یہ کارنامہ تاریخ کبھی فراموش نہ کرے گی کہ انہوں نے ہی منزل کے سنگ ہائے میل نصب کیے، کارواں کی نشاندہی کی اور میرِ کارواں کو متعین کیا اور پھر خود ہی بانگِ درا بلند کر کے اعلان کر دیا کہ

ہو تلک ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا ؎

واحد نمائندہ جماعت

اس وقت مسلمانوں کا کارواں مسلم لیگ تھی اور جب تک اسے مسلمانوں کا واحد کارواں ثابت نہ کیا جاتا اور اسے انگریز اور ہندو سے بھی منوایا نہ جاتا انگریز سے مسلم مفاد کی بات اور ہندو سے مسلم حقوق کے تحفظ کا ذکر قطعاً ممکن نہ تھا۔ اس وقت علامہ کی یہ نشاندہی بالکل صحیح تھی کہ سب سے پہلے کارواں کا تعین ہونا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی کارواں کونسا ہے بے شمار جماعتیں تھیں۔ انگریز اور ہندو مسلمان کا استحصال کرنے کے لیے مسلمانوں میں سے ہی کچھ آدمی اپنے دائرے میں لے کر انہیں مسلمانوں کے لیڈروں اور نمائندوں کی حیثیت سے دکھلاتے تھے اور ان سے بھانت بھانت کی بولیاں بلواتے تھے اور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو نظر انداز کر کے ہندو نیشنل کانگریس کو ساری ہندوستانی قوم کی واحد نمائندہ جماعت ثابت کرتے اور صرف اسی کو ہندوستانیوں کے جملہ مفادات و حقوق کے بارے میں بات کرنے کا اختیار دیتے تھے۔ اس لیے علامہ اقبال، قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کی سب سے پہلی جنگ تو یہی تھی کہ

:: مسلمانوں کا متحدہ سیاسی پلیٹ فارم کونسا ہے۔ جس کی بات مسلمانوں کی بات شمار کی جائے۔

:: مسلمانوں کا نمائندہ لیڈر کون ہے جو مسلمانوں کے حقوق کی بات کرے اور حقیقی طور پر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے۔

یہ طے کیے بغیر فریقین کا تعین ممکن نہ تھا اور فریقین کا تعین کیے بغیر کسی مسئلے کا فیصلہ ممکن نہ تھا اسی لیے کانگریس کا سارا زور اسی بات پر صرف ہوتا تھا کہ وہ سارے ہندوستان کی قومی جماعت ہے۔یہی زمانہ تھا جب کانگریس مسلمانوں کو رابطہ عوام کے ذریعے اپنے اندر سمیٹ رہی تھی اور نیشلسٹ مسلمان رہنما مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ کانگریس میں ہندو کے خوف سے شمولیت اختیار کرنے سے گریز کرنا ایمان کی کمزوری اور خود اعتمادی کی قلت کا نتیجہ ہے اور بہادر مسلمان تو وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور آزادی کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ ان جذباتی باتوں کے پیچھے نتائج و عواقب سب چھپ جاتے تھے۔چنانچہ قائداعظم کے میدان میں آنے کے بعد مسلم لیگ کا سب سے پہلا دعویٰ یہی تھا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی اور جب تک اسے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر کے اس سے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی بات نہ کی جائے، مسلمانوں کی ترجمانی کسی دوسرے پلیٹ فارم سے ممکن نہ تھی۔

یہ قائداعظم کا دعویٰ تھا کہ کانگریس ایک ہندو جماعت تھی، اور اسے صرف ہندو کے مفاد کی بات کرنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکمتِ سیاست اور معقولیت کے لحاظ سے اس وقت قائداعظم کا یہ دعویٰ عین حالات کا تقاضا تھا اور یہ دعویٰ منوائے بغیر مسلمانوں کے مسائل کا کوئی تجویز کردہ حل بھی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی نہ کرتا تھا اور نہ اتحاد سے اسے پیش کیا جا سکتا تھا۔ اسی ضرورت کا ایک مظہر وہ عوامی نعرہ تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔ اس سے مراد مسلم لیگ میں نہ آنے والے مسلمان کے اسلام کا انکار نہیں تھا بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ مسلمانوں کی طرف سے جب سیاسی ترجمانی کا واحد پلیٹ فارم مسلم لیگ ہے تو پھر جیت ملی کا تقاضا یہی ہے کہ سب مسلمانوں کو اسی پلیٹ فارم کے گرد جمع ہو جانا چاہیئے اور جو اس اجتماعیت سے گریز کرتا ہے وہ ملی لحاظ سے ایک نامسلمانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔جب مسلمان یہ روش اختیار کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلم لیگ میں آ جائیں تو اسی صورت میں کانگریس کو ایک ہندو اور صرف ہندوؤں کی ترجمان جماعت ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح مسلم لیگ کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ قائداعظم مسلمانوں کی طرف سے واحد ترجمان اور نمائندہ ہیں۔ ان کے سوا انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کا اور کوئی ترجمان اور نمائندہ نہیں ہے۔ یہ بات اگر پوری قوت سے کہی جاتی تو اسی صورت میں گاندھی اور نہرو صرف ہندو مفاد کے ترجمان ثابت کیئے جا سکتے تھے۔ ورنہ بے شمار مسلمان ترجمانوں کی موجودگی میں وہ بھی اپنی ٹوپی میں مسلمانوں کی ترجمانی کے سرخاب کے پَر لگاتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ مسلمانوں کی علیحدہ تہذیب کیا ہے۔ بس ایک اونچا پاجامہ اور ایک ٹونٹی دار لوٹا۔ لیکن جب قائداعظم کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا تو اس کی حقیقی مصلحت یہی تھی کہ اتنے نازک موقعہ پر مسلمانوں کی ترجمانی کا حق کانگریس اور ہندو لیڈروں سے لے کر مسلمانوں کی طرف منتقل کیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ جب ایک موقعہ کانگریس مسلم لیگ مذاکرات میں ایک طرف سے قائداعظم سامنے آئے اور دوسری طرف سے کانگریس نے مولانا ابوالکلام آزاد کو پیش کیا تو قائداعظم نے "شو بوائے" کہہ کر مذاکرات سے انکار کر دیا۔ خدانخواستہ قائداعظم آداب شرافت سے اتنے بے خبر اور بے بہرہ نہ تھے کہ وہ جان بوجھ کر اور بے جا طور پر ایک مسلم عالم دین کی توہین کرتے لیکن وہ یہ بات گوارا نہ کر سکتے تھے کہ کانگریس چالبازی سے مولانا آزاد کو بھیج کر مسلمانوں کے حق واحد نمائندگی کو مجروح کرے اور مکاری سے کانگریس کو بھی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت اور مسلمانوں کے مفادات کی محافظ پارٹی کے طور پر پیش کرے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے خاص اسلامی بنیاد پر مولانا آزاد سے ملاقات سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ہندو کانگریس کا ہندوؤں کی نمائندگی کے لیے کسی ہندو رہنما خصوصاً مسٹر گاندھی کو مذاکرات کے لیے بھیجنا چاہیئے۔

اس طرح یہ حکمتِ سیاست جو علامہ اقبال کی وضع کردہ تھی اور جسے قائداعظمؒ نے سختی سے استعمال کیا یہ تھی کہ:

۱۔ کانگریس نہیں بلکہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی۔

۲۔ ہندو لیڈر یا کانگریسی لیڈر نہیں بلکہ قائداعظم ہی مسلمانوں کے جذبات و مفادات اور خیالات کے ترجمان تھے۔ یہ حکمت عملی قائم کرنے کے لیئے قائداعظم کو کانگریس پر پیہم

سیاسی حملے کرنے پڑے۔ جو مسلم قوم کی نظریاتی جنگ کا حملہ ہے۔ انہوں نے ایک موقعہ پر فرمایا:

"صرف ایک چیز مسلمانوں کو بچا سکتی ہے اور ان میں اپنا کھویا ہوا وقار و بحال کرنے کی قوت پیدا کر سکتی ہے۔ پہلے تو انہیں اپنی روحوں کی دوبارہ تسخیر کرکے ان عظیم روایات اور اصولوں پر سختی سے جم جانا چاہیئے۔ جو ان کے زبردست اتحاد کی بنیاد ہیں اور جو ان کو ایک ہی سیاسی جماعت کے رشتے میں منسلک کرتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو فرقہ پرست ٹوڈی، رجعت پسند یا ایسے ہی دوسرے القابات سے نوازا جائے تو آپ ہرگز اس کی پروا نہ کریں۔ مسلمانوں میں سے آج کا بدترین ٹوڈی رذیل فرقہ پرست جب اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر کانگرس کے حوالے کر کے اپنی ہی قوم کی توہین کرتا ہے تو وہ کل قوم پرستوں کا تاجدار بن جاتا ہے۔ ان اصطلاحوں کا نیوں اور غلط سلط لفظوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کر کے انہیں دنیا بھر میں بدنام کیا جائے۔ ہم اس قسم کے پروپیگنڈے سے شدید نفرت کرتے ہیں۔"

(اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد کانگریس کی حقیقت کھولتے ہوئے فرمایا:

"کانگریس سراسر ایک ہندو جماعت ہے اور مسلمانوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ کانگریس کو یہ جتا دیا ہے کہ ان کی آئندہ تقدیر کا دارومدار حکومت اور ملک کے انتظام ان کے سیاسی حقوق کے حصول، اور قومی زندگی میں واجب حصہ حاصل ہونے پر ہے اور اس کے لیے وہ اس وقت تک برسرپیکار رہیں گے جب تک ہندو راج کا خواب و خیال کانگریس کے دل و دماغ سے بالکل مفقود نہ ہو جائے گا۔"

(اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ، کلکتہ ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء)

پھر ۲۰، فروری ۱۹۴۰ء دہلی مسلم لیگ کے اجلاس میں آپ نے فرمایا :

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا مطمع نظر کیا ہے۔ بات بالکل صاف ہے۔ برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس مسلمانوں اور ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے اور نہ مسٹر گاندھی اور کانگریس کو کرنے دیں گے۔ ہم ان دونوں کے اثرات سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔"

یہ گویا مطالبۂ پاکستان کی طرف صاف اشارہ تھا۔

قائداعظم نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے کانگریس کی حقیقت بار بار کھولی اور اس کے مکروہ عزائم کا پردہ چاک کیا۔ چنانچہ ایک موقع پر انگریز اور ہندو دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا :

"تمہاری تعداد سب سے زیادہ ہوا کرے تم ترقی یافتہ اور تمہاری اقتصادی حالت مستحکم ہی سہی، اور تم سمجھا کرو کہ سروں کی گنتی ہی آخری فیصلہ ہے۔ لیکن میں تمہیں بتلائے دیتا ہوں تم دونوں کو، کہ تم تنہا یا تم دونوں متحد ہو کر بھی، ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔ تم اس تہذیب کو کبھی مٹا نہ سکو گے، اس اسلامی تہذیب کو جو ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ ہمارا نور ایمان زندہ ہے، ہمیشہ زندہ رہا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بے شک تم ہمیں مغلوب کرو، ہم پر ظلم و ستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک روا رکھو، لیکن ہم ایک نتیجے پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ سنگین فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر مرنا ہی ہے تو لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔"

(مرکزی اسمبلی ۲۲، مارچ ۱۹۳۹ء)

عربک کالج دہلی میں ۱۹۳۹ء میں جب جنگِ حقوق و قومیت زوروں پر تھی تو قائداعظمؒ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

"دولت برطانیہ، ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی ہے اور گاندھی جی مسلم ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم دونوں کو اپنے اوپر حکومت نہ کرنے دیں گے۔ خواہ دونوں متحد ہو کر یا تنہا کوشش کر دیکھیں۔ ساری دنیا مان چکی ہے اور حکومت برطانیہ بھی فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے یہ تسلیم کر چکی ہے کہ مسلم لیگ ہی مسلم ہندوستان کی جائز اور نمائندہ جماعت ہے لیکن تا حال سیوا گاؤں میں روشنی طلوع نہیں ہوئی اور ابھی تک گاندھی صاحب اندھیرے میں ہی ہاتھ ٹوئیاں مار رہے ہیں۔"

(عربک کالج دہلی ۱۹۳۹ء)

پھر مسلم یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"دو سال ہوئے میں نے شملہ میں کہا تھا کہ ہندوستان کے لیے پارلیمانی جمہوری نظام حکومت غیر موزوں ہے۔ اس پر کانگریسی اخبارات نے میرے خلاف طعن و تشنیع سے کام لیا اور مجھے بتایا کہ "تم اسلام کو نقصان پہنچانے کے مجرم ہو کیونکہ وہ جمہوریت کی تلقین کرتا ہے۔" مگر جہاں تک مجھے اسلام کا علم ہے وہ ایسی جمہوریت کی وکالت نہیں کرتا جو غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے۔ ہم کوئی ایسا نظام حکومت قبول نہیں کر سکتے جس کی رُو سے ایک غیر مسلم اکثریت محض تعداد کی بنا پر ہم مسلمانوں پر حکومت کرے اور ہمیں اپنا فرمانبردار بنالے۔ انہوں نے سمجھا ہے کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں۔ جن پر ہندو اکثریت کو حکومت کرنا چاہیئے اور ادھر مسلمان ایک جھوٹے احساس سلامتی میں مسلسل مبتلائے فریب رہے اور اقلیت کی اصطلاح کو تاریخی، آئینی اور قانونی سمجھا جانے لگا لیکن مسلمان کسی حیثیت سے بھی۔ یورپی ممالک کی اقلیتوں کی طرح اقلیت نہیں ہیں ایک چیز قطعی ہے اور وہ

یہ ہے کہ ہم کسی طرح اقلیت نہیں ہیں بلکہ ہم اپنے نصب العین کے ساتھ بجائے خود ایک علیحدہ اور ممتاز قوم ہیں۔"

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۶، مارچ ۱۹۴۰ء)

اس طرح قائد اعظم نے کانگریس کو مسلمانوں سے مسلسل فریب کرنے کے کاروبار سے الگ کر دیا اور اس کا حقیقی روپ دنیا، مسلمان قوم اور خود اس کے سامنے بھی واضح کر دیا۔ چنانچہ ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ہندوستان میں ہماری تربیت برطانوی پارلیمانی جمہوریت کی روایات کے تحت ہوئی ہے۔ یہ دستور ۱۹۳۵ء جو ہمارے سر پر تھوپا گیا ہے۔ کم و بیش برطانوی طرز پر مرتب کیا گیا ہے لیکن اس ملک اور انگلستان کی مملکت میں بنیادی تفاوت ہے۔ برطانیہ میں اکثریت کی جماعتیں تغیر پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا رنگ و روپ اور ان کی طاقت اور تعداد ارکان آئے دن بدلتی رہتی ہے۔ آج قدامت پرستوں کی حکومت ہے تو کل حریت پسندوں اور پرسوں مزدوروں کی۔ لیکن ہندوستان میں یہ حال نہیں ہے۔ یہاں ایک مستقل ہندو اکثریت ہے اور باقی اقلیتیں ہیں جو عرصۂ دراز تک اکثریت بن جانے کی توقع نہیں کر سکتیں۔ ہو سکتا ہے کہ اکثریت غیر فرقہ واری کا نقاب اوڑھے لیکن وہ اپنی سرشت اور اپنے اعمال و افعال میں شرکتِ غیرے ہندو ہی رہے گی۔ اقلیتوں کے لیے صرف یہی ایک امید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تنظیم بنائیں اور اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے اختیارات کا ایک معین اور فیصلہ کن حصہ حاصل کر لیں۔ ایسے اختیار کے بغیر کوئی دستور ہندوستان میں کامیابی سے نہیں چلایا جا سکتا۔"[1]

---

[1] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۵ فروری ۱۹۳۸ء۔

اس کے بعد ۹، مارچ ۱۹۴۰ء کو اسی یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

"دو سال ہوئے میں نے شملہ میں کہا تھا ہندوستان کے لیے پارلیمانی جمہوری نظام حکومت موزوں نہیں ہے۔ اس پر کانگریس کے اخبارات نے میرے خلاف طعن و تشنیع سے کام لیا اور مجھے بتایا کہ تم اسلام کو نقصان پہنچانے کے مجرم ہو کیونکہ وہ جمہوریت کی تلقین کرتا ہے مگر جہاں تک مجھے اسلام کا علم ہے وہ ایسی کسی جمہوریت کی وکالت نہیں کرتا۔ جو غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے ہم کوئی ایسا نظامِ حکومت قبول نہیں کر سکتے۔ جس کی رو سے ایک غیر مسلم اکثریت محض تعداد کی بناء پر ہم مسلمانوں پر حکومت کرے اور ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے۔"

اب پاکستان کی قرارداد ۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے لاہور اجلاس میں علامہ اقبالؒ کی عین آرزو کے مطابق پاس ہو چکی تھی اور اب آزاد مسلم ریاست کے علاقے کا تعین ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے ایک علیحدہ قوم ہونے کے دلائل بھی سامنے آتے چلے جا رہے تھے اور اب اس مطالبۂ پاکستان میں اخلاقی قوت بھی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ اخلاقی قوت پاکستان کے نظریے کی تھی جس کا تذکرہ اب کثرت سے زبانوں پر آنے لگا تھا۔ چوں کہ پاکستان بذاتِ خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ اسلامی نظامِ زندگی کے غلبے کے عظیم مقصد کا ایک ناگزیر ذریعہ تھا۔ قائد اعظم نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کراچی کے اجلاس ۱۹۴۳ء میں فرمایا :

"وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے، وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے! وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن کریم ہے، مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے۔ ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا

ہوتا جائے گا۔ ایک خدا۔ ایک کتاب۔ ایک رسول۔ ایک امت یہی ہمارا نعرہ ہے :"

پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مارچ ۱۹۴۴ء میں خطاب کرتے ہوئے کہا :

" پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے وطن نہیں اور نہ ہی نسل ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا وہ ایک جداگانہ قوم ، کا فرد ہو گیا ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا ہے مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجۂ جواز کیا ہے ؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں ہے ! اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے اور نہ انگریزوں کی چال ہے۔ بلکہ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے :"

افسوس ہے کہ بعض لوگ کیبنٹ مشن کی سفارشات کو قبول کرلینے کے فعل کو مسلم لیگ اور قائد اعظم کو پاکستان کے مشن اور مقصد سے انحراف کا طعنہ دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ بات صورتِ حال سے عدم واقفیت کے سبب پیش کی جاتی ہے۔ قائد اعظم نے زون سسٹم کو قبول کر کے درحقیقت پاکستان کے مطالبے کو تدریجی طور پر حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا تاکہ اس کے ذریعے خون خرابے کے بغیر مسلمانوں کو اسلامی زون میں ایک مقررہ مدت کے اندر آہستہ آہستہ اطمینان اور سہولت کے ساتھ جمع کر لیا جائے اور ساتھ ہی انہیں پاکستان اور اس کے مقصد و محرکات پر یکسو بھی کر لیا جائے۔ اس طرح پاکستان ہر قسم کے خون خرابے سے بچ کر خالص آئینی طور پر قائم ہو سکتا تھا۔

اگرچہ اس طرح دس سال کا عرصہ مزید لگ جاتا لیکن وہ عرصہ مسلم لیگ کی بہتر تنظیم اور اخلاقی تربیت کے لیے استعمال ہو سکتا تھا لیکن جب قائد اعظم کے سامنے ہندو کانگریس کے یک ذمہ دار لیڈر کے مکروہ عزائم کھل کر سامنے آ گئے تو پھر انہوں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے

بغیر فوری طور پر پاکستان کے قیام کی طرف قدم اٹھا دیا۔ اگرچہ اس طرح بہت سے مادی نقصانات سامنے تھے لیکن ہندو پر مزید اعتماد کرنے اور اس سے نقصان اٹھانے کے خطرے سے مستقل نجات اب اسی صورت میں مل سکتی تھی۔ اس بنا پر یہ بات ضمنی طور پر پوری قوت سے کہی جا سکتی ہے کہ قائداعظم کے نزدیک اول تا آخر اسلامی پاکستان کا قیام ہی تھا اور انہوں نے کبھی بھی یہ نصب العین ترک نہیں کیا البتہ تھوڑی سی مہلت کے ذریعے وہ مسلمانوں کو بھاری خانہ جنگی کے نقصانات سے بچانا چاہتے تھے جس پر ہندو اس وقت تلا کھڑا تھا لیکن جب وہ جنگ سر پر آ ہی گئی تو انہوں نے مردانہ وار اس کا مقابلہ اور سامنا کیا اور ایک بہادر جرنیل کی طرح اپنی قوم کو ساتھ لے کر خون کے دریا میں سے گزر کر پاکستان کو حاصل کیا جو اس نظریاتی آئیڈیل کا جسم تھا جس کی تجدید کے لیے وہ جدوجہد کر رہے تھے۔

اس امر سے کسے انکار ہے کہ قائداعظم نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ایک عظیم اخلاقی سیاسی، آئینی اور قانونی جنگ لڑی۔ ان کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ قومیں علاقوں کی نسبت سے نہیں بلکہ نظریات کی نسبت سے بنتی ہیں اور مسلمان نظریے کے سبب ایک الگ قوم ہے۔ وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر متحدہ وطنی قومیت بنانے کے اصولاً مخالف تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنی تقاریر اور تحریروں میں پُرزور دلائل دیے آپ نے مسٹر گاندھی کو ستمبر ۱۹۴۴ء میں خط لکھتے ہوئے فرمایا:

> "ہم اس کے قائل ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں جو "قوم" کی ہر تعریف اور معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ہم ۱۰ کروڑ کی ایک قوم ہیں، مزید برآں ہم ایک ایسی قوم ہیں جو ایک مخصوص اور ممتاز تہذیب و تمدن، زبان و ادب، آرٹ اور فنِ تعمیر، احساسِ اقدار و تناسب، قانونی احکام اور اخلاقی ضوابط، رسم و رواج اور تقویم (کیلنڈر) تاریخ اور روایات، رجحانات و عزائم کی مالک ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہمارا اپنا ایک امتیازی زاویۂ نگاہ ہے اور قانون بین الاقوامی کی

ہر دفعہ کے لحاظ سے ہم ایک قوم ہیں [۱]۔"

اور یہ دو قوموں کا دعویٰ اور نعرہ محض سیاسی سٹنٹ نہیں تھا تاکہ اسلام کو انگریز اور ہندو کی دستبرد سے بچاکر خود اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا جائے اور اسے محض انتخابی نعرہ بناکر مسلمانوں کی ہمدردی اور دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جائے بلکہ قائداعظم اس خطہ میں حقیقتاً ایک خالص اسلامی ریاست اسلام کے اصولوں پر مبنی قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی جدوجہد کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں کہ پاکستان کے قیام سے پہلے قائداعظم مسلمانوں سے ایک اسلامی ریاست کے قیام کا جو وعدہ کرتے رہے تھے وہ اس وعدے کے بارے میں بے حد مخلص تھے چنانچہ وہ اس وعدے کو پاکستان بننے سے پہلے اور بعد بھی مسلسل دہراتے رہے تھے۔ انہوں نے ۲۱۔ نومبر ۱۹۴۵ء کو سرحد مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> "مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطۂ حیات اپنے تہذیبی ارتقاء اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں [۲]۔"

پھر اس کانفرنس میں انہوں نے ۲۲۔ نومبر کو تقریر کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار فرمایا:

> "ہمارا دین، ہماری تہذیب، ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں [۳]۔"

پھر اسی زمانے میں اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

> "لیگ ہندوستان کے ان حصوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کی علمبردار

---

[۱] مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں مرتبہ جمیل الدین احمد صفحہ ۱۸۱ - ۱۸۲۔

[۲] مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں صفحہ ۲۴۵ [۳] صفحہ ۲۴۲۔

ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ وہ وہاں اسلامی قانون کے مطابق حکومت قائم کر سکیں[1]"

بلکہ اگر کسی نے یہ بات کہی کہ پاکستان میں اسلامی شریعت کا قانون نافذ نہ ہوگا تو قائد اعظم نے اس کی بھرپور تردید کی۔

"مگر خان برادران نے اپنے بیانات میں اور اخباری ملاقاتوں میں ایک اور زہر آلود شور برپا کر رکھا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کرے گی، یہ بات قطعی طور پر غلط ہے[2]"

پاکستان کے بنیادی نظریے کی تائید قائد اعظم کے ساتھ ساتھ دوسرے اکابرین مسلم لیگ بھی کرتے رہے۔ چنانچہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور قائد اعظم کے معتمد ترین ساتھی لیاقت علی خاں نے پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں قائد اعظم کے اعلانات کا بار بار اعادہ کرتا ہوں کہ پاکستان ایک مکمل اسلامی ریاست ہو گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاکستان اسلام کی ایک تجربہ گاہ ہو گا اور ہم ساری دنیا کو دکھائیں گے کہ چودہ سو سال پرانے اسلامی اصول اب بھی کار آمد اور دنیا کے رہنما بن سکتے ہیں[3]"

پھر ایک اور موقعہ پر قائد ملت نے فرمایا:

"پاکستان کا آئندہ دستور قرآن مجید کے احکام پر مبنی ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ قائد اعظم اور ان کے رفقاء کی یہ دیرینہ خواہش رہی ہے کہ پاکستان

---

[1] مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں ۴۴۶۔

[2] ڈان ۳۰ جون ۱۹۴۷ء [3] پاکستان ٹائمز ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء۔

کی نشوونما ایک مضبوط اور مثالی اسلامی ریاست کی حیثیت سے ہو جو
اپنے باشندوں کو عدل و انصاف کی ضمانت دے سکے۔"[1]

قائد اعظم کا طرزِ عمل تحریک پاکستان کو برپا کرنے کے دن سے لے کر پاکستان کے قیام تک یکساں رہا۔ وہ جداگانہ قومیت کی بنیاد پر علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے رہے اور وہ علیحدہ وطن کا اس لیے مطالبہ کرتے رہے تاکہ مسلمان وہاں قرآن و سنت کے احکام کے مطابق زندگی گزار سکیں اور جہاں شریعت کا قانون جاری کیا جا سکے۔

قائد اعظم نے تشکیلِ پاکستان کی لڑائی سات سال تک لڑی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لڑائی انہوں نے تنہا اپنے ٹائپ رائٹر کی مدد سے لڑی کہ ظاہر ہے کہ قوموں کی لڑائی تو قومیں ہی لڑ سکتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انہوں نے انگریز اور ہندوؤں کی چالبازیوں کے لیے جو سیاسی حکمتِ عمل وضع کی وہ تنہا ان کا حصہ تھی اور وہ بلاشبہ کامیاب ثابت ہوئی۔ انہوں نے یہ لڑائی علاقہ اور نظریہ کے تعین کے ساتھ لڑی چنانچہ اس نظریے کی برکت سے پورے ہندوستان کی مسلمان قوم اس جنگ میں شریک ہو گئی۔ جس جنگ کی کامیابی کے نتیجے میں ہندوستان کے صرف ایک شمال مغربی گوشے میں مسلمانوں کی ریاست وجود میں آنی تھی اور باقی سارے علاقوں میں مسلمانوں کو تنگ ظرف ہندو قوم کے انتقام کا نشانہ بننا تھا۔ سارے مسلمان اس بات کو خوب سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے لیے ایک گھر مہیا کرنے کا جہاد برپا کیا۔ یہاں تک کہ دارالسلام پاکستان بن گیا۔ اور اس میں مسلمان پوری طرح آزاد ہو گئے کہ اپنی آزاد مرضی سے اپنی زندگیاں اسلام کے مطابق ڈھالیں اپنا آئین قرآن مجید کے مطابق بنائیں۔ اپنی عدالتوں کا نظام۔ نظام تعلیم و تربیت و معیشت و سیاست سب کچھ اسلام کی ہدایات کے مطابق سرانجام دیں اور اس طرح اپنے دیرینہ خواب پریشان کو حقیقت کے روپ میں دیکھیں اور دنیا و آخرت میں اپنے دین کی سربلندی کا جھنڈا بلند کر کے سرخرو ہو جائیں۔

---

[1] پاکستان ٹائمز، ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء۔

قائدِ اعظمؒ نے پاکستان قائم کر دیا۔ پھر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے قائم کردہ پاکستان میں ان کا پیش کردہ نظریہ اب بھی اپنے نفاذ کا منتظر ہے۔ یوں ایک مشن جو قائدِ اعظم نے ۱۹۴۰ء میں اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا۔ اس کا نصف حصہ یعنی تشکیلِ پاکستان تو وہ بروئے کار لے آئے لیکن باقی نصف حصہ یعنی اسلامی نظامِ زندگی کا اجراء وہ اب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ہے اور کسی مردِ از غیب کا منتظر ہے۔

پاکستان کا حقیقی تصور

پاکستان کے قیام اور اس میں اسلامی نظام کے نفاذ سے گریز کے بعد بعض عناصر نے تصورِ پاکستان کے بارے میں بار بار کنفیوژن اور الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو ایسے ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں سے چندہ جمع کر کے مسجد بنائے اور بعض لوگ کہنے لگیں کہ یہ مسجد نہیں بلکہ کلب ہے اور اس کے قیام کا مقصد لوگوں کو تفریح فراہم کرنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ملک کو اس کے حقیقی تصورِ قیام کے مطابق نہیں ڈھالا گیا نہ اس کے لیے ذمہ دار لوگوں نے کچھ بہت زیادہ عملی کوشش کی بلکہ بیشتر اوپر کے مقام پر آنے والوں کی سرگرمیاں اس کے مقصدِ قیام کے منافی ہی رہیں لیکن یہ بلاشبہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ اشتراکی عناصر کے سوا کسی عنصر نے بھی اس کے حقیقی مقصدِ قیام پر پردے ڈالنے یا اسے گرد آلود کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جرأت سے کام لیتے ہوئے پاکستان کے حقیقی تصور کو بالکل صحیح طور پر ہمیشہ بآوازِ بلند بیان کیا اور پھر اس کے بعد کام وہ کرتے رہے جو ان کو پسند تھا اور جو عموماً اس کے حقیقی تصور کے منافی ہی رہا۔ اس معاملے میں بھی حالات کا تجزیہ کیا جائے تو شاید انحراف کرنے والوں میں اتنا شدید جذبہ اس تصور سے بغاوت کا موجود نہ تھا جس قدر ہوسِ اقتدار کا تھا۔

فی الحقیقت پاکستان کا حقیقی تصور کوئی تحقیق طلب مسئلہ نہیں ہے ابھی تو وہ ساری نسل موجود ہے جس کے نعروں کی گونج ——— پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ ——— ہماری ہمسایہ قوم کو بھی اب تک یاد ہے۔ ابھی تو ان مہاجرین کے مسائل بھی حل طلب موجود ہیں جو

جداگانہ قومیت اور جداگانہ تصورِ حیات کے دعوے اور اس کے نفاذ نے پیدا کر دیئے تھے۔ ابھی تو پاکستان کے در و دیوار گلی گلی، محلہ محلہ پاکستان کا حقیقی تصور بیان کرنے کیلئے ہزاروں لوگ موجود ہیں ۔۔۔ یہ مسئلہ تحقیق طلب اس وقت بنتا۔ جب کم از کم ایک صدی اور دو نسلیں ہمارے اسی تذبذب اور منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی کیے بغیر گزر جاتیں ۔۔۔ حالاں کہ حالتِ تذبذب میں قومیں زیادہ مدت زندہ نہیں رہ سکتیں۔ یا پھر کوئی قاہر قوت پاکستان کے حقیقی تصور کے خلاف جاں کوئی دوسرا ہی تصور بزور شمشیر نافذ کر دیتی اور پاکستان کے حقیقی تصور کے علمبردار اسلام پسند عناصر کو کچل کر کوئی دوسرا تصورِ حیات مسلط کر دیتی ۔۔۔ لیکن پاکستان کے حالات میں بہ ظاہر یہ بات بالکل بعید از قیاس نظر آتی ہے اور بفرضِ محال اگر کوئی اقتدار پسند اقلیت کسی سیاسی دھوکا دہی سے پوری قوم کے مزاج اور مطالبے کے خلاف کچھ دوسرے ہی حالات پیدا کر دے تو بھی ایسی حالت ایک قلیل مدت کے لیے ہی رہ سکتی ہے۔ اسے دوام نصیب نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وقتی نعروں کا جوش و خروش اور وقتی مسائل کا ہنگامہ ایمان و عقیدہ کی محکم دیواروں کو منہدم نہیں کر سکتا۔ پاکستان کا حقیقی تصور دراصل ہمارے قومی کردار کا ایک جزو بن چکا ہے۔ بلکہ پاکستانیوں نے اگر کسی چیز کو اپنے قومی کردار کے طور پر اب تک بخوشی قبول کیا ہے تو وہ یہی تصور ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ وقتی اور گذشتنی ہے۔

ہم قیامِ پاکستان کے دن سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں کھڑے ہیں۔ آج بھی اس کے حقیقی تصور کے گواہ قدم قدم پر موجود ہیں اور ان کی اتنی بڑی کثرت ہے کہ اگر وہ فرداً فرداً اس کے حقیقی تصور کے بارے میں کسی جانبدار یا غیر جانبدار عدالت کے سامنے گواہی دینا شروع کریں تو ربع صدی گزر سکتی ہے۔ اس لیے ہم اس سارے ہجوم کو چھوڑ کر صرف ان چار محترم اور معتبر حضرات کو بطور گواہ پیش کرتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ اس بات کے مستحق ہیں، کہ اس اہم ترین مسئلے پر گواہی دیں اور ان کی گواہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ ان میں ایک تو مفکر و مصورِ پاکستان حضرت علامہ محمد اقبالؒ ہیں، جنہوں نے سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے اجلاس میں پاکستان کا تصور پیش کیا جو ہندوستان کے شمال مغربی سرحد کے مسلم اکثریت کے صوبوں کے اتحاد سے ایک آزاد اسلامی مملکت اور ہندوستان کے جنوب مشرق میں

بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ایک دوسری اسلامی مملکت کے وجود پر مبنی تھا اور جسے بعد میں پاکستان بننا تھا ـــــ دوسرے تحریکِ پاکستان کے قائدِاعظم محمد علی جناح ہیں. جن کے لیے یہ مقدر تھا کہ وہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر قیام پاکستان کی جنگ لڑیں. تیسرے معمارِ پاکستان جناب لیاقت علی خاں مرحوم ہیں. جنہوں نے تصور پاکستان کو عوامی تحریک بنانے اور پھر اس کے قیام کے بعد اس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا. اور دستوری طور پر اس کے مقصدِ قیام کو اسمبلی میں پاس کیا ـــــ چوتھے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ہیں جن کی مساعی نے مسلمانوں کو دینی طور پر تحریکِ پاکستان سے وابستہ کیا اور پاکستان کے حقیقی تصور کو قرارداد مقاصد کی شکل میں دستوری شکل دینے میں بھی ان کی مساعی جمیلہ نے بہت بڑا کردار ادا کیا.

پاکستان کے قیام کا مقصد اور اس کا حقیقی تصور یہ ہے کہ:

"ـــــ ملت مسلمہ کو ایک ایسا خطۂ زمین میسر آئے جہاں وہ اپنے دین اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے اسلامی نظریۂ حیات کو فروغ دے سکے. اسکے مطابق زندگی بسر کرسکے اور خلافت علیٰ منہاج النبوت کا احیاء کرکے اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی اور آخرت کی فلاح حاصل کرسکے اور بحیثیت ایک آزاد مسلم ملت کے اپنے دین کے تمام اصولوں کو ان کی تمام جزئیات کے ساتھ اس طرح نافذ کرسکے. جس طرح اللہ اور اس کے رسولؐ کو مطلوب ہے. اور جو اس ملت کے برپا کرنے کا حقیقی مقصود ہے. پاکستان کا حقیقی تصور دراصل ملت مسلمہ کے مقصدِ وجود کا ہی عین تقاضا اور نتیجہ ہے ـــــ"

یعنی جس طرح تمام امتوں میں سے چن کر کے امت مسلمہ کو علیحدہ کیا گیا. اور اس کی یوں علیحدگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی کو مٹائے. اسی طرح ہندوستان میں سے کاٹ کر ملت مسلمہ نے یہ خطہ علیحدہ ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ یہاں اپنے فریضے کو آزادی سے انجام دے سکے ـــــ یہاں نیکی کا حکم دیا جائے. برائی کو مٹایا جائے اور اسلامی نظامِ حیات کو مکمل طور پر اس طرح نافذ کیا جائے. جس طرح وہ خلفائے راشدین کے زمانے میں نافذ تھا ـــــ

یہ ہے وہ حقیقی تصور جس پر پاکستان قائم کیا گیا تھا۔ اب ہم اس پر سب سے پہلے علامہ اقبالؒ کو بطور گواہ پیش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ملت میں انہیں کو پاکستان کے تخیل کا پیش کرنے والا تسلیم کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی گواہی

"اسلام ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کرسکتی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے۔ جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارمدار ہے۔ کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متمیز تہذیب کے حامل بن سکیں ـــــ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کے بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کریں۔ جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا؟"

"میں نہیں کہتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو گا۔ جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصولِ اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے۔ جو آج مسلمانانِ ہندوستان کے سامنے ہے۔"

"مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیہ کے ماتحت اس ملک میں مسلمانوں کو آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔"

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو

بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی ہی پڑے گی۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کرے۔"

"اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظام قانون کو عمل جامہ پہنایا جائے تو کم از کم ہر فرد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ اور اس کی توسیع ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن ہے۔ کئی سال سے میرا یہ ایقان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ مسلمانوں کے معاشی مسئلہ کا حل اور پرامن ہندوستان کے حصول کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں تو دوسری صورت میں صرف فساد جنگی ہے۔"[1]

"مسلم ہندوستان کے لیے ان مسائل کے حل کو ممکن بنانے کی خاطر ملک کی تقسیم کے ذریعے بڑی مسلم اکثریت کے واسطے ایک یا زیادہ مسلم مملکتوں کی فراہمی ضروری ہے کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبہ کا وقت آ گیا ہے۔ جواہر لال کی ملحد اشتراکیت کا شاید یہی بہتر جواب ہے جو آپ دے سکتے ہیں۔"

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔"

"ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ وہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو مجتمع ہو جائیں گی۔ اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"[2]

---

[1] اقتباسات از خطباتِ اقبال [2] اقبال جناح مراسلت سے اقتباسات۔

ان اقتباسات میں آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مفکرِ و مصورِ پاکستان نے پاکستان کا تخیل نام لیے بغیر کن الفاظ میں پیش کیا ہے۔ علیحدہ اسلامی ریاست کی ضرورت کیوں ہے اور مسلمانوں کو وہاں کیا کرنا ہے اور اسے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سب کا جواب علامہؒ کے نزدیک صرف اسلام اور اس کا اتباع ہے اور یہی پاکستان کا حقیقی تصور ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ملت بیضا پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک لیکچر دیتے ہوئے علامہؒ نے اپنے نقطۂ نظر کی اس طرح وضاحت کی:

"۔۔۔۔۔ اسلام کی نوعیت ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا۔ جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر اور وطن ہے کہ جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا ۔۔۔۔۔"

"۔۔۔۔۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ملت میں ایک نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں۔ جو بوجہ کسی امتیازی یا اتحادی مرکز نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا۔ اور گردوپیش کی قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی نسبت زیادہ قوت و جان ہوگی ۔۔۔۔"

پھر ایک دوسرے موقعہ پر آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے فروری ۱۹۳۲ء کے دہلی کے اجلاس میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"۔۔۔۔۔ جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں میں صرف کر دے۔ اس دین

قسم کے مضمرات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں جن میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔"

گویا شمال مغربی سرحدی علاقے میں جس اسلامی مملکت کا خواب علامہ قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے یہ اس کا نقشہ اور نظام تھا جو ان کے ذہن میں محفوظ تھا اور یہی اس مملکت کا حقیقی تصور تھا جو ۱۰ سال بعد دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے اُبھرنے والی تھی۔

مفکر پاکستان کے بعد اب ہم تحریک پاکستان کے قائد اعظم کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح کی گواہی

"ہم (ہندو اور مسلمان) ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہم مذہب میں مختلف ہیں۔ تہذیب و تمدن میں مختلف ہیں۔ تاریخ میں، زبان میں، طرزِ تعمیر میں، موسیقی میں، قانون اور اصولِ قانون میں، کھانے پینے میں، معاشرت میں، لباس میں غرض ہر چیز میں ان سے مختلف ہیں۔ صرف ووٹ ڈالنے کی صندوقچی میں وہ اور ہم یکجا نہیں ہو سکتے[1]۔"

"ہندو اور مسلمانوں کے اختلافات ایسے بنیادی اختلافات ہیں کہ زندگی کا کوئی معاملہ جو کچھ بھی اہمیت رکھتا ہو ایسا نہیں ہے جن میں ان کے اور ہمارے درمیان اتفاق ہو[2]۔"

"ہم ایک علیحدہ قوم ہیں جس کے پاس اپنا خاص تمدن و تہذیب، زبان اور ادب فنونِ لطیفہ اور فن تعمیر، نام اور اصطلاحات اقدار کا تخیل اور تناسب کا تصور، عدالتی قانون اور اخلاق کا ضابطہ رواج اور سنۂ تاریخ اور روایات، رجحانات اور تمنائیں موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ

---

[1] مکتوب بنام گاندھی جی نومبر ۱۹۲۵ء

[2] بیان، دسمبر ۱۹۳۶ء

زندگی پر اور اس کے متعلق ہم ایک خاص تصور رکھتے ہیں اور بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک علیحدہ قوم ہیں[1]۔"

"پاکستان مسلمان قوم کی وحدت کا مجسم ظہور ہے اور اس کو ایسا ہی رہنا چاہیے۔" (مارچ ۱۹۴۸ء)

"آئیے ہم اپنی قوم اور اپنی اس بااختیار ریاست پاکستان کی تعمیر و تجدید اور حیاتِ نو کا نقشہ بنائیں۔ جس کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ وہ نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست ہے بلکہ دنیا کی پانچویں عظیم ترین بااختیار ریاست ہے۔"

"میرے اور علامہ اقبالؒ مرحوم کے خیالات میں کاملاً ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے دستوری مسائل کے گہرے مطالعہ کے بعد انجام کار مجھے یہی نتائج اخذ کرنا پڑے اور بالآخر انہیں خیالات نے مسلم ہندوستان کے متحدہ عزم کی صورت میں جنم لیا جس کو کل ہند لیگ کے اجلاس میں منعقدہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء متشکل کیا گیا جو عام طور پر قراردادِ پاکستان کے نام سے موسوم ہے[2]۔"

اگست ۱۹۴۱ء میں جب قائداعظم محمد علی جناح حیدرآباد تشریف لے گئے تو بعض نوجوان طلباء نے اسلامی تعلیمات پر ان سے کچھ سوالات کیے اور اسلامی حکومت اور عام سیکولر حکومت کا امتیاز معلوم کرنا چاہا تو قائداعظم نے فرمایا — "اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص کی یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے، مسلم لیگ کی تنظیم اس کی جدوجہد۔ اس کا رُخ اور اس کی راہ سب اس سوال کا جواب ہیں[3]۔"

---

[1] گاندھی جناح مراسلت ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء۔

[2] تقاریر مسٹر جناح مطبوعہ اشرف پبلیشرز لاہور۔

[3] قائداعظم محمد علی جناح صفحہ ۵۴۴۔

۲۱، نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطۂ حیات اپنے تہذیبی ارتقاء اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں۔"

پھر اسی کانفرنس کے ۲۷، نومبر کے اجلاس میں فرمایا:

"ہمارا دین، ہماری تہذیب اور ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل قوت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں۔"

پھر ایک دوسرے موقعہ پر اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"لیگ ہندوستان کے ان حصوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کی علمبردار ہے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ وہ وہاں اسلامی قانون کے مطابق حکومت کر سکیں۔"

پھر پاکستان بننے سے صرف ڈیڑھ ماہ پہلے کانگرس خان برادران کے چھوڑے ہوئے شوشوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"خان برادران نے اپنے بیانات میں اور اخباری ملاقاتوں میں ایک اور زہر آلود شور برپا کیا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کرے گی۔ یہ بات بھی قطعی طور پر غلط ہے۔"

("ڈان" ۲۰، جون ۱۹۴۷ء)

کراچی میں ۱۶، جنوری کو ایک اعزازی دعوت میں جو کراچی بار ایسوسی ایشن کی طرف سے دی گئی تھی۔ تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"میرے لیے وہ گروہ بالکل ناقابلِ فہم ہے۔ جو خواہ مخواہ شرارت پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ پراپیگنڈا کر رہا ہے کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنے گا۔"

(پاکستان ٹائمز ۲۷، جنوری ۱۹۴۸ء)

قائداعظم نے مسلمانوں کو عید کا پیغام دیتے ہوئے ۱۹۴۵ء میں کہا:

"ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات و اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا ایمان اور قانونِ حیات ہے یعنی مذہبی، معاشرتی، تجارتی، تمدنی، عسکری اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔ ہمارے رسول اکرم کا ہمیں یہ حکم ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کریں تاکہ یہ مسلمان کی انفرادی و اجتماعی ہدایت کا باعث ہو۔" (پیغام عید ۱۹۴۵ء)

۱۹۴۲ء میں جالندھر کے مقام پر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا:

"میرے خیال میں تو مسلمانوں کے طرزِ حکومت کا آج سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل قرآن حکیم نے خود ہی فیصلہ کر دیا ہے۔"

پھر نومبر ۱۹۴۵ء میں پیر صاحب مانکی شریف کو ایک پرائیویٹ خط میں لکھا:

"اس بات کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ قانون بنانے والی جماعت جس میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت ہو گی، پاکستان کے لیے ایک ایسا قانون بنائے گی جو اسلامی قانون کے خلاف ہو۔ اور نہ ہی پاکستانی غیر اسلامی قانون کو قبول کریں گے۔"

یہ ہے پاکستان کا وہ تصور جو پاکستان کے قائد اعظمؒ کے ذہن میں اس ملک کی تشکیل سے پہلے ہی موجود تھا اور تشکیل کے بعد بھی موجود رہا اور اس کا جگہ جگہ اظہار ہوا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انہیں اس تصور کو عمل میں لانے کی حقیقی مہلت نہ مل سکی۔

قائد اعظم کے بعد تیسرے ذمہ دار ترین گواہ خود لیاقت علی خاں ہیں۔ ان کی گواہی لازماً اس قابل ہے کہ پاکستان کے حقیقی تصور کو جاننے کے لیے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔

لیاقت علی خاں کی گواہی

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور مسلم لیگ کے صدر لیاقت علی خان نے کہا:

• پشاور ۱۴ جنوری پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے اتحاد و یکجہتی کے لیے سرحد کے لوگوں سے اپیل کرتے ہوئے قائد اعظم کے ان اعلانات کا پھر اعادہ کیا کہ

پاکستان ایک مکمل اسلامی ریاست ہو گا۔ انہوں نے فرمایا کہ "پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہے۔ اور ہم دنیا کو دکھائیں گے کہ تیرہ سو برس پرانے اسلامی اصول کس قدر کارآمد اور قابلِ عمل ہیں۔" (پاکستان ٹائمز، ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء)

پھر ایک دوسرے موقعہ پر انہوں نے راولپنڈی میں اس خیال کو دہرایا:

"راولپنڈی۔ ۵ اپریل مسٹر لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان نے آج راولپنڈی میں اعلان کیا کہ پاکستان کا آئندہ دستور قرآن مجید کے احکام پر مبنی ہو گا۔ انہوں نے فرمایا کہ قائد اعظم اور ان کے رفقاء کی یہ دیرینہ خواہش رہی ہے کہ پاکستان کا نشو و نما ایک ایسی مضبوط اور مثالی اسلامی ریاست کی حیثیت سے ہو۔ جو اپنے باشندوں کو عدل و انصاف کی ضمانت دے سکے۔" (پاکستان ٹائمز ۷ اپریل ۱۹۴۸ء)

ایک اور موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کہا:

"پاکستان اس غرض کے لیے حاصل کیا گیا ہے۔ تاکہ دنیا کو اسلامی اصولوں پر قائم شدہ ریاست کا نمونہ دکھایا جا سکے۔" (سول ملٹری گزٹ، ۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء)

پھر ۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کوہاٹ ضلع مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام میں فرمایا:

"جہاں تک لوگوں کی اس امنگ کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت ہونی چاہیئے، دستور ساز اسمبلی کی پاس کردہ قرار داد مقاصد اس کی کافی ضمانت ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اگر ہم نے پاکستان میں اسلامی حکومت قائم نہ کی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا۔ ہم دنیا کو یہ دکھانے کا داعیہ رکھتے ہیں کہ فقط اسلام ہی وہ اصولِ زندگی ہے جو دنیا کے موجودہ مصائب کا خاتمہ کر سکتا ہے۔"

(پاکستان ٹائمز ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء)

۲۰ نومبر ۱۹۴۹ء کو کراچی کی بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا:

"پاکستان بس ایک اور صرف ایک ہی آرزو رکھتا ہے اور وہ آرزو ہے

خدمتِ اسلام اور خدمتِ بنی نوعِ انسان ــــــ میرا یہ محکم یقین ہے کہ آج دنیا جن مشکل مسائل سے دوچار ہے ان کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے کیونکہ اسلام انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو مذہب کے اور دوسرے کو دنیا کے حوالے نہیں کرتا۔ وہ اپنے پیروؤں کی پوری زندگی۔ انفرادی یا اجتماعی اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ وہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔ اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینا اس کی تعلیم ہے۔"

(ڈان۔ کراچی ۲ نومبر ۱۹۴۹ء)

اس کے بعد ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

"ـــــــ میں نے حصولِ پاکستان سے قبل مسلمان رائے دہندوں سے جو وعدے کیے تھے، میں انہیں بھولا نہیں ہوں۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر کیا تھا۔ کہ مسلمان اپنی زندگی اسلامی احکام کے قالب میں ڈھالیں۔ ہم نے ایک ایسے مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا جہاں ایک ایسی حکومت بنائی جا سکے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔ جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی۔ اس مقصد کے لیے ہزارہا مسلمانوں نے اپنی زندگیاں قربان کر دیں تقریباً ۷۰ لاکھ مسلمانوں نے اس مقصد کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا اور مرتے کٹتے پاکستان تک پہنچے۔ ہم نے مسلمان عوام سے جو وعدہ کیا تھا اب ہمیں اسے پورا کرنا ہے اور ایک ایسی حکومت قائم کرنی ہے۔ جس کا نصب العین سچا اسلامی نصب العین ہو۔ دنیا کو آج اسلام کی ضرورت ہے۔" (نوائے وقت ۸۔ جنوری ۱۹۵۰ء)

پھر یہ بھی کہا کہ

"ـــــــ ہمارا ایک مستقل نظامِ حیات ہے۔ ہمارا ایک الگ تمدن ہے۔ ہمارے اپنے طور طریقے ہیں اور ہم انہیں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب اسلامی اصولوں کے مطابق متحد ہونا اور انہی کے ذریعے عروج حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ــــ" (پاکستان ٹائمز ۸ دسمبر ۱۹۴۹ء)

اب میں اس مقدمے کے آخری گواہ کا بیان پیش کرتا ہوں۔ یہ شیخ الاسلام محترم المقام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی گواہی

مولانا محترم نے اسمبلی کے اندر توڑ مساعی سے یہ ممکن بنایا کہ پوری اسمبلی اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لیے قرارداد مقاصد پاس کرے جس کی روشنی میں اس کا آئندہ دستور مرتب کیا جائے۔ اس موقعہ پر انہوں نے ایک طویل تقریر فرمائی جس میں انہوں نے ممبران کو اس مقدس کام کی ادائیگی پر ابھارا۔ ان کی تقریر کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

• ——— ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو خفاش صفت ثابت نہ کریں جو دن کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتا۔ پاکستان مادیت کے جنور میں پھنسی ہوئی اور دہریت و الحاد کے اندھیرں میں بھٹکی ہوئی دنیا کو روشنی کا مینار دکھانا چاہتا ہے۔ یہ دنیا کے لیے کوئی چیلنج نہیں ہے یہ انسانیت کے لیے پُرامن پیغام حیات و نجات ہے۔ دنیا کے لیے عموماً اور پاکستان کے لیے خصوصاً کسی قسم کا نظام تجویز کرنے سے پہلے پوری قطعیت کے ساتھ یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس تمام کائنات کا جس میں ہم اور ہماری یہ مملکت بھی شامل ہے۔ مالکِ اصلی اور حاکم حقیقی کون ہے۔ اب اگر ہم مالک کی خالق الکل اور مقتدر اعلیٰ ہستی کو مانتے ہیں تو پھر ہم اس کے ملک میں اسی حد تک تصرف کرنے کے مجاز ہیں۔ جہاں تک کہ وہ اپنی مرضی سے ہمیں اجازت دے۔ ملک غیر میں کوئی غاصبانہ تصرف ہمارے لیے جائز نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی مالک کی اجازت اور مرضی کا علم اس کے بتلانے سے ہی ہو سکتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسی لیے بھیجے کہ انسانوں کو اس کی مرضی اور اجازت کی صحیح حدود معلوم کرا دی جائیں۔ اسی نکتہ نظر کے پیشِ نظر ریزولیشن میں "اسی کی مقرر کردہ حدود کے اندر" کے الفاظ رکھے گئے ہیں اور یہی وہ بنیادی نقطہ ہے۔ جہاں سے دینی اور لادینی حکومتوں کی لائنیں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں[1]۔

یہ اقتباس پوری وضاحت سے بتاتا ہے کہ مولانا عثمانی کے پیشِ نظر پاکستان کا حقیقی تصور

---

[1] روشنی کا مینار از مولانا شبیر احمد عثمانی ص ۱۷۔

دینی تھا یا لادینی اور ایک خدا پرستانہ نظامِ زندگی کو تھا یا "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" والے نظریئے کی حکومت کا قیام تھا۔

اس کے بعد آخری چیز جو پاکستان کے حقیقی تصور کو نکھار کر پیش کرتی ہے۔ وہ پاکستان کے عوام کا وہ مشہور و معروف مطالبہ ہے جو "مطالبہ نظام اسلامی" کے نام سے تاریخ پاکستان میں ہمیشہ ثبت رہے گا۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ مخصوص مفادات کے مالک اور اسلامی نظام کے مخالف عناصر نے حکومت کے اختیارات کے بل بوتے پر ابھی پر پرزے نہیں نکالے تھے۔ عوام تقسیم ملک کی شدید چوٹ کھا کر ابھی زخم خوردہ تھے۔ لیکن چوٹ کھانے کی وجہ ان کے تصور میں تازہ تھی۔ "حکمران کی ساحری" نے انہیں بے شعوری کی نیند نہیں سلایا تھا۔ عین اس وقت جب پوری نصف ملتِ پاکستان سخت زخم خوردہ اور کمزور تھی اس نے پاکستان کے لیے اسلامی نظام کا مطالبہ اٹھا دیا جو پورے ۱۸ ماہ تک پاکستان کے گلی کوچوں میں گونجتا رہا۔ اور بالآخر پاکستان کی نمائندہ دستور ساز اسمبلی کے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرار دادِ مقاصد پاس کر دینے پر یہ طوفان ختم ہوا۔ گویا وہ ورثنی ہنڈی تھی جو ملک بنتے ہی عوام نے حکمرانوں کے سامنے رکھ دی تھی۔

اس قرار دادِ مقاصد کے ذریعے پوری قوم کی طرف سے پاکستان کے حقیقی تصور کا دستوری اور آئینی طور پر تعین کر کے دنیا بھر کے سامنے اعلان کر دیا گیا۔

"——— چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکتِ غیر حاکم مطلق ہے۔ اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اقتدار حکمرانی اپنی مقررہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اقتدارِ حکمرانی خدا کی طرف سے ایک مقدس امانت ہے ——— لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خود مختار مملکتِ پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے ——— جس میں اصولِ جمہوریت و حریت و مساوات و رواداری، عدل عمرانی کی جس طرح اسلام نے تشریح کی ہے پورے طور پر پابندی کی جائے گی ——— جس کی رو سے مسلمانوں کو لازماً اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق ہو

قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ میں معین ہیں۔ مرتب و معین کریں [1]۔

یہ ہے پاکستان کا وہ حقیقی تصور جس پر پاکستان کا ابتدائی تخیل پیش کرنے والے، اس کی تحریک کی تشکیل و قیادت کرنے والے اس کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے پوری ملت پاکستان اور نمائندہ مجلسِ دستور ساز سب گواہ ہیں۔ ان سب کے نزدیک اسلام اور شورائی جمہوریت دو بنیادی پتھر ہیں۔ جن پر پاکستان کو کھڑا کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی ان دونوں پتھروں کو اس کی بنیاد سے نکال دینا چاہے تو خواہ وہ یہ کام بڑے خلوص اور نیک نیتی سے کرے ملک و ملت کے ساتھ اس کی خیر خواہی اور وفاداری لازماً مشکوک ہو گی۔

حصولِ مملکت کے لیے ملت کی قربانیاں

قومیں جب اپنے عروج پر ہوتی ہیں تو ممالک فتح کرتی ہیں اور جب مغلوب اور پس ماندہ ہو جاتی ہیں تو ملک ان کے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں لیکن پاکستان کا حصول برصغیر میں ملت اسلامیہ کا وہ حیران کن کارنامہ ہے کہ وہ دو سو سال سے غلامی میں جکڑی ہوئی تھی جب اس نے اپنے اتحاد کی قوت اور قربانیوں کی کثرت سے حالتِ غلامی میں بھی ایک نئی مملکت حاصل کی۔ جس کا نام پاکستان ہے۔ بلاشبہ اسے اس مملکت کے حصول کے لیے غیر معمولی مشکلات میں سے گزرنا پڑا۔ آنسوؤں کے سمندر اور خون کے دریا عبور کرنے پڑے۔ عصمتوں کی قربانیاں۔ معصوم بچوں کی مسکراہٹیں۔ کڑیل نوجوانوں کی جوانیاں، اور بوڑھوں کا پُروقار بڑھاپا قربان کرنا پڑا۔ تب یہ ملک حاصل ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم حالتِ عروج میں بھی کوئی ملک فتح کرتی ہے تو اسے شدید مزاحمت میں سے گزرنا پڑتا ہے اور جان جوکھوں میں ڈال کر ہی کوئی ملک حاصل ہوتا ہے جبکہ اس کے پاس یلغار کرنے والی فوجیں اور فتح کرنے والی طاقتور دھاک بھی موجود ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے کسی آئیڈیل کے حصول کے لیے حالتِ غلامی میں اپنے تصورِ حیات کی آزادی اور نفاذ کے لیے کوئی ملک حاصل کرنے کی جدوجہد کرے گی تو دشمن اس کی غلامانہ کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے

---

[1] اقتباس از قرارداد مقاصد، پاس کردہ دستور ساز اسمبلی پاکستان۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء

اس سے غیر معمولی قربانیاں طلب کریں گے اور ناقابلِ برداشت مظالم کی چکیوں میں پیس کر ہی اسے منزل تک پہنچنے کا راستہ دیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ حصولِ پاکستان کے مقصد سے مسلمان قوم کو ہٹانے کے لیے ہندو قوم نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی فسادات کے ذریعے برسوں تک آگ اور خون کی ہولی کھیلی۔ جائیدادیں جلائیں اور انہیں پست حوصلہ کرنے کے لیے ظلم و ستم کی کوئی قسم نہیں جو روا نہ رکھی ہو۔ برسوں کے ہولناک فسادات کے باوجود بھی جب ملت اسلامیہ مطالبۂ پاکستان اور جداگانہ قومیت کے تصور سے باز نہ آئی تو اس نے یہ ملک حاصل کیا۔ اس کے حصول میں اس نے کیا کیا قربانیاں پیش کیں۔ اس کی داستانیں ملت کی تاریخ کے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۵ء کے بیس سالوں میں بکھری پڑی ہیں۔ اگرچہ قربانیوں اور آزمائشوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے ہندو قوم کا اپنے خبثِ باطن اور اپنی ازلی مشرکانہ دشمنی کا سلسلہ مسلمان ملت کے ساتھ ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے۔ جب کبھی مسلمانوں کا زور ہوا تو اس نے غلامانہ ذہنیت کے ساتھ خوشامد اور تملق سے مسلمان حکمرانوں سے فوائد حاصل کیے لیکن جب کبھی اسے معمولی سا بھی اختیار اور موقع ملا تو اس نے اپنی فطرت کی پستی اور اپنی دناءت کی زیادتی کی بنا پر مسلمانوں کے ساتھ بدترین سلوک کیا اور اس کے احسانات کو ہمیشہ فراموش کیا۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے پورے ملک میں اپنی کثرت کے غرور اور اپنی مال و دولت کے وسائل کے وفور کے بل پر ہندوؤں نے ان علاقوں میں، جہاں جہاں مسلمان کمزور اقلیت تھے انہیں سخت ظالمانہ فسادات کے ذریعے مٹانے کی کوشش کی۔ تجارت اور کاروبار میں ان کے راستے بند کیے۔ چلتے ہوئے کاروباروں کو آگ لگا کر جلا دیا۔ اسکولوں، کالجوں میں مسلمان طلبہ کو داخلے سے روکا۔ ملازمتوں میں انہیں دُور دھکیلا۔ ترقی کے راستے پر سانپ بن کر بیٹھ گئے اور سانپ بن کر ہی ان کے ساتھ ہمیشہ پیش آئے۔ جب ملت اسلامیہ نے محسوس کیا کہ ان مشرکوں سے جدا رہ کر ہی آئندہ نسلوں کی ترقی کا راستہ کھولا جا سکتا ہے اور جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا تو فسادات کے ذریعے ان کی نسل کشی کی کوششیں شروع کر دیں۔

ہندوستان اگر جمہوریت کے نام پر اس لیے ہندوؤں کے حوالے کیا جا سکتا تھا کہ ہندوستان میں عمومی طور پر ہندوؤں کی اکثریت تھی اور مسلمانوں کو واپس نہیں کیا جا سکتا تھا اگرچہ ہندوستان کو انگریزوں نے مسلمانوں سے ہی چھینا تھا۔ یہ کارروائی جمہوریت کے نام پر کی جا رہی تھی۔

پھر اسی جمہوریت کے نام پر شمال مغربی علاقوں میں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت کی بنا پر یہ علاقہ مسلمانوں کے حوالے کیا جانا چاہیئے تھا لیکن اس معقول بات یعنی مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں کا حق خود ارادیت یہ حق تسلیم کرنے میں ہندو نے جو مزاحمتیں کیں وہ تاریخ جبر و تشدد کا بدترین اثاثہ ہیں۔ اس کے باوجود جب مسلمانوں نے یہ علاقے انگریز سے اصول خود ارادیت منوا کر سیاسی قوت و استدلال سے حاصل کر ہی لیے تو اس کی تقسیم میں اتنی بد دیانتیاں کی گئیں کہ اس بد دیانتی کی مثال ملنی مشکل ہے۔ کشمیر کے چوراسی ہزار مربع میل علاقے پر جہاں مسلمانوں کی ۸۵ فیصدی آبادی ہے وہاں جبراً قبضہ کر لیا۔ تقسیم کے اثاثے دینے سے انکار کر دیا۔ خزانہ تقسیم نہ کیا۔ پنجاب اور بنگال کو جبراً بے اصولی کے ساتھ تقسیم کر دیا اور پھر اس تقسیم کے موقع پر مسلمانوں پر وہ مظالم ڈھائے جو درندوں کو بھی شرما دیں۔

ڈیڑھ کروڑ سے زائد مسلمانوں کو اکھاڑ کر پاکستان کی طرف دھکیل دیا۔ واگہ سے دہلی تک پانچ سو میل کا علاقہ مسلمانوں سے مکمل طور پر خالی کرا لیا۔ پندرہ لاکھ سے زائد مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کر دیا۔ اربوں اور کھربوں مالیت کی جائیدادیں لوٹ لیں۔ ہزاروں مساجد اور مزار منہدم کر دیئے۔ اور جو جانیں بچا کر پاکستان میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان لاکھوں کی دردناک داستانیں عبرتناک اور اندوہناک ہیں۔ جن میں سے چند ایک کی جھلکیاں ہم یہاں پیش کرتے ہیں تاکہ تاریخ پاکستان کا یہ باب آنکھوں سے اوجھل نہ ہو اور نئی نسلیں یاد رکھیں کہ ان کے ملک کے لیے ان کے آباؤ اجداد نے کیا قربانیاں دی ہیں۔

قتل و غارتگری اور لوٹ مار

"رچرڈ سائمنڈس[1] نے جو اس وقت اسی علاقے میں تھے، جہاں پاکستان ہے۔ اپنی کتاب "دی میکنگ آف پاکستان" میں بڑے اختصار سے قتل و غارتگری کے ان ہنگاموں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اوائل اگست میں وسیع پیمانے پر تمام پنجاب میں بدامنی شروع ہوئی اور تقسیم کی تاریخ جتنی قریب آتی گئی اس میں شدت بڑھتی گئی۔ پاکستانی اس کی وافر شہادتیں پیش کرتے ہیں کہ یہ فسادات راشٹریہ سیوک سنگھ نے اور سکھوں نے شروع کیے اور وہ اس سے انکار بھی نہیں کرتے کہ مسلمانوں نے فوراً ان کا جواب دیا۔ لاہور، امرتسر اور شیخوپورہ کے پورے پورے علاقے جل رہے تھے اور فی الحقیقت پنجاب کے بہت سے بڑے شہروں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ دیہات میں مسلح گروہ لوٹ رہے تھے، جلا رہے تھے، قتل عام کر رہے تھے اور زنا بالجبر میں مشغول تھے۔ ہزاروں عورتیں اٹھائی گئیں جن کو ان کے رشتہ داروں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ پنجاب کی سرحدی فوج جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں تھے (غیر مسلم اکثریت میں) اور برطانوی افسروں کی زیر کمان تھے امن قائم رکھنے میں بالکل ناکام رہی۔ اس کی جمعیتوں نے اپنے فرقے کے لوگوں پر فیر کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر یہ فوج توڑ دی گئی اور یہ کام پاکستان اور بھارت کی فوجوں کے سپرد کیا گیا کہ اپنے اپنے علاقوں میں امن قائم کریں۔

پاکستان کی پوری تحریک میں مسلمانوں کو تشدد کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ پورے برصغیر میں مسلمانوں کی کوئی ایسی انجمن نہیں تھی جیسی ہندوؤں کی راشٹریہ سیوک سنگھ اور کوئی

---

[1] "پاکستان ناگزیر تھا" از سید حسن ریاض ص ۵۲۸ - ۵۲۹۔

ایسی جمعیت نہیں تھی جیسے سکھوں کی اکالی دل، اکال سینا یا شہیدی جتھے۔ مسلمانوں نے اپنے جذبات میں اس گندگی کو کبھی داخل ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کو قتل کریں یا سکھوں کو قتل کریں۔ اگر مسلمان ایسے متعصب، مجنون اور ظالم ہوتے تو ہندوؤں اور سکھوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے وہ سات صدیاں ان کے لیے بہت کافی تھیں۔ جن میں وہ ہندوستان کے مطلق العنان حاکم رہے تھے۔ ان کو تو اب پھر بھی شوق دامن گیر تھا کہ یہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری اور فیاضی برت کر، ایک مرتبہ پھر دنیا میں اس کی مثال قائم کریں کہ انصاف کی راہ سے امن و انتظام کیسے قائم کیا جاتا ہے۔

ملحوظ رہے کہ وہ معاہدہ ۲۲ جولائی کو ہوا تھا۔ جس میں ہندوستان اور پاکستان کی اقلیتوں کے لیے جان، مال، آبرو و مذہب کی حفاظت کی ضمانت کی گئی تھی۔ مشرقی پنجاب میں ۲۸ جولائی ۱۹۴۷ء سے وسط نومبر تک ہندوؤں اور سکھوں نے جو حملے کیے انکی تعداد ذیل میں درج ہے۔[1]

مسلمان پناہ گزینوں کی ٹرینوں پر حملے	۵۴ ء
سیالکوٹ اور جموں کی سرحدوں پر حملے	۶۴ ء
واگہہ اور قصور کی سرحدوں پر چھاپے	۲۸ ء

ہندوؤں اور سکھوں کے ان حملوں میں کتنے مسلمان قتل ہوئے اور ان پر کیا کیا مظالم ہوئے ان کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرقی پنجاب کے مسلمان اس ہنگامہ و فساد کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ ان میں کوئی تنظیم نہ تھی اور وہ بالکل غیر مسلح تھے۔ حملہ آوروں کی تعداد کہیں سینکڑوں اور کہیں ہزاروں ہوتی تھی۔ وہ سب تلواروں، برچھیوں، تیر اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ ان کے پاس آتشیں اسلحہ بھی ہوتے تھے اور وہ برین گنوں، اسٹین گنوں اور توپوں تک۔ تمام حملہ آور فوجوں کی اور پولیس ہی کی قیادت میں اور مدد کے ساتھ حملے کرتے تھے۔ ان کے درمیان مسلمانوں کی حالت بالکل وہی تھی جو ہانکے کے شکار میں ہرن

---

[1] ماخوذ از "سکھ میدان کارزار میں"

جیسے بے ضرر جانور کی ہوتی ہے۔

مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے دہلی میں جو کچھ کیا گیا اس کے متعلق ایک فوجی افسر کے بیان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ یہ فوجی افسر جنرل ہیڈ کوارٹر انڈیا کی کوارٹر ماسٹر جنرل برانچ کے ساتھ اس مقصد سے مقرر کیے گئے تھے کہ حکومت پاکستان کی کراچی کو روانگی کا انتظام کریں۔[1]

۴، ستمبر ۱۹۴۷ء

غیر مسلم پناہ گیروں کے کیمپوں میں ہر روز عام جلسے ہو رہے تھے۔ مشرقی پنجاب کی طرف سے ہدایت یہ تھی کہ پاکستان کے عملے یا اس کے مال و اسباب کو بچ کر نکل جانے کا موقع نہ دیا جائے۔ دہلی کی طرف آنیوالی تمام ٹرینوں پر دہلی کی مضافات میں حملے کیے جاتے تھے اور مسلمان مسافر تہ تیغ کر دیئے جاتے تھے۔ رقبہ دہلی میں کرفیو نافذ ہونے کے باوجود سکھ تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جیپوں میں گھومتے نظر آتے تھے . . .

نواح دہلی کے دیہات میں ۲، ستمبر کو فسادات شروع ہوگئے۔ پالم کے ہوائی اڈے سے جلتے ہوئے دیہات کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ ان دیہات کے مسلم باشندوں کو لوٹا گیا، قتل کیا گیا اور گھروں سے نکال دیا گیا۔

۷، ستمبر ۱۹۴۷ء

پنجاب میل کے بعد جو ٹرین بی بی اینڈ سی آئی ریل لائن پر دہلی سے روانہ ہوئی،

---

[1] رچرڈ سائمنڈس - دی میکنگ آف پاکستان صفحہ ۸۲ سے ۸۵

وہ نظام الدین کے قریب روک لی جاتی تھی۔ مسلمان مسافر گھسیٹ کر باہر نکالے جاتے تھے اور ہلاک کر دیئے جاتے تھے۔ ۸ بجے کے بعد دہلی کے اسٹیشن پر قتلِ عام اور لوٹ مار کا ہنگامہ گرم ہو گیا۔ ۹ بجکر بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ کناٹ پلیس میں لوٹ مار شروع ہو گئی۔ پولیس اور فوج الگ کھڑی ہوئی، تماشہ دیکھ رہی تھی۔

پالم کے ہوائی اڈے پر ۷ ستمبر کو شام کے ۶ بجے تک میری ڈیوٹی تھی۔ دہلی کے تمام حصوں سے قتلِ عام، لوٹ مار اور آتش زنی کی خبریں آتی رہیں۔ ۵ ستمبر کو قرول باغ میں امتحان کے ہال کے باہر بہت سے ان مسلمان لڑکوں کو ذبح کر دیا گیا جو میٹرک کا امتحان دے رہے تھے۔

۷ ستمبر کو لودھی روڈ اور ولینگٹن کے ہوائی اڈے کے رقبے کا محاصرہ کیا گیا، تمام گھرے ہوئے مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔ صرف اس دن لودھی روڈ اور ولینگٹن کے اڈے پر جو مسلمان مارے گئے ان کی تعداد ہزاروں تھی۔ ایک انگریز نے جو اس دن اتفاق سے ولینگٹن کے ہوائی اڈے پر تھا مجھے بتایا کہ مسلمانوں کو ہلاک کرنے کے لیے اسٹین گنیں اور تلواریں استعمال کی گئیں۔

۸ ستمبر ۱۹۴۷ء

آج کا دن دہلی اور نئی دہلی میں قتلِ عام، لوٹ مار اور آتش زنی کے اعتبار سے سخت ترین تھا۔ کناٹ پلیس میں مسلمانوں کی تمام دوکانیں لوٹ لی گئیں، چاندنی چوک، سبزی منڈی اور پہاڑ گنج میں مسلمانوں کی دوکانیں اور ان کا مال اسباب وسیع پیمانے پر لوٹا گیا اور صدہا مسلمان قتل کر دیے گئے۔ دہلی کے مسلمانوں کی ہمت اور مزاحمت کی اہلیت بالکل ختم ہو گئی کیونکہ ان کو صرف مسلح بلوائیوں ہی کا مقابلہ درپیش نہیں تھا

بلکہ پولیس اور فوج بھی ان کی مخالف تھی۔ مسلمان پولیس کی اکثریت یا تو غیر مسلح کر دی گئی یا شہر کے غیر اہم حصوں میں تعینات کر دی گئی تھی۔ مسلمان پولیس مینوں کی بھی خاصی تعداد ہمارے کیمپ میں پناہ گزین ہوئی۔ ۸، ستمبر کی شام تک ایل بلاک میں ۱۲، ہزار پناہ گزین جمع ہو چکے تھے۔

ہمارے بعض افسر اور مٹھی بھر مسلمان سپاہی قرول باغ اور پہاڑ گنج جیسے خطرناک اور فساد زدہ علاقوں میں بھی گئے اور انہوں نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جانیں بچائیں۔ انہوں نے بے شمار لاشیں اور جلے ہوئے مکانات دیکھے۔ جتنے آدمی بچا کر نکالے گئے وہ سب کے سب ایک ہی قصہ سناتے تھے کہ فوج اور پولیس نے ان کی کوئی مدد نہیں کی اور پولیس نے مسلمانوں کو زبردستی ان کے گھروں سے نکالا۔ جو مکانات اس طرح خالی کرا دیئے گئے ان میں ہندو اور سکھ فوراً داخل ہو گئے اور مسلمانوں کے مال اور اسباب پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا۔

اگر مسلمانوں نے منظم حملوں کی مزاحمت کی تو فوج اور پولیس نے ان کو سخت بے دردی کے ساتھ مغلوب کر لیا۔ ۸، ستمبر کو بدنظمی اور ابتری کی یہ حالت تھی کہ کوئی مسلمان خود کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ دہلی کے مسلمانوں کے لیے یہ نہایت تاریک دن تھا۔ اگرچہ پوری دہلی اور خصوصاً نئی دہلی کے خاص علاقوں میں کرفیو نافذ تھا لیکن کرفیو کے دوران میں کوئی کسی کو چیک نہیں کرتا تھا۔ کناٹ پلیس میں ۱۰، بجے رات تک مشین گن چلنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔

۹، ستمبر ۱۹۴۷ء

ایک عینی شاہد نے جو پرانے قلعے میں طبی امداد کے کام پر متعین تھا یہ

دیکھا کہ نئی دہلی کے واٹر ورکس اور فیروز شاہ کے کوٹلے کے درمیان لاشوں سے بھری ہوئی لاریوں پر لاریاں لائی جا رہی ہیں اور وہاں مردوں کا انبار لگایا جا رہا ہے۔ شام تک لاشوں کی تعداد کسی حالت میں دس ہزار سے کم نہ ہو گی۔ ۹ ستمبر کو شام کے ۷ بجے پیٹرول اور ایندھن سے مردوں کے اس ڈھیر کو جلا دیا گیا۔ پرانے قلعے سے یہ آگ ہزاروں نے دیکھی۔

۱۰ ستمبر اور ۱۱ ستمبر کو کسی حد تک حالت بہتر ہو گئی تھی لیکن پہاڑی دھیرج باڑہ ہندو راو، نواب گنج، قصاب پورہ اور جھیل کلو نجہ میں مسلمانوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا۔

۴ اور ۱۴ ستمبر کے درمیان کم از کم بیس پچیس ہزار مسلمان دہلی میں مارے جا چکے تھے، غیر مسلموں کا نقصان جان دو ہزار سے زیادہ نہیں تھا۔

. . . .

سٹروی۔ پی بینن جنہوں نے اس کی بڑی کوشش کی ہے کہ نواکھالی سے دہلی تک جتنے ہندو مسلم فسادات ہوئے ان سب کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کر دیں، دہلی کے متعلق بیان کرتے ہیں:

تنظیم کے ساتھ جو بلوے ہوئے ان سے قطع نظر لوٹ، خنجر زنی اور آتش زنی کی متفرق وارداتیں شہر میں بہت ہو رہی تھیں اور حضرت مند شرپسند اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ خنجر زنی ایک ہنر بن گیا تھا۔ اس میں المناک بات یہ تھی کہ زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے اس کا شکار تھے۔ خنجر زنی صرف تنگ تاریک گلیوں تک محدود نہ تھی۔ خونخوار بدمعاشوں کے گروہ گھروں میں گھس جاتے تھے اور لوگوں کو گھسیٹ کر قتل کرنے کے لیے باہر لے جاتے تھے۔ ان دنوں یہ حالت رہی کہ بدمعاشوں کے غداراانہ اور خاموش قاتلانہ حملوں سے لوگوں کو اچھی طرح پناہ نہیں دی جا سکی جو انتقام

کے جوش میں آنکھ کے بدلے آنکھ کا اور دانت کے بدلے دانت کا مطالبہ کر رہے تھے۔

انتقام[1] کے بہت سے طریقے تھے۔ ان میں سے ایک آگ لگانا تھا دہلی میں آگ بجھانے کے پورا انجن تھے۔ یہ ہر وقت مصروف رہتے تھے اور ضرورت ان سے زیادہ کی تھی۔ بیک وقت بیسیوں جگہ آگ لگی رہتی تھی ۸ ستمبر کی شب میں یہ حالت تھی کہ نئی دہلی کے مکانوں کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے نظر آتا تھا کہ پرانی دہلی میں بے شمار جگہ آگ لگی ہوئی ہے اور ان سے دھواں اٹھ کر فضا میں بل کھا رہا ہے۔

... ...

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے یہ دہلی میں مسلمانوں کا پورا بیان نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ بری حالت تھی۔ آخر اگست ۱۹۴۷ء تک دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب قریب قریب برابر تھا۔ ۲ ستمبر سے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا اور ۱۵ ستمبر تک سوائے پتلی قبر، کوچہ چیلان، گلی قاسم جان اور کوچہ پنڈت کے کہیں مسلمان باقی نہ رہے تھے۔ ... .

پروفیسر فاروق نجیب اختر اپنی کتاب مطالعہ پاکستان میں لکھتے ہیں :

ملازمین اور مہاجرین

تقسیم ملک کے وقت سرکاری ملازمین[2] کے بارے میں طے پایا تھا کہ وہ دونوں نئی حکومتوں میں جس کی چاہیں ملازمت اختیار کریں۔ بھارت کے وزیر داخلہ نے اعلان کر دیا کہ کوئی ہندو پاکستان کی ملازمت نہیں کرے گا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستانی علاقوں

---

[1] سکھ میدان کارزار میں، ضمیمہ ۷، صفحات ۴۳۔ ۵۲۔

[2] مطالعہ پاکستان از پروفیسر فاروق نجیب اختر ص ۱۵۸۔ ۱۵۹۔

میں تعینات، پاکستان کی ملازمت میں آنے والے مسلمان ملازمین کو کیسے منتقل کیا جائے؟ پہلے اس کے لیے دہلی سے مخصوص ٹرینیں چلانا طے پایا، لیکن جب ہندو فسادیوں نے ہر جگہ گاڑیوں پر حملے شروع کر دیئے تو یہ کام برطانوی فضائی کمپنی کے ہوائی جہازوں کے ذریعے ہونے لگا۔ تاہم منتقلی کے اس پروگرام میں بھارتی حکومت نے بھرپور رکاوٹیں پیدا کیں۔

اس ضمن میں ایک مشکل یہ تھی کہ نوزائیدہ مملکت کے پاس نہ دفاتر کے لیے عمارتیں تھیں نہ میزیں کرسیاں اور نہ قلم دوات۔ عمارتوں کی کمی کو ٹین کے شیڈ تعمیر کر کے پورا کیا گیا۔ بعض اوقات پچ پچ اعلیٰ سرکاری افسر ایک چھت کے نیچے کام کر رہے ہوتے۔ وقتی طور پر تجربہ کار انگریز افسروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ سندھ کے علاوہ بقیہ چار صوبوں کے گورنر بھی انگریز تھے۔ بہرحال یہ ایک چیلنج تھا جسے باعزم قوم نے قبول کیا۔ مادی بے سروسامانی کی کمی ملی تعمیر کا قابل ستائش جذبہ پورا کر رہا تھا۔

ان مسائل میں سرفہرست انتظامی کے علاوہ انسانی مسئلہ مہاجرین کی آمد تھی۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا تبادلہ آبادی تھا۔ حالانکہ تقسیم ہند کی سکیم میں یہ چیز شامل نہ تھی۔ اس کے محرک دراصل سکھ تھے جو اگرچہ تقسیم ہند سے پہلے نہ پا سکے تھے مگر اب چاہتے تھے کہ ایک خاص علاقے میں جمع ہو جائیں جو بعد میں کبھی سکھ ریاست بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مشرقی پنجاب میں بڑے وسیع پیمانے پر قتل و غارت کی۔ قافلوں اور ٹرینوں کو روک روک کر قتل کیا گیا۔ یوں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ معصوم بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ نوجوان پردہ دار دوشیزاؤں کے مادر زاد برہنہ جلوس نکالے گئے۔ انہیں اغواء کیا گیا اور عصمتیں لوٹی گئیں۔ بوڑھوں اور بیماروں کو روندا گیا۔ مکانات نذرِ آتش کیے گئے۔ غرضیکہ ایسی درندگی کے مظاہرے کیے گئے جن کی کسی انسان سے توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ دراصل مسلمانوں سے پاکستان کی قیمت وصول کی جا رہی تھی۔ مشرقی پنجاب سے ایک کروڑ سے زائد بے سروسامان مسلمان سرحد کے اس پار دھکیل دیئے گئے ۱۰ لاکھ سے زائد افراد قتل یا لاپتہ ہوئے۔

مقامی مسلمانوں نے آنے والے مہاجرین کا خیر مقدم کیا۔ انہیں دل میں جگہ دی۔ لوگوں نے ذاتی سطح پر ان کے مسائل حل کرنے میں تگ و دو کی۔ سرکاری سطح پر ان کی آبادکاری کے لیے

محکمہ بحالیات قائم کیا گیا اور باقاعدہ وزارت مہاجرین قائم کی گئی۔ ان کی خوراک، لباس اور رہائش کے عارضی انتظامات کے علاوہ ان کی مستقل آباد کاری وقت کی ضرورت تھی مستقل آبادی بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ان کی جائیداد کے کلیم حاصل کرکے بھارتی حکومت سے اس کی تصدیق کروائی گئی اور پھر انہیں مستقل طور پر جگہ کی الاٹمنٹ کی گئی۔ بہرحال قوم نے اپنے عزم صمیم سے یہ عظیم مسئلہ بھی حل کر لیا ــــــــ

خوں رنگ ایام

ــــــــ لاہور کے ریلوے سٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے گاڑی آکر رکی تھی جو مسلمانوں کی لاشوں سے بھری ہوئی تھی۔ ڈبے میں لاشیں تھیں، مردوں کی، جوانوں کی، بچوں کی، جوان عورتوں کی ... ہر ڈبہ خون سے لت پت تھا۔ لاشیں پلیٹ فارم پر رکھی گئیں تو پلیٹ فارم بھی خون سے لت پت ہو گیا۔

ایک ٹرین امرتسر سے لاہور کے لیے روانہ ہونے لگی۔ ٹرین مسلمانوں سے ٹھنسی ہوتی تھی۔ ڈبوں کی چھتوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ ہر چہرہ خوف زدہ تھا۔ آنکھوں میں پاکستان کی امید اور آرزو تھی...

پولیس کی ذمے داری اس ریل گاڑی کو صرف روانہ کرنے تک تھی۔ راستے میں کیا گزر جائے گی اس کا مسئلہ نہیں تھا اور پولیس جانتی تھی کہ اس ریل گاڑی کا سلامت لاہور پہنچنا ناممکنات میں سے تھا۔ ان ایام کی کہانی مولانا آزاد کی زبانی سنیئے[1]:

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو چار بجے شام بھارت کا ترنگا پرچم برطانوی یونین جیک کی جگہ لال قلعہ دہلی پر لہرایا جا رہا تھا۔ ماہ اگست کی چلچلاتی دھوپ کے باوجود لوگ گھنٹوں سے قلعے کے سامنے جمع تھے ان کا ہجوم لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت آگئی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جب اس تقریب سے خطاب کرنے تشریف لائے تو زبردست ہجوم کی وجہ سے

---

[1] مولانا آزاد کی زبانی ۱۹۴۷ء کے مسلم کش فسادات کی کہانی۔ اردو ڈائجسٹ آزادی نمبر ۱۹۸۶ء۔

وہ کار سے باہر نکل سکے اور انہوں نے اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے لوگوں سے خطاب کیا۔
یہ خوشگوار لمحات بشکل اڑتالیس گھنٹے برقرار رہے ہوں گے کہ اگلے ہی دن دارالحکومت میں فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ مشرقی پنجاب کے تمام شہروں، قصبوں اور دیہات میں مسلمانوں کا مال و اسباب لوٹا جا رہا ہے، ان کے مکانوں اور دکانوں کو نذرِ آتش کیا جا رہا ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح ہجوم بے گناہ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا بڑی بے دردی اور بے رحمی سے قتلِ عام کر رہے ہیں۔

ان ہولناک واقعات و واردات میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مشرقی پنجاب کے وزراء یکے بعد دیگرے دوڑ دوڑ کر دہلی پہنچ رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے انڈین نیشنل کانگرس کے صوبائی اور مقامی لیڈروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ یہ لوگ پریشانی اور گھبراہٹ کا شکار ہو رہے تھے اور حالات پر قابو پانے سے اپنی مجبوریوں کا اظہار کر رہے تھے۔ ہم نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ ان حالات میں فوج کیوں طلب نہیں کر لیتے۔ ان کا جواب تھا کہ انہیں پنجاب میں متعین فوج پر کوئی اعتماد نہیں۔ ان لوگوں میں فرقہ پرستی کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں اور انہیں ان سے کسی بہتری کی امید نہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ مشرقی پنجاب میں فوج دہلی سے بھجوائی جائے۔

دہلی کی فضا اگرچہ شروع شروع میں پر امن رہی لیکن جلد ہی وہاں کے حالات بھی بگڑنے شروع ہو گئے۔ ہمارے لیے اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ دہلی میں موجود فوج کو مشرقی پنجاب بھجوا دیں۔ تاہم ہم نے فیصلہ کیا کہ بھارت کے دوسرے علاقوں سے فوج مشرقی پنجاب بھجوا دی جائے لیکن اس سے پیشتر کہ اس تجویز پر عمل کیا جاتا، فرقہ وارانہ فسادات دہلی میں بھی پوری طرح پھوٹ پڑے۔ یہ سب کچھ مغربی پنجاب سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی کارفرمائی تھی۔ انہوں نے یہاں پہنچ کر افواہوں کا وہ بازار گرم کیا کہ دہلی کا پرسکون ماحول دھواں آلود ہو کر رہ گیا اور ہر ہندو اور سکھ مسلمان کا جانی دشمن بن گیا۔

ان فرقہ وارانہ فسادات کو خواہ وہ مشرقی پنجاب میں سر ابھار رہے تھے۔ خواہ دہلی میں جنم لے رہے تھے یا کسی اور جگہ، فوج کی امداد سے فوری طور پر دبایا جا سکتا تھا لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بے حد

افسوس ہوتا تھا کہ فوج بھی مجرمانہ حد تک فرقہ پرستی کے جنون میں مبتلا ہو چکی تھی حالانکہ تقسیم سے قبل یہ امر ہندوستانی فوج کی ایک مخصوص خوبی تصور کیا جاتا تھا کہ وہ فرقہ پرستی کے جذبات سے بالاتر ہے اور مذہبی جنون ان کے دل و دماغ پر اثر انداز نہیں ہوا۔ دہلی میں تعینات فوجی دستے ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھے۔ ان کی موجودگی میں امن و امان کا مسئلہ بگڑ تو سکتا تھا لیکن اس کے سنورنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

ان فرقہ وارانہ فسادات نے نہ صرف اندرونِ شہر دہلی مسلمانوں کو جان و مال کے بھاری نقصانات سے دوچار کیا بلکہ بیرونِ شہر بھی قرول باغ، لودھی کالونی، سبزی منڈی، صدر بازار اور پہاڑ گنج کو جہاں مسلمان بہت بڑی تعداد میں آباد تھے، قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا سامنا تھا۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہ رہا تھا کہ ہم ان لوگوں کے لیے فوجی تحفظ فراہم کر سکیں۔ ہم ایک جگہ انتظام کرتے تو اور دوسری جگہ گڑبڑ شروع ہو جاتی تھی۔

فسادات کے اس زمانے میں مَیں نے فوجی افسروں کے ہمراہ دہلی کے مختلف محلوں کا دورہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور وہ اپنے آپ کو مظلوم اور بے یار و مددگار سمجھ بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کو حملہ آوروں نے ان کے جملہ مال و اسباب پر ڈاکہ ڈالا تھا اور انہیں ان کی رہائش گاہوں سے تن کے کپڑوں میں نکال دیا گیا تھا، چنانچہ بہت سے ایسے مسلمان لوگوں کو میں نے اپنی کوٹھی میں پناہ دی۔ کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں ان کے لیے خصوصی شامیانے لگوائے گئے لیکن جلد یہ خیمے تمام ان بے آسرا لوگوں سے پر ہو گئے۔ ہمیں اس کی زیادہ فکر تھی جو دو دو چار چار کی صورت میں شہر کی ہندو آبادیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں فوج کی حفاظت میں ان کے گھروں سے نکال کر لایا گیا اور انہیں بھی میں نے اپنے ہاں جگہ دی۔

ہمارے پیشِ نظر دارالحکومت کے جو حالات تھے ان سے واضح طور پر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی امن و امان کی بحالی میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔ اس لیے دہلی اور مضافات کے بے گھر بے در لوگوں کی غیر معمولی کثیر تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان لوگوں کی عارضی آباد کاری کے لیے وسیع پیمانے پر انتظامات کیے جائیں چنانچہ ہم نے اس مقصد

کے لیے دہلی کے پرانے قلعے کا انتخاب کیا اور وہاں پر لوگوں کے لیے ایک بڑا کیمپ قائم کر دیا۔ یہ کیمپ بھی آہستہ آہستہ پر ہوتا چلا گیا۔ اس کیمپ میں سے روزانہ کچھ نہ کچھ مسلمان پاکستان کی جانب نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ پھر بھی بہت سارے مسلمان پناہ گزینوں کو سردی کا پورا موسم کیمپ میں گزارنا پڑا۔ ان بے چاروں نے گرمی اور برسات کے موسم جیسے تیسے گزار لیے لیکن اب سخت سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا اور ہزاروں پناہ گزین ٹھٹھراتی ہوئی سردی میں کھلے آسمان کے نیچے کس مپرسی کے عالم میں رات دن پڑے رہتے تھے۔ انہیں مناسب خوراک فراہم نہ کی جاتی تھی اور نہ ان کے لیے پینے کا صاف پانی دستیاب تھا۔

سب سے بڑا مسئلہ ان لوگوں کے سامنے رفع حاجت کا تھا جس کا انتظام سرے سے کوئی موجود ہی نہ تھا۔ اس طرح پورے کا پورا کیمپ گندگی کا شکار تھا۔ انہی ایام میں ایک روز ڈاکٹر ذاکر حسین ایمرجنسی بورڈ کے سامنے پیش ہوئے اور مسلم کیمپ کی حالتِ زار کے متعلق ان کو بتایا اور کہا کہ اگرچہ ان غریب لوگوں کو فسادیوں کے ہاتھوں موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا گیا ہے لیکن پرانے قلعے کے اس کیمپ میں بھیج کر گویا جیتے جی ان کو ایک بہت بڑی قبر میں دفن ہونے کے لیے دھکیل دیا گیا ہے۔ بورڈ نے مجھے ہدایت کی کہ میں فوری طور پر اس کیمپ کا معائنہ کروں اور بتاؤں کہ ان لوگوں کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اسی روز کیمپ کا معائنہ کیا اور اگلی صبح بورڈ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کی۔ بورڈ نے میری رپورٹ کے پیشِ نظر فیصلہ کیا کہ کیمپ میں وافر مقدار میں پینے کا صاف پانی فراہم کیا جائے اور وہاں صفائی کے انتظامات کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ بورڈ نے محکمہ دفاع سے کہا کہ وہ آج ہی کچھ خیمے اس کیمپ کو فراہم کرے تاکہ پناہ گزینوں کو سر چھپانے کا مناسب آسرا نصیب ہو۔ بورڈ کے ان فیصلوں پر اسی دن عمل ہوا اور کیمپ کی حالت کچھ بہتر ہو گئی۔

دہلی میں امن و امان کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے ہم نے کچھ اسپیشل مجسٹریٹ بھی مقرر کیے تھے لیکن افسوس کہ وہاں بھی ہمیں اسی فرقہ وارانہ ذہنیت سے سابقہ پڑا اور ان میں سے بیشتر لوگ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام رہے۔ مجھے ایک ہندو کانگرسی کارکن کی زبانی معلوم ہوا کہ جب اس نے ایک ہندو اسپیشل مجسٹریٹ کی توجہ ہندو محلے میں رہائش پذیر چند مسلم

خاندانوں پر توقع حملے کی جانب مبذول کرائی تو اس نے لعن طعن کی اور کہا کہ تم کیسے ہندو ہو جو مسلمانوں کی طرفداری کر رہے ہو۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب جواہر لال، پٹیل اور میں گاندھی جی کے پاس بیٹھے تھے۔ جواہر لال نے بڑے غمزدہ انداز میں کہا کہ وہ دہلی کے واقعات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ جہاں مسلمان شہری کتوں اور بلیوں کی طرح مارے جا رہے ہیں اور اس معاملے میں ان کا ضمیر قطعی مطمئن نہیں ہے۔ سردار پٹیل نے بڑی دیدہ دلیری سے جواب دیا کہ جواہر لال جی کی شکایت حقائق پر مبنی نہیں، اکا دکا واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تاہم ان کا بھی ہم سختی سے نوٹس لیتے ہیں۔ یہ جواب سن کر جواہر لال نہرو خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے گاندھی سے مخاطب ہو کر اداس لہجے میں کہا کہ اگر سردار پٹیل کا یہ نظریہ ہے تو پھر میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

سردار پٹیل کا ذہن ان فسادات میں کس طرح کام کر رہا تھا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے: ایک روز وہ مسلمانانِ دہلی پر ہندوؤں اور سکھوں کے حملوں کو جائز ثابت کرنے کے لیے دور کی کوڑی لائے۔ انہوں نے ایمرجنسی بورڈ کی میٹنگ میں بتایا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو تہ تیغ کرنے کے لیے مہلک ہتھیار جمع کر رکھے تھے۔ اگر ہندو اور سکھ اپنی مدافعت میں پہل نہ کرتے تو ظاہر تھا کہ مسلمان انہیں فنا کر ڈالتے۔ لہٰذا پولیس نے مسلمانوں پر چھاپہ مار کر قرول باغ اور سبزی منڈی سے کچھ ہتھیار برآمد کیے ہیں اور وہ یہاں پہنچا دیے گئے ہیں۔ انہوں نے ایمرجنسی بورڈ سے اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ آج کی کارروائی شروع ہونے سے قبل وہ ہتھیار دیکھ لیں۔ چنانچہ ہم ساتھ والے کمرے میں یہ ہتھیار دیکھنے چلے گئے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں دو تین میزوں پر سبزی کاٹنے کے چاقو، چھریاں، پنسل تراش، چھلنیاں اور نلکوں کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دو ایک چاقوؤں اور چھریوں کو اٹھا لیا اور طنزاً ہنس کر کہنے لگے کہ کتنے بے وقوف تھے وہ مسلمان جو ان ہتھیاروں سے دہلی فتح کرنے چلے تھے۔

گاندھی جی نے کہا کہ میری اپنی آنکھوں کے سامنے دہلی کے مسلمان روزانہ قتل کیے جا رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب سردار پٹیل حکومت ہند کے ہوم منسٹر ہیں

اور دارالحکومت میں امن و قانون برقرار رکھنا ان کی اپنی ذمے داری ہے۔ انہوں نے کہا کہ سردار پٹیل دہلی کے مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے میں قطعی ناکام رہے ہیں بلکہ وہ ان شکایات کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے جو مسلمانوں کی جانب سے ان کو ارسال کی جاتی ہیں۔ میں اس لاپروائی اور غفلت پر احتجاج کرتا ہوں اور اس صورتِ حال کے خلاف اس وقت تک برت رکھنے کا اعلان کرتا ہوں جب تک کہ حالات میں خوشگوار تبدیلی واقع نہ ہو جائے۔

پاکستان کی قیمت

پنجاب سی آئی ڈی کے سربراہ مسٹر سیویج نے بہ نفس نفیس دہلی پہنچ کر جو رپورٹ وائسرائے کو دی وہ یہ تھی:

۱؎ سکھوں کے ایک انتہا پسند گروپ کا رابطہ ہندوستان کے سب سے زیادہ انتہا پسند مسلم دشمن گروپ آر ایس ایس کے ساتھ قائم ہو چکا ہے۔ سکھوں اور آر ایس ایس نے باہمی تعاون کے ساتھ مسلمانوں کا صفایا کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ سکھوں کی سربراہی تیسرے درجے کا اسکول ماسٹر تارا سنگھ کر رہا ہے۔ اس نے سکھوں کا ایک خفیہ اجلاس طلب کیا اور اس میں اعلان کیا کہ سکھوں کو چاہیئے کہ وہ آر ایس ایس کے ساتھ مل کر ہندوستان کو مسلمانوں کے خون سے نہلا دیں۔ یہ خفیہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا ہے۔ دونوں گروپوں، سکھوں اور آر ایس ایس کے مذہبی جنونی انتہا پسند ہندوؤں کے گروپ نے اپنے اپنے ذرائع یکجا کر کے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

سکھ جو زیادہ منظم، تربیت یافتہ اور دھماکہ خیز مواد کے استعمال میں مناسب مہارت رکھتے ہیں، وہ ان خاص ریل گاڑیوں کو تباہ کریں گے جو معقول حفاظتی انتظام کے ساتھ دہلی سے کراچی روانہ ہوں گی۔ ان ریل گاڑیوں میں اہم مسلمان سرکاری ملازم اثاثوں اور سرکاری فائلوں اور

۱؎ فریڈم ایٹ مڈنائٹ از لیری کولینز شائع شدہ اردو ڈائجسٹ آزادی نمبر ۱۹۸۶ء۔

اسباب کے ساتھ پاکستان کی طرف سفر کرنے والے ہیں۔ سکھوں کا منصوبہ یہ ہے کہ ایسی تمام ریل گاڑیاں جن پر مسلمان سرکاری عملہ سوار ہو اور کاغذات اور اثاثے ہوں جو پاکستان کے حصے میں آئے ہیں۔ راستے میں انہیں مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے۔

ماسٹر تارا سنگھ ایک وائرلیس سیٹ حاصل کر کے نصب کر چکا ہے۔ اس وائرلیس سیٹ کے ذریعے انتہا پسند سکھوں کو پاکستان جانے والی خصوصی ٹرینوں کی روانگی اور راستوں کی بروقت اطلاع دی جا سکے گی۔

انتہا پسند اور دہشت گرد ہندو تنظیم آر ایس ایس نے یہ ذمے داری سنبھالی ہے کہ چونکہ ہندو ہونے کے ناتے وہ مسلمانوں میں آسانی سے گھل مل سکتے ہیں اور ان کی انفرادی شناخت نہ ہو سکے گی، اس لیے ان کی ایک بھاری تعداد پاکستان پہنچا دی جائے گی۔ آر ایس ایس کے ان تمام انتہا پسندوں کو برطانوی فوجی ساخت ملز کا ایک ایک ہینڈ گرینیڈ دیا جا چکا ہے۔ اس گروہ کے ارکان کو اس طرح کیموفلاج کر کے بھیجا جائے گا کہ ایک کو دوسرے کی شناخت نہ ہو گی گویا ان میں سے کوئی کسی وجہ سے گرفتار بھی ہو جائے تو وہ کسی دوسرے کی اطلاع نہ دے سکے گا۔ اس طرح منصوبہ انتہائی راز ہی میں رہے گا۔"

مسٹر سیویج نے اس خوفناک منصوبے کی تفصیل بتلاتے ہوئے کہا: "۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آر ایس ایس کے یہ انتہا پسند اس راستے پر بکھر جائیں گے جس سے قائداعظم محمد علی جناح کی سواری ان کی سرکاری رہائش گاہ سے دستور ساز اسمبلی کا فاصلہ طے کرے گی۔ آر ایس ایس کے دہشت پسند، قائداعظمؒ کی کھلی سواری پر ہینڈ گرینیڈ پھینک کر انہیں اس وقت ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ جب پاکستان کا قیام معرض وجود میں آنے والا ہو۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی جنگ چھڑ جائے گی جو پہلی جنگِ عظیم کی طرح ہو گی ـــــ جس کا آغاز سربیا کے ایک دہشت پسند نے سرائیو شہزادے پر بم پھینک کر کیا تھا۔ آر ایس ایس کو مکمل طور پر یقین ہے کہ قائداعظمؒ کے قتل کے ساتھ ہی پورے برصغیر میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی، مسلمانوں کا صفایا کر دیا جائے گا اور پاکستان کبھی نہ بن سکے گا اور یوں ہندو پورے ہندوستان کے حکمران اور مالک بن جائیں گے ـــــ۔

پانچ دنوں کے بعد گیارہ اور بارہ اگست کی رات ماسٹر تارا سنگھ کے دہشت پسند سکھ اپنے اس پروگرام کا پہلا حصہ انجام دینے میں کامیاب ہو گئے جو ان کے اور انتہا پسند ہندو تنظیم آر ایس ایس کے درمیان طے پایا تھا۔ پاکستان جانے والی پہلی خصوصی ٹرین کو ان انتہا پسند سکھوں نے گدڑ بار ریلوے اسٹیشن پر مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ گدڑ بار ریلوے اسٹیشن فیروز پور ضلع میں واقع تھا . . .

پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو چلے تھے۔ صوبے کی سڑکیں اور ریل کی پٹڑیاں جنہیں انتہائی محفوظ سمجھا جاتا تھا، اب غیر محفوظ ہو چلی تھیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے بے خوف و خطر مسلمانوں کے دیہات میں قتل و غارت کر رہے تھے۔ وہ مردوں اور بچوں کو قتل کر ڈالتے اور عورتوں کی آبرو ریزی کرتے۔ امرتسر میں برہنہ مسلمان عورتوں کے جلوس تک نکالے گئے۔ اس شہر میں آتش زنی اور مسلمانوں کے قتل کی وارداتیں ایسے انداز میں ہو رہی تھیں کہ ایک انگریز پولیس افسر نے کہا تھا: "یہ شہر خودکشی کر رہا ہے۔"

ہندوؤں، سکھوں نے ایک اور گھناؤنی اور اشتعال انگیز چال چلی۔ وہ لاہور چھوڑ کر جانے میں ہجوم کی صورت آتے اور سینکڑوں ہزاروں خطوط ہر روز اپنے مشرقی پنجاب میں رہنے والے ہندو اور سکھ عزیزوں کو بھیجتے جن میں بتایا جاتا کہ مسلمان ان کی جان کے درپے ہو چکے ہیں، اس لیے مشرقی پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ کسی مسلمان کو زندہ سلامت بچ کر پاکستان نہ آنے دیں۔ یہ منافقت، عیاری اور مسلم دشمنی کی انتہا تھی۔ خط بھیجنے والے ہندو زندہ سلامت ہوتے لیکن خطوط میں لکھتے کہ ان پر حملے ہو رہے ہیں اور ان کی عزتیں لوٹی جا رہی ہیں۔

اس دورِ خرابی میں جب انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، گھر جلائے جا رہے تھے، مسلمان قتل ہو رہے تھے اور عصمتیں لوٹی جا رہی تھیں، امرتسر کے سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈین نے پولیس بینڈ طلب کیا اور شہر کے مرکزی چوک میں بینڈ بجانے کا حکم صادر کر دیا۔ شہری عمارتوں سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے، آگ کے شرارے تڑخ رہے تھے اور پولیس بینڈ

پسندیدہ انگریزی نغموں کی دھنیں بجا رہا تھا۔"

مشہور ادیب مشکور حسین یاد اپنی کتاب "آزادی کے چراغ" میں لکھتے ہیں :

پاکستان ہجرت اور شہداء

"عوام ان دنوں حب الوطنی کے جذبات سے بے حد سرشار تھے۔ لسانی ہو یا صوبائی ان کے دل و نگاہ میں کسی قسم کا تعصب موجود نہ تھا۔ وہ پاکستان اور صرف پاکستان کے لیے جیتے اور مرتے تھے۔ میں جہاں گیا جس سے بات کی خواہ وہ مقامی تھا یا ہجرت کر کے آنے والا ہر ایک کو پاکستان کا شیدائی پایا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ہجرت کر کے آنے والوں میں جو شخص جس قدر زیادہ مظلوم اور ستم زدہ ہوتا، اسی قدر پاکستان کے لیے اس کی محبت شدید ہوتی۔ قائدِ اعظمؒ کی پُرخلوص قیادت نے نصب العین کی لگن کے سامنے کڑے سے کڑے غم کو آسان کر کے رکھ دیا تھا۔ اس وقت اخوت اور وحدت کا عجیب عالم تھا، کراچی جاتے وقت راستے میں ایک سندھی نوجوان میرے پاس آ بیٹھا۔ مجھے سندھی زبان کے دو چار جملے آتے تھے، انہی میں اس سے بات کرنے لگا، تو وہ بولا :

"بھائی صاحب، آپ اردو میں بات کیجیے، ہم لوگ اس زبان کو خوب سمجھتے ہیں۔"

اسی طرح ایک پٹھان سے میں نے پشتو بولنا چاہی، تو وہ ہنس کر کہنے لگا :

"آپ اردو بولیے، ہمیں یہ زبان اچھی طرح آتی ہے۔"

پنجابی گھرانوں میں والدین اپنے بچوں کو اردو بلوا کر فخر محسوس کرتے تھے۔ انہی دنوں ایک بنگالی بھائی سے ملاقات ہوئی۔ جتنی بنگالی جانتا تھا اسی میں گفتگو کرنے لگا، تو وہ بولا :

"آپ اردو میں کیوں بات نہیں کرتے۔ معلوم ہونا چاہیئے مشرقی پاکستان میں ہم لوگ جس قدر اردو جانتے ہیں، اس کا عشرِ عشیر بھی آپ لوگ بنگالی نہیں جانتے اور پھر اردو تو ایسی

لے آزادی کے چراغ از مشکور حسین یاد ص ۱۴۸ ۔ ۱۵۰ ۔

زبان ہے جو پاکستان کے گوشے گوشے میں بھی جاتی ہے۔ اس کی وسعت سے کسی بھی پاکستانی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیئے اگر ہم نے اردو کی اس حقیقت سے چشم پوشی کی، تو ہمیں بہت بڑے قومی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

پاکستان میں اخوت اور یگانگت کی اسی فضا سے متاثر ہو کر میں نے یہ محسوس کیا تھا جیسے ہر طرف میرے شہید پیارے چل پھر رہے ہیں۔ ایک دفعہ کسی عزیز نے مجھ سے آکر کہا:

"مشکور، تم تو کہتے تھے نفیس بانو شہید ہو گئی، تمہارے خالہ زاد بھائی سید سرفراز حسین کا کہنا ہے کہ انہوں نے اسے راولپنڈی میں زندہ و سلامت دیکھا ہے۔ چونکہ وہ موٹر میں بیٹھی جا رہی تھی اور یہ پیدل تھے، اس لیے اسے پکڑ نہ سکے۔"

میں نے اس عزیز کو جواب دیا: "سرفراز بھائی نے نفیس بانو کو ضرور دیکھا ہو گا لیکن وہ اسے پکڑ نہیں سکتے۔ شہید اپنا دیدار کرا سکتے ہیں، ہماری گرفت میں نہیں آ سکتے اور پھر سرفراز بھائی نے صرف نفیس بانو کو زندہ و سلامت دیکھا، میں نے تو اپنے مرنے والے ایک ایک پیارے کو زندہ دیکھا ہے اور ان بے شمار شہید پیاروں کو بھی دیکھا ہے جن کی جانیں یقیناً میری ماں، میرے بھائی، میری بیوی، میری معصوم بیٹی مسرور بانو سے زیادہ قیمتی تھیں۔"

جب تک میرے شہید اس طرح ارضِ پاک کے چپے چپے پر چلتے پھرتے نظر آتے رہے، میرے دل کو بڑی ڈھارس رہی، لیکن یہ مدت بہت ہی قلیل ثابت ہوئی۔ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد تو جیسے ایک دم شہیدوں نے منہ چھپا لیا۔ اقربا پروری، رشوت ستانی، حسد، تنگ نظری، بد دیانتی، خود غرضی، لالچ، طمع، غیر ذمہ داری، تعصب، لاپرواہی —— اُف!

اس فضا میں شہید کس طرح نظر آ سکتے! البتہ میں جب تنہائی میں بہت ہی مغموم ہوتا، تو میرے شہید میرے پاس آ کر مجھے تسلیاں ضرور دیتے۔ کبھی میری ماں، کبھی میرا بھائی، کبھی میری بیوی اور کبھی میری بیٹی۔ سب کے سب ایک ہی بات کہتے: "گھبرانے اور مایوس ہونے کی

قطعی ضرورت نہیں۔ اپنے میں اور اپنے رہنماؤں میں ایثار کا جذبہ پیدا کرو۔ ایثار سے آگہی اور حسن عمل دونوں پیدا ہوتے ہیں۔" شہید مجھ سے ایثار کا تقاضا کرتے رہے اور میں مسلسل ان سے شرم سار ہوتا رہا۔

سفر پاکستان

"——— سورج نکلنے سے پہلے ہی لاریاں[1] چل دیں۔ رہ جانے والے افراد یاس اور حسرت سے تک رہے تھے۔ جو لوگ ادھر ادھر لاریوں کے گرد پڑے تھے۔ انہیں یوں مایوس دیکھ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کوششوں میں وہ ہم سے کمزور ثابت ہوئے تھے، اس لیے پیچھے رہ گئے تھے۔ آہ یہ ظالم و مظلوم، قوی و کمزور اور منعم و مسکین کی دنیا!

ملٹری کیمپ کے سامنے اچانک گورکھوں نے لاریاں روک لیں اور انہیں خالی کرنے کا حکم دیا۔ اعتراض یہ تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف لاریاں کیوں بھری گئی تھیں۔ سب لوگ اتار دیے گئے اور پھر وہ سب ویسے ہی مسکین وہ مظلوم ہو کر رہ گئے جیسے پہلے تھے۔ لاریاں دوسری بار لدنے لگیں اور بھاگ دوڑ کر اب کی دفعہ ہم عورتوں اور بچوں کو دوبارہ لادنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں بھی اس لاری کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ پھر ایک زبردست ریلا آیا اور شور و غل اٹھ کھڑا ہوا۔ بحث و تکرار شروع ہو گئی۔ چند ایک نے تو دوسروں کا سامان اٹھا اٹھا کر نیچے پھینکنا اور چھت پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر یہ ریلا ختم ہوا۔ اس ہنگامے کے باوجود میں چھت پر موجود رہا۔

بالآخر لاریاں کیمپ سے باہر نکلیں تو پتہ چلا کہ ہمارے قافلے کی عورتیں اور بچے سب آ گئے تھے لیکن مردوں میں صرف میں ہی آ سکا تھا۔ باقی سب اتار یا پھینک دیے گئے تھے۔ اور جب ہم نے کیمپ چھوڑا تو مجھے احساس ہوا جیسے ہم ایک ارضی دوزخ سے نکل کر بہشت کی طرف جا رہے ہیں۔ پاکستان دیکھنے کا شوق اس لیے بھی تیز تر تھا کہ وہاں کے نظام حکومت

---

[1] اقتباس از مضمون "مرکز آنندو کی طرف" از اسعد گیلانی شائع شدہ اردو ڈائجسٹ اگست ۱۹۸۵ء

میں اخلاق اور ہمدردی کا عنصر نمایاں ہونے کی موہوم امید تھی۔ اسلامی حکومت کا تصور ذہن کو مسرت سے بھر دینے والا تھا لیکن دل میں خطرہ تھا کہ بداخلاق معاشرے میں سے با اخلاق حکومت اور بے اصول معاشرے میں سے با اصول حکومت کیسے ابھر سکے گی۔ قیادت کے اسلامی دعووں میں بھی اسلامی الفاظ بہت زیادہ تھے اور اسلامی کردار ناپید تھا۔ بہرحال پاکستان کا احساس بھی ایک کشش رکھتا ہے اور یہی کشش ہمیں لیے چلے جا رہی تھی۔

لاریاں سڑک پر آگے پیچھے رواں دواں تھیں اور میں چھت پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ سرزمین جہاں کے ایک ایک ذرے سے ہم بے تکلف اور آشنا ہیں، پہیوں کے ہر چکر میں پیچھے ہی پیچھے جا رہی ہے۔ اور اس سے مستقل جدائی ایک عذاب سے کم نہ تھی۔ سڑک کے دونوں جانب گاؤں جلے ہوئے، لٹے ہوئے ویران پڑے تھے۔ ہر طرف تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی۔ مویشیوں کی لاشوں کے تعفن سے فضا مسموم ہو رہی تھی۔ درختوں پر اونگھتے گدھوں کے ڈیرے لگے تھے۔ ایک خوف آمیز سکوت، ایک موت کا سا سناٹا فضا میں گھلا ہوا تھا۔

چھاؤنی اسٹیشن کو گزرتے ہوئے میں نے حسرت سے دیکھا۔ ہم وہاں دن رات بے تکلفی سے گھوما کرتے تھے۔ اسٹیشن کے ایک کوارٹر میں ہمارا اجتماع ہوتا تھا۔ کوارٹر موجود تھا، اجتماع منتشر ہو گیا تھا۔ آگے جا کر پانی پلانے کے لیے ہماری لاریاں رکیں۔ میں نے بچوں کو پانی پلایا جو اپنے سارے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں کے باوجود دو روز سے بھوکے پیاسے تھے اور پھر بھی ایسی خاموشی سے بیٹھے تھے جیسے سارا صبر انہی کے لیے تھا۔ ڈھلان پر سکھوں کا ایک بڑا سا قافلہ اترا ہوا تھا۔ قافلے کے عین درمیان پہنچ کر ہماری لاری پنکچر ہو گئی۔ عورتوں اور بچوں کو باہر نکالا گیا اور گھنٹے بھر کی مرمت کے بعد لاری پھر چلی۔

دوسری لاریاں بیاس کے پار اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ دریا گزر کر سڑک کے دونوں طرف سکھوں کے مسلح جتھے موجود تھے جو ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ بیاس کا بازار سکھوں سے بھرا ہوا تھا اور لاریاں ان کے درمیان سے رینگ رینگ کر گزر رہی تھیں۔ اس وقت ہمارے ساتھیوں میں سے اکثر خوف کا اظہار کر رہے تھے۔ لاریوں کی چھتوں پر ہم سامان کے

ڈھیروں سے چمٹے بیٹھے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف درختوں کی ٹہنیوں نے ہمیں طمانچے مار مار کر ہمارے غیر ملکی ہونے کا بہت کچھ ثبوت دیا تھا۔ ہمارے چہرے، ہاتھ اور گردنیں خراشوں سے بے طرح مجروح ہو رہے تھے۔ راستے میں لاریاں اس کثرت سے خراب ہوتیں اور ایسی دھیمی رفتار سے چلتی رہیں کہ سات بجے شام بمشکل امرتسر پہنچ سکے۔ شہر کے بیچ میں آ کر لاریوں کا پھر موڈ بگڑ گیا۔ جہاں تقریباً آدھ گھنٹہ انہیں مرمت کرنے میں لگا۔ اس کے باوجود ایک لاری درست نہ ہو سکی اور اس کی سواریاں دوسری لاریوں میں ٹھونسنی پڑیں۔

امرتسر سے ایک میل آگے نکل کر لاریاں پھر خراب ہو گئیں۔ اب اندھیرے کی وجہ سے ان کی مرمت میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ غیر مسلم پناہ گزینوں کے ٹرک بڑے زور شور سے تاریکی میں ہمارے قریب سے گزر رہے تھے۔ ہم بے چارگی میں گھرے سرِ راہ بے آسرا پڑے تھے۔ آخر کار کس طرح جوڑ توڑ کر کے لاریاں پھر چلیں۔ تکان، بھوک اور راتوں کی بے خوابی نے ہمیں نڈھال کر دیا تھا۔ کئی بار آنکھیں بند ہو گئیں اور میں لاری کی چھت سے گرتے گرتے بچا۔ ایک دفعہ تو میں نصف آگے کی طرف جھک چکا تھا کہ میرے ایک ہم سفر نے مجھے بروقت تھام لیا۔ ورنہ امرتسر واہگہ کی سڑک مجھے عزرائیل ملکِ عدم پہنچا دیتی۔ ہماری لاریاں پھر چل پڑیں۔

اب ہم سے دو چار ہاتھ ادھر ہی پھر ہماری لاری خراب ہو گئی۔ اب ہم واہگہ سے فقط ایک میل پرے غیر ملک میں تھے۔ خرابی کے ساتھ پٹرول بھی ختم ہو گیا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ امن و سلامتی کا خطہ ہم سے ایک میل کے فاصلے پر تھا اور ہم اس میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ کئی مہینوں سے لاحق اندیشۂ جان کا تسلسل ٹوٹنے میں اب صرف ایک میل کا فاصلہ تھا، پھر ہم اپنے ملک میں تھے لیکن وہاں پہنچنا جوئے شیر لانے کے برابر نظر آتا تھا۔ باقی سات لاریاں تو ہمیں خدا حافظ کہہ کر آگے نکل گئیں اور ہم تنہا اس بے دست و پائی کی حالت میں رہ گئے۔
اب صرف ایک ہی راہ تھی کہ جس لاری نے ہمیں اتنی دور کھینچا تھا ہم اسے میل بھر دھکیلتے۔ یہ تجویز معقول تھی اور اس پر فوراً ہی عمل شروع ہو گیا اور ہم لاری دھکیلنے لگے۔ نصف گھنٹے میں ہم واہگہ پل پار کر رہے تھے۔ سنتری پھرتی سے لپک کر پھسلتی موٹر کی زد سے نکل گیا اور ہم لاری

کے پیچھے ہانپتے ہوئے ڈیڑھ بجے شب اپنے مرکز آرزو میں داخل ہوئے۔ خوف، بدامنی اجنبیت اور بے اعتمادی کا ہمارے گرد ایک غول تھا جو یک لخت پھٹ گیا اور ہم سلامتی کے گھر میں آ گئے۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ موٹر کی لاش سڑک کے ایک سرے پر پڑی تھی۔ واہگہ کے کنویں سے ٹھنڈا پانی لا کر میں نے سب کو پلایا۔ چار وقت کے فاقے نے سب کو نڈھال کر دیا تھا، سفر کی تکان نے چور چور کر رکھا تھا۔ بادل اُمنڈ رہے تھے اور بجلی ان میں سنہری لکیریں کھینچ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر کھلی زمین پر ہم نے چادریں بچھائیں اور اطمینان سے لیٹ گئے۔ کئی مہینوں کے بعد اطمینان کی یہ پہلی نیند تھی۔ بیگانوں کے ظلم ختم ہو گئے تھے۔ لیکن اپنوں کی چیرہ دستیاں ہنوز باقی تھیں۔

ہم اپنے خوابوں کی سرزمین میں پہنچ کر خلافتِ راشدہ کے عدل و انصاف کے سہانے خواب سرہانے پڑے، دیکھ رہے تھے اور مشیتِ الٰہی اپنی سنت کے مطابق ہمارے دست و بازو کی قوت اور صبر ایوبی کا جائزہ لے رہی تھی۔

پاکستان، آگ اور خون کی منزل

پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ اپنے مضمون "میں نے پاکستان بنتے دیکھا" میں لکھتے ہیں:

"ـــــ میرا یہ سفر ۱۹۴۷ء میں عیدالفطر کے ایک ڈیڑھ ہفتے بعد[1] کی ایک رات کے دوسرے پہر سے شروع ہوا تھا، جب میں اپنے والدین کے ساتھ ریاست پٹیالہ کے مشہور تاریخی مقام بھٹنڈہ کے ایک محصور مسلم محلے سے نکلا۔ یہ سفر فساد زدہ شہر کے غیر محفوظ گلی کوچوں سے گزر کر اسٹیشن تک پہنچنے کی کوششوں میں شروع ہوا۔ یہ سفر محض ایک خاندان کا نہیں تھا بلکہ اس محصور محلے اور اس محلے میں پناہ حاصل کر لینے والے شہر کے دوسرے حصوں کے سینکڑوں

---

[1] "میں نے پاکستان بنتے دیکھا" از پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ مطبوعہ تکبیر کراچی یکم ستمبر ۱۹۸۸ء۔

مسلمانوں کا تھا جو قافلہ بنا کر رات کے دوسرے پہر اپنے گھروں سے پاکستان جانے کے لیے نکلے تھے۔

جب سفر شروع ہوا تو چاندنی پھیلی ہوئی تھی البتہ چاند مغربی افق کی جانب سرنگوں تھا۔ قافلے کے شہری حدود سے نکلنے اور ویرانے میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی کسی حادثے، اختلاف رائے یا واقعے کے سبب قافلے میں بھگدڑ مچ گئی اور اسی افراتفری میں میرا اور میرے چھوٹے بھائی معین کا ساتھ اپنے والدین سے چھوٹ گیا۔ قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک نے اسٹیشن کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور قافلے کے دوسرے حصے نے ایک قریبی گاؤں کا رخ کیا جو مسلمانوں کا تھا۔ ہم دو بھائی قافلے کے اس حصے کے ساتھ ہو لیے جس کا رُخ گاؤں کی طرف تھا اور والدین تیسرے چھوٹے بھائی اور ایک بہن کے ساتھ اس قافلے میں رہے جو ریلوے اسٹیشن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اصل قافلے کے تقسیم ہونے اور بکھرنے سے پہلے قافلے کی ترتیب یہ تھی کہ مستورات اور بچے درمیان میں تھے اور مردوں نے ان کا حصار کیا ہوا تھا۔ قافلے کے اگلے حصے میں وہ مرد تھے جن کے پاس چند بندوقیں یا رائفلیں تھیں، ان ہی میں ابا جان بھی تھے۔ دائیں، بائیں اور عقب میں جو مرد تھے، ان کے پاس اِکا دُکا تلواریں کچھ کے پاس نیزے، بھالے، برچھیاں اور بیشتر نہتے تھے یا محض ڈنڈے اور لاٹھیاں تھامے ہوئے تھے۔

قافلے کے بکھرنے کے بعد یہ ترتیب باقی نہیں رہی تھی۔ ہم بھائی قافلے کے جس حصے میں شامل ہو گئے تھے اس میں مردوں کی تعداد عورتوں اور بچوں کے مقابلے میں کچھ کم بھی تھی اور یہ سب تقریباً نہتے بھی تھے۔ اس قافلے میں دیکھے بھالے چہرے تو بہت تھے مگر ایسے مانوس اور قریبی تعلق والے چہروں کی تلاش تھی، جن کی قربت پریشان کن لمحوں میں ڈھارس بن سکے۔ اسی تلاش میں سلطان چچا ہمارے ایک محلے دار جو ریلوے میں ملازم تھے اور ابا جان سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے اچی (سلطان چچا کی اہلیہ) اور ان کا لڑکا امین اللہ نظر آئے۔ یہ امین اللہ ہمارے ہم مکتب بھی تھے اور دوست بھی۔ اس خاندان سے مل کر ہم دونوں بھائیوں کی وحشت میں کچھ کمی آئی۔ سلطان چچا نے ہم دونوں کو اپنے والدین سے الگ

پاکر اپنی تحویل میں لے لیا۔

چاند نمودِ سحر کی اطلاع دیے بغیر مغربی افق میں غروب ہو رہا تھا اور رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی۔ جہاں سے ہم گزر رہے تھے وہ غیر ہموار سا میدانی علاقہ تھا جو سرکنڈوں کی چھوٹی بڑی جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں کٹی ہوئی تھیں اور کٹے ہوئے سرکنڈوں کے گٹھے (پولیاں) ہموار زمین پر عموداً کھڑے تھے یا پڑے تھے۔ اندھیرا بڑھنے کے باعث سرکنڈے کی ان جھاڑیوں سے گزرنا دشوار ہو رہا تھا۔ ہاتھوں اور چہروں پر خراشیں آ رہی تھیں۔

دفعتاً اس ویرانے میں کسی موٹر کی آواز نے اس قافلے میں ایک بار پھر بھگدڑ کی کیفیت پیدا کر دی۔ لوگ افراتفری میں جھاڑیوں کے اندر کود کر چھپنے لگے۔ سلطان چچا نے ہم لڑکوں کو زمین پر لٹا کر کٹے ہوئے سرکنڈوں کے گٹھے کھول کر ہم پر اس طرح بکھیر دیے کہ پوری طرح سرکنڈوں کے اس ڈھیر میں چھپ گئے۔ ہم بڑی اذیت میں سرکنڈوں کے اس ڈھیر میں دم سادھے پڑے تھے اور گھومتی ہوئی موٹر کی گھٹتی بڑھتی آواز کو سن رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد موٹر کی آواز غائب ہو گئی اور مکمل سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد سلطان چچا نے ہمیں سرکنڈوں کے اس ڈھیر سے نکالا۔ جسم کے تمام کھلے حصے سرکنڈوں کی چھال کی پھانسوں کی دی ہوئی خراشوں سے جل رہے تھے اور کہیں کہیں سے خون بھی رِس رہا تھا۔

اب چاند مکمل طور پر ڈوب چکا تھا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں یہ قافلہ نہ جانے کس کی رہبری میں کس سمت بڑھ رہا تھا۔

گھپ اندھیرے میں تھوڑی سی کمی ہوئی اور سحر کے قریب کا دھندلکا پھیلا تو اندازہ ہوا کہ ہمارا سفر اب ناہموار اور جھاڑیوں سے اٹے ہوئے میدان کی بجائے کسی نہر کے کنارے کی کچی سڑک پر ہو رہا ہے۔ دفعتاً فضا میں پیچھے سے ایک دلدوز چیخ ابھری۔ سب کے قدم رک گئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو تھک کر پیچھے رہ جانے والی چچی چار پانچ سکھوں کے نرغے میں تھیں۔ انہوں نے نہر میں چھلانگ لگا دی تھی اور ایک سکھ انہیں

بالوں سے پکڑ کر نہر سے کھینچ رہا تھا۔ سلطان چچا جو ہم لوگوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے آگے چل رہے تھے، ہمیں چھوڑ کر بجلی کی سی تیزی سے پیچھے پلٹے اور بے دھیان کھڑے ہوئے ایک سکھ کا گنڈاسہ چھین کر بچی کو بالوں سے کھینچنے والے سکھ پر حملہ آور ہوئے۔ دوسرے سکھ ان پر جھپٹے۔ کچھ مرد ہمارے قافلے سے سلطان چچا کو بچانے کے لیے بڑھے اور دو بدو لڑائی شروع ہو گئی۔ قافلے کے بچے اور عورتیں خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگے اور قافلہ ایک بار پھر تتر بتر ہو گیا۔ صبح کا اجالا اچھا خاصا پھیلنے کے بعد جب لوگ پھر مجتمع ہوئے اور قافلے کا سفر از سرِ نو شروع ہوا تو نہ سلطان چچا دکھائی دیے، نہ بچی نظر آئیں اور کچھ دوسرے لوگ بھی غائب تھے۔ میں نے آخری بار سلطان چچا کو نہر کے اندر پانی میں سکھوں سے نبرد آزما دیکھا تھا۔ اس منظر کے بعد کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔

سفر خاصی دیر جاری رہا۔ سورج چڑھ آیا تو ایک گاؤں آیا۔ غالباً یہی وہ گاؤں تھا جو ہمارے قافلے کی منزل تھا۔ قافلہ بھی سڑک سے ہٹ کر گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ جب ہم لوگ گاؤں میں داخل ہونے والی گلی کے قریب پہنچے تو اچانک "جائے ماندن نہ پائے رفتن" والی کیفیت سے دو چار ہو گئے۔ گلی سے ننگی پنڈلیوں تک پیلے رنگ کے چغوں میں ملبوس اکالی سکھوں کا جتھا برآمد ہوا۔ ان کے ہاتھوں میں خون آلود تلواریں تھیں۔ ان کی لنگوٹیوں میں بھی ننگی کرپانیں لٹک رہی تھیں۔ ان کے کپڑوں اور ہاتھوں پر خون کے دھبے تھے اور وہ ست سری اکال اور اسی قسم کے دوسرے نعرے لگا رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے ہمارے قافلے کو جس میں اب بیشتر بچے، عورتیں اور کمزور بیمار بوڑھے مرد ہی باقی بچے تھے، سہما دیا اور یہ سمجھا دیا کہ جس مسلمان گاؤں میں پناہ لینے کے لیے ہم پہنچے تھے، اس گاؤں میں کوئی مسلمان ہمارے استقبال کے لیے زندہ باقی نہیں بچا تھا۔

ہمیں گھیرے میں لے کر گاؤں سے کچھ دور ہٹایا گیا۔ اس اثناء میں اکالیوں کے گھیرے کے اندر ایک سکھ بہت جوش کے ساتھ بڑے بے ہنگم طریقے سے ڈھول پیٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی سنکھ بھی بجایا جا رہا تھا۔ قافلے کے سب لوگ خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے۔ کسی کو کچھ

پتہ نہیں تھا کہ انہیں کس انجام سے دوچار کرنے کے لیے روکا گیا تھا اور انتظار کس بات کا ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں گاؤں سے دھواں اٹھنا شروع ہوا جو لمحہ بہ لمحہ سیاہ سے سیاہ تر ہوتا چلا گیا اور پھر اس دھوئیں سے شعلے لپکنے لگے۔ ہم پر راکھ برس رہی تھی کچھ ہی دیر میں فضا میں بہت ہی ناگوار بو پھیلنا شروع ہوئی۔ یہ لاشوں کے جلنے کی بو تھی پاکستان کی آزادی کی قیمت ادا کرنے والے ان گمنام جاں نثاروں کے خون اور گوشت کے بھننے کی بو، جو علی الصبح اپنے گاؤں میں محض مسلمان ہونے اور پاکستان کے تصور سے ہمدردی کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار چکے تھے اور جن کی لاشیں اب ان کے اپنے ہی گھروں میں پڑی جل رہی تھیں۔

پوری فضا بے حد دہشت ناک اور مجنونانہ انداز میں پیٹے جانے والے ڈھول کی لرزہ خیز آواز، دھوئیں، آگ، جلتی لاشوں کی بو، برستی راکھ، بھوک سے بلکتے دو چار شیرخوار بچوں کے رونے کی آوازوں اور اکالیوں کے نعروں سے معمور تھی۔ دفعتاً کسی سکھ کی کریہہ آواز کا اضافہ ہوا اور بالکل اچانک ایک قوی الجثہ اور دراز قد سکھ نے قافلے میں شامل ایک نوعمر ماں کی گود میں ایک شیرخوار بچے کے پیٹ میں تلوار کی نوک چبھو دی اور بچے کو نوکِ شمشیر پر فضا میں بلند کر دیا۔ ننھی سی جان سے خون کا ایک فوارہ ابلا اور اس معصوم شہید کا خون چاروں طرف پھیل گیا۔ بچے کی ماں دلدوز چیخ کے ساتھ چیتے کی سی تیزی سے تلوار کی نوک پر لٹکے ہوئے اپنے لختِ جگر کو چھیننے اور سنبھالنے کے لیے جھپٹی کہ پلک جھپکتے ہی کسی دوسری تلوار نے ایک ہی جھٹکے میں اس ماں کا سر تن سے جدا کر دیا۔ خون کا ایک اور فوارہ ابلا اور اس کے ساتھ ہی تمام اکالی حرکت میں آ گئے۔ ایک خوف ناک رقص شروع ہو گیا۔ ہر طرف بجلی کی طرح تڑپتی ہوئی تلواریں اور کٹتے ہوئے انسانی جسم دکھائی دیے اور قافلے کے لوگ ایک دوسرے پر گرنے شروع ہوئے۔ ہم بچے شاید اتنے پستہ قد تھے کہ ان کی تلواروں کی زد سے بچ گئے یا شاید گرتی لاشیں ہمیں بچا گئیں۔ البتہ خون میں نہا ضرور گئے۔ بہرحال میں اس خوفناک منظر کو دیکھنے کے لیے ایک دو منٹ سے زیادہ ہوش میں نہیں رہا کوئی مجھ پر گرا اور پھر مجھے کچھ پتہ نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ اور کیا ہو رہا ہے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرا سر ایک لاش کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میرے منہ، ناک اور آنکھوں میں گرم ریت سے نہایت اذیت ناک جلن ہو رہی تھی اور دماغ بری طرح جھنجھلا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنا سر اور ریت میں دھنسا ہوا چہرہ لاش کے نیچے سے نکالا۔ مجھے ٹھیک سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا اور پے درپے چھینکیں آ رہی تھیں۔ چھینکوں کا سلسلہ رکا اور آنکھوں کی جلن کچھ کم ہوئی تو مجھے چھوٹے بھائی معین کی تلاش اور فکر ہوئی۔ میں نے قریب ہی اسے پا لیا۔ اس کے اوپر بھی ایک لاش پڑی تھی اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ میں بڑی کوشش اور قریب ہی پڑے ہوئے ایک زخمی کی مدد سے معین کو لاش کے نیچے سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد جائزہ لیا تو گاؤں سے باہر جس جگہ صبح ہمارا قافلہ سکھوں کے نرغے میں کھڑا تھا، وہاں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ کچھ لوگ زندہ تھے مگر ہم دونوں بھائیوں کے سوا سب ہی بری طرح زخمی تھے اور اٹھنے یا کھڑے ہونے کے لائق نہیں تھے۔ دوپہر ہو چلی تھی اور سورج بالکل سر پر تھا۔ کوئی سکھ یا چلتا پھرتا انسان دور تک دکھائی نہ دے رہا تھا۔

معین بھی ہوش میں آ گئے۔ ہمیں کھڑا اور چلتا پھرتا دیکھ کر کئی پیاسے زخمیوں نے پانی مانگا۔ پانی کہاں سے لایا جائے اور کیسے پلایا جائے؟ یہ مشکل ایک زخمی نے حل کی جس کا اوپر کا جسم صحیح سلامت تھا مگر ٹانگیں زخمی تھیں اور وہ اٹھنے سے معذور تھا۔ اس نے ہمیں سمجھایا کہ چند قدم کے فاصلے پر کھیتوں کو پانی دینے والا نالہ ہے۔ اس پانی میں اپنی قمیض کے دامن بھگو کر پیاسوں کے منہ میں نچوڑ دو۔ ہم دونوں بھائی بہت دیر تک وقفے وقفے سے اس خدمت میں مصروف رہے۔ کئی زخمیوں نے پانی پی کر ہمارے سامنے آخری ہچکی لی آخری ہچکی لے کر زندگی کا سفر ختم کر دینے کا غم انگیز منظر ذہن کو کیسا ماؤف کر دینے والا ہوتا ہے۔ اس منظر کو میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔

اسی مصروفیت میں دن ڈھل گیا تو اچانک کسی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ آواز دور کی تھی۔ تھوڑی دیر میں بیل گاڑی ہمارے قریب پہنچ گئی۔ ہم لاشوں ہی میں لیٹ کر ایک زخمی کی ہدایت کے مطابق دم سادھے پڑے تھے۔ بیل گاڑی پر چار پانچ سکھ آئے تھے۔ جنہوں نے

لاشیں اٹھا کر بیل گاڑی میں ڈالنا شروع کیں۔ خوف کے مارے ہمارا برا حال تھا اور اگلے کسی بھی لمحے میں موت کا انتظار تھا۔ بیل گاڑی کے دوبارہ چلنے کی آواز نے تھوڑا سا اطمینان پیدا کیا۔ قریب پڑے ہوئے زخمی نے بتایا کہ وہ چلے گئے۔ ہم نے اٹھ کر دیکھا تو بیل گاڑی تھوڑی دور جا کر رک گئی اور وہاں بیل گاڑی سے لاشیں اتار کر ایک طرف پھینکی جانے لگیں۔ یہ جگہ زیادہ دور نہ تھی۔ ہم نے سوچا کہ سکھوں کے ہاتھوں مر کر وہاں پہنچنے سے بہتر ہے کہ آنکھ بچا کر خود ہی وہاں پھینکی جانے والی لاشوں میں جا چھپیں تاکہ مارے نہ جائیں۔ خوف اور ہمت کی درمیانی کیفیت کے ساتھ ہم اس مہم میں کامیاب ہوئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور بلا کا حبس تھا۔ لاشوں سے تعفن پھوٹنے لگا تھا۔ خود ہمارے کپڑے جو خون آلود تھے اور بدن سے چپکے ہوئے تھے، ان میں سے شدید بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اسی عالم میں ایک نئی افتاد کا اندازہ ہوا۔ یہ لاشیں ایک خشک نالے میں لا کر ڈالی گئی تھیں اور اب وہی بیل گاڑی کہیں سے مٹی لا کر ان پر مٹی ڈال رہی تھی۔ گویا اب زندہ درگور ہونے کا مرحلہ تھا۔ مگر پھیلتے ہوئے اندھیرے نے ہماری مدد کی اور ہم لاشوں سے نکل کر کچھ دور نظر آنے والے کھیتوں میں جا گھسے۔ یہ باجرے کے کھیت تھے جہاں ہمیں کئی دن رکنا پڑا۔ ان کھیتوں میں ہمیں پودوں کی جڑوں سے پھوٹنے والے اس مرطوب حبس کا تجربہ ہوا جو بڑا ہی اذیت ناک تھا۔

یہ ہمارے سفرِ پاکستان کا پہلا دن تھا۔ جس میں آگ، خون، پانی، دھوپ اور پودوں سے پھوٹنے والے حبس سے مرتب ہونے والی اس مہک کا تعارف حاصل ہوا جو ہمارے بعد کے کئی ہفتوں کے سفر میں ہمارے ساتھ رہی اور جو آج بھی میرے شعور اور وجدان میں آزادی کی مہک کے طور پر محفوظ ہے ــــ"

خطرناک راستے

سید مشکور حسین یاد نے اپنی کتاب "آزادی کے چراغ" میں اپنی داستان ان الفاظ میں بیان کی:

تھے۔ راستے نہایت خطرناک ہو چکے تھے۔ کہیں آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پاکستان پہنچنے کی تڑپ تھی لیکن سارے راستے بند تھے۔ فارسی پڑھانے والے ایک ماسٹر صاحب نے جانے میں عجلت دکھائی، تو غریب اگلے اسٹیشن ہی پر ختم کر دیے گئے۔ منڈی ڈبوال میں مسلمانوں کا ایک ہی محلہ تھا۔ ہر وقت نعرے لگتے رہتے اور راتیں آنکھوں میں کٹ جاتیں۔

۲۴ راگست کی صبح موٹروں کے اڈے پر پہنچا۔ معلوم ہوا ایک لاری سے سید اختر حسین نائب تحصیلدار کسی کام سے صدر مقام جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا موقع بہت اچھا ہے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا اور ایک مسلح ملازم بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ چنانچہ میں لاری میں اختر حسین صاحب کی سیٹ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ لاری چلنے کو ہوئی، تو اڈے کے ایک سکھ مینجر نے مجھے اور میرے ساتھی کو یہ کہہ کر اتار دیا کہ اس لاری میں جگہ نہیں ہے۔ دوسری لاری سے چلے جانا۔ ہم جانے کے لیے مصر ہوئے تو اس نے سختی سے کہا: "میں جو کہہ رہا ہوں، آپ اس لاری سے نہ جائیں۔ ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں۔ فوراً اتر جائیے۔" ہم بادلِ نخواستہ لاری سے اترے اور دوسری کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی ہمیں انتظار کرتے کچھ دیر ہوئی تھی کہ وہی لاری جس میں اختر حسین نائب تحصیلدار گئے تھے، واپس آتی نظر آئی۔ معلوم ہوا اختر صاحب کو شہر سے نکلتے ہی چند فرلانگ کے فاصلے پر قتل کر دیا گیا اور لاری کے تمام مسافر بھاگ نکلے۔ اس قتل کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اختر حسین اگرچہ نوجوان افسر تھے۔ تاہم بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے تمام شہر میں ان کا دبدبہ تھا (واضح رہے کہ منڈی ڈبوالی ضلع حصار کی سب تحصیل تھی اور سب تحصیل میں نائب تحصیلدار ہی سب سے بڑا افسر سمجھا جاتا ہے)

اس خبر کے کچھ ہی دیر بعد شہر میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ میری والدہ کے ماموں سید عنایت حسین منڈی ڈبوالی کی پولیس چوکی کے انچارج تھے اور وہاں عرصے

لہ آزادی کے چراغ۔ از منظور حسین یاد صہ ۱۶-۱۷۔

سے تعینات تھے۔ ان کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ اس لیے ہر مذہب و ملت کے لوگ ان کا بہت لحاظ کرتے۔ حملہ ہوا تو ہم لوگ ایک گھر میں جمع ہو گئے۔ ہمارے ساتھ مسلمان پولیس کے دو تین گھرانے بھی شامل ہو گئے۔ محلے کے کچھ اور لوگ بھی اپنے بچوں اور عورتوں کو ہمارے ہاں چھوڑ گئے۔ ہم اپنے مکان کی چھت پر کھڑے تھے اور چاروں طرف لرزہ خیز چیخیں اٹھ رہی تھیں۔ جیسے ہی کوئی بچہ یا آدمی ہمارے گھر کی طرف پناہ لینے کے لیے بڑھتا ظالم اسے برچھیوں اور بلموں سے ہلاک کر دیتے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو نیزے کی نوک میں پرو کر ناچنے لگتے۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ جاتا تھا اور میں دل ہی دل میں اپنی بزدلی پر لعنت بھیج رہا تھا۔ پھر خیال آیا کہ میں چپ رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہوں۔

جب مسلمانوں کا اچھی طرح صفایا ہو چکا تو ہندو پولیس کی مسلح گارد ہمارے گھر آئی اور سید عنایت حسین اور دوسرے دو پولیس والوں سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا:

"آپ صرف اپنے آدمی اس گھر سے نکال لیں، کوئی دوسرا آدمی آپ کے ساتھ نہ ہو۔ ہم آپ کو محفوظ مقام پر پہنچا دیتے ہیں لیکن اس بات کا خیال رہے کہ کوئی دوسرا آدمی نکلنے نہ پائے۔ ورنہ آپ اپنی بھی خیر نہ سمجھیں۔"

میں آج تک وہ منظر کسی طرح نہیں بھول سکا جب ہم اس گھر سے نکل رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے بچے، گھبرائی ہوئی عورتیں اور چند ہراساں مرد ہمیں حسرت سے الوداع کہہ رہے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ جیسے ہی ہم لوگ گھر سے نکلیں گے، ظالم ہندو گھر میں گھس کر ان کا خاتمہ کر دیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ ادھر ہم گھر سے نکلے۔ ادھر قاتلوں کی منظر ٹولی ان پر بھیڑیوں کی طرح جھپٹ پڑی اور ان سب کا خاتمہ کر دیا۔"

لاشوں کا خوفناک سفر

اردو ڈائجسٹ میں ایک مہاجر کی آپ بیتی شائع ہوئی ہے جب وہ قافلے کے ساتھ بھاگتے پاکستان آیا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ قریبی دیہات کے سکھ گدھوں کی طرح

مسلمانوں کے قافلوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ ان کی اشیاء کی خرید و فروخت کرتے، مسلمانوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے اور انہیں بہت کم قیمت ادا کرتے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات یہ مایوس مہاجرین صرف چائے کی پیالی کے بدلے میں اپنی کوئی قیمتی چیز بیچنے پر تیار ہو جاتے۔ بدترین حالت ان مسلمانوں کی تھی جو کمزوری، بیماری یا بھوک کی وجہ سے موت کی سی کیفیت سے دوچار تھے۔ ایسے دردناک مناظر بھی دیکھنے میں آئے کہ والدین اپنے بچوں کو محض اس لیے دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے تھے کہ انہیں ساتھ لے جانے کی ہمت ان کے اندر نہ تھی۔ بہت سے بوڑھے افراد درختوں کی تلاش میں تھے تاکہ ان کے سائے میں آرام کی موت مر سکیں۔

میں نے خود دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے ایک ننھا منا معصوم بچہ اپنی مُردہ ماں کے پاس بیٹھا اس کے دونوں بازو جھنجھوڑ رہا تھا۔ شاید وہ اپنی ماں کی گود میں جانے کے لیے بے قرار تھا مگر وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ اب اس کی ماں کبھی اسے اپنے بازوؤں میں نہیں لے سکے گی۔

لاہور سے امرتسر تک کی ۳۵ میل لمبی سڑک کے دونوں کناروں پر جا بجا لاشوں کے ڈھیر تھے یوں لگتا تھا کہ یہ سارا علاقہ ایک طویل و عریض قبرستان میں تبدیل ہو گیا ہے ہر طرف گلی سڑی لاشوں کی سڑاند پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف راستے میں ایک ایک گز پر کوئی نہ کوئی لاش پڑی تھی۔ کسی شخص کی گردن کٹی ہوئی تھی اور کوئی بدنصیب بھوک اور ہیضے کا شکار ہو کر مرا تھا۔ سڑک کے کنارے پڑی ان لاشوں پر جا بجا گدھ منڈلا رہے تھے اور جنگلی کتے ان کی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ ہمارے قافلے میں ایک بوڑھا تھا جو صرف ایک بکری ساتھ لا سکا تھا۔ راہ چلتے ہوئے بکری قافلے سے الگ ہو گئی۔ بوڑھا اسے پکڑنے کے لیے دوڑ لگا رہا تھا۔ اچانک گنے کے کھیت میں سے ایک سکھ ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر نکلا۔ بوڑھے آدمی کا سر تن سے جُدا کیا اور بکری اٹھا کر کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔"

دہلی سے آئے ہوئے ایک مہاجر نے بتایا کہ جب میں وہاں سے نکلا تو سارا شہر

نئی دہلی ظلم و تشدد کی زد میں تھا۔ شہر میں لاشوں کے اس قدر ڈھیر تھے کہ ایک پولیس افسر کے بقول مردہ آدمی اور گھوڑوں اور بیلوں کی لاش میں امتیاز بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی لاشیں کئی روز تک گلیوں اور بازاروں میں پڑی رہیں کیونکہ ہندو انہیں مردہ خانوں تک پہنچانے کے لیے ہاتھ لگانے کو تیار نہ تھے۔ ایک انگریز افسر ایک گلی سڑی اور پھولی ہوئی لاش کے قریب سے گزرا تو اس نے ایک ٹرک کو اشارے سے پاس بلایا۔ ہندو ڈرائیور سے لاش اٹھا کر ٹرک پر لادنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

دہلی کے مہاجر کیمپ میں ہزاروں مسلمانوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ اپنے وطن پاکستان جانا چاہتے تھے۔ جب تک انہیں بحفاظت پہنچانے کا انتظام نہ ہو جاتا انہیں اس کیمپ میں رہنا تھا۔ یہ کیمپ پرانے قلعے میں لگایا گیا تھا۔ یہ وہ قلعہ تھا جس نے مسلمانوں کا ہزار سالہ دورِ حکومت دیکھا تھا۔ اس قلعے کے در و دیوار پر اکبر، جہانگیر اور اورنگ زیب جیسے پُرشکوہ مسلمان حکمرانوں کے جاہ و جلال کی داستانیں رقم تھیں۔ آج اسی چار دیواری میں مسلمان کس مپرسی کی حالت میں دن گزار رہے تھے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی بھی پوری طرح میسر نہیں تھیں ــــ"

امرتسر سے آئے ہوئے ایک مہاجر نے بتایا کہ:

"ــــ اسلامیانِ امرتسر اپنی ماؤں، بہنوں اور بہو بیٹیوں کو ہندو سکھ غنڈوں کی ہولناک نظروں سے بچاتے پاکستان کا رُخ کر رہے تھے۔ عید کے روز جن لڑکیوں کے ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی کی سرخیاں رچی ہوتی تھیں آج وہی ہاتھ پاؤں ان کے عزیز و اقارب کے خون سے تر ہو رہے تھے۔ امرتسر اور لاہور کی درمیانی جرنیلی سڑک پر سکھ وحشیوں کے مشتعل ہجوم مسلمانوں پر اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن کے تمام پلیٹ فارم اور پٹڑیاں مسلمانوں کے خون میں نہائی ہوئی تھیں۔ یہ عید کہاں تھی یہ تو ہولی کا تہوار تھا جس میں خونِ مسلم سے دل کھول کر ہولی کھیلی جا رہی تھی۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر عید کے روز امرتسر کے مسلمانوں کی یہ حالت تھی

تو بھارتی پنجاب کے دوسرے شہروں، قصبات اور دیہات میں نہتے اور بے بس مسلمانوں نے یہ عید کس طرح گزاری ہو گی؟ ـــ"

ممتاز بزرگ صحافی جناب وقار انبالوی جالندھر کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہی دنوں گوجرانوالہ سے ایک ہندو ڈپٹی کمشنر جس کا نام سکھانند تھا جالندھر تبدیل ہو کر آ گیا۔ باؤنڈری کمیشن کے اعلان تک وہ جالندھر کے مسلمانوں کو اِکا دُکا قتل کراتا رہا لیکن ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کے روز عیدالفطر تھی اس روز خوف و خطر کی فضاؤں میں جالندھر کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں عید کی نماز ادا کرنے کے لیے عید گاہ میں جمع تھے اور ابھی پہلی رکعت میں سجدہ ریز ہوئے ہی تھے کہ ہندوؤں، سکھوں نے تلواروں، گنڈاسوں، برچھیوں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر ان پر حملہ کر دیا اور آنِ واحد میں بیسیوں مسلمانوں کے سر تن سے جدا کر دیے جو اس وحشیانہ حملے سے جان بچا کر عید گاہ سے باہر بھاگے انہیں بھالوں کی نوک پر دھر لیا۔ اسطرح جالندھر کی عید گاہ لاشوں سے پٹ گئی۔ اس کے بعد سکھانند ڈپٹی کمشنر کی سربراہی میں فرقہ پرست ہندو سکھ طے شدہ پروگرام کے مطابق جالندھر کے آسودہ حال اور ذی اثر مسلمانوں کے گھروں سے زبردستی پردہ نشین عورتوں کو گھیر کر عید گاہ تک لائے یہاں ان کے برقعے اور ان کی چادریں ہی سروں سے نہ اتاریں بلکہ ان کے لباس اتار کر انہیں ننگا کر دیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے مردوں کو عید کی مبارک باد کہیں اور قیام پاکستان کی خوشی میں ان کی لاشوں کے آس پاس رقص کریں۔

یہ وحشیانہ سلوک اور سنگدلانہ کارروائی ایسی تھی کہ جس کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کی لاشوں پر ان کو رونے بھی نہ دیا گیا۔ برہنہ حالت میں حیا کی ماری عورتیں جب سکڑنے سمٹنے اور ایک دوسری کے ساتھ لپٹنے لگتیں تو ان کو بھالوں کی نوک چبھو چبھو کر نہ صرف ایک دوسری سے الگ کیا جاتا۔ بلکہ چرکے اور کچوکے اس طرح دیے جاتے کہ وہ تڑپنے لگتیں اور قاتل قہقہے لگاتے۔

دشمنانِ پاکستان کی درندگی اس حد تک پہنچی کہ انہوں نے اسی ہزار کے قریب مسلمان دوشیزائیں اغوا کیں اور انسانیت کے دامن پر غلیظ ترین داغ لگایا۔ ۵ را لاکھ سے زائد مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ لیکن پاکستان قائم کرنے کے جرم میں عید کے موقعہ پر ہندوستان سے لاہور آنے والی ایک مال گاڑی کے ڈبے میں مسلمان عورتوں کی کٹی ہوئی چھاتیاں، معصوم بچوں کی گردنیں اور کٹے ہوئے ہاتھ عید کے تحفے کے طور پر مسلمانانِ پاکستان کو ارسال کیے۔ جب وہ ڈبہ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو اس پر "پاکستانی مسلمانوں کے لیے عید کا تحفہ" کے اشتعال انگیز الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

بھارت کے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا وہ کسی عارضی گمراہی اور ہنگامی جنون کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ ان کی درندگی، گھٹیا فطرت اور خوفناک ذہنیت کا ایک بھیانک مظاہرہ تھا۔

عصمت و عفت کی تاراجی

روزنامہ آفاق نے اپنی ۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں ایک مہاجر صحافی کی نگارشات شائع کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"______ بھارت [1] سے پاکستان آنے والا کوئی پیدل قافلہ یا سپیشل ٹرین، صحیح سلامت لاہور نہیں پہنچتی تھی۔ لاکھوں مسلمانوں کو شہید کیا جا رہا تھا اور مسلم دوشیزاؤں کے ننگے جلوس نکال کر انہیں کلمہ گوئی اور پاکستان کا مطالبہ کرنے کے جرم کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔ ہزاروں مسلمان دوشیزائیں ہندو، سکھ غنڈوں نے مالِ غنیمت سمجھ کر تاش کے پتوں کی طرح آپس میں بانٹ لیں اور ایک ایک مغویہ کے ساتھ شراب کے نشے میں دھت ہو کر ان درندوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا تصور کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

---

[1] روزنامہ آفاق لاہور ۲ ستمبر ۱۹۷۹ء مضمون "لاہور سے لاہور تک"

لاہور کے روزنامہ آفاق نے ۲، ستمبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں " لاہور سے لاہور تک " کے عنوان کے تحت ننکانہ صاحب کے مقام بابا گورونانک کے استھان پر ہندوستان سے آنے والے ایک سکھ یاتری کا انٹرویو بالاقساط شائع کیا ہے جس میں وہ زود پشیمان سکھ اپنے گھنائونے جرائم کا اقرار کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ " میں بابا گورونانک کے استھان پر پاکستان آیا ہوا ہوں اور ابھی پاکستان میں مقیم ہوں۔ میں بھی تقسیم کے وقت کا ایک کردار ہوں۔ میں ضلع امرتسر کے ایک گاؤں سٹھالہ کا رہنے والا ہوں۔ جن دنوں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ میں نوجوان تھا۔ ابھی نئی نئی مسیں بھیگی تھیں۔ جوانی کا جوش تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ان دنوں ایک نعرہ دیا تھا۔ رنگے اور مودے کے مظالم کا بدلہ لو۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اورنگزیب نے سکھوں پر اور محمود غزنوی نے ہندوؤں پر بہت ظلم کیے ہیں۔ ان کا بدلہ لینے کا وقت آگیا ہے اور پھر کیا تھا ہم تو وحشی بن گئے۔ انسانیت کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ حیوانیت اور بہیمیت ہمارے دماغوں پر مسلط ہو گئی درندگی کے عالم میں قتل و غارت، مار دھاڑ، بے کسوں کی چیخیں، مظلوموں کی آہیں اور بچوں کی فریادیں کوئی چیز ہمیں پگھلا نہ سکی۔ ہم نے مسلمانوں کو خوب لوٹا۔ ان کے نہتے قافلوں پر حملے کرکے جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل کرکے ہم ان کی نوجوان بیٹیاں اٹھا لیتے اور داد عیش دیتے تھے۔

ہم اس وقت وحشی بن گئے تھے۔ ہم دس دس سکھوں نے بیک وقت ایک ایک مظلوم لڑکی کو بے آبرو کیا۔ ہمیں اس وقت تخریب کاری اور درندگی کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ہم نے معصوم اور مظلوم بچوں کو کرپانوں کی نوک پر اٹھا اٹھا کر مارا۔ عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کاٹ کر کہتے " لو یہ تمہارا پاکستان ہے " نوجوان عورتوں کو چھانٹ کر الگ کر لیتے اور باقی بچوں، بوڑھوں اور بوڑھی عورتوں کو گھروں میں بند کرکے آگ لگا دیتے جب انسانی جسم جلتے تو ہمیں کئی بوتلوں کا نشہ ہو جاتا۔ ہم قہقہے لگاتے اور اتنا بھنگڑا ڈالتے کہ ہمارے کیس (یعنی بال) کھل کر رہ جاتے اور پھر نوجوان لڑکیوں کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے۔ بکروں کا جھٹکا کرتے شراب پیتے اور پھر ان کھلی سرمستیوں کی

کہانی کا باب کھل جاتا۔

میں کیا بتاؤں میاں جی — ہم بالکل اندھے ہو گئے تھے اور انسانیت کا آخری احساس بھی ہٹ چکا تھا۔"

پھر اسی اخبار کی ۵ ستمبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں انٹرویو کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔ جس میں سکھ بھیڑیوں نے ایک ایسی مسلمان لڑکی کو اپنی ہوس کا بار بار نشانہ بنایا جو اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھی اور یہ ظالم درندے اس سے یکے بعد دیگرے بدکاری کر رہے تھے —"

خون کی ہولی

مشہور ادیب اے حمید نے اپنے مضمون "خون کی ہولی" میں ۷ اکتوبر ۱۹۸۸ء کے نوائے وقت میں لکھا ہے:

"— گوبند سنگھ آنکھیں ملتا باہر آیا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا: "یہ کون ہے، بھرا جی؟"

اس نے پیارا سنگھ سے پوچھا۔ پیارا سنگھ نے بندوق پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہ مسلمان ہے۔"

گوبند سنگھ کرخت لہجے میں بولا۔[1]

"تو پھر اسے ختم کیوں نہیں کرتے؟ اسے یہاں کیوں لے آئے ہو؟" پیارا سنگھ نے اسے غصے میں گالی دی اور کہا۔

"یہ میرا دوست ہے۔ سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ ایک بار اس نے کولمبو کے جنگلوں میں میری جان بچائی تھی۔ اب اس کی جان بچانا میرا فرض بن گیا ہے۔"

---

[1] اے حمید کے مضمون "خون کی ہولی" کا اقتباس نوائے وقت میگزین ۷ اکتوبر ۱۹۸۸ء

گوبند سنگھ اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا اور بالٹی میں سے مسواک نکال کر چبانے لگا۔ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پیارا سنگھ نے مجھے ناشتہ کروایا اور پھر بولا۔

"تم اندر میری کوٹھڑی میں جاکر سو جاؤ۔"

میں ہچکچایا تو وہ میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اوئے ڈرتے کیوں ہو، یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ جاؤ وہ سامنے والی کوٹھڑی میں جاکر سو جاؤ۔ میں دوپہر کے بعد آؤں گا۔ پھر تمہیں امرتسر کیمپ پہنچانے کی کوشش کروں گا۔"

میں ڈرتے ڈرتے اٹھا اور سامنے والی کوٹھڑی میں چلا گیا جہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ بستر تہہ کرکے سرہانے کی طرف لگا دیا تھا۔ اس کوٹھڑی میں بڑا قیمتی سامان کونے میں ڈھیری کی طرح لگا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مسلمانوں کے گھر سے لوٹ کر لایا ہوا سامان ہے۔ میں چپکے سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مجھے باہر پیارا سنگھ اور گوبند سنگھ کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ گوبند سنگھ کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں نے پاکستان میں ہمارے لوگوں کو مارا ہے۔ ہم یہاں کے مسلمانوں کو کیوں زندہ چھوڑیں۔ پیارا سنگھ اسے ڈانٹتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ لڑکا میرا دوست ہے۔ اس نے میری خاطر انگریز کا تشدد برداشت کیا اور میرے ٹھکانے کا پتہ نہیں بتایا۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ خبردار! یہاں کسی کو خبر نہ ہو کہ ایک مسلمان میری کوٹھڑی میں ہے۔ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ مجھے پیارا سنگھ کے باہر جانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے جانے کے بعد مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ کیا خبر یہ گوبند سنگھ دوسرے سکھوں کو میری خبر کر دے اور وہ لوگ یہاں آکر مجھے قتل کر ڈالیں۔ گوبند سنگھ بعد میں پیارا سنگھ کو کہہ سکتا ہے کہ بھراجی میں کیا کرتا پورا جتھا آگیا تھا نہنگوں کا . . . .

طرح طرح کے وسوسے میرے دل میں اٹھ رہے تھے۔ کبھی سوچتا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ امرتسر شریف پورے کی آبادی میں تو کیمپ بن ہی گیا ہے اور وہاں اپنی بلوچ رجمنٹ کے سپاہی بھی ہیں کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاؤں گا۔ پھر خیال آتا کہ کہیں یہ گوبند سنگھ ہی

میرے پیچھے نہ لگ جائے اور آگے کھیتوں میں جا کر مجھے قتل کر ڈالے اور پیارا سنگھ کو یہ کہہ دے کہ لڑکا بھاگ گیا تھا۔ راستے میں اکالیوں نے اسے مار ڈالا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ ساری رات کا جاگا ہوا تھا مگر اس خوف اور وحشت کی وجہ سے لمحہ بھر بھی نہیں سو سکا۔ کوٹھڑی کا دروازہ میں نے بند کر لیا تھا۔ میں نے دروازے کی درز میں سے باہر صحن میں دیکھا۔ گوبند سنگھ پمپ میں سے پانی نکال کر منہ دھو رہا تھا۔ پھر قمیض الگنی پر سے اتار کر پہنی اور کرپان کمر میں ڈال کر بولا۔

" چلتا ہوں آج نہر پار والے گاؤں کے مسلمانوں کی باری ہے۔ کل سے انہوں نے مورچہ بنایا ہوا ہے۔ ان میں ایک ریٹائر فوجی ہے اس کے پاس اسلحہ ہے۔ آج ختم ہو جائے گا اس کا اسلحہ..... کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔"

دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔ اپنی بیوی گورمیت کور کی طرف مڑ کر کہنے لگا۔

" اس مسلے کے بارے میں کوئی آئے تو مت بتانا۔ بھرا جی کا خیال ہے، کیا کروں۔"

وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ سکھ عورت گورمیت کور بالٹی کے پاس بیٹھ کر ہاتھ دھونے لگی۔ اس کی باہوں کا سونے کا چوڑا چھنک رہا تھا۔ مجھے یونہی خیال آیا کہ خدا جانے یہ کس بدنصیب مسلمان عورت کا چوڑا ہو گا۔ سکھ عورت منہ دھو کر دوپٹے کے پہلو سے منہ پونچھتی ہوئی کوٹھڑی کی طرف آئی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سکھ عورت نے باہر سے کنڈی لگا دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کوٹھڑی میں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔

سخت بے چینی کی حالت میں چارپائی پر بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے۔ کسی درخت پر کوئی کوا بھی زور سے بولتا تو یہی لگتا کہ سکھوں کا جتھہ آ گیا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مجھے دور سے جو بولے سونہال ست سری اکال کا جیکارا سنائی دیا۔ میں سہم گیا۔ نعروں کی آوازیں قریب آ گئی تھیں۔ پھر کسی نے باہر سے پیارا سنگھ کو

آواز دے کر بلایا۔

"پیاریا!"

گورمیت کور نے جواب دیا" وہ باہر گیا ہے۔"

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسی سکھ کی آواز آئی۔

"بھابھو! دروازہ کھولنا ذرا۔"

صحن کا دروازہ کھولنے کی آواز سنائی دی۔ اس سکھ نے کہا۔

"بھابھو! یہ مسلمان لڑکی ہے۔ اسے کوٹھڑی میں بند کر کے تالا لگا دو۔ قافلے سے اٹھائی ہے۔ اگلے گاؤں جا رہے ہیں واپس پر لیتے جائیں گے۔"

میں نے جلدی سے بند دروازے کی درز میں سے باہر دیکھا۔ دو سکھ ہاتھوں میں برچھے لیے کھڑے تھے۔ یہ زرد کپڑوں زرد پگڑیوں والے نہنگ تھے۔ انہوں نے ایک لڑکی کو پکڑ رکھا تھا۔ لڑکی بالکل مردہ ہو رہی تھی۔ اس میں جان نہیں تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔ سکھ نہنگ نے اسے اندر صحن میں دھکیل کر کالی دی اور گورمیت کور سے کہا۔

"بھابھو! ابھی تھوڑی دیر میں آ کر لے جائیں گے۔ اسے کوٹھڑی میں تالا لگا کر رکھنا۔"

اور وہ جو بولے سونہال کا نعرہ لگا کر آگے بڑھ گئے۔ گورمیت کور نے مسلمان لڑکی کو بازو سے پکڑا اور اسے ڈانٹتی، برا بھلا کہتی، کھینچتی ہوئی دوسری کوٹھڑی کی طرف لے گئی۔ لڑکی منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ مزاحمت بھی برائے نام کر رہی تھی۔ اس مسلمان لڑکی کو کوٹھڑی میں بند کر کے گورمیت کور نے باہر تالا لگا دیا۔ میں سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

مسلمان لڑکی ساتھ والی کوٹھڑی میں بند تھی۔ میں اسے ہندو سکھوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔ لیکن صورتِ حال ایسی تھی کہ خود میری جان محفوظ نہیں تھی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب قتل ہو جاؤں۔ چاروں طرف مسلمانوں کی جان و مال کے دشمن

بلمیں، تلواریں، بندوقیں اور کرپانیں لیے درندوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور کبھی بے چینی کے عالم میں بند کوٹھڑی میں ٹہلنے لگتا۔ اسی الجھن اور ذہنی کشمکش میں دوپہر ہو گئی۔ کبھی کبھی وقت دور سے سکھوں، ہندوؤں کے نعروں کی آواز آجاتی تھی۔ باہر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازے میں سے باہر دیکھا۔ صحن کی کچی دیوار کے اوپر سے مجھے صوبیدار پیارا سنگھ دکھائی دیا۔ اس نے گھوڑے کو باہر باندھا اور دروازہ کھول کر مکان کے صحن میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی۔ گٹھڑی چارپائی پر رکھتے ہوئے گورمیت سے کہا....

"یہ میرے دوسرے سامان میں رکھ دو۔"

اور خود پمپ چلا کر ہاتھ دھونے لگا۔ وہ یوں رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھو رہا تھا جیسے خون کے دھبے دھو رہا ہو ظاہر ہے وہ کسی مسلمان کا خون کر کے کسی مسلمان کے گھر کے زیور وغیرہ لوٹ کر آیا تھا۔ میرا دل خوف سے بیٹھنے لگا۔ کسی وقت پیارا سنگھ مجھے نجات دہندہ معلوم ہوتا اور کسی وقت لگتا کہ یہ مجھے بھی اپنی کرپان سے ذبح کر دے گا۔ جیب سے میلا کچیلا رومال نکال کر اس سے اپنے ہاتھ پونچھتا ہوا وہ گورمیت کور کے پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور اس سے میرے بارے میں پوچھا۔ گورمیت کور نے بیزاری سے کہا۔

"تمہارا مسلا ٹھیک ٹھاک ہے۔"

پھر اس نے پیارا سنگھ کو بتایا کہ ننگل کرپالا ایک مسلمان عورت کو اندر رکھا گیا ہے۔

پیارا سنگھ نے رومال سے اپنی ڈاڑھی صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ باز نہیں آئیں گے۔ عورتیں تو گائیں ہوتی ہیں۔ لاؤ روٹی ڈال دو۔ میرے یار کو روٹی کھلائی کہ نہیں ؟"

گورمیت کور نے نفرت سے سر کو ہلکا سا جھٹک کر کہا۔

"تم ہی جا کر کھلا دو اسے روٹی۔"

پیارا سنگھ بولا۔" اچھا لاؤ مجھے دے دو۔ اس کی روٹی بھی چنگیر میں ڈال دو۔"
چنگیر میں دو چار پراٹھے ڈلوا کر پیارا سنگھ میری کوٹھڑی میں آ گیا۔ اس نے آدھا دروازہ کھلا ہی رکھا۔ باہر سے تازہ ہوا کوٹھڑی میں آنے لگی۔ پیارا سنگھ میرے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چنگیر درمیان میں رکھ لی اور بولا۔

"لو یار روٹی کھا لو۔ گھر کے گھی کے پراٹھے ہیں۔ میٹھے پراٹھے ہیں۔"

میں نے کہا۔" مجھے بھوک نہیں ہے پیارا سنگھ جی۔"

اس نے میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ مار کر کہا۔

" اوئے تو فکر کس لیے کرتا ہے۔ سوں گورو کی تیری ہوا کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔"

" مجھے امرتسر کے رفیوجی کیمپ میں کب لے جاؤ گے؟"

پیارا سنگھ بولا۔

" نہنگ چاروں طرف بھتے لیے پھر رہے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ لیکن میں ان کی پروا بھی نہیں کرتا۔ آج آدھی رات کو تمہیں یہاں سے نکال کرلے جاؤں گا۔"

تب میں نے پیارا سنگھ کو بتایا کہ سامنے والی کوٹھڑی میں ایک مسلمان لڑکی بند ہے اور میں اسے بھی اپنے ساتھ کیمپ میں لے جانا چاہتا ہوں۔ پیارا سنگھ سر جھکائے روٹی کھا رہا تھا۔ کچھ دیر تک اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے بھی سوال دہرانا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے ڈر تھا کہ پیارا سنگھ انکار کر دے گا۔ پیارا سنگھ نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

" کرپالا نہنگ اسے رکھوا گیا ہے وہ تو اسے لینے تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔"

میں مایوس ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ یہ بدنصیب لڑکی اب شاید ہی پاکستان واپس جائے۔ پیارا سنگھ یہاں مجبور لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی کے گھنے بال تھے۔ اس کے تاثرات کا فوری علم نہیں ہوتا تھا۔ صرف آنکھوں سے کچھ ظاہر ہو جاتا تھا۔ آنکھیں اس کی میری طرف

نہیں تھیں۔ میں بھی روٹی زہر مار کر رہا تھا۔ کوٹھڑی میں خاموشی چھائی تھی۔ باہر کیکر کے درخت پر ایک کوا بار بار بول رہا تھا۔ اس کی آواز میرے ذہن میں خراشیں ڈال رہی تھی۔

میں نے بمشکل ایک پراٹھا کھایا۔ صوبیدار پیارا سنگھ باقی سارے پراٹھے ہڑپ کر گیا۔ پھر ہاتھوں کو ڈاڑھی پر پھیرتے ہوئے اٹھا اور بولا۔

"جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ اِک منٹ ٹھہرو میں اس لڑکی کو باہر نکال لاؤں۔"

یہ کہہ کر کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ اس طرح بند کیا کہ باہر جھانک سکوں۔ گورمیت کور روٹیاں پکا چکی تھی۔ اور پمپ کے نیچے پلاسٹک کی بالٹی کے پاس بیٹھی ہاتھ دھو رہی تھی۔ پیارا سنگھ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ایک کوٹھڑی چھوڑ کر دوسری والی کوٹھڑی کی کنڈی کھول کر اندر گھس گیا۔ اس کی بھابھی گورمیت کور اس کے اندر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اور کچھ نہ بولی۔ جب پیارا سنگھ سہمی ہوئی مسلمان لڑکی کو کوٹھڑی سے نکال کر باہر لایا تو گورمیت کور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس کو باہر کیوں نکالا ہے؟"

"پیارا سنگھ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ سنی ان سنی کر دی اور مجھے آواز دی کہ باہر آ جاؤ۔ میں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ جلدی سے باہر صحن میں آ گیا۔"

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

اب گورمیت کور نے غصے میں کہا۔

"اس لڑکی کو کہاں لے جا رہے ہو؟ وہ کرپالا آئے گا تو میں کیا جواب دوں گی؟"

صوبیدار پیارا سنگھ نے لڑکی کی کلائی پکڑ رکھی تھی۔ لڑکی بدحواس سی تھی۔ پیارا سنگھ نے کہا۔

"اس کو میں جواب دے دوں گا۔ تم بیچ میں ٹرٹرمت کرو۔"

مہاجر کیمپ سے پاکستان کا سفر:

جناب عبدالقادر اپنے مضمون عصمتوں کا نذرانہ میں لکھتے ہیں:

"_____ گلی میں پہنچ کر والد صاحب نے آہستہ سے مجھے کہا۔" شاید اپنے گھر میں یہ ہماری آخری عید ہے۔ اگر تمہارے دونوں بھائی بھی یہاں ہوتے تو بہتر تھا۔ خورشید کو تو آج یہاں ہونا چاہیئے تھا۔" خورشید ہمارے وٹرنری ڈاکٹر بھائی کا نام تھا ۔۔۔۔

میں کیا جواب دیتا، خاموش رہا۔ گھر کے اندر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اماں نے سویاں دیں تو ان کا ذائقہ بھی بدلا بدلا محسوس ہوا۔ ایسی روکھی پھیکی عید کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ والد صاحب کو بار بار اپنے بھائی، ہمارے چچا یاد آرہے تھے جو پاکستان پر قربان ہو گئے تھے۔

چند دنوں کے بعد شہر میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا۔ اکا دکا مسلمان کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اپنے محلے سے باہر جا سکیں۔ مسلمانوں کے بعض محلوں کو آگ لگا کر لوٹ لیا گیا۔ خطرہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ محلے کے تمام مسلمان ہمارے ہاں جمع ہوئے۔ عورتوں کا حال تو دیکھا نہیں جاتا تھا۔ وہ چہرے جو گلاب کی طرح کبھی سُرخ اور تروتازہ تھے، اب مرجھائے مرجھائے دکھائی دے رہے تھے۔ سب چاہتے تھے کہ ان کا گھر ان سے نہ چھوٹے لیکن خطرہ اتنا قریب آچکا تھا کہ سب گھر چھوڑ کر کیمپ میں جانے پر مجبور تھے۔ میرے والد چونکہ سرکاری ملازم تھے، اس لیے ملاقات کا سکھ تھانیدار انہیں کہہ گیا تھا کہ وہ کسی طرح کی کوئی ذمے داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں _____ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنا محلہ خالی کر کے کم سے کم سامان کے ساتھ کیمپ میں چلے جائیں۔

میں وہ منظر ساری عمر نہیں بھول سکتا۔ جب ہم لوگ اگلی صبح اپنے اپنے محلے سے

لے "عصمتوں کا نذرانہ" از عبدالقادر شائع شدہ اردو ڈائجسٹ لاہور آزادی نمبر ۱۹۸۶ء

نکلے۔ محلے کے تقریباً ہر گھر میں گائے یا بھینس تھی لیکن کوئی اپنے ان چہیتے پالتو جانوروں کو ساتھ لے کر نہیں جا سکتا تھا۔ پولیس کے کچھ سپاہی ایک تھانیدار کی قیادت میں وہاں موجود تھے۔ جو میرے والد کی درخواست پر وہاں آئے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں درجنوں ہندو اور سکھ بھی پہنچ چکے تھے۔ ان میں پنڈت شام لال بھی تھا، میرے چچاجان کا قاتل۔ سب ہندو اور سکھ مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں لوٹ مار کرنے کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے چہروں پر ہمارے لیے حقارت تھی۔ ہر شخص بار بار اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ مردوں اور عورتوں کو دیکھ کر بچے بھی رونے لگے تھے۔ خود میری آنکھیں خود بخود آنسو بہانے لگی تھیں۔ والد صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ والدہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں۔ میری بہن نسرین بھی رو رہی تھیں۔ اس وقت مجھے اپنا کیپٹن اور وٹرنری ڈاکٹر بھائی یاد آئے۔ خدا جانے وہ کہاں تھے اور کس حال میں تھے۔

اپنی گلی اور اپنے مکانوں کو چھوڑ کر نکلنا بہت مشکل تھا۔ ایک ایک قدم منوں بھاری ہو رہا تھا۔ ہر شخص نے اپنے مکان کو تالا لگا دیا تھا، اس امید میں کہ چند دنوں کے بعد اپنے گھروں کو واپسی ہو جائے گی لیکن بہت سے چہرے ایسے تھے جو صاف بتا رہے تھے کہ اب واپسی ممکن نہیں، اب یہ گھر ہمیشہ کے لیے پرائے ہونے والے ہیں۔ یہ گھر جنہیں ہمارے بزرگوں نے تعمیر کیا تھا، جن میں ان کا خون پسینہ شامل تھا اب غیروں کے ہونے والے تھے۔ ان گھروں کے ساتھ زندگی، موت، محبتوں اور شفقتوں کی ان گنت اور انمٹ یادیں وابستہ تھیں لیکن یہ گھر اب ہمیشہ کے لیے چھوٹ رہے تھے۔ آہوں، سسکیوں اور ہچکیوں کے ساتھ گلی چھوڑی گئی۔ جب سیکڑوں مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل یہ قافلہ اپنے محلے کی مسجد کے سامنے رُکا تو یکدم خاموشی چھا گئی۔ یکدم آنسو اور آہیں تھم گئے۔ ایک پُر ہیبت سناٹے نے سب کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ لوگ جو تھوڑی دیر پہلے اپنے اپنے گھر، اپنے گھروں میں اپنی قیمتی چیزیں، مال اسباب چھوڑ کر جاتے ہوئے آنسو بہا رہے تھے، واویلا کر رہے تھے، اب وہی خدا کے گھر کے سامنے رُکے تھے۔ سب کی آنکھیں مسجد کے درو دیوار، محراب اور مینار پر جمی تھیں۔ سب کے چہروں پر ایک ہی

سوال تھا،

ہم اپنی مسجد کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں۔

اس مقدس مسجد کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ کون اس کی صفائی کرے گا۔ کون۔۔۔ کون ...؟ یہ مسجد، جن میں کئی نسلوں کے افراد نے خضوع و خشوع سے نمازیں پڑھی تھیں۔

کیا اب وہاں کبھی اذان نہیں گونجے گی؟

میں اس وقت ایک عجیب طرح کی تھرتھری اور لرزش اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ گلی میں رہنے والے استاد ماسٹر عبدالرحمٰن نے سب چہروں پر لکھا ہوا یہ سوال پڑھ لیا تھا۔ وہ آگے بڑھے۔ سب لوگوں پر اک نگاہ ڈالنے کے بعد مسجد پر ان کی نگاہ تھوڑی دیر کے لیے گڑ گئی۔ پھر وہ کھنکھارے، گلا صاف کرکے بوجھل آواز میں کہنے لگے،

" بھائیو ... اب ہمیں چلنا ہے .... مسجد خدا کا گھر ہے۔ اس کی حفاظت خدا کرے گا۔ انشاء اللہ ایک دن آئے گا۔ جلد آئے گا، جب ہم واپس آئیں گے اور مسجد میں پھر سے اذان گونجا کرے گی "۔

ماسٹر عبدالرحمٰن کے کلمات نے دلوں کو ڈھارس بندھائی۔ رُکے اور تھمے ہوئے قدم پھر حرکت میں آگئے۔ ہندو اور سکھ طنز سے مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو انسانی نہیں ہوتی .... جب ہم گلی سے باہر نکل کر بازار کی طرف نکلے اور کھلی جگہ پر پہنچے تو ہندو اور سکھ پیچھے رہ گئے تھے۔ کچھ بھینسیں اور گائیں جو اپنے مالکوں کے پیچھے آرہی تھیں، وہ انہیں روک رہے تھے، ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے۔ بھینسیں ڈکرا رہی تھیں۔ ایک بار پھر آہوں کا سلسلہ جاری ہوگیا ....

اپنے محلے سے نکل کر ریلوے اسٹیشن کے قریب کیمپ تک ہم کیسے پہنچے، یہ تین میل کا فاصلہ ایسا فاصلہ تھا جو شاید برسوں پر محیط ہوگیا تھا یا چند پلوں پر ... میں آج تک اس فاصلے کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکا۔ ایک خواب کی سی کیفیت تھی۔

جس میں مَیں چل رہا تھا۔ اس فاصلے کے درمیان میں اپنے گردوپیش کو یکسر فراموش کر گیا تھا۔ ایک ایسی کیفیت تھی جو اس سے پہلے یا اس کے بعد پھر کبھی طاری نہیں ہوئی۔ خود فراموشی کی کیفیت جس میں حواس شل اور ماؤف ہو جاتے ہیں۔ . . .

کیمپ کی حدود میں پہنچتے ہی ایک بدلی ہوئی دنیا دکھائی دی۔ ایک ایسی دنیا آباد ہو چکی تھی جو غلاظت میں لتھڑی ہوئی تھی۔ بارشوں کی وجہ سے کیچڑ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس کیچڑ میں لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ تنبو بھی موجود تھے لیکن ان کی حالت بھی خراب تھی۔ جہاں جگہ مل گئی، وہاں ہم بھی بیٹھ گئے۔ ان گنت لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ سوال . . . سینکڑوں سوال زبانوں پر سوال، ہونٹوں پر سوال . . . . اور پھر ہر شخص کی ایک داستان تھی۔ سب کی داستان ایک جیسی تھی . . . .

سب کے گھر چھوٹ گئے تھے۔ سب اپنے گاؤں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سب کے ڈھور ڈنگر، گھربار، مال اسباب پیچھے رہ گئے تھے۔ سب بھوکے تھے . . . سب تکلیف میں تھے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آنسو جو بہہ رہے تھے، آنسو جو آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے . . . . اور پھر ان میں وہ بھی تھے جو زخمی تھے . . .

وہ بھی تھے جن کے عزیز راستے میں . . . گاؤں سے کیمپ تک پہنچتے پہنچتے سکھوں اور ہندوؤں نے قتل کر دیے تھے۔ اپنے اپنے پیاروں کی لاشیں چھوڑ کر وہ یہاں پہنچے تھے اور اب یہ لاشیں اپنے سینے سے لگائے رو رہے تھے . . . یہ لاشیں جو اب وہ کبھی اپنے سینے سے اتار نہیں سکیں گے . . . . جب تک وہ زندہ رہیں گے، ان لاشوں کو سینے سے چمٹائے رکھیں گے . . . .

یہ میں اس وقت نہیں جانتا تھا لیکن آج جب کچھ لاشیں خود میرے سینے پر لیٹی ہوئی ہیں تو میں بھی اس المیے کو اچھی طرح جان چکا ہوں . . . .

کیمپ میں بھوک تھی . . . غلاظت تھی، بیماری تھی، مرنے والوں کا نوحہ تھا۔ مستقبل کا کچھ علم نہیں تھا۔ جدائی اور ہجر کی داستانیں تھیں اور بارش تھی . . . آسمان سے پانی برس رہا تھا۔ خدا کی بے گھر مخلوق بھیگ رہی تھی۔ وہ چند گھنٹوں کی مسافت طے کر کے اپنے

اپنے محفوظ گھروں میں جا سکتے تھے لیکن نہیں جا سکتے تھے۔ ان کے گھروں کے دروازے ان کے لیے ہی بند ہو گئے تھے۔ گھر کی طرف جانے والی سب راہوں پر موت کھڑی تھی۔ بندوقیں، رائفلیں، گنڈاسے، لاٹھیاں، چھرے اور کرپانیں لے کر....

واپسی کا راستہ بند ہو چکا تھا....

جو کچھ جس کے پاس تھا وہ اس میں اپنے دوسرے بھائی کو شریک کر رہا تھا۔ اس کے باوجود کھانے پینے اور پیٹ بھرنے کا سلسلہ کب تک چلتا۔ بڑے تو پھر بھی صبر کر لیتے اور ویسے بھی ان کی بھوک مر چکی تھی۔ وہ محض زندہ رہنے کیلئے چند لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیتے تھے لیکن بچے تو بھوک سے بلبلا اٹھتے تھے۔ سارے کیمپ میں یہی حال تھا اور لٹے پٹے لوگوں کو مزید لوٹنے کے لیے کیمپ سے کچھ فاصلے پر ہندو بنیے دکانیں لگا کر بیٹھ گئے تھے نمک مرچ، دال اور آٹے ایندھن کا بھاؤ سونے کے مول ہو گیا تھا اور اس کیمپ میں کتنے تھے جو اپنے ساتھ پیسے لے کر آئے تھے یہاں قیمتی سے قیمتی چیز ــــ اونے پونے بکنے لگی۔ سونے کی وہ چوڑیاں جو برسوں پیسے جمع کر کے کبھی کسی نے اس بھلے زمانے میں تین سو روپے میں بنوائی تھیں، اب وہی سونے کی چوڑیاں تیس روپوں میں بک رہی تھیں برسوں کی بچت اور سنبھالی ہوئی قیمتی چیزیں ٹکے سیر بکنے لگیں۔

اور کیمپ میں اعلان ہو چکا تھا کہ لوگوں کو پاکستان کی سرحد تک پہنچانے کے انتظام کیے جا رہے ہیں لیکن کب ..... اور کیسے؟ ان سوالوں کا جواب کسی کو نہیں دیا گیا تھا۔

میں سارا دن ادھر ادھر کیمپ میں گھومتا رہتا۔ آج بھی وہ دن یاد آتے ہیں تو میں ہر چیز سے بیزار ہو جاتا ہوں۔ کیمپ میں وہ بھی تھے جن کے چہرے ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، جو صفائی اور نفاست کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اب ان کے چہرے میلے، بال الجھے اور لباس میلے کچیلے دکھائی دیتے تھے۔ پھٹے کپڑے، برے حال، چہروں پر خوف اور بھوک کی پرچھائیاں.... وہ چہرے جنہیں کبھی آسمان نے نہیں دیکھا تھا، اب وہ کیمپوں میں اپنے چہرے چھپاتے پھرتے تھے... آنکھیں ویران تھیں اور مایوسیاں چہروں

پر گھنڈی سی ہوئی تھیں۔

کیمپ میں گھومتے کتنے ہی جانے پہچانے چہرے اور لوگ دکھائی دیے۔ سب کے حالات ایک جیسے تھے۔ سب ایک ہی بات پوچھتے تھے۔

"پاکستان کب جائیں گے۔۔۔"

ہر روز افواہیں کیمپ میں پھیلتیں سکھ اور ہندو کیمپ پر حملہ کرنیوالے ہیں۔ راتوں کی نیند اڑ گئی تھی اور دنوں کا چین کافور ہو چکا تھا۔۔۔۔

بہت کچھ بک چکا تھا۔ پھر بھی کھانے کو کچھ نہ رہا تھا۔ والدہ نے ایک دن والد صاحب سے کہا:

"گھر میں آٹے کی دو بوریاں پڑی ہیں۔۔۔"

والد صاحب عجیب انداز سے مسکرائے پھر بولے: "اچھا۔۔۔ دیکھو۔۔۔" میں نہیں جانتا کیسے پولیس کے ایک سپاہی کا انتظام کرنے میں والد صاحب کامیاب ہو گئے لیکن مجھے علم ہے کہ اس کے لیے انہیں کیمپ انچارج کی بہت منت سماجت کرنی پڑی ہوگی۔ میرے شدید اصرار کے بعد والد صاحب مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔

گھر کی طرف۔۔۔ اپنے محلے کی طرف۔۔۔ میں اور والد صاحب چل پڑے۔ ہمارے ساتھ ایک سپاہی تھا جو بہت بیزار دکھائی دے رہا تھا۔

گورداسپور شہر پر ایک اداس چھائی ہوئی تھی۔ نئے نئے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ جان پہچان والے ہندوؤں اور سکھوں نے بھی والد صاحب سے آنکھ ملانے کی کوشش نہ کی بلکہ حقارت سے مسکرا دیے۔ جب ہم اپنے محلے کے بازار والے بہرے پر پہنچے تو والد صاحب اچانک رک گئے۔ بازار کھلا تھا۔۔۔ وہ دکان بھی کھلی تھی جو چچا جان کی تھی۔ وہاں ایک لس چوٹی والا بنیا بیٹھا سودا تول رہا تھا۔۔۔۔ یہ وہ دکان تھی جسے چچا جان نے بڑی محنت اور مقابلے کے بعد قائم کیا تھا۔ اس دکان کو انہوں نے پاکستان پر قربان کر دیا تھا اور خود بھی پاکستان کے لیے شہید ہو گئے۔۔۔۔ والد صاحب نے اپنی آستین سے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھے اور گلی کی طرف بڑھ گئے۔۔۔۔

گلی کے اندر ہم چند گز کا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ والد صاحب کے قدم اچانک رک گئے ... میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ سر گھوم رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھیں .... گلی کے دوروید مکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ وہ سب گھر جن کے مالک تالے لگا کر گئے تھے، وہ تالے ٹوٹ چکے تھے۔ سب گھر لوٹے جا چکے تھے ... سب دروازے کھلے تھے ... ہر گھر کا صفایا ہو چکا تھا ... اور گلی کاغذوں اور کتابوں کے انبار سے اٹی ہوئی تھی۔ گلی کا فرش کاغذوں اور پھٹی کتابوں سے ڈھنپا ہوا تھا۔

ہر قیمتی چیز، ہر کارآمد چیز لوٹ لی گئی تھی۔ کتابیں پیسوں اور چھپی ہوئی قیمتی چیزوں کی تلاش میں پھاڑ کر گلی میں پھینک دی گئی تھیں۔ انسانوں کی عقل و دانش، فکر و فلسفے اور علم و تجربات پر مشتمل قیمتی کتابیں ورق ورق گلی میں ڈھیر تھیں، بکھری پڑی تھیں، مردہ بے جان لاشوں کی طرح فریاد کرتی ہوئیں، زبانِ خاموشی سے آہ و بکا کر رہی تھیں ... ان میں قرآن پاک کے اوراق بھی پھڑ پھڑا رہے تھے۔

والد صاحب کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ وہ بھول گئے کہ کتنی منت سماجت کے بعد وہ سپاہی کا انتظام کر کے اپنی گلی میں اپنے گھر میں رکھی آٹے کی بوریاں لینے آئے ہیں۔ میں نے ایسا منظر پھر کبھی نہیں دیکھا ....

اپنی گلی میں جہاں تک نگاہ جاتی ہے پھٹی پرانی، دریدہ، بکھری، ورق ورق کتابوں کا فرش بچھا ہوا تھا ... ہر گھر کا دروازہ کھلا تھا .... ہوا میں کاغذ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ آہیں بھر رہے تھے ....

سکھ سپاہی نے درشت لہجے میں کہا: "آگے چلو میاں صاحب .... میں تمہارا نوکر نہیں ہاں کر ا یتھے کھلوتا رہواں ..." (آگے چلو میاں صاحب میں تمہارا نوکر نہیں ہوں کہ یہاں کھڑا رہوں)

والد صاحب نے اپنا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ اوپر اٹھا۔ اک نگاہ میری طرف دیکھا پھر رندھی ہوئی آواز میں کہا:

"ہمیں واپس کیمپ لے چلو ..."

سکھ سپاہی حیران سا رہ گیا۔

"بادشاہو کہیہ گل اے۔ بن اپنی گل وچ آکے واپس جاسے او..."

"ہاں ہم آگے نہیں جاسکیں گے۔" والد صاحب نے سسکی لیتے ہوئے کہا "ہم آگے جا ہی نہیں سکتے۔ بس چلو..."

ہم تیزی سے پیچھے لوٹے... جب کیمپ پہنچے تو والد صاحب نے والدہ سے کہا:

"گھر لٹ چکا ہے۔ آلما تو کیا وہاں کچھ بھی نہیں رہا..."

میں جانتا ہوں ہم نے اپنے لٹے ہوئے گھر کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن حقیقت وہی تھی جو والد صاحب نے بیان کر دی تھی۔ والدہ نے میری بہن نسرین کو گلے سے لگا کر اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ میں جانتا ہوں وہ کیوں رو رہی تھیں۔ کتنے برسوں سے وہ پیسہ پیسہ جوڑ کر محبت سے، امنگوں اور دعاؤں کے ساتھ نسرین کا جہیز تیار کر رہی تھیں.... جو اب لٹ چکا تھا۔

والد صاحب سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور وہ اٹھ کر چل دیے۔

کیمپ میں لٹے پٹے دیہات کے لٹے پٹے مسلمانوں کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بھوک بیماری اور غلاظت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اب زخمیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خاندان جن کے عزیز شہید ہو گئے تھے، ان کے قصے سنے نہیں جاتے تھے۔ سب سے ہولناک واقعات عورتوں کے اغوا اور عصمت لٹنے کے تھے۔ ایسے واقعات سن کر میرا جوان خون کھولنے لگتا۔ جی چاہتا کوئی ایسی چیز ہاتھ آجائے کہ جس سے میں ظالم ہندوؤں اور سکھوں کا صفایا کر سکوں....

بھوک، بیماری، برسات کی بارشوں اور غلاظت نے کیمپ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ لوگ مر رہے تھے، بچے مر رہے تھے۔ کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ بس آنسو بہا سکتا تھا۔ خدا سے دعا مانگ سکتا تھا۔ پاکستان پہنچنے کے خواب دیکھ سکتا تھا۔ بین اور ماتم کر سکتا تھا.....

ایک دن میں نے والد صاحب اور والدہ کو کھسر پھسر کرتے دیکھا۔ والدہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ کبھی انکار میں سر ہلاتیں، کبھی اقرار میں، آنسو ان کی آنکھوں سے چھلکے جا رہے تھے۔ اس شام والد صاحب نے علیحدگی میں بتایا۔

"بیٹے تم پر بھاری ذمے داری آپڑی ہے۔ صبح ایک قافلہ پاکستان جانے والا ہے دس ٹرکوں کا انتظام ہوا ہے۔ تم جانتے ہو کہ دس ٹرکوں میں کتنے لوگ جا سکتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح میں نے تمہیں اور نسرین کو بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے۔ ہم تمہارے بعد آنے والے قافلے میں آئیں گے۔ نسرین کا خیال رکھنا بیٹا اور دیکھو اگر اس کی عزت کو خطرہ لاحق ہو تو تمہیں ایک باغیرت مسلمان اور بھائی کا فرض ادا کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر والد صاحب نے مجھے ایک چھری جو اپنے تہبند میں چھپا رکھی تھی، نکال کر دے دی.... میں نے وہ چھری اپنی شلوار کے نیفے میں چھپا لی۔ والد صاحب نے وہ سب باتیں جو زبان سے نہ کہہ سکتے تھے، اپنی دھندلی آنسوؤں سے بھری نظروں سے کہہ دیں....

وہ رات کیسے بیتی.... میں کیسے بیان کروں۔ والد صاحب کو اِک چپ لگ گئی تھی۔ والدہ بار بار نسرین کو چومتی اور سینے سے لگاتی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتی تھیں۔ والد صاحب نے جب بھی زبان کھولی کہا:

"تریموں ہیڈ کے پار پاکستان ہے۔ وہاں سے سیدھے لاہور اپنے ماموں کے ہاں چلے جانا۔ ہم تمہیں وہاں آن ملیں گے۔ تمہارے بھائی بھی انشاء اللہ وہاں تمہیں آن ملیں گے۔"

پاکستان، لاہور میں ماموں کا گھر.... راستے.... والدین سے جدائی.... راہ کے خطرے.... میں بہت کچھ سوچتے ہوئے بھی کچھ نہ سوچ سکتا تھا۔

علی الصبح والد صاحب نے ہمیں جگا دیا۔ میں تو جاگ ہی رہا تھا۔ نسرین اٹھتے ہی رونے لگی۔ بار بار والدہ سے لپٹتی تھی۔ بار بار والد صاحب کی طرف دیکھتی تھی۔ والد صاحب نے بوجھل لہجے میں کہا:

"اب چلو دیر نہ کرو ...."

والدہ نے ہمیں جانے کتنے آنسوؤں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا... وہ سراپا دعا بنی کھڑی تھیں......!

انسان کو جان کتنی پیاری ہوتی ہے۔ موت کا خوف کتنا ہولناک ہوتا ہے....

انسان یکدم کتنا خود غرض بن جاتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا۔

دس ٹرک تھے لیکن ہر شخص ان پر خود یا اپنے کسی عزیز کو سوار کرانے کے لیے لڑ مر رہا تھا۔ دوسروں کو دھکے دے رہا تھا، کچل اور روند رہا تھا، چیخ اور چلا رہا تھا، پولیس ڈنڈے برسا رہی تھی لیکن وہ ڈنڈے کھا رہے تھے۔ والد صاحب کسی نہ کسی طرح مجھے اور نسرین کو ایک ٹرک میں سوار کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ ٹرک انسانوں سے ٹھنسا ہوا تھا۔ آدمی ایک دوسرے کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا۔ سانس لینے کے لیے زور لگانا پڑتا تھا۔ ہزاروں افراد نیچے کھڑے چیخ رہے تھے، دھکے دے رہے تھے، پولیس کے ڈنڈے کھا رہے تھے۔ رو رہے تھے، آنسو بہا رہے تھے، سوار ہونے والوں کو چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔

شور اتنا تھا کہ کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔

میں آنسوؤں سے بھیگی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا... پھر آہستہ آہستہ ٹرک چلنے لگے... میری نگاہیں اپنے والد پر گڑ گئیں جو انسانوں کے ہجوم میں سر جھکائے کھڑے تھے۔

میں جانتا ہوں اس وقت وہ ہمارے لیے دعائیں کیے چلے جا رہے تھے اور پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئے ــــ گورداس پور شہر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا... راستے... اور ٹرکوں کو گھورتی ہوئی ہندوؤں اور سکھوں کی آنکھیں....

ہم پاکستان جا رہے تھے۔ پاکستان جسے مسلمانوں نے اپنی ان تھک جدوجہد اور قربانیوں سے بنایا تھا، جس کے لیے میرے چچا جان نے جان دی تھی....

ٹرک چلتے رہے اور پھر جب دوپہر کا وقت ہوا، جب پیاس سے ہونٹ خشک ہو

چلے تھے، ٹرک اچانک رُک گئے۔ گشتی کے ہندو سپاہیوں نے حکم دیا،

"ٹرکوں سے اتر جاؤ۔ ایک میل کے فاصلے پر تریموں ہیڈ ہے۔ وہاں تک پیدل جانا ہو گا۔"

لوگ ایک دوسرے کو نظر انداز کر کے ٹرکوں سے اترنے لگے۔ جلدی جلدی... سب سے آگے نکل جانے کے لیے چھلانگیں لگانے لگے۔ میں نے نسرین کو اتارا اور ہجوم میں کھو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن میرے قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ کسی انجانے خوف نے دل کی حالت غیر کر دی تھی اور پھر وہی ہوا....

ابھی ہم تریموں ہیڈ سے نصف میل دور تھے کہ چاروں طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ واہگورو کی فتح، ہرے رام اور بھارت زندہ باد کے کریہہ اور کانوں کو پھاڑ دینے والے نعرے... مسلح ہندو اور سکھ قافلے لوٹنے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بلمیں، کرپانیں، گنڈاسے اور بندوقیں تھیں۔

اور پھر ہم پر گولیاں برسنے لگیں....

قیامت ٹوٹ پڑی۔ شور، چیخیں، ظالموں کے نعرے، زخمیوں کی چیخیں، مرنے والوں کی چیخیں.... عورتوں کی چیخیں۔ بچاؤ بچاؤ.... لشکتی دھوپ، چندھیا دینے والی دھوپ اور اس میں چمکتی بلمیں اور کرپانیں... وہ ظالم عورتوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ عورتوں کو پکڑ کر نوچ کھسوٹ رہے تھے۔

میں نسرین کی طرف بھاگا۔ اس کا دوپٹہ گر کر اس کے پاؤں سے الجھا ہوا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں... میری معصوم بہن... میں نے اک نگاہ اس کی طرف بڑھتے سکھوں اور ہندوؤں پر ڈالی اور پھر تیزی سے اپنی بہن نسرین کی طرف لپکا.... میری آنکھوں نے دیکھنا بند کر دیا۔ میرا ہاتھ شلوار کے نیفے کی طرف بڑھا۔ چھری باہر نکالی....

بہنوں کی شادیاں ہوتی ہیں تو بھائی انہیں کندھا دے کر الوداع کرتے ہیں۔ تب بہنوں کے ہاتھ پر مہندی لگی ہوتی ہے۔ چہرے حیا سے گلنار ہوتے ہیں.... میں نے

بھی اپنی بہن کو رخصت کر دیا... چھری کا ایک وار، دوسرا وار... خون... خون... وہ چیخی نہیں۔ اس نے گلہ نہیں کیا... اس کی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔ اس کا پاک جسم زمین پر ڈھیر ہو گیا....

اور پھر میں ان مظلوم عورتوں کی طرف بڑھا جن پر سکھ حملہ کر رہے تھے۔ میں آنکھیں بند کر کے ان بہنوں، ان بیٹیوں کے سینوں اور پیٹ پر چھری کے وار کرتا چلا گیا....

ہاں... ان کو میں ناپاک ہاتھ نہ لگنے دوں گا...

یہ پاکستان جا رہی تھیں۔ ان کے جسم پاکستان پر قربان کر دوں گا۔ ان کی روحیں پاک اور بے داغ حالت میں پاکستان جائیں گی ___ کسی غیر کا ہاتھ ان کے جسم کو نہ چھو سکے گا....

اور پھر اچانک ایک گولی میری ٹانگ کو چیرتی ہوئی آگ لگاتی نکل گئی.... چھری میرے ہاتھ سے گر گئی۔ میں اندھا دھند بھاگا۔ کس طرف، کس سمت، مجھے کچھ معلوم نہ تھا... میں کب گرا کہاں گرا... کچھ معلوم نہیں... بہت عرصے تک مجھے یہ بھی احساس نہ رہا کہ میں زندہ ہوں یا مردہ....

جب ہوش آیا تو میں آس پاس بکھری لاشوں کے پاس لیٹا ہوا تھا۔ وہ مجھے بھی مردہ سمجھ کر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں خون سے لت پت تھا۔ ٹانگ زخمی تھی۔ جانے کتنا خون بہہ چکا تھا۔ میں دم سادھے لیٹا رہا... کچھ سوچنا چاہا لیکن کچھ سوچ نہ سکا۔ پھر بے ہوش ہو گیا....

ہوا بند تھی، شام ہو چکی تھی جب مجھے پھر ہوش آیا... میں لاشوں میں سے اٹھا، گھسٹتا لڑکھڑاتا چل پڑا۔ میرے پیچھے گورداسپور تھا۔ میرے ماں باپ تھے۔ میری بہن کی لاش تھی۔ چچا جان کی قبر تھی۔ مسلمانوں کا صدیوں پرانا ماضی تھا... لیکن میں ایک سرمستی اور بے خودی کی کیفیت میں پاکستان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کس طرح میں کچھ اور لوگوں میں شامل ہوا جو میری طرح خستہ حال تھے، کس طرح تریموں ہیڈ تک پہنچا تھا، کس طرح

پاکستان کی سرحد تک پہنچا۔ کن لوگوں نے مجھے تھاما، میری دیکھ بھال کی کچھ یاد نہیں...

فجر کی اذان سُن کر میری آنکھ کھلی۔ میں اب اس سرزمین میں تھا جہاں مسجدوں میں اذانیں دی جاتی تھیں، جو آزاد تھا... اپنے گندے خون سے لت پت کپڑوں ہی میں مَیں سجدے میں گر گیا....

اپنے جیسے کچھ زخمیوں کے ساتھ میں چل نکلا۔ پھر ایک گمنام سے اسٹیشن سے ریل گاڑی پر سوار ہوا۔ جب لاہور پہنچا تو میری ٹانگ سے پیپ رس رہی تھی۔ مجھ سے چلنا دوبھر تھا۔ کسی نے سہارا دیا۔ ٹانگے میں بٹھایا۔ اپنے ساتھ شاہ عالمی لے گیا جہاں ماموں جان کا گھر تھا...

ماموں جان کا گھر جلا ہوا تھا پاس پڑوس سے معلوم ہوا کہ فسادات میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھر جلا دیئے تھے۔ ان میں ماموں جان کا گھر بھی تھا... اب وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا پتہ مل گیا۔ وہی مہربان مسلمان بھائی مجھے تانگے میں سوار کر کے ماموں جان کے گھر چھوڑ گیا۔

دوسرے دن میں ہسپتال میں تھا۔ جہاں چند دنوں کے بعد میری وہ ٹانگ کاٹ دی گئی جس میں زہر پھیل گیا تھا۔ میری ٹانگ اپنے وطن پاکستان کی نذر ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ٹانگ کے سہارے اپنے وطن، اپنے پاکستان میں زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا.....

اور پھر تلاش.... ریلوے اسٹیشن، مہاجرین کے کیمپ... ایک دن... دو دن، ہفتے بیت گئے... اور پھر دل کو قرار آ گیا... میرے ماں باپ، میرے دونوں بھائی پاکستان کی راہ میں شہید ہو چکے تھے مَیں اکیلا ہی رہ گیا تھا....

میں نے تعلیم حاصل کی۔ نوکری اختیار کی... اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میری بیوی مر چکی ہے اور میرا نواسہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ میں ہر اگست کو کیوں روتا ہوں....

میں نے سب کچھ بیان کر دیا ہے، لکھ دیا ہے... مَیں اس لیے روتا ہوں کہ ہماری

نئی نسل وہ قربانیاں بھول گئی ہے جو ہم نے پاکستان کے لیے دی تھیں ۔۔۔۔۔"

خونِ دل سے ہم نے برسوں تک جلائے ہیں چراغ
تب کہیں جا کر ہوئی یہ صبحِ آزادی نصیب

لاشوں میں میری بچی

جناب مشکور حسین یاد اپنی کتاب آزادی کے چراغ میں اپنی درد بھری آپ بیتی بیان کرتے ہوئے اپنی شہید پیاری بچی کا ذکر کر کے اس طرح تڑپاتے ہیں :

"۔۔۔۔ میں جب بھی فرحانہ کو دیکھتا ہوں، تو مجھے خیال آتا ہے کہ میری بیٹی اتنی بڑی ہو گئی ہو گی۔ شہید مرتے نہیں۔ فرحانہ نے گذشتہ سال بی۔ اے کیا تو مجھے یوں لگا جیسے مسرور نے بھی یہ امتحان پاس کر لیا ہے۔ دونوں کی پیدائش میں صرف چھ ماہ کا فرق تھا۔

۲۹۔ اگست کو ہمارے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا اور اس سے دس پندرہ روز قبل میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ میرے تمام عزیزوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے مار کر ایک گڑھے میں دفن کر دیا ہے۔ میں نے جب اپنا یہ خواب گھر والوں کو سنایا، تو سب نے میرا مذاق اڑایا اور کہا :

"تم ہندوؤں اور سکھوں سے خوب ڈرتے ہو، اس لیے تمہیں ایسے خواب نظر آتے ہیں۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسرور کی آنکھوں میں اس دن کے بعد سے ایک عجیب قسم کی اداسی اور سنگینی نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ مجھے دیر تک گھورتی رہتی اور بعض اوقات تو میں اس کے اس طرح دیکھنے سے بری طرح خوف کھاتا۔ امی سے میں نے اس بات کا ذکر کیا، تو انہوں نے کہا :

لہ آزادی کے چراغ از مشکور حسین یاد صہ ۲۸ تا ۳۱۔

- خدا خیر کرے، مَیں خود بھی محسوس کرتی ہوں کہ اس بچی کے چہرے سے شادابی کم ہوتی جا رہی ہے۔" جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے، مسرور کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اعلانیہ کہنے لگا تھا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں زندہ نہیں بچوں گا یا پھر یہ بچی زندہ نہیں رہے گی۔ ہم پر ضرور کوئی آفت آنے والی ہے۔ اظفر مرحوم ہنس کر کہتا: "بھائی جان، آپ نے علم غیب کہاں سے حاصل کر لیا؟"

۲۹ اگست کو جس دن ہم پر حملہ ہونے والا تھا، ہمارے ہاں اس قدر مہمان جمع تھے کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس روز میں نے مسرور کو گود میں لینا تو درکنار، اچھی طرح دیکھا بھی ہو۔ اس دن تو مجھے وہ ایسے وقت نظر آئی جسے میں تادمِ زیست نہیں بھول سکتا۔ جس وقت میرا چھوٹا بھائی اظفر ریوالور اور بندوق، پولیس کے حوالے کرنے کے لیے باہر نکلا اور فائر ہوئے، تو میری والدہ بھی گھر سے باہر نکل پڑیں۔ فوراً ہی خدیجہ نے مجھ سے باہر جانے کی اجازت مانگی۔ اس وقت مسرور، خدیجہ کی گود میں تھی۔ ہندو اپنے گھروں سے اینٹیں اور پتھر برسا رہے تھے۔ خدیجہ، مسرور کو اپنے ایک ہاتھ سے بچانے کی کوشش میں مصروف چلی جا رہی تھی۔ میری بیٹی کے بھورے بھورے بال پریشان تھے۔ چلتے وقت اس نے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھا جس میں ہزار ہا معنی پوشیدہ تھے۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری بیٹی مجھ سے کہہ رہی ہے: "لیجیے بابا جان ہم تو چلے، آپ کو یہ زندگی مبارک۔" ایک لمحے کے لیے شدت کے ساتھ میرا دل چاہا کہ اپنی لاڈلی کو سینے سے لگا کر رخصت کروں، لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اور میری پیاری بیٹی کے درمیان مصلحت حائل ہو گئی۔ میں نے دل میں کہا: "مشکور، جذباتی نہ بنو، زندگی ہے تو پھر ملیں گے۔" میرا خیال تھا اور بالکل خیالِ خام کہ شاید باہر نکلنے پر ہندو انہیں حسبِ وعدہ کچھ نہ کہیں گے اور یوں ہماری جان بچ جائے گی۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں، لیکن خیال پڑتا ہے کہ خدیجہ نے چلتے وقت نہ صرف اپنے لیے اجازت چاہی تھی، بلکہ مسرور کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ اس امانت کو آپ اپنے پاس رکھیں گے یا میں گود میں سنبھالے رہوں۔ غالباً میں نے نہایت غیر ذمہ داری

کا ثبوت دیتے ہوئے اور اپنی جان کی فکر کرتے ہوئے خدیجہ کو یہی جواب دیا کہ مسرور کو تم ہی اپنے پاس رکھو۔ اس وفا شعار نے چون وچرا کے بغیر سر تسلیم خم کیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔

میں اپنے گھر کے دروازے کے قریب ہی جہاں ظہیر اور نفیس بانو خون میں نہائے پڑے تھے، اگر گیا تھا اور خدیجہ، مسرور کو لے کر باہر آ گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہندو برچھیوں اور بلموں سے ہمارے گھر سے باہر نکلنے والوں کو مار رہے ہیں۔ میری معصوم بیٹی کے ساتھ اس وقت فی الواقعہ کیا بیتی یہ مجھے نہیں معلوم، البتہ میں نے اپنی ماں کی یہ آواز ضرور سنی: "لے بہو، مسرور کو مجھے دے دو" بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہندوؤں نے خدیجہ پر حملہ کیا، تو معصوم بچی کو بچانے کی غرض سے میری والدہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور جب امی پر حملہ ہوا، تو مسرور اپنی ماں کی گود میں آ گئی۔ دونوں نے بچی کو بچانے کی کوشش میں اپنا خاتمہ کر لیا۔ میں اپنی جگہ پڑا یہ سمجھ رہا تھا کہ مسرور بھی ان کے ساتھ ختم ہو چکی ہے، کیونکہ لاٹھیوں، کرپانوں اور بلموں سے مارنے کے فوراً بعد ہندو حملہ آوروں نے مٹی کا تیل اور جلا دینے والی گیس پھینک کر ہمارے مکان اور لاشوں کو آگ لگا دی تھی، لیکن رات کے اندھیرے میں جب حملہ آور جا چکے اور آگ بھی قریب قریب بجھ چکی تھی، میں نے مسرور کی آواز سنی۔ مسرور نے پہلے تو اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دادی کو پکارا اور جب دادی کی لاش نے کوئی جواب نہ دیا، تو وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوئی۔ وہ ابھی اپنی ماں کو بلا رہی تھی اور میں اس کے قریب جانے کا موقع بھانپ ہی رہا تھا کہ ایک ہندو سپاہی آگے بڑھا اور کہا: "لے، تو ابھی زندہ ہے" اس فقرے کے ختم ہوتے ہی مسرور کی ایک چیخ سنائی دی، پھر مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہوا۔ صبح کو جب میں لاشوں سے نکل کر بھاگا، تو میں نے دیکھا کہ مسرور اپنی ماں اور دادی کی لاشوں کے درمیان پڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کے ننھے سے گلے پر ہلکا سا زخم تھا اور سینے پر جوتے کا نشان۔ جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس ہندو سپاہی نے پہلے تو میری معصوم ڈیڑھ سالہ لاڈلی کو زور سے ٹھوکر ماری جو

اس کے گلے پر لگی اور بعد میں فوراً اس کے منہ سے پیلنے کو چلنے پاؤں تلے کچل دیا۔ جب میں نے چلتے وقت اپنی لاڈلی کو دیکھا ہے، تو یقین کیجیے کہ اس کے چہرے پر خاص قسم کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا میں اس کے بال اڑ رہے تھے۔ اس کی ننھی سی لاش عجب طرح کا اطمینان اور سکون کا منظر پیش کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری بیٹی کہہ رہی ہے: "بابا، زندگی کے بکھیڑوں سے آپ نمٹتے پھریں، ہم تو مزے آرام سے ہیں۔"

حال ہی میں میرے ایک عزیز بزرگ نے بتایا کہ جب ہمارے گھر کی لاشیں ایک ٹرک میں لاد کر مردہ خانے میں لائی گئیں، تو وہ اس وقت وہاں موجود تھے۔ جب میری ماں کی لاش اتری ہے تو اس کے سینے پر مسرور کی لاش بھی رکھی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی ستم ظریف نے ہمارے گھر سے لاشیں اٹھاتے وقت پوتی کی لاش کو دادی کے سپرد کر دیا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جب لاشوں کو دفن کرنے کے لیے لے جایا گیا، تو مسرور اس وقت بھی اپنی دادی کے سینے پر آرام کر رہی تھی۔ کہتے ہیں اسی حالت میں اسے سپردِ خاک کیا گیا۔ واضح رہے کہ ان لاشوں کو کفن وغیرہ نہیں دیا گیا، بلکہ جس حالت میں وہ ملی تھیں، اسی طرح ہندو پولیس نے انہیں ایک گڑھے میں ڈال کر دبا دیا۔ جب میں نے یہ سنا کہ میرے یہ سب پیارے ایک ہی گڑھے میں دبائے گئے، تو مجھے اپنا خواب یاد آیا۔ کاش! میں اپنے اس خواب کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے اپنے پیاروں کو کسی محفوظ جگہ لے جا سکتا۔

میں اپنی لاڈلی کا ذکر ختم کر رہا ہوں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کہہ رہی ہے:

"ابو! میرے پیارے ابو! کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے یاد کر کے آپ قوم کے دوسرے معصوم شہید بچوں کو بھولے جا رہے ہیں۔ اے بابا، اگر آپ نے ایسا کر دیا، تو یاد رکھیے میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ میں نے آپ کو بیس سال اس بات سے روکے رکھا کہ آپ ہمارا ذکر نہ کریں، بلکہ ہماری یاد کو سینے سے لگا کر اس سے کوئی کام لیں لیکن

اب جو آپ نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ قوم خود چاہتی ہے کہ میں تمہارا ذکر کروں، تو اے میرے پیارے باباجان اس ذکر کو کافی نہ سمجھیے۔ ہم مرنے والوں کو ہم شہیدوں کو خوش کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ ملک و قوم کے لیے کچھ کرکے دکھائیں۔"

صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ

فی الحال تو میں اپنی بیٹی کے اس پیغام پر ندامت کے ساتھ سر ہی جھکا سکتا ہوں۔ میں نے ان بیس برسوں میں، جی ہاں آزادی کے بیس برسوں میں سچ پوچھیے تو کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر مجھے ذرا بھی فخر کا احساس ہو سکتا ہو۔ خبر نہیں میں اس اعتراف کی منزل سے آگے قدم کب بڑھا سکوں گا۔ محاسبہ صرف اعتراف تک محدود نہیں ہوتا۔ سچا محاسبہ انسان کو عمل کے لیے مستعد کرتا ہے۔ محاسبے کے ساتھ اگر عمل نہیں ہے، تو سمجھ لیجیے ہم اپنی کوتاہیوں کا دل سے اعتراف نہیں کر رہے ہیں۔ میری شہید بیٹی میرے پاس بیٹھی مسکرا رہی ہے اور اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے کہہ رہی ہے:

"ابو، آپ باتیں زیادہ بناتے ہیں، لیکن ہمارے خون کا تقاضا تو کچھ اور ہے۔"

وہ غنچے جن کی آنکھ بھی نہ کھلنے پائی تھی ابھی
چمن کے نام پر مٹے سدا بہار ہو گئے

خونی لکیریں:

مشہور صحافی سردار احمد علی خاں اپنی مشہور کتاب "ہندوستان سے پاکستان تک"[1] میں تحریر فرماتے ہیں:

"...... ذیل کی تحریریں ان دلخراش المیوں کی منہ بولتی تصویریں ہیں جو تقسیم ملک کے دوران ظہور پذیر ہوئے اور جن کے پیچھے پوری ہندو فاشسٹ مشینری برسرِ عمل تھی۔ ان

---

[1] ہندوستان سے پاکستان تک۔ مصنف سردار احمد علی خاں ص ۴۴۵ تا ۴۴۸۔

واقعات کی صداقت کا اندازہ اس ایک حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے راوی ہندو، عیسائی اور دیگر غیر مسلم لوگ ہیں۔ تاریخ کی اس بھیانک ترین صورتِ حال پر ایک کتابچہ جناب ایم۔ آر عمرانی نے مرتب کیا اور ایم۔ جی خواجہ نے جون ۱۹۴۸ء میں ملتان سے طبع کرایا۔ ہم اس کتابچے میں سے ہی چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

مسلم کش فسادات

۱۹۴۶ء میں کلکتہ، بہار میں ہندوؤں نے فسادات کر کے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا اور پھر ۱۹۴۷ء میں دہلی، پنجاب، کاٹھیاواڑ، کشمیر کے وسیع علاقوں میں وسیع تر مسلم کا قتلِ عام ہوا۔ ہندوستان کی کانگریس اور ہندو مہا سبھا نے مل کر ۱۹۴۶ء سے لے کر اپریل ۱۹۴۸ء تک مندرجہ بالا مقامات کو محاذِ جنگ بنا کر بے گناہ مسلمان بچوں، بوڑھوں اور مستورات کا قتلِ عام کیا۔

میوات کا محاذ

(گوڑگاؤں الور اور بھرت پور کی ریاستیں)

مئی جون، جولائی، اگست اور ستمبر ۱۹۴۷ء کے مہینوں میں یہ علاقے فساد کا مرکز بنائے گئے۔

میواتی مسلمان مشرقی پنجاب کے ضلع گوڑگاؤں اور دہلی کے نزدیک اور بھرت پور کی ریاستوں میں آباد تھے۔ ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو مٹانے کی منظم سازش کی اور اپنی فوج اور پولیس کی مدد سے جو ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ ان کی آبادیوں پر حملے کر کے مسلمانوں کا قتل و غارت شروع کر دیا۔

مساجد کی تباہی

اُلور کی ریاست میں ہندوؤں کو مسجدوں کو مسمار کرنے اور ان کے ملبے کو صاف کرنے

کا ٹھیکہ دیا گیا، تمام مساجد اور مقدس مزاروں کو مکمل طور پر تباہ کر کے ان کا نام ونشان بھی مٹا دیا گیا۔ ریاست سے جو مسلمان سب سے آخر میں نکلا وہ بریگیڈیر عبدالرحمٰن خاں تھا۔ یہ ریاست الور کا وزیر تھا اور اسے مسلم دستوں کی حفاظت میں دہلی پہنچا دیا گیا۔

ہندوؤں اور سکھوں نے ہندوستان میں اسلام کو مٹانے کی ناپاک سازش کر رکھی تھی اور مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ بنایا پاکستانی فوج کے افسروں اور جوانوں کو دہلی سے کراچی پہنچانے کے لیے پاکستان سپیشل گاڑیاں چلائی گئیں۔ انہی گاڑیوں میں سٹور بھی تھا۔ ہندوؤں کے جتھوں نے ان پر حملے کئے تاکہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں نہ تو فوجی افسر رہیں، نہ جوان اور نہ فوجی سامان۔[1]

کرپان کے زخم

کرنل جے ایم بی پلاؤڈن، رجسٹرار نمبر ۲ برٹش ریڈ کراس سوسائٹی نے خود ایک مظلوم زخمی مسلمان سے جو ہندو سکھوں کی بربریت کا شکار ہوا تھا، بات چیت کی، ستم رسیدہ نے کہا کہ اس کو گورکھا سپاہیوں نے گاؤں سے پکڑ لیا اور ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ ساری رات وہیں رہا۔ دوسری صبح اسے ایک خندق کھودنے پر لگا دیا گیا اور نہ پانی پینے کی اجازت ملی۔ اس کے بعد اسے ایک سکھ کرنل کے پاس لے گئے۔ اس نے پوچھ گچھ کی پھر اپنے فوجیوں سے کہا کہ اسے پاکستانی نالہ کے پاس لے جایا جائے۔ اس سے ان کی مراد قتل گاہ تھی۔

وہاں اسے لے جا کر بری طرح پیٹا گیا اور کرپان سے چرکے لگائے گئے پھر اسے ایک گڑھے میں پھینک دیا گیا اور اوپر پتھر ڈال دیئے۔ اس گڑھے میں اس نے اور لاشیں بھی دیکھیں جو تازہ تھیں۔

کرنل پلاؤڈن نے کہا۔

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور اشاعت ۲۹ مئی ۱۹۴۸ء

میں نے اس کا معائنہ کیا۔ اس کے جسم پر کرپان کے سات زخم تھے۔
یہ واقعہ راجوری کے دو میل مغرب کی جانب پیش آیا۔

مسلمان بچوں کا قتل

دہلی میں مہا سبھائیوں نے ۲۰ اگست کو یوم شہداء منانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے "جے بھارت" کے نام سے ہزار ہا پمفلٹ چھپوا کر تقسیم کیے اس کا مضمون یہ تھا۔
"۲۰ اگست ۱۹۴۷ء کو مت بھولیں۔ یہ ہمارے شہداء کا دن ہے۔ اس دن کی ابتداء مسلمان بچوں اور عورتوں کے قتل سے شروع کی جائے۔ مسلمانوں کے گھروں پر زبردستی قبضہ کرلو۔ مسلمان محلوں کو آگ لگا دو مگر اتنا خیال رہے کہ آگ ہندو یا سکھوں کے محلوں تک نہ پھیلنے پائے۔"[1]

اعداد و شمار

۱۔ دس لاکھ مسلمان مقتول ہوئے ان میں بیشتر تعداد بچوں اور عورتوں کی تھی۔
۲۔ ایک کروڑ مسلمانوں کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور وہ پناہ لینے کیلئے پاکستان میں ہجرت کرکے آگئے۔ یہ سارے لوگ پنجاب اور سندھ میں پہنچے۔
۳۔ ساٹھ ہزار مسلمان عورتوں کو اغواء کرکے ان پر مجرمانہ حملے کیے گئے۔
۴۔ بہار، برار، مدراس اور بمبئی سے دس لاکھ مسلمانوں کو زبردستی ان کے گھروں سے نکالا گیا۔
۵۔ کپور تھلہ کی غیر مسلم ریاست میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بہت زیادہ تھا یہ ریاست کی کل آبادی میں ۶۸ فیصد تھے۔ ان کے قتل کے منصوبے بنائے گئے۔ آج اگر آپ کپور تھلہ جائیں تو آپ کو وہاں ایک بھی مسلمان نظر نہیں آئے گا۔

---

[1] بلیڈنگ پنجاب ص ۲۶۔

۶۔ پٹیالہ۔ فرید کوٹ۔ جیند۔ نابھ اور شملہ کی پہاڑیوں کی ریاستوں سے مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا۔

۷۔ صرف پٹیالہ میں پچیس ہزار مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا۔

۸۔ بمبئی۔ سی پی۔ یوپی۔ بہار۔ مدراس اور ریاست میسور میں بھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

۹۔ اجمیر شریف میں حضرت خواجہ اجمیری کی درگاہ پر حملے کیے گئے اور ہزارہا مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔

۱۰۔ دہلی تو مسلمانوں کی موت کا گھر بن گیا۔

لاتعداد تاریخی مساجد۔ مزارات اور عمارتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ دہلی کی بہت سی خانقاہوں اور مذہبی درس گاہوں پر قبضہ کر کے وہاں ہندوؤں نے انہیں مندروں میں تبدیل کر دیا۔

۱۱۔ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار کی بے حرمتی کی گئی۔ مہرولی کا قصبہ سات صدیوں پرانا تھا اسے قطب مینار کا شہر بھی کہتے ہیں۔ اسے مکمل طور پر تباہ برباد کر دیا گیا۔

اب ہم ایک سکھ کا ذاتی اعتراف اور مشاہدہ پیش کرتے ہیں جو اس نے اخبار بندے ماترم کی اشاعت میں شائع کروایا:

"میں خود سکھ ہوں لیکن جو کچھ دیکھا ہے اسے اس لیے نہیں چھپاؤں گا کہ یہ سب میرے بھائی بندوں نے کیا۔

۱۹۴۷ء میں جب سکھ عوام نے دیکھا کہ ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں تو انہوں نے نہایت بے باکی اور بے فکری سے مسلمانوں کو قتل کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا۔ ۱۲ یا ۱۴ اگست کو ضلع امرتسر کے دیہات میں یہ وبا بہت زور پکڑ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکالی دل پارٹی کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ انہوں نے ساڑ پھونک کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جس کے باعث مسلم عوام اتنے خوفزدہ ہو گئے کہ انہیں گھر بار کو خیرباد کہنے کے سوا اپنی

سلامتی کا کوئی دوسرا راستہ نظر ہی نہیں آیا۔ اس دوران میں سکھ جتھے مسلمان دیہات پر اکٹھے یورش کرتے اور پولیس والے بھی ان کے ہمراہ جاتے۔ مسلمانوں کو قتل کرنے کے علاوہ جو مسلمان بھاگ کر جان بچاتے اور اپنے گھروں کو خالی کر دیتے ان کی جائیدادوں پر یہ جتھے ہاتھ صاف کرتے، ان کو دل بھر کر لوٹتے۔ جوں جوں لوٹ کی عادت بڑھنے لگی جتھوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اکالی پارٹی کا مقصد نہ صرف مسلمانوں کو مشرقی پنجاب بلکہ ہندوستان سے نکالنا تھا جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے معتبر دوستوں سے اس گڑبڑ کے ہولناک مظالم کی بابت سنا ہے اس کی یاد بدن کے رونگھٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ مشرقی پنجاب کے لوگوں نے بے گناہ انسانوں اور معصوم بچوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ ان کا کبھی کسی کو تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا۔ بچوں کو والدین کے روبرو برچھیوں اور بھالوں پر چڑھا کر مار دیا گیا اور زندہ انسانوں کو جلتی آگ میں ڈال کر بھون دیا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا گیا۔ ایک عورت کے ساتھ دس غنڈوں نے رات بھر منہ کالا کیا۔ حتیٰ کہ وہ پاگل ہو گئی۔ [1]

ایک بھیانک رات کی یاد

"۔۔۔۔۔۔ ہندو اور سکھ حملہ آوروں کی تعداد ساٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ہندو فوج کے دستے بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے قافلے کے قریب پہنچتے ہی گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ حملہ آوروں نے آگے بڑھ کر قافلے کو گھیرے میں لے لیا اور مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ چیخ پکار، فریاد و فغاں کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عورتیں مرد اور بچے سراسیمہ ہو کر دریا کی طرف بھاگے اور دریا میں چھلانگیں لگا لگا کر اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کرنے لگے۔ حملہ آور دریا کے کنارے پر گولیوں، برچھیوں

---

[1] اقتباس از اخبار بندے ماترم مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۴۸ء از سردار بچن سنگھ۔

نیزوں، کرپانوں اور کلہاڑیوں سے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے۔ عصر سے مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ سینکڑوں مسلمان سکھوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ سینکڑوں نذر آب ہو گئے۔ سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ ماں کو بچے کی، بھائی کو بہن کی، شوہر کو بیوی کی اور بیٹے کو باپ کی خبر نہ تھی۔ مغرب کے قریب حملہ آوروں کا جتھا مال مویشی اور بیل گاڑیوں پر لدا ساز و سامان لے کر لوٹ گیا۔ اب ہر شخص اپنے عزیزوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگا مجھے اپنے بیوی اور بچے دریا کی موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آئے۔ بڑھ کر ان کے پاس پہنچا اور موجوں سے لڑتے ہوئے بمشکل انہیں کنارے تک لایا۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ بیوی اور بچوں کو کنارے پر بٹھا کر میں والدہ کی تلاش میں نکلا۔ ان کی گود میں میرا چار سالہ بچہ ادریس تھا۔ مجھے توی خدشہ تھا کہ وہ دونوں دریا کی نذر ہو چکے ہیں لیکن خدائے کریم نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انہیں محفوظ رکھا اور وہ مجھے مل گئے[1]۔

یہ ان دلخراش واقعات کی ایک جھلک ہے جو آزادی کی خاطر امت مسلمہ نے برداشت کیے۔ اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ کیا ان قربانیوں کے بعد حاصل ہونے والے ملک کو ہم نے مستقبل کے لیے ناقابلِ تسخیر بنا لیا ہے یا نہیں اور یہ کہ جن مقاصد کے لیے ہم نے یہ قربانیاں دی تھیں وہ کس حد تک حاصل کیے گئے ہیں۔

... ...

تحریکِ پاکستان کے ذریعے برصغیر کی ملت اسلامیہ نے ملت کے ایک بڑے حصے کی آزادی اور اسے اسلامی نظام کی منزل تک پہنچانے کے لیے کس قدر قربانیاں دیں اس کی صرف چند جھلکیاں گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ جتنی مسلمان آبادی ہندوستان سے پاکستان منتقل ہوئی ہے ان میں سے ہر ایک مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان کی ایسی ہی المناک داستان ہے جس کی جھلک آپ نے گذشتہ سطور میں دیکھی ہیں گویا لاکھوں نہیں

---

[1] اقتباس از اندھیروں کے ناگ۔ از مظہر الدین مظہر۔

کروڑوں دردناک اور المناک قربانیوں کی کہانیاں ہیں۔ جو قربانیاں اس مملکتِ پاکستان کے لیے ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے مشترکہ طور پر ایک ملت کی حیثیت سے دی ہیں۔

تحریکِ پاکستان کی یہ کہانی اگر اس بات پر ختم ہو جاتی کہ ملت نے قربانی دے کر ایک مملکت حاصل کی اور اسی مملکت کی منزل اس نے راس کماری سے خیبر تک بہانگِ دہل ساری دنیا کو گواہ بنا کر پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ کے الفاظ میں اسلامی طرزِ حیات کا نفاذ۔ اسلامی قوانین کا اجراء اور اسلامی نظام کا قیام قرار دیا اور پھر وہ اس ملت کا مطلوبہ اسلامی نظام اس مملکت میں اپنی تمام خصوصیات اور برکات کے ساتھ نافذ بھی ہو گیا تو ہم ان تمام قربانیوں اور شہداء کی لاشوں کو منزل تک پہنچنے کے سنگ ہائے میل شمار کر لیتے اور خدا و رسول اور تاریخِ اسلامی کے سامنے سرخرو ہو جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ واہگہ کے اس پار مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے لوٹا اور برباد کیا تو واہگہ کے اس پار پاکستان اور ملت اسلامیہ کے دشمن مسلمان رہنماؤں نے ملت اسلامیہ کو لوٹا، پھاڑا، لڑایا، ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ دشمن کے لیے آسان چارہ بنایا۔ تعصبات پیدا کیے اور مسلمانوں کے ذریعے مسلمانوں پر ایسے ایسے مظالم کروائے کہ لوگ تقسیم کے وقت ہندوؤں اور حکمرانوں کے مظالم بھول گئے۔ شاید اسلامی نظام کے وعدے سے انحراف کی یہی سزا ہے جو سامری کا بچھڑا پوجنے پر بنی اسرائیل کو اور خدا پرستی کو بھول کر مفاد پرستی کا بچھڑا پوجنے پر ملت اسلامیہ کو دی گئی ہے۔

یہ حال تو ملت اسلامیہ کا پاکستان میں ہے۔ اب ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے باقی ماندہ حصے کا کیا حال ہے تو اس کی موجودہ تصویر ایک خصوصی رپورٹ میں پیش کی گئی ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے جن امیدوں کے ساتھ ملی سطح پر بھاری نقصانات برداشت کیے تھے کہ اسلامی نظام کا اجراء دنیا اور آخرت میں ان تمام نقصانات کی تلافی کرائے گا تو ان امیدوں پر پانی پھیرنے کا کام پاکستان کی نام نہاد مسلمان قیادت نے جس بڑے پیمانے پر کیا ہے اس کا کوئی نمونہ تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ برصغیر میں ملت اسلامیہ کی تباہی کی ساری ذمہ داری اس سیکولر مغرب زدہ

قیادت پر عائد ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں قائداعظم کے بعد یہ ملک آیا اور جس نے اپنی نفسانیت پر اس ملک اور ملت اسلامیہ کو قربان کر دیا۔

بھارت میں مسلمان ایک نظر میں

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا کہ بھارت میں مسلمان کا صدر بن جانا آسان ہے لیکن ایک چپراسی کی جگہ پانا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد بھارت میں باقی ماندہ مسلمان اقلیت کے ساتھ بھارتی نام نہاد سیکولر جمہوری حکومت میں ہندو کیا سلوک کر رہے ہیں۔ اس کا نقشہ ایک خصوصی رپورٹ میں درج ذیل ہے۔ اس رپورٹ میں صرف ۱۹۷۱ء تک کے اعداد و شمار رکھے گئے ہیں۔ اس سے آپ بعد کے حالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جہاں اب مسلمانوں کی عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔

بھارت کی حکومت مسلم ممالک میں پروپیگنڈہ کرتی رہی ہے کہ بھارت کے مسلمانوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو بھارتی آئین میں ہر شہری کو حاصل ہیں۔ لیکن خود بھارتی حکومت اور بھارتی پریس کے شائع کردہ اعداد و شمار اور آئے دن کے ہونے والے فسادات اور مسلمانوں کے قتل عام خود پکار پکار کر اس حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں کہ بھارتی مسلمانوں کو آئین کے تحت حقوق دینا تو درکنار اب ان کے جان و مال عزت و آبرو بھی خود حکومت کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہیں۔

اندرا گاندھی کے دوبارہ برسراقتدار آنے کے بعد مسلمانوں پر ہندو فرقہ پرست تنظیموں کو پیچھے چھوڑ کر جس طرح حکومت کی پراونشیل آرمڈ کانسٹیبلری، بہار ملٹری پولیس اور سینٹرل ریزرو فورس نے مراد آباد، علی گڑھ، الہ آباد، بہار شریف، تالندہ، حیدرآباد اور دوسرے شہروں میں مسلمانوں کا قتل عام محض مسلمان ہونے کی وجہ سے کیا۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ یہ مسلمانوں کے خلاف حکومت کی منظم سازش ہے تاکہ مسلمانوں کے اندر جو خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ اسے ختم کیا جا سکے اور انہیں جنتا پارٹی کے اتحاد میں شریک ہو کر کانگریس کو شکست دینے کی سزا دی جائے۔ جنتا پارٹی کے قیام کی وجہ سے جو زبردست اتحاد بھارتی عوام

میں دیکھنے میں آیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا جس کی وجہ سے شمالی بھارت سے اندرا کانگریس کا جنازہ نکل گیا تھا۔ اس کا اعتراف بھی بھارتی اخباروں نے کیا تھا۔ یہ اتحاد ٹوٹا تو اندرا گاندھی اقتدار میں آگئیں اور اس میں پوری ذمہ داری اکثریتی فرقہ کے رہنماؤں کی تھی جنہوں نے مسلمانوں کو کانگریس کی طرح نظرانداز کر دیا۔

ایک وقت اردو کے سلسلے میں ایک وفد کے سامنے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین نے اعتراف کیا تھا کہ "یہاں صدر بن جانا مسلمان کے لیے آسان ہے لیکن ایک چپراسی کی جگہ پانا بہت مشکل ہے"۔ اب اگر سابق کانگریسی منسٹر علی ظہیر مرحوم کے داماد بھارتی فضائیہ کے ائیر مارشل ہو گئے یا ہدایت اللہ صاحب نائب صدر بن گئے یا ایک پرانے بیوروکریٹ علی گڑھ کے وائس چانسلر بنا دیئے گئے تو انگلیوں پر گنے جانے والے ان "نمائشی افراد" کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھ جسٹس انصاری کا اقلیتی کمیشن سے استعفیٰ اور مدراس ہائی کورٹ کے مسلم جج کے استعفےٰ کے ساتھ حمید اللہ بیگ کا اقلیتی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے تقرر بھی بھارتی مسلمانوں کے سامنے ہے۔ مسٹر بیگ اپنی اسلام دشمنی میں بہت مشہور ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب اور تعلیم میں ان کی پسماندگی اور ان کے اسکولوں اور کالجوں کے ساتھ امتیازی سلوک ایسی چیزیں ہیں جن کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ادھر پولیس کے حملے اور فسادات کرا کے حکومت ہند نے مسلمانوں کے اندر پھر خوف و ہراس پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہے۔ بھارت کے مسلمان خود کو بالکل غیر محفوظ اور بے آسرا محسوس کرتے ہیں۔ کانگریس کے دور میں یہ احساس اور ابھرتا جائے گا کیونکہ یہ اس کی داخلی پالیسی ہے۔

۱۔ بھارت میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی

سنہ	کل آبادی	دس سال میں فیصد اضافہ	مسلمان آبادی	دس سال میں فیصد اضافہ	مسلمانوں کا فیصد تناسب کل آبادی کے حساب سے
۱۹۳۱ء	۲۷۹،۱۵۳۹۸	۱۱،۰۱	۷۹۳۰۶۰۰۰	۱۱،۶۹	۲۲،۳۹
۱۹۴۱ء	۳۱۸۷۰۱۰۱۲	۱۴،۲۲	۹۴۴۴۶۰۰۰	۱۹،۰۰	۲۴،۲۸

سنہ	کل آبادی	دس سال میں فیصد اضافہ	مسلمان آبادی	دس سال میں فیصد اضافہ	مسلمانوں کا فیصد تناسب کل آبادی کے حساب سے
۱۹۵۱ء	۳۶۰ ۱۲۹ ۹۶۲	۱۳٫۳۱	۳۵ ۴۱۴ ۲۸۴	—	۹٫۹۱
۱۹۶۱ء	۴۳۹ ۲۳۵ ۰۸۲	۲۱٫۵۰	۴۶ ۹۳۹ ۳۵۷	۲۵٫۳۶	۱۰٫۶۹
۱۹۷۱ء	۵۴۷ ۹۴۹ ۸۰۹	۲۴٫۶۶	۶۱ ۴۱۷ ۹۳۴	۳۰٫۸۵	۱۱٫۲۱

۲۔ بھارت میں مسلم اکثریت کے شہر

آبادی کم کرنے کے طریقے

۱۔ سری نگر — مقبوضہ کشمیر — ۸۵٫۵۵ فیصد مسلمان — فسادات کرائے گئے مسلمان ہلاک ہوئے۔

۲۔ مراد آباد — یوپی — ۵۱٫۲۶ " — قتلِ عام۔ ۲۰ ہزار مسلمان شہید اور لاکھوں ہجرت کر گئے۔

۳۔ مالی گاؤں — مہاراشٹر — ۵۷٫۵۲ " — فسادات کرائے گئے مسلمان شہید ہوئے۔

۴۔ رام پور — یوپی — ۷۱٫۹۲ " — ہجرت کر گئے۔

۵۔ گارڈن ریچ — مغربی بنگال — ۶۰٫۴۸ " — ہجرت کر گئے۔

۳۔ بھارت کے اضلاع جہاں مسلمان ۲۰ فیصد سے زیادہ ہیں

۱۔ گوالپاڑہ — آسام — ۴۲٫۳۵ فیصد — غیر آسامیوں کے نام پر مسلمانوں پر حملے ہو رہے ہیں اور انہیں ختم کیا جا رہا ہے۔

۲۔ نوگاؤں — آسام — ۲۹٫۴۹ " — بہت سے مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ بہت سے ہجرت کر گئے۔ قتل و غارت اور ہجرت جاری ہے۔

۳۔ کاچھار یا کچھ — آسام — ۲۹٫۴۹ " — فسادات کرائے گئے۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔

۴۔ کامروپ — آسام — ۲۸٫۹۲ " — " " "

۵۔	پورنیہ	بہار	۲۹.۶۲ فیصد۔	فسادات کرائے گئے بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔
۶۔	ملاپورم	کیرالا	۶۳.۹۳ 〃	〃 〃
۷۔	قاضی خود		۳۰.۶۲ 〃	〃 〃
۸۔	منہیر بھوم		۲۹.۱۹ 〃	〃 〃
۹۔	مغربی دیناج پور		۳۵.۸۹ 〃	〃 〃

۴۔ بھارت کے شہر جہاں مسلمان ۲۵.۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہیں

۱۔	حیدرآباد	آندھرا پردیش	۳۸.۰۰ فیصد۔	کئی بار فسادات ہوئے مسلمان شہید کیے گئے یہ سلسلہ جاری ہے۔
۲۔	کرنول	〃	۳۲.۰۳ 〃	فسادات کرائے گئے۔ مسلمان شہید کیے گئے۔
۳۔	بھاگل پور	بہار	۳۰.۰۱ 〃	کئی بار فسادات ہوئے۔ مسلمان شہید کیے گئے۔
۴۔	بہار شریف	بہار	۳۵.۰۸ 〃	قتلِ عام کیا گیا پہلے بھی اور آج بھی۔
۵۔	دربھنگہ	بہار	۲۵.۰۲ 〃	کئی بار فسادات کرائے گئے اور مسلمان شہید ہوئے۔
۶۔	کال کٹ	کیرالا	۲۳.۰۳ 〃	〃 〃 〃
۷۔	بھوپال	مدھیہ پردیش	۳۶.۰۵ 〃	کئی بار فسادات ہوئے مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔
۸۔	برہان پور	مدھیہ پردیش	۴۵.۰۶ 〃	کئی بار فسادات ہوئے مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا یہ سلسلہ جاری ہے۔
۹۔	اورنگ آباد	مدھیہ پردیش	۳۵.۰۰ 〃	فسادات ہوئے مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔
۱۰۔	ناندیر	مدھیہ پردیش	۲۶.۰۲ 〃	قتلِ عام ہوا۔
۱۱۔	گلبرگہ	میسور	۴۲.۰۱ 〃	فسادات کرائے گئے مسلمان شہید ہوئے۔

۱۲۔	بلاری	میسور	۲۰٫۶۴ فیصد	〃 〃 〃
۱۳۔	بیجاپور	میسور	۲۳٫۲۳ 〃	〃 〃 〃
۱۴۔	لکھنؤ	یوپی	۲۹٫۶۵ 〃	〃 〃 〃
۱۵۔	بریلی	یوپی	۲۵٫۶۸ 〃	فسادات ہوئے مسلمان مارے گئے۔ ہجرت جاری ہے۔
۱۶۔	میرٹھ	یوپی	۳۶٫۰۶ 〃	بڑے فسادات ہوئے۔ مسلمان شہید کیے گئے۔
۱۷۔	علی گڑھ	یوپی	۲۲٫۲۰ 〃	بار بار فسادات کرائے گئے بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔
۱۸۔	سہارن پور	یوپی	۲۷٫۰۱ 〃	فسادات ہوئے مسلمان ہلاک ہوئے۔
۱۹۔	فیروز آباد	یوپی	۳۰٫۰۰ 〃	فسادات ہوئے مسلمان ہلاک ہوئے۔
۲۰۔	مظفر نگر	یوپی	۲۹٫۶۲ 〃	فسادات پولیس کے حملے ڈیڑھ سو مسلمان شہید ہوئے۔
۲۱۔	وارانسی	یوپی	۲۵٫۰۸ 〃	فسادات کرائے گئے مسلمان شہید ہوئے۔
۲۲۔	گورکھ پور	یوپی	۲۵٫۶۸ 〃	فسادات کرائے گئے مسلمان شہید ہوئے۔
۲۳۔	فرخ آباد فتح گڑھ	یوپی	۲۵٫۰۷ 〃	〃 〃 〃

۵۔ بھارت کے سالانہ ہندو مسلم فسادات جن میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ املاک لوٹی اور جلائی گئیں۔ کوئی پکڑا نہیں گیا مسلمان گرفتار ہوئے اور سزا پائی۔

۱۹۵۴ء	۳۳ فساد	۱۹۵۸ء	۴۱ فساد
۱۹۵۵ء	۷۲ فساد	۱۹۵۹ء	۴۲ فساد
۱۹۵۶ء	۷۴ فساد	۱۹۶۰ء	۲۶ فساد

میزان : ۲۸۵ فسادات

یہ اعداد کمیونسٹ ممبر پارلیمنٹ مسٹر اسحاق سنبھلی کے بیان اور امپیکٹ انٹرنیشنل لندن مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ء سے لیے گئے ہیں۔ مسٹر گاباسابق ممبر پارلیمنٹ بھارت نے اپنی کتاب پسووائنسز میں بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔

۱۹۶۱ء	۹۲ فساد	۱۹۷۱ء	۳۲۱ فساد
۱۹۶۲ء	۶۰ فساد	۱۹۷۲ء	۲۴۱ فساد
۱۹۶۳ء	۶۱ فساد	۱۹۷۳ء	۲۴۲ فساد
۱۹۶۴ء	۱۰۷۰ فساد (یہ بھارت کی جنگ کی تیاریاں تھیں)	۱۹۷۴ء	۲۴۸ فساد
۱۹۶۵ء	۲۷۶ فساد	۱۹۷۵ء	۲۶۰ فساد
۱۹۶۶ء	۱۳۲ فساد	۱۹۷۶ء	۲۳۰ فساد
۱۹۶۷ء	۶۳۰ فساد	۱۹۷۷ء	۱۸۸ فساد
۱۹۶۸ء	۳۴۸ فساد	۱۹۷۸ء	۲۳۹ فساد (اندرا حکومت کی روانگی)
۱۹۶۹ء	۵۱۹ فساد (پاک بھارت جنگ کی دوسری تیاریاں)	۱۹۷۹ء	۳۰۴ فساد
۱۹۷۰ء	۵۲۱ فساد (اندرا حکومت کی واپسی)	۱۹۸۰ء	۴۲۸ فساد

میزان : ۷۱۳۲ فسادات

مسٹر اسحاق سنبھلی ممبر پارلیمنٹ اور دوسرے اخباری اندازے کے مطابق ۱۹۴۷ء کے ستمبر سے ۱۹۶۰ء تک ۷ ہزار ۵ سو فساد ہوئے تھے۔ اس طرح کل فساد آزاد بھارت میں ۱۴،۶۴۱ ہوئے جس کا اوسط ہر ۱۹ گھنٹے میں ایک فساد ہوا۔ جس میں کسی نہ کسی جگہ کوئی نہ کوئی مسلمان خاندان تباہ ہوا اور مسلمان شہید ہوئے۔

بھارتی وزیر داخلہ کے نوٹ کے مطابق ہر روز ایک فساد ہوا جس میں مسلمان شہید ہوتے۔ حیدرآباد، مرادآباد، علی گڑھ اور الہ آباد میں پولیس نے خود مسلمانوں کو گھروں سے کھینچ کر شہید کیا۔ یہ اعداد و شمار صرف سرکاری ہیں جس پر امریکی سوشیالوجسٹ رچرڈ لیمبرٹ کا کہنا ہے کہ "مرنے والوں کی تعداد کی سرکاری گنتی بھی دس گنا کم کر کے دکھلائی جاتی ہے۔ اب فیصلہ بھارتی سفیر خود کر لیں۔ بھارتی مسلمان بھی پکار پکار یہی کہتے

چلے آ رہے ہیں۔

اعظم خان ممبر یوپی اسمبلی نے ایوان میں تصاویر دکھلا کر بتلایا تھا کہ مراد آباد میں دو ہزار مسلمان شہید کیے گئے اور سب پولیس کے ہاتھوں۔ یہی بیان الہ آباد میں جے پال نگھ کشیپ اور رام تہور ممبر پارلیمنٹ نے دیا۔ یہی علی گڑھ میں مسلم ممبران پارلیمنٹ نے کہا اور اندرا گاندھی نے فرمایا تھا کہ پولیس کا حوصلہ پست نہ کیا جائے۔

یہ اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ اندرا گاندھی اور ان کے والد نہرو کے دور میں فسادات زیادہ ہوئے ہیں اور بہت خونریز ہوئے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ الزام مسلمانوں پر تھا اور پاکستان پر۔ اب پھر اندرا گاندھی وہی راگ لاپ رہی ہیں۔ جس کو ان کے والد نہرو الاپتے آ رہے تھے کہ پاکستان سے خطرہ ہے اور جان گئی تو بے چارے مجبور بھارتی مسلمانوں کی۔

۶۔ مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب

۱۔ پارلیمنٹ ۱۹۸۱ء میں (۱۱٫۰۱ کی مردم شماری میں مسلمان ۱۲ فیصد ہیں)

کل ممبران میں ۹٫۲۸ فیصد مسلمان ہیں۔

کانگریسی ممبران میں ۸٫۹۸ فیصد مسلمان ہیں۔

لوک دل و جنتا میں ۷٫۰۱ فیصد مسلمان ہیں۔

۲۔ ملازمتوں میں۔

(الف) مرکزی سیکریٹریٹ وغیرہ میں اعلیٰ افسران سیکریٹری سے جوائنٹ سیکریٹری تک۔

۱۔ صدر و نائب صدر کے سیکریٹریٹ میں کوئی مسلمان نہیں۔

۲۔ وزیر اعظم کے یہاں کوئی مسلمان نہیں۔

۳۔ بڑے بڑے محکموں میں۔

زراعت کیمیکل فرٹیلائزر کامرس و سول سپلائی، مواصلات، ڈیفنس، تعلیم، خزانہ (فنانس)

صنعت، قانون وانصاف، ریلوے، جہاز رانی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں کوئی مسلمان نہیں۔

وزارتِ خارجہ میں ایک جوائنٹ سیکریٹری مسلمان ہے۔

داخلہ میں ایک سیکریٹری مسلمان ہے۔

اطلاعات میں سیکریٹری مسلمان ہے۔

(ٹیلی فون ڈائریکٹری دہلی ۱۹۷۷ء)

(ب) مرکزی وزارتِ خارجہ (۵ مئی ۱۹۸۰ء)

۱۔ سفیر ۱۰۶، سے ۶ مسلمان۔ عرب ملکوں کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ قونصل واعزازی قونصل ۴۹، میں کوئی مسلمان نہیں۔

۳۔ ہائی کمشنر ۳۳، میں کوئی مسلمان نہیں۔

ج۔ مسٹر یوگیندر مکوانہ اسٹیٹ منسٹر کے پارلیمنٹ میں بیان کے مطابق۔

بارڈر سکوریٹی خواص میں مسلمان افسران ۲۹ء۱۱ فیصد ہیں۔

عام سپاہی میں ۲۵ء۴ فیصد ہیں۔

پرانے افسران تربیت دینے کیلئے گئے ہوئے ہیں۔

سینٹرل ریزرو پولیس فورس ۰۰۰۰۰۰ افسران : کوئی مسلمان نہیں

عام سپاہی میں ۹۲ء۲، فیصد

مسٹر شہاب الدین ممبر پارلیمنٹ نے تبلایا کہ

یوپی آرمڈ کانسٹبلری میں مسلمان ۱۵ء۰ فیصد ہیں۔

مسٹر رام تہور ممبر پارلیمنٹ نے بتایا

۱۔ ریسرچ اور انالیسس ونگ عام کے ۲، ہزار کے عملے میں کوئی مسلمان نہیں۔

۲۔ سنٹرل انٹیلیجنس میں ڈھائی ہزار میں صرف ۲، سپاہی گزشتہ دسمبر میں رہا ورن پٹریکا مورخہ یکم دسمبر ۱۹۸۰ء) لیے گئے۔

مسٹر اے آر شیروانی (دہلی کے ایک سیکولر صحافی) کے بیان کے مطابق مرکزی حکومت کے تین ہزار ۶، سو ملازمین میں صرف ۱۲۵، مسلمان نیچے درجوں پر ہیں یعنی کل ۵ء۳ فیصد

۵۔ ریاستوں (صوبوں) میں مسلمانوں کی حالت۔

۱۔ گورنر، ہماچل پردیش (شملہ کا علاقہ) اور مہاراشٹر میں مسلمان ہیں۔

۲۔ وزیر اعلیٰ مقبوضہ کشمیر اور مہاراشٹر میں دونوں جگہ ڈانوا ڈول ہے۔

۳۔ اسپیکر؛ مقبوضہ کشمیر اور کمیونسٹ بنگال میں۔

۴؛ ڈپٹی اسپیکر، صرف مقبوضہ کشمیر میں۔

۵۔ چیف جسٹس، صرف مقبوضہ کشمیر میں ناڈر (مدراس) کے چیف جسٹس نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا ہے۔

۶۔ ہائیکورٹ کے جج صاحبان ۲۶۸ میں ۱۲ (ہونا چاہیئے ۳۲)

۷۔ چیف سیکریٹری؛ مقبوضہ کشمیر اور گجرات میں۔

۸۔ چیئرمین پبلک سروس کمیشن کوئی مسلمان نہیں۔

(ر) فوج میں مسلمانوں افسران کی تعداد ۲ فیصد سے کم ہے۔

(س) بیرونی ممالک سے صنعتی و ٹیکنیکل تعاون جس کو بھارتی حکومت نے جنوری سے ستمبر ۱۹۸۰ء تک منظور کیا۔

کل ۲۲۴. اداروں میں صرف ایک مسلمان ہے۔ جس کا تعاون ہانگ کانگ کے ادارے سے ہوا۔

اس پر بھی اگر بھارتی سفیر مسلمانوں کے ساتھ مراعات کا ڈھنڈورا پیٹیں تو پھر کہنا پڑتا ہے۔

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ [1]

---

[1] روزنامہ جسارت کراچی ۷، نومبر ۱۹۸۱ء۔

خلاصۂ کلام

تحریکِ پاکستان کی کامیابی کے باوجود اس مملکت کے ملت کی آرزو کے خلاف اسلامی نظام سے محروم رہ جانے کے باعث یہ مملکت ترقی اور عالمی دعوتِ اسلامی کی علمبردار بننے کی بجائے فتنوں کا شکار ہو کر رہ گئی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ بھارت کو ظلم و زیادتی کی کھلی آزادی حاصل ہو گئی۔ اس کی ذمہ دار مسلمانوں پر مسلط حکمران اقلیت ہے۔

ملت اسلامیہ نے جن قربانیوں اور جذباتی وابستگیوں کے ساتھ تحریکِ پاکستان کو کامیاب کیا تھا۔ ان قربانیوں پر انگریز کی مسلط کردہ ایک حقیر سی مغرب زدہ اقلیت نے جو تمام تر جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بیوروکریٹس پر مشتمل ہے۔ پانی پھیر دیا۔ اس حکمران اقلیت نے پوری بے دردی سے ملت مسلمہ کی آرزوؤں اور قربانیوں کا خون بہایا اور انگریز کی جانشینی کا انتہائی بھونڈا پن بروئے کار کیا۔ اتنا ظلم شاید فرعون نے بھی بنی اسرائیل کے ساتھ نہ کیا ہو گا۔ جس قدر ظلم اس مغرب زدہ نام نہاد مسلمان جاگیردار اقلیت نے ملت اسلامیہ پر برصغیر میں کیا۔ ملت نے تشکیلِ پاکستان کی صورت میں جو کام خدا و رسول کی رضامندی اور اسلام کی سربلندی کے لیے کیا تھا۔ اس مغرب زدہ اقلیت نے اس ملک کو اپنے نفس کی آماج گاہ بنا لیا۔ جس مملکت کی ملت نے غلامی کی بے سروسامانی میں چٹاگانگ سے خیبر تک صورت گری کی تھی۔ اس مملکت کے دو ٹکڑے کر کے اس ظالم مغرب زدہ سیکولر اقلیت نے اسے مزید کمزور کر دیا جس مملکت کو اسلامی نظام نافذ کر کے سارے عالم اسلام کی قیادت اور ساری دنیا کی ہدایت کا ذریعہ بننا تھا۔ اس مملکت کو اس گمراہ گروہ نے عالم اسلام میں رسوا اور پوری دنیا میں بدنام کر کے رکھ دیا۔

عالمی سطح پر ملت مسلمہ کا سب سے بڑا دشمن یہی طبقہ ہے جسے مغربی سامراج نے اپنی گود میں پرورش کر کے مسلمانوں پر ملک در ملک مسلط کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی سربلندی جہاں اسلام کی سربلندی میں پوشیدہ ہے ان کی آزادی بھی اس طبقے سے آزادی میں ہی پوشیدہ ہے۔

(۶)

تحریک تحفظِ پاکستان

ستمبر ۱۹۶۵ء

بظاہر ۶۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کو تحریک کا نام نہیں دیا سکتا لیکن فی الحقیقت یہ ایک تحریک ہی بن گئی اسے محض ایک قومی جنگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس واقعہ نے ملت کے اندر ایک تحریکیت کو تخلیق کیا اور سوئی ہوئی پوری ملت بیدار ہو گئی۔ بھارت کے اچانک غیر متوقع حملے نے پاکستان میں آباد پوری ملت اسلامیہ میں اپنے وجود کے لیے ایک عظیم خطرے کا احساس پیدا کر دیا۔ جسے صدیوں کی فکری اور عملی جدوجہد سے جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا اسے خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور اس کی ساری سابقہ جدوجہد پر پانی پھر جانے والا تھا۔ ملت نے یوں محسوس کیا کہ جیسے پورے برصغیر کو جس دشمن کے حوالے کر کے اس نے ایک گوشۂ عافیت میں اپنا آشیانہ بنایا تھا، دشمن نے اس آشیانے سے محروم کرنے کے لیے اس پر حملہ بھی کر دیا تھا۔ اس طرح ملت کے لیے یہ جنگ جہادِ تحفظِ ملت بن گئی۔ ایک عظیم ردعمل وجود میں آیا۔ حیرت ناک ایثار و قربانی کی مثالیں اس کے اندر سے نمودار ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ پوری ملت کے مرد و زن، بوڑھے اور بچے اور مویشی تک میں جذبۂ حریت شعلہ زن ہو گیا تھا۔

اس شعلہ زن جذبۂ ملی نے جانی اور مالی قربانیوں کے باب رقم کیے۔ جرأت و بہادری کے لافانی واقعات تخلیق کیے۔ للّٰہیت اور دینِ حق کے لیے فدائیت کی تازہ مثالیں پیدا کیں اور چند گھنٹوں کے اندر پوری قوم میں بیداری و ہوشیاری کی زبردست برقی رو اس طرح دوڑ گئی جیسے کسی بند پڑے ہوئے عظیم الجثہ کارخانے کی مشینیں یکایک بجلی کی رَو

آجانے سے یک بیک چلنے لگیں اور سارا علاقہ ان کی حرکت اور گونج سے تھرتھرانے لگے۔

میں خود اس تحریک کا ایک حقیر حصہ اور اس میں شامل تھا میرا تجزیہ یہ ہے کہ ملت کے وجود کو حقیقی خطرے کے جانگداز احساس نے فرد فرد کو بیدار کر دیا تھا جیسے کوئی کشتی یکایک سمندر کی تہ میں پوشیدہ چٹان سے ٹکرا جائے اور کشتی کا ہر فرد خطرے کے حقیقی احساس سے بیدار و ہوشیار اور آمادہ پیکار ہو جاتا ہے۔ قوم نے اس جنگ کو جس انداز میں اپنے خلاف چیلنج کے طور پر قبول کیا اور جس انداز میں اسے نبھایا۔ میں اسے جنگ کی بجائے تحریک تحفظ پاکستان ہی سمجھتا ہوں جو جنگ کے دھماکے نے یک بیک ساری قوم میں پیدا کر دی۔ ستمبر کا جہاد فی الواقع تحریک تحفظ پاکستان کہلانے کا مستحق ہے۔ اس جہاد نے ایک مدتِ دراز کے بعد ہماری ملی تاریخ میں ایک بیش قیمت باب کا اضافہ کیا۔ یہ اضافہ بلاشبہ بیش قیمت، بے بہا، غیر فانی اور ایک زندہ قوم کے بھرپور اظہارِ زندگی پر مشتمل ہے اور اس کی تاریخ کے شایانِ شان ہے۔

یہ ہماری عہد آفریں تاریخ کا درخشاں باب ایک حیرت ناک انقلاب کی مانند رونما ہوا راتوں رات ایک اشارۂ غیبی کے تحت واقعات کی ایک کروٹ نے یہ انقلاب رونما کر دیا۔ جب مکار ہمسائے اور بزدل دشمن نے اچانک پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے نے پاکستان کی ملتِ مسلمہ کی آزادی اس کی حمیت اور غیرت اس کے دین اور اخلاقی اقدار، اس کے تاریخی سرمائے اور تابع اسلاف، غرض ساری ہستی کو تباہی اور غلامی کے خطرے سے دوچار کر دیا۔ برعظیم ہند میں اسلام کے آخری قلعہ پر حملہ ہو گیا تھا اور ملت مسلمہ اٹھارہ سال تک خواب خرگوش کے مزے لینے کے بعد اچانک بیدار ہو گئی تھی۔

اس حملے نے غفلت و لاپروائی نفسانفسی، مادی مفادات، اخلاقی اور دینی اقدار سے بے نیازی کے دبیز غلاف کو نوچ کر ایک طرف کر دیا۔ اور پوری ملت انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کوئی اصلاحی اور تعمیری تدابیر کارگر نہیں ہو رہی تھیں۔ کوئی دعوتِ اصلاح اثر پذیر نہ ہو رہی تھی۔ بگاڑ کا ریلا فسادِ کردار کے جلو میں ہر طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اور اخلاق اور

اصلاحی پکار بے فکری اور بے حسی کے خراٹوں میں دبتی چلی جا رہی تھی۔ جب اچانک یہ حملہ ہوا۔ سوئی ہوئی ملت بیدار ہو گئی اور بیدار ہوتے ہی اس نے اپنے اصل مقام کی طرف رجوع کیا۔ قوم یونسؑ کی طرح تباہی کو سرپر دیکھ کر اس کا سب سے پہلا ردِ عمل خوفِ خدا، دین کی پیروی کا گہرا جذبہ اور اسلام کی حفاظت کا زبردست ولولہ اور داعیہ تھا۔

اس ہمہ گیر و ہمہ پہلو انقلاب نے ملت کے فرد فرد اور گروہ در گروہ کو ملک و ملت کی حفاظت، خدا کی بندگی اور ایثار و قربانی کے جذبات سے اس طرح معمور کر دیا جیسے یہ کوئی نئی قوم تھی جو اپنے تازہ بتازہ ایمان کے ساتھ تازہ دم اٹھی تھی۔ اور باطل کی کھیتی پر برق بن کر گرنے والی تھی۔ سپاہیوں نے مورچوں کے اندر خالدؓ اور طارقؒ کے کارنامے تازہ کر دیئے، شہریوں نے ایثار و قربانی کے اندر مکہ و مدینہ کے اولین اہل ایمان کے واقعات دہرا دیئے خواتین نے خولہؓ بنت ازور اور ام حرامؓ کے نقوشِ قدم کو از سرِ نو تازہ کر دیا۔ بچوں نے عون و محمد کی داستان کو اپنے عمل و جذبے کی زبان سے بیان کر دیا۔ غرض ملت کا ہر فرد ایک بے پناہ ایمانی جذبے اور جوش کے ساتھ اس خوفناک خطرے کے مقابلے میں سخت چٹان کی طرح ڈٹ گیا جو ۶ ستمبر کی رات کو چوروں کی طرح بھارتی سامراج کی رتھ پر بیٹھ کر پاکستان کی سرحدوں پر نمودار ہو تھا۔ ملت کی یہ بیداری اور افراد ملت کے یہ درخشاں کارنامے اسلامی تاریخ کے مورخ کے لیے نہایت قیمتی متاع ہے جو اسے ایک مدت کے بعد میسر آئی۔ میں چونکہ اس جہاد حریت میں خود شامل تھا اس لیے میں نے کوشش کی ہے کہ اخبارات اور حالات کے دامن سے ان واقعات کو چن کر ایک گلدستہ مرتب کر دوں۔ تاکہ ملت کے سامنے خود اس کے اپنے کام کا ایک مختصر آئینہ موجود رہے جس میں وہ اپنی اس دلنواز ادا کو دیکھ سکے جو زندہ اقوام کے لیے زندگی کی سب سے بڑی قیمتی متاع ہوتی ہے۔ یہ قیمتی اور دلنواز انقلاب مکار دشمن کے اس جارحانہ حملے نے پیدا کیا جو پاکستان کی ملت مسلمہ کے لیے اپنی طرف سے ایک بہت بڑی تباہی لے کر اس کی سرحدوں پر آیا تھا۔ لیکن مالک الملک نے اس تباہی کو اسی کی طرف لوٹا دیا اور اس کے بدلے میں پاکستان کی ملت مسلمہ کے لیے یک جہتی۔ اتحاد۔ ایثار و قربانی۔ دینی شوکت۔ ہمدردی و مواخاۃ اور فتح و

کامرانی کا ہدیہ پیش کر دیا۔

یہ ہدیہ بلاشبہ مشیت الٰہی نے پیش کیا لیکن اس کے حصول کے لیے ملتِ پاکستان کے ہر فرد نے ہر طبقہ ہر گروہ اور ہر جماعت نے اپنا اہل ہونا ثابت کیا۔ زخمیوں اور بیماروں کے لیے جس قدر خون سال بھر میں جمع نہ ہوا کرتا تھا۔ لوگوں نے مجاہدوں کے لیے ایک دن میں اس سے زیادہ خون پیش کر دیا۔ تاجروں نے اپنی دیانت اور وطن دوستی کا حق ادا کر دیا۔ فوجیوں نے اپنے مضبوط جسموں کا ذرہ ذرہ خون کشت ملت کی آبیاری پر لگا دیا۔ طالب علموں اور بچوں نے اپنے والہانہ جذبات پیش کیے خواتین نے اپنا مال وزر پیش کیا مردوں نے اپنی ہمہ پہلو خدمات پیش کیں۔ خطیبوں اور مقرروں نے اپنے ولولہ انگیز خطبے اور ادیبوں اور شعراء نے اپنی ساری فکری توانائیاں پیش کر دیں۔ ریڈیو نے مسلمان عوام کے اٹھارہ سالہ سارے گلے شکوے دور کر دیئے اور نام نہاد ثقافتی پروگراموں سے یکسر کنارہ کش ہو کر دین واخلاق کے اسباق اور رجزو للکار کے پرجوش ترانے پیش کیے اخبارات نے اپنے کالموں کو خدمات ملک ودین کے لیے وقف کر دیا اور ان کا ہر کالم جسد ملت میں تازہ روح دوڑانے والا۔ ایثار وقربانی کے جذبات ابھارنے والا دین واخلاق سے گہری وابستگی پیدا کرنے والا بن گیا۔ اخبارات کے صفحات میں قرآن وحدیث کی تعلیمات جگمگانے لگیں اور ان پیشانیوں پر ارشادات ربانی کے سہرے دمکنے لگے۔

پوری فضا، پورا ماحول، پورا معاشرہ اور پوری قوم یک جہتی اور یک سوئی کا بہترین منظہر بن گئی۔ حزب اختلاف۔ حزب اقتدار کی موید اور پشت پناہ ہو گئی۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے کارکن اس طرح مل جل کر کام کرنے لگے۔ گویا مختلف پروگرام نصب العین لائحہ ہائے عمل اور طریق کار سب مٹ کر صرف ایک ہی پروگرام نصب العین اور لائحہ عمل باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا فتح پاکستان کی مکمل فتح۔ یہ ایک معجزہ تھا جو مشیت ایزدی کے دستِ بیضا نے ایک ہی اشارے سے رونما کر دیا تھا۔

... ...

یہ معجزہ اس لیے رونما ہوا تھا۔ کہ دغاباز ہمسایہ ہمارے ملک پر چڑھ دوڑا تھا۔

وہ اول روز سے ایک زہریلے سانپ کی طرح ہمارے خلاف بس گھولتا رہا تھا۔ اس نے ایک دن کے لیے بھی خوش دلی سے ہمارے جداگانہ وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ پاکستان میں رواداری، حق ہمسائیگی اور آداب ہمسائیگی کے پیشِ نظر کبھی ایک روز بھی یہ آرزو نہیں رہی تھی کہ بھارت کو فتح کر کے اسے نیست ونابود کر دیا جائے لیکن بھارت میں ایسی جماعتیں اور تحریکیں ہمیشہ مسلسل کام کرتی رہیں جو پاکستان کے وجود کو ختم کر کے اکھنڈ بھارت کو وجود میں لانے کا نصب العین لے کر چلتی رہیں۔ پاکستان علیحدگی کے رجحانات کے باوجود اقلیتوں سے بہترین سلوک کرتا رہا اور بھارت لادینیت کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی بدترین مذہبی تعصب کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کو مسلسل جبر و تشدد، نسل کشی، تباہی اور بربادی کا نشانہ بناتا رہا حد یہ ہے کہ پاکستان میں ہندوؤں کے خلاف کبھی ایک دفعہ بھی فرقہ وارانہ فساد نہ ہوا۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف ہزارہا فسادات عین سیکولرازم کے پردے میں ہر سال کیے گئے۔

بھارت پاکستان کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہمیشہ جمہوریت کا چیمپئن بناتا رہا اور مغربی ملکوں کو اپنی سب سے بڑی ایشیائی جمہوریت کے نام پر مدد کی اپیل بھی کرتا رہا لیکن اس جمہوریت میں نہ کسی اقلیت کو اس کی آبادی کی نسبت سے کبھی جمہوری نمائندگی دی گئی اور نہ ملازمتوں میں ان کے حقوق ان کی آبادی کی نسبت سے محفوظ کیے گئے۔ جمہوریت کا نام لے کر تنگدل اکثریت سب کچھ ہڑپ کر جانے کا کاروبار مسلسل اٹھارہ سال سے کرتی چلی آرہی تھی اور اس کی کھلی ہوئی پالیسی تھی کہ چھوٹی بڑی اقلیتوں کو آہستہ آہستہ تحلیل کر کے ہندو قوم میں مکمل طور پر جذب کر لیا جائے۔ لادینیت کی وسیع النظری اور جمہوریت کی جمہور پرستی کا یہ وہ نمونہ ہے جو بھارت میں آزادی کے اٹھارہ برس سے وہاں کی اقلیتوں کے لیے غلامی حق تلفی اور تباہی کا عذاب بن کر ان پر مسلط چلا آیا ہے۔ یہی وہ تنگ نظر سامراجیت ہے جو کشمیر کے مسلم اکثریت کے وسیع شاداب علاقے پر بھی قبضہ کرنے کی بیک وقت مدعی ہے۔ وہاں وہ جمہوریت کا کھلا کھلا خون کر رہا ہے۔

کشمیر کے مسلمان اپنے فطری حق کے لیے اول روز سے لڑ رہے ہیں پاکستان اس حق کا

ہمیشہ سے حامی اور مؤید ہے۔ کشمیریوں نے الجزائر کے باشندوں کی طرح جنگِ آزادی چھیڑ رکھی ہے اور پاکستان اصولی طور پر اس جنگِ آزادی کا پشت پناہ ہے۔ یہ پوزیشن ناقابلِ تغیر ہے جب تک کشمیر کے لوگوں کو آزادی کے ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنیکا حق نہ دے دیا جائے اگر ہندوستان صرف قوت کی دلیل کا ہی قائل ہے تو پھر اسے اسی دلیل سے قائل کر کے حقیقت سمجھانے کی کوشش کرنا پاکستان کا بھی فرض ہے اور اہلِ کشمیر کا بھی۔

... ...

خطرہ بہت دنوں سے فضا میں سمویا ہوا تھا۔ اور گہرے گھنے کُہرے کی طرح ملکی فضا کے اندر رچا بسا محسوس ہوتا تھا۔ کشمیر میں جہاد شروع تھا۔ دینی اور سیاسی جماعتیں اس جہاد میں ہر نوعیت کی مدد فراہم کرنے کی اپیل کر رہی تھیں۔ جماعت اسلامی تو بہت دنوں سے یہ مہم چلا رہی تھی کہ کشمیر کے مسلمانوں کی مدد کی جائے۔ ہمارے شہر سرگودھا میں بھی ایک ڈیفنس کمیٹی بن گئی تھی جس میں تمام جماعتوں کے نمائندے شریک تھے۔

غالباً اس ڈیفنس کمیٹی کو پورے پاکستان میں اولیت کا شرف حاصل تھا۔ پھر ایک آل پارٹیز صوبائی جنگی کمیٹی انہیں مقاصد کے تحت بہت دنوں کے بعد وجود میں آئی۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ پھر ۶ ستمبر ۶۵ء کے بھارتی حملے کے بعد تو پورے ملک میں جا بجا محاذِ جنگ کھل گئے تھے۔ لاہور، سیالکوٹ، راجستھان اور چھمب کے محاذ اور پاکستانی افواج کے بہادر سپاہی خود سفر کر کے ان محاذوں پر پہنچ رہے تھے۔ لیکن ہمارے شہر سرگودھا کے عوام اور یہاں کے جانباز توپچیوں کو خود چل کر کہیں محاذ پر جانا نہیں پڑا۔ بلکہ محاذ خود چل کر ان کے پاس آ گیا پھر یہ محاذ ۷ ستمبر سے لے کر ۲۲ ستمبر تک مسلسل کھلا رہا۔ یہ سرگودھا کا فضائی محاذ تھا۔

یہ محاذ کچھ یونہی نہیں کھل گیا تھا۔ اس کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سرطان کے پھوڑے کی طرح بین الاقوامی سیاسیات کے جسم میں یہ زہر گذشتہ اٹھارہ سال سے پرورش پا رہا تھا۔ زخموں کو ڈھانک دینے سے تو ان کی ٹیس کم نہیں ہوتی۔ اور نہ پھوڑوں کو چھپا لینے سے ان کا زہر ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا کی بڑی طاقتوں نے اگر مجرمانہ چشم پوشی سے کام لیا تھا۔ تو زمانہ اس مجرمانہ چشم پوشی سے کس طرح اطمنان برت سکتا تھا۔ سیاستدانوں کے ناخن تدبیر

جب کند ہو گئے تو اس گرہ کو کھولنے کے لیے توپ کے دھانوں اور بندوق کی گولیوں نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۶، ستمبر کو بھارت نے ایک فسادِ عظیم برپا کر دیا۔ اس نے کشمیر کا بدلہ لینے کے لیے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ چوری اور سینہ زوری بھارت کی خارجی پالیسی کا حصہ ہمیشہ رہی ہے۔

... ...

ظاہر ہے کہ جب انصاف کی طرف سے منہ پھیر لیا جائے تو فساد سامنے آجاتا ہے اور جب مظلوموں کا حق غصب کر لیا جائے تو ان کی آہیں شعلے بن کر بادلوں سے بھی بلند ہونے لگتی ہیں۔ بین الاقوامی طاقتوں نے بلاشبہ انصاف کے بجائے فساد کی طرف منہ پھیر لیا تھا۔ وہ کہتی تھیں: "یہ کشمیر کا مسئلہ تم بار بار ہمارے سامنے لے آتے ہو۔ تم مردہ گھوڑے کو لا کر بین الاقوامی چوراہے پر رکھ رہے ہو۔ تم سستی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

چنانچہ سستی شہرت کے بجائے اب مہنگی اور نہایت گراں شہرت حاصل کرنے کا وقت آگیا تھا۔ بھارت نے پاکستان کی طرح سستی شہرت کے بجائے مہنگی شہرت حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ اس نے ۱۷ دن کی لڑائی میں اپنے ۱۱۰ طیاروں، کئی سو ٹینکوں، ہزاروں لاشوں قیدیوں اور اربوں روپے کے خرچ کے بعد اپنے لیے شکستِ فاش کی نہایت مہنگی ذلت خریدی تھی۔ اس نے دنیا بھر کی لعن طعن ہزاروں مربع میل کا رقبہ اور اربوں روپے کے ہتھیار برباد کر کے نہایت گراں شہرت حاصل کی تھی۔ بین الاقوامی پنچایت کے چوہدریوں کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ جس ہاتھی کو وہ گولہ بارود۔ امداد اور ہتھیاروں کا چارہ ڈال ڈال کر ایشیا کی قیادت کے لیے تیار کرتے رہے تھے وہ صرف پورس کا ہاتھی تھا۔ جس کے پاس بھاری جسم اور نہایت کمزور روح تھی۔ جس کے پاس بے شمار باتیں اور بہت تھوڑا عمل تھا۔ جس کے پاس بے شمار اسلحہ اور نہایت کمزور دل تھا جو اپنے لیے ہتھیاروں کے جہاز تو درآمد کر سکتا تھا۔ لیکن ہمت و جرات، انسانیت و شرافت، بہادری و جانبازی مردانگی اور شجاعت درآمد کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ افسوس کہ یہ چیزیں کسی ملک کی برآمدی فہرست میں پائی نہیں جاتی تھیں۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان اگر تہذیب و تمدن ، مذہب و اخلاق اور تہذیبی قدروں کی بناء پر دو حصوں میں تقسیم ہوا تھا تو کشمیر پاکستان کا حصہ تھا۔ جس کی اس وقت نوے فیصد آبادی مسلمان تھی۔ اگر جغرافیائی عوامل اس تقسیم کا سبب تھے تو بھی کشمیر پاکستان کا دست و بازو اور حصہ تھا۔ اگر قانون تقسیم قوموں کی اکثریت اور اقلیت پر مبنی تھا، تو بھی کشمیر میں بسنے والی قوم پاکستان میں شامل ہونے والی تھی۔ لیکن اگر عہد شکنی و مکر و فریب وعدہ فراموشی اور جبر و تشدد کے دلائل کشمیر کو بھارت کا حصہ قرار دیتے تھے تو مسلمان اپنے اخلاق اور اصول کی بناء پر ان چیزوں کے سامنے جھکنے کا کبھی عادی نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنی پوری تاریخ میں عہد شکن لوگوں کو ہمیشہ سخت سزا دی تھی۔ عہد شکن لوگوں کو اگر معاشرتی مجالس میں عزت و آبرو حاصل نہیں ہوتی تو انہیں بین الاقوامی سطح پر کس طرح معزز اور قابل اعتماد سمجھا جا سکتا ہے جو لوگ ہر دلیل کو چھوڑ کر صرف قوت کی دلیل سے اپنا حق جتائیں ان کا علاج یہی ہے کہ انہیں قوت کی دلیل سے ہی سمجھایا جائے کہ یہ ان کا حق نہیں ہے۔ خود ارادیت کا حق ہر قوم کا فطری حق ہے۔ خود ارادیت کے اس فطری حق نے ہی ہندو جیسی صدیوں کی غلام قوم کو جو اپنی فطرت خصائل، مزاجی کمزوری، تنگدلی اور دون فطرتی کی بناء پر غلامی کے لیے ہی بنائی گئی ہے اور آج بھی غلامی کے لیے ہی موزوں ہے اور ہندو کی حیثیت سے پھر ایک بار غلام بن جائے گی۔ اسے آزادی کی نعمت دی ہے تو وہ ایک بلند فطرت، آزادی پسند توحید پرست اور حریت پیشہ مسلمان قوم کا حق خود ارادیت کیسے چھین سکتی ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ اس کے پاس زیادہ ٹینک ہیں، تو ان ٹینکوں کو چونڈہ اور سیالکوٹ کے قبرستان میں دفن کر دیا جائے گا۔ کیا اس لیے کہ اس کے پاس زیادہ فوجیں ہیں، تو ان فوجیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا جائے گا۔ کیا اس لیے کہ اس کے پاس زیادہ طیارے ہیں، تو ان طیاروں کا مدفن سرگودھا کا فضائی محاذ بنے گا۔ چنانچہ سرگودھا ہندوستان کی فضائی قوت کا مدفن بن کر رہا۔ جبر و تشدد کا علاج ہمیشہ صبر آزما مزاحمت میں پوشیدہ رہا ہے لیکن یہ سب کچھ اچانک نہیں ہو گیا۔ اچانک تو مکار ہندوستان نے حملہ کیا تھا۔ جب پاکستان

کے شہری اور دیہاتی باشندے اپنے اپنے گھروں میں میٹھی نیند سو رہے تھے۔ اس وقت نیفا کے بھگوڑے اور رن کچھ کے شکست خوردہ بھارتی فوجی آدھی رات کے وقت چوروں کی طرح پاکستان کی سرحدوں کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ نہ اعلان جنگ تھا نہ الٹی میٹم نہ نہتے اور بے خبر لوگوں کو پتہ تھا کہ مکار اور بزدل بھارتی توپوں، بکتر بند دستوں اور ٹینکوں کے ساتھ ان کے کچے مکانات اور نہتی بستیوں پر دادِ شجاعت دینے کے لیے چلے آ رہے تھے۔ یہ رن کچھ کا معاہدہ امن کرنے والوں کی فوج تھی۔ جو غداری اور دھوکے سے بین الاقوامی سرحد کو عبور کرتی لاہور چلی جا رہی تھی تاکہ اپنے آقایان ولی نعمت کے اشارۂ چشم ابرو پر لاہور میں بیٹھ کر اپنے ہمسائے پاکستان سے اپنی من مانی شرائط لکھوائے۔ اپنے امن پسند بے خبر ہمسایوں کے ساتھ شاید ہی کبھی کسی ملک نے ایسی غداری کی ہوگی۔ جس کے ساتھ سفارتی تعلقات موجود ہوں جس کے ساتھ رن کچھ میں کیے گئے معاہدۂ امن کی روشنائی بھی خشک نہ ہوئی ہو۔ اس کی بین الاقوامی سرحدوں کو اس طرح پھاند نا سمگلروں اور چوروں کا کام تو ہو سکتا ہے لیکن مہذب اور ذمہ دار حکومتوں کو یہ زیب نہ دیتا تھا۔

... ...

لیکن شاید ایسا ہی غیر مہذب کام بھارتی ہندوؤں کو زیب دیتا تھا۔ مشرکوں اور بت پرستوں سے کسی بہتر معیارِ اخلاق کی توقع عبث تھی۔ سراب کے دامن میں سے پانی نچوڑا جا سکتا تھا لیکن بت پرستوں سے کسی معیار اخلاق، عہد و پیمان کے پاس اور شرافت نفس کی توقع بالکل بیکار تھی۔

چنانچہ در پردہ امریکی اور روسی چشم یار کی شہ پا کر بت ہندی نے جب سرحد پاک کے اندر قدم رکھ ہی دیا تو پاکستان کے شیر دل جوانوں نے اس کا زبردست سواگت کیا۔

صدر مملکت نے ہنگامی حالات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

"پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دلوں میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے مقدس کلمات بسے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپوں

کے دہانے ہمیشہ کے لیے سرد نہیں ہو جاتے۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ انہوں نے کس جری قوم کو للکارا ہے۔ پاکستانی عوام جو اپنے عقائد کی سربلندی اور اپنے مقصد کی صداقت پر ایمان کامل رکھتے ہیں۔ اللہ کے نام پر فرد واحد کی طرح متحد ہو کر دشمن کے خلاف جنگ آزما ہوں گے۔ نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ کی یہ بشارت ہے کہ حق کا بول ہمیشہ بالا ہو گا۔"

پھر انہوں نے ایک مومن کے پختہ یقین و اعتماد کے ساتھ فرمایا :

"بس عقیدے کی پختگی اور والہانہ سپردگی درکار ہے۔ خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمت بے پایاں سے ہمیں کامیابی نصیب کرے گا۔ حق کی فتح ہو گی۔ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ شکست اور تباہی اس باطل کا مقدر ہے۔ جس نے تمہاری سرحد پر سر اٹھایا ہے۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

خدا بلاشبہ ہمارا حامی و ناصر تھا۔ پاکستان کی فوجوں نے آگے بڑھ کر دشمن کی توپوں کے دہانے پھیر دیئے اور ایک بار پھر اسلام کی برکت اور اللہ کی نصرت نے پاکستان کو بچا لیا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمایا :

"دارالاسلام کے کسی حصے پر دشمن حملہ آور ہو تو اس کی مدافعت کے لیے تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔۔۔ جس قوم کو آزاد رہنا ہو اسے لازماً آزادی کی قیمت دینی ہوگی۔ ہم آزادی حاصل کرنے کی قیمت اور بڑی بھاری قیمت پہلے دے چکے ہیں۔ اب ہمیں اس آزادی کو برقرار رکھنے کی قیمت بھی دینے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔"

اس طرح جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔ پاکستان کی پوری ہستی، ملت کی پوری آزادی، اسلامی اقدار و اخلاق کا پورا مستقبل خطرے میں تھا۔ ہماری آئندہ نسلوں کی آزادی خطرے میں تھی اور ملت اسلامیہ نے اپنی آزادی، تہذیب و تمدن اور دین و وطن کے لیے زندگی اور موت کی جنگ چھیڑ دی تھی۔

"تخت یا تختہ" یہی وقت کا یہی نعرہ تھا جو پاکستان کے ہر باشندے کے سامنے نوشتۂ

دیوار بنا ہوا تھا لیکن یہ ہنگامی صورت حال سرحدوں کے مسلمانوں کو درپیش تھی، پاکستانی فوج کے جوانمرد بہادر اور شجاع نوجوانوں کو درپیش تھی۔ لاہور اور سیالکوٹ کے شہریوں کو درپیش تھی۔ سرگودہا کے باسی تو میٹھی نیند سو رہے تھے۔ لیکن وہ میٹھی نیند صرف ۶، ستمبر کی رات ہی سو سکے تھے۔ ۷، ستمبر کی صبح کو محاذِ جنگ خود اہل سرگودھا کے شہریوں کے پاس پہنچ گیا۔ سرحد سے ایک سو پچاس میل دور رہنے والے اہل سرگودھا فضائی محاذ کی صفِ اول میں پہنچ گئے اور سرگودھا کا ہر شہری اس محاذ کا نہ صرف بصر تماشائی تھا۔ بلکہ بذاتِ خود اس جنگ میں شریک تھا۔

یہ ۷، ستمبر کی صبح تھی۔ جب جنگ سفر کر کے سرگودہا پہنچی اور اپنے ساتھ ہندوستانی فضائیہ کے دس طیارے لائی۔

... ...

سیٹلائٹ ٹاؤن کی مشہور بلڈنگ دارالرحمت کے برآمدے میں ہم چند نمازی نمازِ فجر سے فارغ ہو کر ابھی صفوں پر ہی بیٹھے تھے۔ سرگودہا کے باشندے آہستہ آہستہ بیدار ہو کر فجر کے معمولات میں مصروف ہو رہے تھے۔ نیم غنودگی کا کہرہ پرسکون ماحول میں پھیلا ہوا تھا اور ہم حسبِ معمول نمازِ فجر کے بعد تھوڑے سے وقفہ کے لیے وہیں فرش پر بیٹھے ملکی حالات کے تشویش ناک موڑ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ وقت تقریباً پونے چھ بجے صبح کا ہو گا۔ سورج ابھی طلوع نہ ہوا تھا۔ البتہ مشرق کا افق سفید سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور شفق کے گلابی رخسارے خون آلود ہو رہے تھے۔

جب اچانک فضا میں گھری گھرر۔ ر۔ ر۔ گھرر۔ ر۔ ر۔ کی آواز ہمیں اپنے عقبی جانب مشرق کی طرف سنائی دی۔ جو پہلے دور تھی پھر نزدیک تر آ گئی۔ پھر اچانک سٹلائٹ ٹاؤن کے پختہ مکانات سے ذرا ہی بلند گہرے بھورے رنگ کے بہت سے طیارے بالکل عجیب اور نامانوس سے طیارے ایک ایک کرکے گزرنے لگے۔ ایک دو تین کئی ایک یکے بعد دیگرے ہماری آنکھوں کے سامنے سے بہت نیچی اور پُراسرار اڑان کے ساتھ بالکل ہمارے عقبی مکانوں پر سے گزرتے چلے گئے۔ جھنڈ کا جھنڈ۔ مردار خور گدھوں اور چیلوں کی طرح۔ آہنی پرندوں کے غول

کی طرح۔ ہم حیران، متحیر اور کچھ ششدر سے انہیں گزرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور ابھی وہ ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہوئے تھے۔ بس یوں نظر آتا تھا شاید ابھی وہ گورنمنٹ کالج اور اسٹیڈیم کے محاذ پر فضا کی بلندی میں پرواز کر رہے تھے جب اچانک دھندلے آسمان کی طرف لوگوں کی ایک زبردست بوچھاڑ بلند ہوئی۔ دھائیں۔ دھائیں۔ دھائیں۔ یہ طیارہ شکن توپیں چل رہی تھیں۔ اور سینکڑوں پُراں شعلے آتشیں گولوں کے فوارے کی مانند زمین سے آسماں کی طرف پرواز کر رہے تھے جن میں سے ہر گولہ طیاروں کے لیے موت کا پیغام تھا۔ نہ کوئی خطرے کا سائرن بجا تھا۔ نہ کسی دشمن کے یوں اچانک آنے کی توقع تھی۔ نہ فضا میں ایسے خطرے کا کوئی احساس پھیلا ہوا پایا گیا تھا۔ نہ شہری ایسے کسی خطرے کی آمد کا کوئی فوری تصور رکھتے تھے۔ لیکن اچانک یہ سب کچھ فضا میں ہو رہا تھا۔ طیارے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ گولے شرارے پھینکتے ہوئے ہوا میں برات کی ہوائیوں کی مانند بلند ہو رہے تھے۔ ہم ششدر کھڑے یہ سارا فضائی تماشا دیکھ رہے تھے اور اسے کسی فضائی حملے کی مشق گمان کر رہے تھے۔ جب اچانک ہمارے دیکھتے دیکھتے دو طیارے ہوا میں اوندھے ہو گئے اور سرنگوں ہو کر نیچے کی طرف جھکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید ان لوگوں نے ان کو مار گرایا تھا۔ ہمیں تب پتہ چلا کہ یہ حقیقی جنگ تھی یہ تماشا نہیں تھا۔ یہ اس دشمن کے طیارے تھے جو ہماری سرحدوں پر بھی اچانک حملہ آور ہوا تھا۔ اور ابھی ہم خیالات کو سمیٹ کر حقیقی جنگ کے سرگودھا تک پہنچ جانے کا تصور کر ہی رہے تھے۔ جب اچانک فضا میں خطرے کا سائرن گونجا۔

گھوں اوں . . . . . گھوں اوں . . . . . گھوں۔ اوں۔ اوں۔ ں۔ ں۔ وقفہ۔ وقفہ سے خطرے کا الارم اپنی خوفناک آواز سے دشمن کی آمد کا پتہ دے رہا تھا۔

سرگودھا پر پہلا ہوائی حملہ ہو گیا۔

لیکن یہ آخری حملہ نہیں تھا۔ پھر تو ہوائی حملوں کا سلسلہ ہی لگ گیا۔ اس پہلے حملے میں ہی دشمن کے چھ طیارے مار گرائے گئے۔ ہوا باز ایم۔ ایم عالم نے اپنے حیرت ناک جوہر دکھائے اس روز اس کا ریکارڈ پانچ طیاروں کی آہنی لاشوں کا ڈھیر تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے کی ہوائی جنگ

شدید گولہ باری اور تعاقب کے بعد "سب ٹھیک ہے" کا سائرن بجا. لیکن تھوڑے ہی وقفہ بعد پھر خطرے کا سائرن بج گیا. اس طرح یہ سلسلہ دن بھر چلتا رہا. دشمن بار بار حملے کر کرکے آتا تھا اور ہر بار نقصان اٹھا کر پسپا ہو جاتا تھا. ہماری ہوا مار توپیں وقفہ وقفے کے بعد آسمان کی طرف آگ اگلنے لگتی تھیں. اسی روز نماز عصر کے بعد تقریباً ساڑھے چار بجے کی ہوائی جنگ کو پھر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا. دو طیارے ہوا میں پٹخنیاں کھاتے نیچے کی طرف تیزی سے گرے. اور گولوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سٹلائٹ ٹاؤن کے متعدد مقامات پر برسے۔

... ...

پہلے ہی روز دشمن نے متعدد بم ادھر ادھر پھینکے لیکن اللہ کے فضل و کرم سے مطلق کوئی نقصان نہ ہوا. معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی قوت ان تباہی و بربادی کے لوگوں کو بے موقع اور بے محل گرا کر بے اثر بنا دیتی تھی. بم کے گرنے کی دھمک اور دہشت بلاشبہ کافی تھی. ہزار ہزار پاؤنڈ یعنی ساڑھے بارہ من وزن کے بم پورے علاقے کو ہلا دیتے تھے. توپوں کی گرج سے بم کی دھمک کئی گنا زیادہ خوفناک تھی. مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں شدت سے کھڑکھڑاتے اور لرزتے تھے. اسی روز خندقیں کھدگئیں اور لوگ ہوائی حملہ کی احتیاطی تدابیر ملحوظ رکھنے کا اہتمام کرنے لگے. اس روز سرگودہا والوں کو یقین ہو گیا کہ جنگ واقعی چھڑ گئی تھی اور دشمن کے طیارے بم لے لے کر ان پر پرواز کر رہے تھے۔

پہلا حملہ بالکل بے خبری میں ہوا تھا. خطرے کا سائرن تک خطرہ پہنچ جانے بلکہ خطرہ گرا لیے جانے کے بعد ہوا تھا. یہ سخت حیران کن بات تھی لیکن ہمارے توپچیوں نے جس مستعدی کا ثبوت دیا وہ قابلِ تعریف تھا. ایک ہی روز میں آٹھ طیارے مار گرائے گئے تھے اور دشمن کے صرف دو طیارے ہی اپنی داستانِ تباہی بیان کرنے کے لیے افتاں و خیزاں واپس جا سکے تھے. سرگودہا کے آہنی شکنجے نے پہلی جوابی کاروائی میں ہی دشمن کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

اس روز سرگودہا والوں کو خصوصیت سے بھارت کے ریڈیو کی جھوٹی خبروں کا پہلی بار ذاتی تجربہ ہوا. بھارت ریڈیو نے نشر کیا کہ سرگودہا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی اور ہوائی اڈہ شعلوں میں لپٹا ہوا تھا. جبکہ ہم یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ سرگودہا اور

اس کے ہوائی اڈہ کی کسی اینٹ کا پلستر بھی نہ اکھڑا تھا۔ ہمارے دوست چوہدری ظفر اللہ مجسٹریٹ تو اپنی کار لے کر خود ہوائی اڈے پر پہنچے تھے اور انہوں نے دشمن کے اسمارے ہوئے طیارے کو خود بھاگتے اور اپنے دو طیاروں کو اس کا تعاقب کرتے دیکھا تھا۔ جہاں انہیں اپنے سفید براق کپڑوں سمیت کیچڑ والے نالے میں لیٹ کر اپنے آپ کو محفوظ کرنا پڑا تھا۔ اس روز بھارتی ریڈیو اور پاکستان ریڈیو کی خبروں کا پورا پورا موازنہ اور تجربہ اہل سرگودہا کو ہو گیا تھا۔

ہمارا ریڈیو دوسرے دن شام تک آٹھ کے بجائے چھ طیاروں کے گرائے جانے کی خبر ہی دیتا رہا۔ یعنی حقیقت سے بھی دو کم۔ اور بھارتی ریڈیو سرگودہا والوں کو یہ اطلاع دیتا رہا کہ سرگودہا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ حقیقت سے بہت ہی بعید۔ اس پر لوگ ہنستے رہے۔ لیکن بھارت ریڈیو اس فارمولے پر عمل کر رہا تھا کہ جاننے والے چاہے اسے جھوٹا سمجھتے رہیں لیکن کچھ دیکھ تو نہ جاننے والے بھی ہونگے۔ جو اسے سچ سمجھ کر قبول کرلیں گے اور یہ نہ جاننے والے ہی اس کا اصل نشانہ تھے۔

بھارت ریڈیو یہ بات بھول گیا تھا کہ جھوٹ زیادہ عرصہ تک نفع نہیں دے سکتا۔ بہت سے لوگوں کو کچھ دنوں کے لیے دھوکا دے کر غلط فہمی میں رکھا جا سکتا ہے یا چند احمقوں کو کچھ زیادہ عرصے کے لیے دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن سب لوگوں کو ہمیشہ کے لیے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جھوٹ کا سکہ تو دھوکے کے اندھیرے میں تھوڑی دیر چل جاتا ہے لیکن جیسے جیسے صداقت کی روشنی بڑھتی جاتی ہے جھوٹ کا کھوٹا سکہ نمایاں ہو کر اپنا کھوٹا پن خود ظاہر کر دیتا ہے۔ لاہور پر قبضہ کا افسانہ بھارتی ریڈیو دنیا والوں کو سنا رہا تھا اور اہل لاہور اس پر ہنس رہے تھے۔ اس لیے جھوٹ اور لاف زنی کے بجائے لوگوں میں اب "آکاش وانی" کا لفظ استعمال ہونے لگا تھا۔

... ...

سرگودہا پر بھارتی ہوائی حملے نے اہل سرگودہا کو جنگی وجدان دے دیا۔ اور وہ پوری طرح تیار ہو گئے۔ جا بجا شہر میں مورچے کھد گئے۔ خندقیں تیار ہو گئیں۔ بلیک آؤٹ کا ذمہ دارانہ

احساس بیدار ہو گیا۔ اہل سرگودہا فضائی لڑائی کے عقبی مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ اس فضائی معرکے میں سب سے آگے ایئر فورس تھی۔ اس کے تو بچی تھے۔ ان کے مددگار ہوا باز تھے۔ اور ان سب کی پشت پر سرگودہا کے شہری تھے۔ بلند حوصلہ، ہمت جرأت مند اور اپنے روز مرہ کے کاموں کے ساتھ ساتھ شہری دفاع کے کاموں میں معروف۔ رات کی تاریکی میں رضا کار پھرتے تھے۔ محلوں اور گلیوں میں لوگوں نے رضا کارانہ پہرے دینے شروع کر دیئے پل، نہر اور شہر کے اہم مقامات پر پہرے لگ گئے۔ ہمارے محلہ کی چھوٹی پل پر خواجہ گل محمد باقاعدہ روزانہ اپنی بندوق لے کر بیٹھنے لگے اور دن کی دکانداری کے ساتھ رات کے پہرے کو بھی معمول بنا لیا۔ محلہ وار دفاعی کمیٹیاں بن گئیں۔ ابتدائی طبی امداد کی چوکیاں قائم ہو گئیں جن کے لیے شہر کے ڈاکٹروں نے مفت طبی امداد اور خدمات پیش کر دیں۔ جابجا ہوائی حملے سے احتیاطی تدابیر کے لیکچر شروع ہو گئے اور ابتدائی طبی امداد کی کلاسیں لگ گئیں اور شہر اپنے شہریوں کے جلو میں پوری طرح ایک مسلح مورچہ بن کر کھڑا ہو گیا۔

روز مرہ کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ شہر کی ڈیفنس کمیٹی کے اجلاس روز ہوتے تھے اور شہری دفاع۔ نظم و نسق۔ فنڈز کی فراہمی بازار کے مناسب نرخ، عوامی مورال کی بلندی اور بحالی کی مختلف تدابیر پر غور ہوتا اور گذشتہ رات میں دشمن کی بمباری کے نقصانات کی رپورٹیں بیان کی جاتیں۔

ہوائی حملوں اور بمباری کے ان دنوں میں لوگوں کا جوش و خروش جذبہ۔ ولولہ اور حوصلہ دیکھنے کی چیز تھا۔ مدت کی گم شدہ زندگی لوٹ آئی تھی۔ مدت کی گمشدہ یکجہتی و اجتماعیت باہمی ہمدردی اور مواخاۃ لوٹ آئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات دب گئے تھے۔ سیاسی جھگڑے مٹ گئے تھے۔ اختلاف رائے رخصت ہو گیا تھا۔ خدا فراموشی کی جگہ خدا خوفی نے لے لی تھی اور انتظامیہ اور عوام کے درمیان کھڑی ہوئی امتیاز اور بے جا حفظِ مراتب کی اونچی دیواریں ڈھے گئی تھیں۔ پوری قوم اپنے سارے شگاف اپنے سارے امتیازات اور اپنی ساری کمزوریاں مٹا کر یک جان ہو گئی تھی۔ سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار تھی جو دفاع ملک و ملت کا مضبوط مورچہ بن کر شہر شہر، گلی گلی اور بستی بستی میں کھڑی ہو گئی تھی۔

سب ایک ہی کشتی ملت کے مسافر تھے اور اس کشتی کے وجود میں سب کا وجود مدغم ہو گیا تھا دکھ درد ایک ہو گئے تھے۔ مسرت و انبساط ایک ہو گئے تھے۔ خیال و عمل ایک ہو گیا تھا۔ اور خدا و رسول و کتاب کی وحدت کے ساتھ پوری ملت کا وجود بھی ایک ہو گیا تھا۔ یہ ایک عظیم عطیۂ الٰہی تھا جو درماندہ ملت مسلمہ کو اس کے مالک کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

... ...

محلہ دار طبی چوکیوں کے لیے دوا فروشوں نے مفت ادویہ فراہم کرنے کی پیش کش کی تھی۔ ڈاکٹروں نے رضا کارانہ خدمات انجام دینے کی پیشکش کی تھی۔ علماء و خطیب وہ چاہے کسی فقہی مسلک سے وابستہ تھے سبھی جہاد اور اس کے فضائل، شہادت اور اس کے بلند مراتب پر تقاریر کر رہے تھے۔ قومی دفاعی فنڈ میں ہر روز عطیات کا اعلان بڑھ چڑھ کر کیا جاتا تھا۔

ہوائی حملے ہر رات ہوتے تھے۔ بم روزانہ گرائے جاتے تھے۔ رات اور دن کے کئی کئی گھنٹے خندقوں میں بسر ہوتے تھے۔ لیکن جو لوگ راتیں خندقوں میں جاگ جاگ کر گزارتے تھے وہ لوگ دن میں اپنے روزمرہ کے کاروبار میں حسب معمول پوری طرح مصروف نظر آتے تھے۔ رات کی بے آرامی بڑھ گئی تھی لیکن دن کی مصروفیات کم نہیں ہوئیں تھیں۔ صرف ایک مصروفیت بڑھ گئی تھی اور وہ خطرے کے الارم اور خندقوں میں آمد و رفت تھی۔

... ...

اور ہندوستان کے جہاز حملے کے لیے حسب معمول روزانہ آتے تھے۔ لیکن ان میں وہ پہلے روز جیسا دم خم نہ تھا۔ پہلے روز انہوں نے بے جگری سے حملہ کیا تھا بے آئے اور بے جگری اور حوصلے سے کام لے کر ہمت کر کے دس میں سے آٹھ گر گئے۔ لیکن یہ بہادری پاکستانی فضائیہ کے کمال فن سے بے خبری میں ان سے سرزد ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہندوستانی فضائیہ نے یہ غلطی نہیں کی۔ پھر وہ روزانہ آتے رہے لیکن نہ دن کو آنے کی ہمت کی اور نہ نیچے اڑان کی جرأت۔ ہمیشہ رات کو آئے کبھی نو دس بجے۔ کبھی بارہ ایک بجے اور کبھی تین

چار بجے۔ رات کے مختلف اوقات میں آتے رہے لیکن رات دن میں ان کی اڑان ہمیشہ ہزاروں فٹ بلندی پر رہی۔ انہوں نے کبھی نیچے اترنے کی ہمت نہ کی اوپر ہی اوپر منڈلاتے رہتے اور منڈلا منڈلا کر کسی آس پاس کے دیہات میں اپنا بار گناہ بموں کی صورت میں ہلکا کر کے چلے جاتے۔

... ...

وہ راتیں بھی دلچسپ تھیں، سائرن بجتا۔ گھوں اوں ..... گھوں اوں .....
اونچی خوفناک چیخ اور زیر و بم کے ساتھ اور شہر خموشاں رات کے آخری پہروں میں اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ ہر شخص اپنے اپنے بستر پر اٹھ بیٹھتا اور اٹھ کر سیدھا خندق کا رخ کرتا۔ شاید قیامت میں بھی ایسا ہی منظر ہو گا جب یکایک صور قیامت پھونکے گا اور مردے اپنے اپنے بستر خاک سے اچانک اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کسی کو جگانے کی ضرورت نہ ہو گی اور جس طرح سائرن کی خوفناک آواز کے ساتھ دل بے قاعدہ دھڑکتے تھے اور بموں کے گرنے کے خیال سے یہ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ صبح کا سورج کون دیکھے گا۔ اسی طرح قیامت کے دن دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہر کوئی اٹھ کھڑا ہو گا اور نہیں جانے گا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔

... ...

جنگ کی ساری مدت بھارتی طیارے رات کو روزانہ آتے رہے۔ سرگودھا کے شہری اب اس اڑان اور بمباری کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ دن کو کبھی آنے کی جرأت نہ کریں گے اور رات کو بہر حال اپنی ڈیوٹی دینے کے لیے ضرور آئیں گے۔ بھارتی جنگی مشین نے جن ہوا بازوں کو اس آگ میں جھونک رکھا تھا اس میں جلنے کے لیے وہ مجبور تھے۔ روزانہ وہ راتوں کو آ کر سرگودھا پر پرواز کرتے۔ بادلوں سے بھی اونچے اور روزانہ ہی وہ بے موقعہ بے محل اور بے تکے بم پھینکتے، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ روزانہ ہی ہمارے توپچی گولہ باری سے آسمان کو سرخ و سفید روشنیوں سے مزین کر دیتے اور آسمان کے نیچے روشن اڑتے ستاروں کا ایک دوسرا آسمان تیار کر دیتے۔ فوارے کی بوچھاڑ کی طرح گولے اڑ اڑ کر

ہوا میں بلند ہوتے رہتے اور آسمان کی بلندیوں پر بزدل بھارتی ہوا باز اوپر ہی اوپر گھوں گھوں۔ گھرر۔ گھرر کی اڑان کرتے رہتے۔ کبھی یہاں کوئی طیارہ گرتا کبھی وہاں گرتا۔ سرگودھا کے آس پاس کے دیہاتوں میں بھارتی طیاروں کے بم اور ڈھانچے تقریباً روز ہی گرا کرتے۔

لوگ بھارتی طیاروں کی آواز تک پہچاننے لگے تھے۔ بھاری بھاری گھرر گھرر جیسے ہوا کے دوش پر کوئی چھکڑا گھسٹ رہا ہو۔ اس کے مقابلے میں ہمارے طیاروں کی اڑان ہلکی اور فراٹے دار ہوتی۔ دونوں کی آوازیں نمایاں ہوئیں اور تقریباً لوگ پہچاننے لگے تھے کہ یہ آواز دشمن کے طیارے کی ہے یا اپنے طیارے کی۔

دشمن کی ناکام بے تکی اور بے محل بمباری نے بھارتی فضائیہ کی بے بسی مایوسی اور گھبراہٹ کو بالکل نمایاں کر دیا تھا اور لوگوں میں یہ بات چل گئی تھی کہ شاید سرگودھا میں سب سے زیادہ محفوظ جگہ وہی تھی جہاں بمباری کے لیے بھارتی طیارے آتے تھے۔ یعنی ایئرپورٹ کا رن وے جہاں انہیں پہنچنے یا اسے نقصان پہنچانے کی نہ کبھی ہمت ہوئی نہ توفیق میسر آئی۔

ایسا بھی ہوا کہ دشمن بالکل بے خبری میں سرگودھا کی فضا میں پہنچ گیا۔ فضا میں کئی کئی روشنی کے بم گرا دیئے اور ساری فضا اچانک روشنی سے منور ہو گئی۔ تب کہیں ہمارا سائرن بجا اور ہمارے توپچی حرکت میں آئے لیکن ہمارے سائرن سے زیادہ مستعد سائرن قدرت کا تھا۔ اور ہمارے توپچیوں سے زیادہ مستعد قضا و قدر کے کارکن تھے۔ ہماری مستعدی یا غفلت دونوں حالتوں میں قدرتِ الٰہی کا تحفظ ہمیں یکساں حاصل رہا کہ دشمن کبھی کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ فضا میں موقع پر پہنچ جانے کے باوجود اسے کبھی اپنی ذات پر اعتماد پیدا نہ ہوا۔ اور ہمیشہ بمباری میں خطا کرتا رہا۔ کبھی ہمارے بم اور شور سے چمکتے ہوئے سفید بنجر کھیتوں پر آٹھ آٹھ اور دس دس بم ایئرپورٹ یا آبادی کے دھوکے میں پھینک گیا۔ اور کبھی کسی دیہاتی کی سلگائی ہوئی آگ کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا کر بھاگ گیا۔ ان پر بھارتی بموں کا لدا ہوا ایک بوجھ ہوتا تھا جسے کہیں نہ کہیں جلد از جلد خالی کر کے بھاگنے کی نگران کو

ہر وقت لاحق رہتی تھی اور یہ کام کرچکنے کے بعد فرار کا راستہ ہی ان کے لیے سب سے زیادہ سیدھا اور سلامتی کا راستہ ہوتا تھا۔

... ...

بم کا دھماکہ بلاشبہ بڑا جان لیوا ہوتا تھا جیسے زمین نیچے کی طرف دھنستی ہوئی محسوس ہوتی۔ دروازے کھڑکیاں پر شور آواز کے ساتھ کھڑکھڑاتے اور لرزتے مکانات زبردست دھچکے کے ساتھ کانپتے اور زمین کا سینہ لرز لرز جاتا دروازوں کی کنڈیاں اس کی دھمک سے کھل جاتیں۔ اور جہاں جہاں بم گرے وہاں تازے کھدے ہوئے کوئیں کی طرح وسیع و عریض گڑھے پڑ گئے۔ اور بعض میں سے تو پانی بھی نیچے سے نکل آیا جس کھیت میں پڑے پورے سے پورے کھیت خشک ہو کر اڑ گئے۔ جہاں بھارتی طیارے گرے۔ بلڈوزر کی طرح دور دور تک کھیتوں کی مٹی کو اکھاڑتے اور درختوں کو جھلستے چلے گئے۔

مضافات کے دیہات میں بم گرے تو شہر کے لوگ انہیں دیکھنے کے لیے گئے ان علاقوں میں امدادی کمیٹی جائزے اور امداد کے لیے بھیجی گئی جہاں بم گرے تھے وہاں دور دور تک ملبہ جلے ہوئے ڈھیر کی طرح پڑا تھا۔ مکانوں کی دیواروں اور چھتوں میں شگاف پڑ گئے گاؤں بھر کے مکانات کی کھڑکیاں اور دروازے اکھڑ گئے تھے۔ درخت اس طرح جل گئے تھے جیسے برسوں سے خشک کھڑے تھے۔ اور یہ ظالمانہ بمباری اہنسا کے پجاری نہتے دیہاتوں کے باشندوں پر کر رہے تھے۔ لیکن ان دیہاتیوں کے حوصلے کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے ہر قسم کی امداد لینے سے صاف انکار کر دیا۔

"آپ ہماری فکر نہ کریں۔ اللہ مالک ہے ہم اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ یہ امداد ہماری طرف سے دفاعی فنڈ میں دے دیجیے۔"

بھارتی بموں سے برباد ہونیوالے خاندانوں کا یہ جواب تھا۔

جب کسی قوم میں یہ جذبہ ابھر آئے تو پھر اسے شکست دینا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو کر اپنی زندگی کو سہارا دیتی ہے۔ مشیت خداوندی بھی اسکی

زندگی کا حق تسلیم کر کے اسے مہلت زندگی عطا کر دیتی ہے۔

ہمارے شہر پر بمباری روزانہ ہی ہوتی رہی۔ ذمہ دار حکام کی اطلاع کے مطابق ان سولہ دنوں میں سرگودھا پر ۵۹ بار ہوائی حملے ہوئے اور ۱۴۸ بم پھینکے گئے۔ جن سے دو دیہاتوں میں ۴۳ انسانی جانیں تلف ہوئیں۔ چند مویشی بھی مر گئے چند کھیت اجڑ گئے چند مکانات تباہ ہو گئے لیکن وہ ہوائی اڈے کی ایک اینٹ بھی اکھاڑ نہ سکے اس کے مقابلے میں دشمن کے کل ۱۱۰ مارے جانے والے طیاروں میں سے صرف سرگودھا میں ہی بیس بائیس تباہ ہوئے۔ یہ بھی صرف ہمارے دفاعی محاذ کی رپورٹ تھی جبکہ سرگودھا کا فضائی محاذ صرف دفاعی مورچہ ہی نہیں تھا بلکہ دشمن کے خلاف فضائی اقدامات کا سب سے بڑا مورچہ بھی یہی تھا۔ پاک فضائیہ کے شاہیں یہاں سے اڑ اڑ کر جاتے تھے اور ان کے ساتھ یونس حسن اور ایم۔ ایم عالم جیسے ہوا باز جاتے تھے۔ انہوں نے ہلواڑہ۔ جودھ پور۔ سری نگر۔ آدم پور۔ انبالہ اور پتہ نہیں کہاں کہاں تاک تاک کر دشمن کے فوجی اڈوں کو نشانہ بنایا۔ اور ان نشانوں کا ہی اثر تھا کہ بھارتی فضائیہ جارحیت چھوڑ کر مدافعتی جنگ پر آ گئی تھی۔ پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہوئے ان کے ہوا بازوں پر رعشہ طاری ہوتا تھا اور وہ صاف صاف ایک شکست خوردہ جنگ لڑ رہے تھے۔ ان میں سے کسی میں بھی فضائی لڑائی کا اب بل بوتا نہیں رہ گیا تھا۔ ان کی دیہاتیوں پر بے تکی بمباری۔ راتوں کے پچھلے پہروں میں آنا۔ ہزاروں فٹ اونچی اڑان اور بیگار کاٹنے والی ذہنیت خود بتاتی تھی کہ اب وہ ہاری ہوئی بازی لڑ رہے تھے۔ اور اب ان کے بازوؤں میں سے جارحیت کا کس بل نکل گیا تھا۔

ہماری فضائیہ نے اللہ کے فضل و کرم کی مدد سے بھارتی فضائیہ کی کمر بالکل ہی توڑ دی۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت فائر بندی کا جھوٹا ڈھونگ رچانے کے بعد بھی فائر بندی کی ساری قسم کی خلاف ورزیاں کرتا رہا لیکن فضائی خلاف ورزی کرنے کی جرأت اس میں مفقود ہو کر رہ گئی اس نے پاکستانی فضائیہ کی زبردست اور غالب یلغار سے بچنے کے لیے ساری خلاف ورزیوں کے باوجود فضا کی خلاف ورزی سے مسلسل اجتناب کیا۔ اس لیے کہ اس میں اسے اپنی عافیت خوب معلوم ہو چکی تھی۔

سرگودھا نے اپنے ہوائی محاذ کی لڑائی میں دشمن کو رسوا کن، دل شکن، تباہ کن، لرزہ خیز اور کمر توڑ شکست دی۔ بھارتی فوج کے ہوا میں اڑنے والے پر ٹوٹ گئے ہیں۔ ہوا میں اڑنے کے لیے اسے ابھی کچھ زیادہ ریاضت کی ضرورت ہوگی۔

پاکستان نے اس لڑائی سے بہت کچھ کمایا۔ بھارت سے چار گنا زیادہ رقبہ دشمن کے گولہ بارود، اسلحہ اور فوجوں کی کئی گنا زیادہ تباہی اور عالمی رائے عامہ کی تائید و ہمدردی۔ عالم اسلام سارا جاگ اٹھا۔ اٹھ کر پاکستان کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ اپنے ذرائع و وسائل کی پیشکش کر دی۔ اپنے سیاسی اور ڈپلومیٹک وزن کو پاکستان کے پلڑے ڈال دیا۔ اس لیے کہ پاکستان عالم اسلام کا دل ہے اسے وہ تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

... ...

اس جنگ میں عالم اسلام دنیا کے نقشہ پر ابھر کر ایشیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یک جہتی، اجتماعیت اور ہمدردانہ برادری کی صورت میں سامنے آیا۔ کون کہتا ہے کہ ہمارے ذرائع کم، افراد تھوڑے، علاقہ قلیل اور ہمارا ملک دنیا کے نقشہ پر ناقابل لحاظ ہے۔ مسلمان ایک برادری کی حیثیت سے ابھی تو بیدار ہو رہے ہیں مسلمان دنیا کے نقشہ پر ایک جوانمرد قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخ ان کو تھوڑے وسائل پر بڑی فتوحات، تھوڑے افراد سے بڑے گروہوں پر غلبہ اور تھوڑی پونجی سے بڑے معرکے ہمیشہ سر کرتے چلے آنے کی گواہی دیتی ہے۔ اور بلاشبہ تاریخ کی یہ گواہی برحق ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی مشیت اپنے تکوینی اشارے سے مسلمانوں کی تاریخ کو اسی راستے پر چلاتی چلی آ رہی ہے۔ کون کہتا ہے کہ ہم کمزور ہیں جبکہ سب سے بڑا طاقتور مالک الملک ہمارے ساتھ ہے۔ کون کہتا ہے کہ ہم چھوٹا سا ملک ہیں جبکہ مالک السموات والارض ہمارا پشت پناہ ہے۔ کون کہتا ہے کہ ہم ہر حال میں صرف امن ہی چاہتے ہیں۔ نہیں امن ہم صرف انصاف کی شرط کے ساتھ چاہتے ہیں اگر انصاف اور خدا خوفی کو چھوڑ کر فساد اور ظلم کا راستہ اختیار کر لیا جائے تو خدا کا وفادار بندہ مسلمان آگے بڑھ کر اس فسادی اور ظالم کا ہاتھ ضرور پکڑے گا۔ اور اس یقین کے ساتھ پکڑے گا کہ وہ پکڑ اس کی اپنی پکڑ نہ ہوگی بلکہ اللہ کی پکڑ ہوگی۔ اور اللہ کی پکڑ بڑی سخت

ہوتی ہے۔ یہی سخت پکڑ جب پاک سرزمین میں پاکستانی ہوا بازوں کے ذریعے بھارتی "دماغوں" پر پڑی، تو یہ سرزمین ان کا مدفن بن گئی۔ آج بھی پاکستان کے دیہاتوں میں بھارتی فضائیہ کے ٹوٹے ہوئے جہازوں کے ٹکڑے ہر جگہ پائے جاتے ہیں جس طرح ان کے جھوٹے دعووں اور وعدوں کے ٹکڑے دنیا کے چوراہے پر بکھرے پڑے ہیں۔ پاکستان اب بھی پہلے کی طرح آباد۔ پر رونق۔ خوش و خرم مصروف اور محفوظ ہے اور دشمن کے عزائم خاک میں مل چکے ہیں۔

... ...

اس جہاد میں پوری ملت اسلامیہ نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند کام کیا۔ حتیٰ کہ تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں نے صدر ایوب خاں سے خود ملاقات کر کے اپنی خدمات پیش کیں۔ ہم یہاں اس جہاد کے بارے میں دو اہم تقاریر پیش کرتے ہیں۔ صدر ایوب خاں نے جنگ کا چیلنج قبول کرتے ہوئے جو ولولہ انگیز تقریر کی اس نے پوری ملت کو متحد کر دیا اس تقریر کا متن درج ذیل ہے۔

آزمائش کا وقت:

عزیز ہم وطنو! السلام علیکم

دس کروڑ پاکستانی عوام کی آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔

بھارتی فوج نے آج علی الصبح مملکتِ پاکستان کی حدود میں لاہور کے محاذ پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے اپنی روایتی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مسافر ٹرین پر بمباری کی جو وزیر آباد ریلوے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ بھارتی حکمران گزشتہ پانچ ماہ کے دوران میں پاکستان کے خلاف جو جارحانہ اقدامات کرتے آئے ہیں یہ تازہ حملہ انہی مجرمانہ سرگرمیوں کی ایک کڑی ہے۔

بھارتی حکمرانوں نے گزشتہ مئی میں خط متارکۂ جنگ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھارتی

حدود میں کرگل کی تین چوکیوں پر قبضہ کر کے اپنے جارحانہ اقدام کی ابتداء کی تھی۔ اقوام متحدہ کی مداخلت پر بھارتی فوجوں نے یہ چوکیاں عارضی طور پر خالی کر دیں اور اگست میں ان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

بھارت نے جارحانہ اقدامات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ٹیٹوال کے علاقے میں ہماری چوکیوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیش قدمی کی۔ اس کے بعد بھارتی فوج اپنی پوری طاقت کیساتھ اوڑی اور پونچھ کے علاقہ میں داخل ہو گئی۔ بھارت خط متارکۂ جنگ کی صریح خلاف ورزی سے بھی مطمئن نہ ہوا۔ بلکہ اس نے پاکستان کے موضع اعوان شریف پر گولہ باری کر دی۔ اب یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ان تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود ہم نے جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ بھارتیوں نے اس کا مطلب غلط سمجھا۔ بالآخر بھارتی جارحیت کو روکنے کے لیے آزاد کشمیر کی افواج کو چھمب کے علاقہ میں داخل ہونا پڑا۔ اب بھارت جنون کے عالم میں اپنی فضائی فوج کو جارحانہ کارروائیوں کے لیے حرکت میں لے آیا ہے۔ اس طرح ایک شدید بحران کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اس وقت تک یہ حقیقت ساری دنیا پر واضح ہو چکی ہے کہ کشمیر میں بھارت کا جارحانہ اقدام دراصل پاکستان پر حملہ کا آغاز تھا۔ بھارت نے قیام پاکستان کے فوری بعد سے اس ملک کے خلاف جن معاندانہ عزائم کی پرورش کی تھی آج اس کا عملی ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان کی آزاد مملکت کو جسے مسلمان اپنے وطن عزیز کے طور پر مستحکم بنانا چاہتے ہیں۔ کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ گذشتہ اٹھارہ سال کے دوران میں ان کی تمام جنگی تیاریوں کا مقصد پاکستان کے خلاف کارروائی رہا ہے۔

بھارتی حکمرانوں نے چینی خطرے کا ہوا کھڑا کر کے ہمارے بعض دوست ممالک سے زبردست فوجی امداد حاصل کی۔ ہمارے یہ مغربی دوست بھارتی حکمرانوں کے اصل مقاصد کو سمجھ ہی نہ سکے۔ انہوں نے بھارت کے ان اعلانات پر یقین کر لیا کہ پوری طرح مسلح ہونے کی صورت میں وہ چینیوں سے جنگ کریں گے۔ یہ بات ہمیشہ ہمارے علم میں رہی کہ یہ اسلحہ ہمارے خلاف استعمال ہوگا۔ وقت نے ہمارے اس اندیشہ کی تصدیق کر دی ہے۔

اب بھارتی حکمرانوں نے کسی رسمی اعلانِ جنگ کے بغیر اپنی روایتی بزدلی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے اپنی فوج کو پاکستان کی مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے۔ ہمارے لیے وقت آ گیا ہے کہ دشمن کو دندان شکن جواب دیں اور بھارتی سامراجیت کو کچل کر رکھ دیں۔

حالات نے دشمن سے مقابلے کے لیے لاہور کے بہادر شہریوں کا سب سے پہلے انتخاب کیا ہے۔ تاریخ ان جوانمردوں کے کارنامے اس عبارت کے ساتھ زندہ رکھے گی کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے دشمن کی تباہی کے لیے آخری ضرب لگائی۔

پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دلوں میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے مقدس کلمات بسے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپوں کے دہانے ہمیشہ کے لیے سرد نہیں ہو جاتے۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ انہوں نے کس بڑی قوم کو چھیڑنے کی جسارت کی ہے۔ پاکستانی عوام جو اپنے عقائد کی سربلندی اور اپنے مقصد کی صداقت پر ایمان کامل رکھتے ہیں اللہ کے نام پر فردِ واحد کی طرح متحد ہو کر دشمن کے خلاف جنگ آزما ہوں گے۔ نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ کی یہ بشارت ہے کہ حق کا ہمیشہ بول بالا ہو گا۔

ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جنگ شروع ہو گئی ہے ہمارے صف شکن سپاہی دشمن کو پسپا کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ پاکستان کی آزاد افواج دشمن کے حملہ کا منہ توڑ جواب دیں گی۔ یہ افواج جو ایک ناقابل شکست جذبہ اور غیر متزلزل ارادے کی مالک ہیں دشمن کو کچل کر رکھ دیں گی حکومت پاکستان پوری طرح تیار ہے۔ اور اس کے تمام وسائل موجودہ صورتحال سے مقابلہ کے لیے وقف ہوں گے۔

بھارتی جارحیت کے خلاف اس جدوجہد میں ہمیں بلاشبہ ان تمام ملکوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل رہے گا جو امن اور آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم نے یہ کارروائی اقوام متحدہ کے منشور کے باب ہفتم کے تحت کی ہے جس میں ہر ملک کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی مدافعت کا حق دیا گیا ہے۔

عزیز ہم وطنو! آزمائش کی اس ساعت میں تمہیں بالکل پرسکون رہنا ہوگا۔ ہم میں سے ہر فرد کو ایک عظیم فریضہ ادا کرنا ہے جس کے لیے عقیدے کی پختگی اور والہانہ سپردگی درکار ہے۔ خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمتِ بے پایاں سے ہمیں کامیابی نصیب کرے گا۔ حق کی فتح ہوگی۔ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ شکست اور تباہی اس باطل کا مقدر ہے جس نے تمہاری سرحد پر سر اٹھایا ہے مردانہ وار آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔

... ...

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ریڈیو پاکستان پر جہاد کے موضوع پر مسلسل پانچ تقاریر کیں۔ ان میں سے ایک اہم تقریر کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔

اسلام کا حصار

برادران اسلام! السلام علیکم

پچھلے ایک مہینے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر جن برکات کا نزول ہوا ہے ان کو آج اس سرزمین کا ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور ہماری زبانیں اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ۶ ستمبر کو جب دشمن نے اپنی کثیر تعداد اور اپنے ساز و سامان کی فراوانی کے زعم میں ہمارے ملک پر حملہ کیا تھا اس وقت وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ ہمارے اوپر کوئی بہت بڑی تباہی اور مصیبت لے کر آرہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل نے اس شر کو ہمارے لیے خیر بنا دیا اور اس ایک ہی جھٹکے سے اس کی رحمت نے ہماری قوم کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ چند روز کے اندر یہاں اتنا بڑا انقلاب رونما ہوا ہے جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ قوم وہ قوم نہیں ہے جو پچھلے اٹھارہ سال سے یہاں رہتی تھی۔ بلکہ ایک نئی قوم نے جنم لیا ہے جس کی رگوں میں زندگی کی حرارت جوش کھا رہی ہے۔

ہماری فوجوں نے اس زمانے میں ان اوصاف کا مظاہرہ کیا ہے جو کبھی قرونِ اولیٰ کے مسلمان فوجیوں کے متعلق ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کا ایک ایک افسر اور سپاہی

جہاد کے جذبے سے سرشار ہے اور شجاعت کا ایک نمونہ بنا ہوا ہے ان کی پلٹنوں نے بریگیڈوں کا مقابلہ کیا ہے اور ان کے بریگیڈوں نے ڈویژنوں کے منہ پھیر دیے ہیں۔ انہوں نے آج قرآن مجید کی اس آیت کو حرف بحرف سچ کر دکھایا ہے کہ "اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور تمہارے سو آدمی ہزار پر غالب ہوں گے۔"

ہماری قوم نے فوج کے ساتھ ایسا بھرپور تعاون کیا ہے جو شاید ہی دنیا کی کوئی قوم اپنی فوج کے ساتھ کرتی ہو۔ آج وہ تمام دیواریں منہدم ہو گئی ہیں جو قوم اور فوج کے درمیان انگریزی دور میں استعماری سیاست کے تحت قائم کی گئی تھیں اور جنہیں پوری طرح ڈھانے کی نوبت اب تک نہ آئی تھی۔ اس چند روز کی جنگ نے ان دیواروں کو ڈھا کر قوم اور فوج کو ایک کر دیا ہے۔ محاذ جنگ پر تنہا فوج ہی نہیں لڑی ہے بلکہ پوری قوم اس کی پشت پر کھڑی ہو گئی ہے اور اس نے ہر ممکن طریقے سے فوج کا ہاتھ بٹایا ہے کوئی حکومت بڑی سے بڑی دولت خرچ کر کے بھی جنگ کے موقع پر وہ تعاون حاصل نہیں کر سکتی جو ہماری عورتوں اور بچوں نے ہمارے شہریوں اور دیہاتیوں نے ہمارے تاجروں اور محنت پیشہ لوگوں نے غرض ہمارے ہر طبقے نے اپنے دل کے جذبے سے خود بخود کسی معاوضہ کے بغیر فوج اور حکومت کے ساتھ تعاون کیا ہے۔

ہمارے عوام کے حوصلے اس زمانے میں اتنے بلند رہے ہیں کہ جو آبادیاں عین محاذ جنگ کے سامنے تھیں ان کے اندر بھی خوف اور بدحواسی کی کوئی کیفیت پیدا نہ ہونے پائی مجھے ان مقامات پر جانے کا موقع ملا ہے جہاں دشمن کے ہوائی جہازوں کی بمباری اور ان کی توپوں کی گولہ باری سے سینکڑوں گھر برباد ہو گئے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی جزع فزع کرتے نہ دیکھا۔ میں ان لوگوں کے پاس بھی گیا ہوں جن کے دیہات براہ راست جنگ کی زد میں آ گئے اور ان کو اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل جانا پڑا ہے ان کے اندر بھی میں نے پست ہمتی کے کوئی آثار نہیں پائے بلکہ ان کی خودداری اور غیرت کا یہ حال ہے کہ وہ اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے اور اپنے بل بوتے پر کھڑے

ہونا چاہتے ہیں۔

ہمارے تاجروں نے اس زمانے میں اس اخلاق کا ثبوت دیا ہے جو شاذو نادر ہی کسی قوم کے تاجر جنگ کی حالت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ یہاں نہ اشیائے ضرورت بازار سے غائب کی گئیں نہ قیمتیں بڑھائی گئیں۔ نہ چور بازاری کو کسی قسم کا فروغ حاصل ہو سکا۔ سارے ملک میں قیمتیں معمول پر رہیں اور لوگوں کو اشیائے ضرورت معمول کے مطابق ملتی رہیں جس سے عوام کا حوصلہ برقرار رہنے میں بڑی مدد ملی۔ یہی نہیں بلکہ ایسی مثالیں بھی بکثرت دیکھی گئی ہیں کہ فوج کے لیے جس چیز کی ضرورت پیش آئی ہے اسے تاجروں نے خود بخود بلا قیمت مہیا کر دیا ہے۔

ہمارے تمام کارکنوں نے خواہ وہ حکومت کے کسی محکمے میں ہوں یا قومی معیشت کے کسی شعبے میں اس موقع پر نہایت تندہی اور پورے جذبۂ جہاد کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے میں کسی تعطیل کے بغیر لگاتار کام کیا ہے۔ اجیروں کی طرح نہیں بلکہ رضاکاروں کی طرح اپنے دل کے جذبے سے محنت کی ہے اور پوری قابلیت جنگ کی کوششوں کو کامیاب بنانے میں صرف کر دی ہے۔ جو شخص جس ڈیوٹی پر تھا خدا کے فضل سے اس نے ایک مزدور کی طرح نہیں بلکہ ایک مجاہد کی طرح کام کیا ہے۔

ہماری قوم کے ہر طبقے نے اس زمانے میں نہایت فراخدلی کے ساتھ حکومت کو دفاعی فنڈ مہیا کیا ہے۔ کوئی حکومت ٹیکس لگا کر اور جبر کر کے وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتی جو قوم نے انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے سے خود اس کی نذر کر دیا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مختصر سی مدت میں پوری قوم کی اخلاقی حالت بدل کر رہ گئی ہے جرائم بہت کم ہو گئے۔ فسق و فجور کا سیلاب رک گیا۔ رجوع الی اللہ پہلے سے بہت بڑھ گیا، مسجدیں نمازیوں سے بھر گئیں تفرقے اور اختلافات مٹ گئے اور پوری قوم تن واحد کی طرح دشمن کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ زبان اور قلم کی طاقتیں جو پہلے کچھ دوسرے ہی کاموں میں لگی ہوئی تھیں یکسوئی کے ساتھ جہاد کے کام میں لگ گئیں۔ عورت، مرد، بچے، بوڑھے، اور جوان سب کے دل میں ایک ہی دھن سما گئی اور وہ تھی جہاد کی دھن۔

یہ سب کچھ سراسر اللہ کا فضل اور اسلام کی برکت ہے اس تجربے سے یہ بات ایک مرتبہ پھر ثابت ہو گئی ہے کہ پاکستان کا بنانے والا بھی اسلام تھا، اس کا بچانے والا بھی اسلام ہے اور اس کو فتح سے ہمکنار کرنے والا بھی اسلام ہی ہے اگر اسلام کا جذبہ نہ ہوتا، اس کا پیدا کیا ہوا ایمان ہمارے دلوں میں نہ ہوتا، اور اس کے بخشے ہوئے اخلاق کی بچی کھچی طاقت ہمارے اندر باقی نہ ہوتی تو نہ ہمارے سپاہی اس بے جگری کے ساتھ اپنے سے کئی گنا فوجی طاقت کے دانت کھٹے کر سکتے تھے اور نہ ہماری قوم اس آزمائش سے بخیر گزر سکتی تھی اب یہ کام ہمارا ہے کہ جو کچھ اس زمانے میں ہم نے حاصل کیا ہے اسے برقرار رکھیں، اس کو کھو نہ دیں۔

ہم کو معلوم ہے کہ ہمارا سابقہ ایک ایسے دشمن سے ہے جس کو قول و قرار سے پھر جانے اور تمام دنیا کے سامنے کیے ہوئے عہد و پیمان کو توڑ ڈالنے میں کوئی باک نہیں، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پاکستان و ہندوستان کی تقسیم اس نے آگ اور خون کی ہولی کھیلے بغیر نہیں ہونے دی تھی۔ اور آج تک وہ اس تقسیم کا غصہ ہندوستان کے بے بس مسلمانوں پر نکال رہا ہے۔ ہم اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ اس کی آبادی، اس کی فوج، اس کے ذرائع و وسائل اور اس کے ہتھیار ہم سے بہت زیادہ ہیں اور ہمارے اور اس کے درمیان کوئی دریا یا پہاڑ نہیں بلکہ کھلے میدان میں تقسیم کی ایک لکیر ہے جسے پار کرکے وہ نہایت دغابازی کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہو گیا ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جس چیز نے اس کے مقابلے میں ہماری حفاظت کی ہے وہ ہماری تعداد اور ہمارے جنگی وسائل نہیں، بلکہ ہمارا یہ ایمان ہمارا خدا اور اس کے دین سے تعلق، اور ہمارا اسلامی اخلاق ہے۔ اب آخر ہم سے بڑھ کر نادان اور کون ہو گا۔ اگر ہم اپنے اسی حصار کو کمزور کر دیں جو ہمیں دشمن سے بچانے والا ہے اور اسی ہتھیار کو کند کر لیں جو ہمیں اس پر غلبہ عطا کرنے والا ہے۔ ہمیں خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے لیے ہر وہ چیز زہر ہلاہل ہے جو خدا اور رسولؐ اور آخرت پر ہمارے ایمان کو کمزور کرنے والی ہو اور جو خدا سے ہمارے تعلق کو ضعف پہنچانے والی ہو اور جو خدا کا خوف ہمارے دلوں سے نکالنے والی اور جو ہمارے اخلاق کو بگاڑنے والی ہو، آج دنیا میں کوئی قوم ایسی

نہیں ہے جو ہم سے بڑھ کر اسلام کی احسان مند اور اس کے فیض کی حاجت مند ہو۔ ہم تو اپنے وجود کے لیے بھی اس کے رہینِ منت ہیں اور ہماری بقا بھی اسی پر منحصر ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور اس ایک مہینے کے دوران میں ہر لمحے اس کا تجربہ ہمیں ہو چکا ہے کہ اسلام ہی وہ طاقت تھی جس کے بل پر ہم دشمنوں کا منہ پھیر دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس لیے اب ہمیں صدقِ دل سے یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ ہم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں گے جو برا وقت آنے پر خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں اور وہ وقت گزر جانے کے بعد اسے بھول جاتے ہیں۔ ہماری سرزمین میں اب کبھی وہ حالت نہ آنی چاہیئے جس میں ہم پچھلے اٹھارہ برس میں مبتلا رہے ہیں، جس میں ہمارے ہاں جرائم روز بروز بڑھ رہے تھے، فسق و فجور ایک سیلاب کی طرح ہماری متاعِ اخلاق کو بہائے جا رہا تھا، حرام خوری کی نجاست ہماری رگ رگ میں سرایت کر رہی تھی اور الحاد اور دہریت کی وبا ہمارے ایمان کو غارت کیے ڈال رہی تھی۔ کیا عجب کہ خدا کی طرف سے یہ ابتلا ہم پر اسی لیے آیا ہو کہ وہ اپنی رحمت سے ہم کو اس حالت پر متنبہ کرنا چاہتا تھا۔ ہم سب کو پوری عاجزی کے ساتھ اس کے حضور توبہ کرنی چاہیئے اور اس سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ ہمیں اپنی اصلاحِ حال کی توفیق عطا فرمائے۔[1]

... ...

ایثار و قربانی کی حیرت انگیز مثالیں

اب ہم اس جہادِ تحفظ پاکستان میں عوام کی طرف سے پیش کردہ ایثار و قربانی کی وہ چند مثالیں پیش کرتے ہیں جو یادگار نوعیت کی ہیں اور جنہوں نے اس جدوجہد کو تاریخی جدوجہد بنا دیا ہے۔ مثالیں تو ہزاروں ہیں، ہم صرف نمونے کے طور پر چند ایک پر اکتفا کر رہے ہیں۔

---

[1] تقریر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مورخہ ۶ اکتوبر ۱۹۶۵ء ریڈیو پاکستان لاہور

ساری پونجی

دشمن سے ملک و ملت کی حفاظت کا مسئلہ تھا اور مسلمانوں پر جوش جہاد کی کیفیت طاری تھی۔ شہر کے ایک بیرونی باغ میں چند لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے ان میں سے ایک شخص نے بتایا کہ میں نے دفاع ملک فنڈ میں صرف انیس روپے دیئے اور یہ انیس روپے میں نے گزشتہ تین ماہ کی روزانہ محنت و مشقت سے اس لیے بچائے تھے کہ اپنی اکلوتی بچی کے لیے کپڑے خریدوں۔ اس شخص کو افسوس اس بات کا تھا کہ وہ دفاعی فنڈ میں صرف انیس روپے ہی دے سکا اس پر دوسرے شخص نے یہ کہہ کر اس کی ڈھارس بندھائی کہ بھائی، تم یہ خیال نہ کرو کہ فلاں شخص نے اتنے ہزار اور اتنے لاکھ روپے دیئے بلکہ یہ سوچو کہ انہوں نے اپنی دولت کا بہت معمولی حصہ فنڈ میں دیا جبکہ تم نے اپنی ساری پونجی ہی دے دی۔

قومی ترانے

ایک مقامی چائے خانے میں بہت سے لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ایک میز کے گرد بیٹھے تین لڑکوں نے بیرے سے کہا "بھئی تم لوگوں نے آج سناٹا کیوں طاری کر رکھا ہے۔ اب تو بڑے عمدہ ریکارڈ بن گئے ہیں۔ جاؤ کوئی عمدہ ریکارڈ لگواؤ"۔ اس پر بیرے نے جواب دیا "جناب ہمارے پاس سب فلمی گانوں کے ریکارڈ ہیں۔ انہیں نہ مالک لگانا پسند کرتا ہے اور نہ لوگ سننا پسند کرتے ہیں۔ البتہ کل قومی ترانوں کے ریکارڈ آجائیں گے تو لگائیں گے"۔

پرانے لوگ

ایک سفید ریش ساٹھ سالہ بزرگ نے ایک نوجوان کو روک کر پوچھا کہ "بھرتی کا دفتر کہاں ہے"؟ بابا تمہیں بھرتی کے دفتر سے کیا کام؟ نوجوان نے پوچھا بابا سینہ تان کر بولا "بھرتی ہونا چاہتا ہوں" یہ جواب سن کر نوجوان مسکرا دیا۔ بابا غصے میں آ گیا۔ اور کہا "بابو ہم

پرانے لوگ ہیں تم جیسے دس نوجوانوں کو پچھاڑنے کی اب بھی ہمت رکھتا ہوں۔ نہیں یقین تو لاؤ ادھر کرو کلائی اگر پنجہ چھڑا لو تو باقی عمر تمہارا پانی بھر کر گزار دوں گا۔" نوجوان نے بابا کے تیور دیکھے تو جلدی سے بھرتی کے دفتر کا راستہ بتلا دیا۔

ایمان افروز مثال

شجاع آباد کے ایک سابق فوجی کو جب دوبارہ طلب کیا گیا تو اس نے روانگی سے قبل اپنی زمین کی تمام آمدنی دفاعی فنڈ میں دے دی۔ اس کے علاوہ اس کو ساٹھ روپے پنشن ملتی تھی وہ بھی اس نے ساری کی ساری اسی فنڈ میں دے دی اور خود خالی جیب لے کر محاذِ جنگ پر روانہ ہو گیا۔

کاش یہ میرا جنازہ ہوتا

میدانِ جنگ سے ایک شہید کا جنازہ اٹھا۔ وہ فضائی جنگ کے دوران اچانک گولی لگنے سے شہید ہو گیا تھا۔ اس شہید کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے پورا شہر اُمڈ آیا تھا۔ ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ وہ جنازے کو قبرستان تک اکیلا ہی کندھا دیتا چلا جائے۔ ایک راہ گیر نے یہ ولولہ انگیز منظر دیکھا تو بے اختیار بول اٹھا: "کاش اس شہید کی جگہ میں ہوتا۔"

صبر و شکر

ہندوستانی بمباری سے ایک گاؤں کے ایک معمر شخص کا مکان تباہ ہو گیا لیکن اس نے نقصانات کا معاوضہ دینے والے سرکاری افسر سے کہا "میرے حصے کی رقم قومی دفاعی فنڈ میں دے دیں۔ میرے خدا کا رزق میرے لیے کافی ہے۔"

... ...

احساسِ دیانتداری

چند دیہاتی کھیتوں میں جا رہے تھے۔ ریلوے لائن کے قریب پہنچے تو ایک دیہاتی کو پٹڑی کے عین درمیان ایک پوٹلی سی گری ہوئی ملی۔ وہ پوٹلی اٹھا کر اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔ پوٹلی میں سولہ سو روپے کے کرنسی نوٹ بندھے ہوئے تھے۔ دیہاتی یہ رقم لے کر اپنے علاقہ کے شہری دفاع کے مرکز میں چلے گئے اور دفتر میں موجود ایک رضا کار سے کہا "بھائی یہ رقم ہمیں پڑی ہوئی ملی ہے اگر کوئی شخص لینے نہ آئے تو پھر اسے قومی دفاعی فنڈ میں جمع کرا دیجئے گا۔"

حجِ اکبر

بنک میں ایک معمر شخص آیا اور قومی دفاعی فنڈ میں کچھ رقم جمع کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ متعلقہ کلرک کے استفسار پر اس نے بتایا کہ یہ رقم میں نے حج کے لیے پائی پائی کر کے جمع کی تھی۔ معلوم نہیں میری قسمت میں حج کرنا لکھا ہے یا نہیں۔ کہیں اس سے پہلے ہی میری آنکھیں بند ہو جائیں۔ اب وطن کی خدمت کر کے ثواب حاصل کرنے کا موقعہ آیا ہے تو میں یہ موقعہ ضائع کرنا نہیں چاہتا۔

رنج

ایک دیہاتی کو خبر ملی کہ اس کے دو فوجی بیٹے محاذِ جنگ پر جا رہے تھے کہ راستے میں دشمن کی گولہ باری سے شہید ہو گئے۔ بوڑھے باپ نے سنا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا "بھائیو! میں اس لیے نہیں رویا کہ میرے بیٹے مارے گئے ہیں۔ بلکہ مجھے رونا اس بات کا آیا کہ انہیں اگلے مورچوں پر دشمن سے جنگ کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔"

... ...

آرزو

جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سنٹر میں ایک ستر سالہ شخص بوڑھا شخص آیا اور زخمی جوانوں کے لیے خون دینے کی پیشکش کی۔ ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ ستر سال سے زائد عمر کے افراد کا خون لینے کی اجازت نہیں ہے لیکن اس نے خون دینے پر بہت زیادہ اصرار کیا۔ لیکن ڈاکٹرز مانے تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے کہا "میرا بوڑھا ہونا کیا جرم ہے۔ میں نے مجاہد فورس کے لیے خدمات پیش کیں تو مجھے ضعیفی کی وجہ سے نہیں لیا گیا۔ اور اب آپ میرا خون بھی قومی دفاع کے لیے لینے سے انکار کرتے ہیں بتائیں میں اپنی قوم کے کس کام آ سکتا ہوں؟"

فخر شہادت

ایک شہید سپاہی کے والد سے جب اس کے بیٹے کی شہادت کے متعلق تاثرات لیے گئے تو اس نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔ بھائی ہم جیسے غریبوں کو بھی خدا نے یہ سعادت نصیب کی کہ ہمارا بیٹا ملک و ملت کے کام آیا۔ مجھے اس پر بجا طور پر فخر ہے۔"

مجاہد کی بیوی

ایک نوجوان خاتون نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ میرا خاوند کس حال میں ہے۔ زندہ ہے یا جام شہادت نوش کر چکا ہے۔ وہ دشمن کی صفوں کو چیر رہا ہے یا شہیدوں کی سرزمین میں داخل ہو چکا ہے۔ بہر حال اگر وہ زندہ ہے تو مجھے خوشی ہے اور اگر شہید ہو گیا ہے تو مجھے فخر ہے۔"

... ...

دودھ نہ بخشوں گی

ایک بوڑھی خاتون کے پاس دفاعی فنڈ میں دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ مگر وہ اسلام اور پاکستان کی حفاظت کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے بے تاب تھی۔ اس نے اپنے جوان بیٹے کو یہ حکم دے کر محاذ پر بھیج دیا کہ جاؤ بیٹا اپنی پاک سرزمین کو کافروں کے حملے سے بچانے کے لیے جہاد میں شامل ہو جاؤ اور یاد رکھو کہ اگر گولی تمہاری پشت میں لگی تو میں تمہیں کبھی اپنا دودھ نہ بخشوں گی۔

موت کی وادی

ایک اخبار نویس نے ایک بہن کو خیر خیریت دریافت کرنے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ ان کے شوہر پاکستان کی بہادر فوج میں ہیں۔ میں نے حوصلہ دلانے کی بات کر دی۔ بس پھر کیا تھا بہن جلال میں آگئیں، فرمانے لگیں! "میرے بھائی کیا تمہیں پتہ نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور ایک مجاہد کی بیوی ہوں! مجھے خدائے واحد پر ایمان کے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین واعتماد ہے کہ جب تک پاکستان کا ایک بھی جیالا مرد زندہ ہے اس کی ماں، بہن، بیٹی یا بیوی کو گھبرانے کی ضرورت نہیں اور اگر مرد باقی نہیں رہیں گے تو ہم بھی اپنی چوڑیاں توڑ کر موت کی وادی تک دشمن کا پیچھا کریں گی۔" اپنی بہن کے یہ الفاظ سن کر میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا اور میرے دل نے کہا جس قوم کی بیٹیاں یہ جذبہ رکھتی ہوں اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

اللہ کے سوا کچھ نہیں

جہاد کے ایام میں ایک طالب علم مجاہدوں کے لیے ضرورت کی اشیاء جمع کر رہا تھا۔ وہ ایک گھر میں داخل ہوا اور اہل خانہ سے کچھ دینے کی اپیل کی۔ اندر سے ایک خاتون نکلیں ان کے ہاتھ میں ایک پرانی قمیص تھی۔ طالب علم نے پوچھا "اور کچھ نہیں دیجئے گا؟"

خاتون نے گردن جھکا لی اور نہایت آہستگی سے بولی "شوہر اور تین بیٹے وطن کی حفاظت کے لیے دے چکی ہوں۔ اب میرے پاس اللہ کے نام کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے حاضر ہے۔"

حق مہر

ایک باعزم خاتون نے اپنا حق مہر مجاہد فنڈ میں دے دیا۔ اس خاتون نے اپنے خاوند سے یہی استدعا کی تھی ایثار پسند خاوند نے بھی قرض لے کر اس کا سارا حق مہر دفاعی فنڈ میں دے کر ادا کر دیا۔

سارا خون نچوڑ لیجئے

بلڈ بنک کے انچارج ڈاکٹر ایک خاتون کا خون لے رہے تھے۔ جب حسب ضرورت خون لے لیا گیا تو آپ نے خاتون کے بازو سے خون کھینچنے والا آلہ اتار کر کہا "شکریہ بہن" اس پر خاتون حیرت زدہ ہو کر کہنے لگی "کیا اتنا ہی خون لینا تھا" "ہاں بہن" ڈاکٹر نے جواب دیا مگر خاتون بستر پر دوبارہ لیٹ گئی اور کہنے لگی "ڈاکٹر صاحب آپ نے تو صرف ایک ہی بوتل خون لیا ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھ میں ابھی کافی خون ہے آپ وطن کے محافظوں کے لیے میرے جسم سے سارا خون نچوڑ لیجئے۔"

گولیوں میں چرخہ

دشمن سے جہاد جاری تھا اور ایک محاذ پر ایک سرحدی گاؤں پر دشمن کی فوجیں عورتوں بچوں اور بوڑھوں پر گولے برسا رہی تھیں۔ لیکن گاؤں والوں میں کسی قسم کا خوف و ہراس موجود نہیں تھا۔ اسی گاؤں کی ایک بزرگ خاتون اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھی بڑے سکون سے چرخہ کات رہی تھی اور گاؤں کے آس پاس توپوں کے گولے گر رہے تھے۔

... ...

بیٹے محاذ پر جاؤ

ملک پر دشمن کی فوجیں حملہ آور تھیں اور سندھ کے ایک گاؤں کی معمر خاتون مسماۃ ملوکن نے کہا "میں اپنے مقدس وطن پر کوئی قیمتی چیز قربان کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میری زندگی کی عزیز ترین متاع، میرا اکلوتا فرزند اللہ بخش ہی ہے۔ میں نے اپنے بیٹے سے کہہ دیا ہے کہ میرے بیٹے محاذ پر جاؤ اور جا کر غازی یا شہید ہو جاؤ۔ میں نے اپنے لختِ جگر کو یہ تلقین بھی کی ہے کہ گولی سینے پر ہی کھانا ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بوڑھی خاتون نے کہا مقدس وطن کی اس سے بڑی خدمت اور کیا ہو گی کہ ہم اس کے لیے کافروں سے نبرد آزما ہوں ان کو ماریں اور خدا کی راہ میں جان دے کر شہید ہوں۔"

مجاہد کی نذر

مظفر آباد کی ایک بیوہ جس کا نام فاطمہ ہے گزشتہ روز جہاد کونسل کے خزانچی کے پاس آئی اور اپنا کل اثاثہ جو ساڑھے ۲۷ تولے چاندی کے زیورات پر مشتمل تھا مجاہد فنڈ میں دے دیا اس بیوہ کے تین بچے ہیں جو خوانچہ لگاتے ہیں اور بمشکل اپنا پیٹ پالتے ہیں بیوہ نے کہا کہ میں وطن کے لیے اپنے بیٹوں کو بھی پیش کرتی ہوں اور اپنی تمام پونجی بھی مجاہدوں کی نذر کرتی ہوں۔

جاؤ تمہارا خدا نگہبان

گھر کی بیوہ مالکہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے اپنی نوجوان لڑکی کو کہا نگہت بھائی کو ہنسی خوشی محاذ پر روانہ کرو۔ نگہت نے بھائی پر بھرپور محبت کی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ سعید تمہارا خدا محافظ، یہ لو اس رومال میں دس روٹیاں اور کچھ سالن ہے۔ سعید چلنے لگا تو ماں نے کہا" دیکھو بیٹا مسلمانوں کے نام کی لاج رکھنا۔ بے مجھے

اللہ تعالیٰ کے روبرو اس بات پر شرمندہ نہ ہونا پڑے کہ میرے اکلوتے بیٹے نے کفر و اسلام کی جنگ میں اپنی قوم کا ساتھ نہ دیا۔ خدا حافظ بیٹے جاؤ تمہارا اللہ تعالیٰ نگہبان ہو۔

فتح کا مژدہ

دشمن کے خلاف محاذ پر لڑنے والا ایک مجاہد چند لمحوں کے لیے اپنے گھر واپس آیا وہ ابھی کمرے میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ اندر سے اس کی بہن تیزی سے نکلی اور اس کا راستہ روک کر کہنے لگی بھیا! کامیابی کا پیغام لے کر آئے ہو تو اندر آ جاؤ۔ ورنہ یہیں سے پلٹ جاؤ۔ اور فتح حاصل کرنے کے لیے زندگی کے آخری سانس تک دشمن سے لڑو" مجاہد نے اپنی بہن کو فتح کا مژدہ سنایا تو وہ بھائی سے لپٹ گئی اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔

بیوہ عورت

ایک عمر خاتون بازار میں سے گزر رہی تھیں۔ راستے میں ایک جگہ ہجوم دیکھ کر خاتون نے پوچھا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟" ایک نوجوان نے کہا کہ رضا کار قومی دفاعی فنڈ کے لیے چندہ جمع کر رہے ہیں عمر خاتون نے ایک لمحہ سوچا اور ہاتھ کی طلائی چوڑیاں اتار کر قومی دفاعی فنڈ میں دے دیں۔ ایک صاحب نے خاتون کا نام پوچھا تو وہ کہنے لگی "بیٹا ایک بیوہ عورت لکھ لو۔"

حسرتِ ایثار

جڑانوالہ کے چک ۲۲۸ گ ب میں چند رضا کار قومی دفاعی فنڈ کے لیے رقم جمع کرنے والوں کا راستہ گاؤں کی ایک انتہائی غریب بڑھیا نے روک لیا اور بیس سیر گندم دیتے ہوئے کہا "یہ میری طرف سے قبول کرو۔" رضا کاروں نے بڑھیا کی غربت اور ناداری کے پیشِ نظر گندم

لینے سے انکار کیا تو وہ رو پڑی، اس نے حسرت سے کہا "کیا میں اتنی بدقسمت ہوں کہ میری محنت کی کمائی سے خدا کے نام پر بھی کچھ قبول نہیں کیا جاتا؟"

پُرعزم بیٹا

جنگ کے دنوں میں نوجوان نعیر کو اس کی ماں کی طرف سے لاہور چھوڑ دینے کے لیے پہلے خط اور پھر تار موصول ہوا۔ نعیر نے اپنی ماں کو جواب لکھا:

"پیاری امی جان اس وقت اہل لاہور اپنے دلیر پاسبانوں کے ساتھ ایک اَن کہے معاہدے کے پابند ہیں "ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے"۔ ان حالات میں میں کس طرح لاہور چھوڑ سکتا ہوں! کل کا مورخ ہمارے بارے میں کیا لکھے گا؟ ــــ آپ ہمارے اور ہمارے پاسبانوں کے حق میں صرف دعا کرتی رہیں "اب تو ہم ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے" اور فتح کے بعد جب اس معاہدے کی تکمیل ہو جائے گی تو آکر آپ کے قدم چومیں گے جن کے نیچے جنت ہے۔"

مجاہد بچہ

بلڈ بنک میں ایک پانچسالہ بچہ اقبال بھی خون دینے آیا۔ ڈاکٹروں نے کہا "بیٹے تم چھوٹے ہو۔ بڑے ہو کر خون دینا" اقبال نے بڑے بھولپن سے کہا "چند قطرے ہی لے لیں" اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی تو وہ بے اختیار ہو کر رونے لگا کہ امی ماریں گی۔ اس کی ضد پوری کرنے کے لیے ڈاکٹروں نے اسے پلنگ پر لٹایا۔ اس کے بازو میں ہلکے سے سرنج کی سوئی چبھوئی اور اسے یہ تاثر دیا کہ اس کا خون لے لیا گیا ہے۔ ننھا اقبال خون دیکر بہت خوش ہوا۔

موت کا ڈر

جنگ زوروں پر تھی اور دشمن کے ہوائی جہاز روزانہ بم برسانے تھے۔ لاہور سخت

خطرے میں تھا۔ اپنی بارہ سالہ بچی سے اس کے والد نے کہا "بیٹی لاہور میں بہت خطرہ ہے چلو تمہیں کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ آؤں" بچی نے باپ کے منہ سے یہ فقرہ سن کر کہا۔ "ابو آپ خود ہی تو کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو موت سے نہیں ڈرنا چاہیئے"

سعادت

قومی جذبے سے سرشار ہو کر ایک لڑکا قومی بلڈ بنک میں خون دینے آیا۔ ڈاکٹروں نے وزن کیا تو وہ چار پاؤنڈ کم نکلا۔ لڑکا بہت مایوس ہوا اور چپ چاپ وہاں سے نکل آیا۔ دوسرے روز وہ پھر خون دینے آیا اور نام درج کرا کے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اس بار اس کا وزن کیا تو وہ پورا نکلا۔

خون دینے کے بعد اس نے اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں سے ایک ایک سیر کے دو بٹے نکالے اور انہیں زمین پر رکھتے ہوئے بڑے فخر سے بولا "معاف کیجئے میں مجاہدین کے لیے خون دینے کی سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا"

امی اور خون

زخمی مجاہدین کے لیے خون جمع کرنے والے مرکز میں ایک چھوٹا سا بچہ آیا اور مجاہدین کے لیے خون دینے کی خواہش ظاہر کی وہ بہت دور سے چل کر آیا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ بیٹے ہم چھوٹے بچوں کا خون نہیں لیتے۔ بچے نے یہ سنا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ڈاکٹروں نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا کہ آپ نے میرا خون نہ لیا تو میری امی ناراض ہوں گی۔ انہوں نے ساڑھے چار آنے بس کا کرایہ دے کر مجھے خون دینے کے لیے ہی بھیجا ہے۔ خدا کے لیے میرا خون ضرور لیجئے۔ ورنہ میں اپنی امی کو کیا منہ دکھاؤں گا"

ابو کی فتح

شہر کے ایک گھرانے کی چھ سالہ بچی ثمینہ اپنی دادی اماں کے ہمراہ ظہر کی نماز

پڑھ کر فارغ ہوئی تو اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے وہ آنکھیں بند کیے کافی دیر تک منہ ہی منہ میں کچھ کہتی رہی۔ گھر والوں نے پوچھا ثمینہ تم نے کیا دعا مانگی ہے۔ ننھی نے بڑے بھولپن سے جواب دیا میں نے اللہ میاں سے کہا ہے! کہ میرے ابو اور ان کے ساتھیوں کو کامیاب کرے۔ ثمینہ کے والد ملک کی فوج میں افسر تھے اور دشمن کے خلاف ایک محاذ پر لڑ رہے تھے۔

جہاد کی فیس

دور دراز کے ایک گاؤں کے سکول میں جہاد کے لیے چندہ جمع ہو رہا تھا۔ لوگ حتی المقدور اس کار خیر میں حصے رہے تھے اور جو کچھ بھی ان کے پاس تھا وہ دے رہے تھے ایک طالب علم کلاس روم میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور خاموشی سے اپنی فیس کے پانچ روپے جہاد فنڈ میں جمع کرا دیئے۔

خانہ خدا کا محافظ

جس روز ہڈیارہ پر بھارتی فوجوں نے حملہ کیا اس وقت ہڈیارہ کی ایک مسجد کے امام نماز فجر پڑھ کر فارغ ہوئے تھے کہ انہیں بھارتی فوجوں کے حملے کی اطلاع ملی۔ یہ گاؤں خالی کرایا جا رہا تھا کہ امام مسجد سے بھی لوگوں نے یہاں سے نکل جانے کو کہا لیکن اسی سالہ امام مسجد نے بڑی جرأت سے جواب دیا کہ میری زندگی تو اسی مسجد سے وابستہ ہے میں خانہ خدا کو کیسے چھوڑ دوں اتنے میں بھارتی فوجی مسجد میں داخل ہوئے۔ امام صاحب نے زوردار آواز میں کہا کہ جوتی اتار کر مسجد میں آؤ بھارتی فوجی نے پستول نکالا اور کہا کہ پاکستانی فوج کی نشاندہی کر دو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا یہ بوڑھا جوانمرد مسکرایا اور بھارتی فوجی کے روبرو کلمہ شہادت بلند کیا اس نے آناً فاناً تین فائر کر کے اس مجاہد کو شہید کر ڈالا اس وقت بھی اس مرد خدا کے لبوں پر کلمہ شہادت جاری تھا۔

... ...

خدا کا کھاتہ

لاہور کی ایک دوا ساز فیکٹری کو کسی فوجی افسر کا ٹیلی فون آیا۔ فوجی افسر نے چند ادویات کے نام لے کر کہا "براہ کرم ان کے نرخ بھجوا دیجئے۔" فرم کے مینجنگ ڈائریکٹر نے پوچھا۔ "آپ کو یہ ادویات کتنی مقدار میں چاہئیں۔" فوجی افسر نے مقدار بتائی تو انہیں کہا گیا۔ "ہم اس مقدار سے دوگنی ادویات بھجوائے دیتے ہیں۔ انہیں ہماری فرم کی طرف سے مجاہدین کے لیے عطیہ سمجھئے۔ ان کا بل ہم اپنی قوم اور خدا کے کھاتے میں لکھ دیں گے آپ بے فکر رہیں۔"

کارِ خیر

دو فوجی افسر اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ خون دینے آئے۔ بلڈ بنک کے ڈاکٹروں نے کہا۔ "آپ کے لیے ساری قوم حاضر ہے۔ آپ کیوں خون دیتے ہیں؟" یہ سن کر دونوں آفیسر مسکرائے اور کہنے لگے "کیا ہم اس کارِ خیر میں حصہ نہیں لے سکتے جو قوم نے شروع کر رکھا ہے۔" یہ سن کر ڈاکٹر لاجواب ہو گئے۔

خون لینے کی باری آئی تو وہ جلدی سے آگے بڑھے اور کہنے لگے "پہلے ہمارا خون لیجئے ہمیں اپنے مقام پر بہت جلدی پہنچنا ہے۔"

سینہ سپر

پاکستانی فوج کے ایک افسر نے ایک صحافی سے کہا۔ "آپ اس پاکستانی جوان کی تصویر شائع کریں جس نے میدان جنگ میں پیٹھ پر گولی کھائی ہو۔" یہ فقرہ سن کر صحافی نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ اسے یوں حیران دیکھ کر وہ مسکرائے اور بڑے اعتماد سے بولے۔ "انشاءاللہ آپ کو کوئی بھی ایسا سپاہی نہیں ملے گا۔ ہمارے جوان اور افسر سینے پہ وار سہنے کے عادی ہیں۔"

اپنی ہی نیکی

دشمن کے حملہ سے ایک روز پہلے دو فوجی افسر بلڈ بنک میں خون کا عطیہ دینے گئے۔ انہیں کہا گیا، آپ وطن کی حفاظت کریں خون دینے کے لیے ساری قوم موجود ہے لیکن وہ نہ ماننے بضد ہو کر خون دے گئے دوسری صبح محاذ پر دشمن کی فوجوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ان میں سے ایک افسر زخمی ہو گئے۔ ہسپتال میں انہیں خون کی جو بوتل دی گئی وہ ان کا اپنا خون ہی تھا۔

یہ ہے وہ بے مثال جذبہ جو ملک کے گوشے گوشے میں ہر جگہ ملک و ملت اور اسلام کے لیے فدائیت محبت اور قربانی کی صورت میں پیدا ہو گیا تھا اور زندگی کا ہر شعبہ ایک دوسرے سے بڑھ کر درخشاں اور تابندہ ہو گیا تھا۔

... ...

سرحد پر دشمن کا پہلا نشانہ بننے والے لوگ

اب ہم ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو ملک کے بارڈر پر آباد تھے اور دشمن نے یکایک بلا اعلان حملہ آور ہو کر ان نہتے پُرامن اور غیر مسلح لوگوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔

ایسے ہزاروں واقعات ہیں کہ شدید ظلم و تشدد کے باوجود کسی ایک شخص نے بھی ملک کے راز کی کوئی بات بتانے سے انکار کر دیا اور جب انہیں برباد کر کے ان کے مکانات گرا دیئے گئے۔ مویشی چھین لیے گئے۔ ان کے بچے ان کے سامنے قتل کر دیے گئے تو انہوں نے آہ و زاری تو الگ رہی کمزوری کا ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نکالنے سے انکار کر دیا جب انہیں مہاجر بنا کر اور ہر شے چھین کر اندرون ملک دھکیل دیا گیا تو ان میں سے کسی ایک فرد نے بھی اپنے اجڑنے، مکان گرنے یا بے آسرا ہونے کے سبب کسی شخص سے کوئی امداد لینا بھی پسند نہ کیا اور بیشتر اپنے عزیز و اقرباء کے پاس چلے گئے۔ ان کے سبب سے بھیک

مانگنے والوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ جرأت، بہادری، خودداری اور صبر و استقامت کی نہایت بلند مثال سرحد سے ابھر اور اجڑ کر آنے والوں نے ملک کے ہر گوشے میں پیش کی ہم ہزاروں میں سے چند ایک مثالیں پیش کرتے ہیں۔

میرے سینے پر گولی چلاؤ

ایک بوڑھے زمیندار پر رائفل کے کندے مارنے سے بہتر ہے کہ اس کے سینے پر گولی چلاؤ۔ اگر اس طرح تمہاری جوانمردی میں اضافہ ہو سکتا ہے تو اپنا شوق پورا کر لو"۔ یہ الفاظ سیالکوٹ سیکٹر کے ایک گاؤں سلیمان کے بوڑھے زمیندار محمد دین نے ان بھارتی جوانوں سے کہے جو سات اور آٹھ ستمبر کی درمیانی شب چوروں کی طرح اس کے گاؤں میں گھس آئے تھے اور اپنی فتحیابی کا جشن بوڑھوں، عورتوں اور بچوں پر رائفل سے گولیاں چلا چلا کر منا رہے تھے جب کہ ان کی آنکھوں میں انسانیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔

ساٹھ سالہ محمد دین پنجاب کے ایک مہاجر کیمپ میں جب یہ تفصیل سنا رہا تھا تو اس کا سر درد اور شدید تکلیف سے خم تھا۔ لیکن اس کی آواز میں عزم و ہمت کی وہ جھلک تھی جو پنجاب کے جیالے کسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

محمد دین نے بتایا کہ بھارتی فوجیوں نے اس کے گاؤں پر اتنا اچانک حملہ کیا کہ بہت سے لوگوں کو گھروں سے نکلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ جب انہوں نے باہر دیکھا تو ہر طرف بھارتی فوجی اور ٹینک نظر آ رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور بارود کی بدبو فضا میں رچ کر رہ گئی تھی۔

وہ اپنے مٹی کے بنے ہوئے گھر سے نکلا اور بھاگ کر کماد میں چھپ گیا۔ دو دن اور دو راتیں اس نے اس کھیت میں بھوکے پیاسے گزار دیں جس کے بعد اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ چپکے سے گاؤں میں داخل ہوا اور اس گھر میں گیا، جہاں اس نے زندگی کا بڑا حصہ گزارا تھا۔ مکان بھارتی ٹینکوں کی گولہ باری سے تباہ ہو چکا تھا۔ صرف ایک کوٹھڑی سلامت تھی جہاں تلاش کرنے پر اسے دو سوکھی روٹیاں مل گئیں۔ یہ روٹیاں اس نے اپنی جیب

میں ڈالیں اور دوبارہ کھیتوں میں گھس گیا۔

تمام گاؤں پر قبرستان کا سا سکوت تھا۔ جنہیں بھاگنے کا موقعہ ملا۔ وہ بھاگ گئے۔ باقی افراد بھارتی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ گلیوں میں جا بجا لاشیں پڑی ہوئی تھیں یہ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ اس نے زندگی کا خاصا بڑا حصہ گزارا تھا۔ اور جو اس کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔

محمد دین کھیتوں میں چھپتا چھپاتا ایک اور گاؤں میں پہنچا جہاں کوئی آبادی نہ تھی۔ بھارتی فوجی یہاں بھی ایک روز قبل اپنا جشن منا چکے تھے، وہ آنسو بہاتا دوبارہ کھیتوں میں گھس گیا۔ جہاں اسے بوڑھا شیرو ملا۔ شیرو بڑھئی تھا اور اس سے محمد دین نے ایک مرتبہ اپنا ہل بنوایا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملے اور پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ ایک ایسا سفر جہاں قدم قدم پر موت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ اور کوئی نہ جانتا تھا کہ آئندہ لمحے کیا ہو گا!

دونوں بوڑھے ابھی مشکل سے ڈیڑھ میل گئے ہوں گے کہ بھارتی فوجیوں نے انہیں گھیر لیا۔ یہ فوجی سکھ تھے۔ انہوں نے رائفلیں دونوں کے سینوں پر رکھ دیں۔ سکھ فوجی نے ان کے نام پوچھے اور پھر ان کی تلاشی لی۔ بوڑھے زمیندار کی جیب سے جب دو سوکھی روٹیاں نکلیں تو سکھ فوجی نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور جنوب کی طرف اشارہ کیا کہ" بابا ادھر نکل جاؤ"۔ بابا محمد دین نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا میرا خیال ہے کہ وہ سکھ ضرور کسی کسان کا بیٹا ہو گا۔ جبھی تو اس نے گندم کی روٹی دیکھ کر ہمیں چھوڑ دیا"۔ ابھی چند قدم گئے تھے۔ کہ یکایک گولیوں کی باڑھ چلی۔ وہ دونوں جلدی سے زمین پر لیٹ گئے۔ چند لمحوں بعد بھارتی فوجی ان کے سروں پر تھے۔

یہاں بھی تلاشی لی گئی۔ اور ان فوجیوں نے بھی گندم کی وہ دو سوکھی روٹیاں دیکھیں لیکن اس مرتبہ وہ روٹیاں کسی کے دل میں رحم نہ ڈال سکیں۔ دونوں بوڑھوں کو زمین پر سینے کے بل لیٹنے کا حکم ملا اور پھر ان پر رائفل کے کندوں سے ضربیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ محمد دین یہ تکلیف برداشت نہ کر سکا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور

کلمہ شہادت پڑھا۔ اپنے سینے کو ننگا کیا۔ یہی وہ موقع تھا جب اس کے اندر "کا کسان" جاگ اٹھا۔ اس نے کہا کہ بوڑھے کو اس طرح مار کر تم کوئی جوانمردی نہیں کر رہے ہو۔ میرے سینے پر گولی چلاؤ اور دیکھو کہ ایک بوڑھا کس طرح مر سکتا ہے!

بھارتی فوجی بوڑھے کسان کی جرأت پر حیران رہ گئے۔ رائفل کے کندوں کی ضربات تھم گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں کو کرنیل کے پاس لے گئے۔ کرنل نے انہیں ڈانٹ کر اپنے پاس بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے انہیں قریبی کنوئیں سے پانی پینے کی اجازت دے دی۔ پانی کے چند گھونٹوں نے ان میں جان ڈال دی۔

دونوں بوڑھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وہاں بٹھائے گئے اور پھر اس "کرنیل" نے انہیں بھاگ جانے کا حکم دیا۔ جب وہ دونوں گھبرا کر کھڑے ہوئے تو اس نے کہا۔ "سڑک پر مت جانا۔ کھیتوں کھیتوں جاؤ۔ اگر بچ کر نکل جاؤ تو تمہاری قسمت!

دونوں بھاگ کر کھیتوں میں گھس گئے۔ وہ دن بھر کھیتوں میں چھپے رہتے اور رات کو سفر کرتے۔ تین دن بعد وہ محفوظ مقام پر تھے۔ ان کے سامنے پاکستان کے فوجی جوان تھے جہاں انہیں بسکٹ اور چائے دی گئی۔

محمد دین اب مہاجر کیمپ میں ہے۔ اس کے لہلہاتے کھیت گندم سے بھرا ہوا چوبارہ اس کے دوست اس کے شناسا اب اس کے آس پاس نہیں۔ بہت سے ساتھی اور عزیز بھارتی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ بھارتی فوجیوں نے اس سے سب کچھ چھین لیا لیکن ایک چیز نہ چھین سکے وہ اس کا عزم ہے۔ وہ آج بھی اس دن کا منتظر ہے۔ جب اسے یہ اجازت ملے کہ وہ اپنے گاؤں میں جائے اور دوبارہ ان کھیتوں پر ہل چلائے جو اس کے اپنے ہیں۔ اسے یقین ہے وہ دن جلد آئے گا۔ وہ دوبارہ سرحد پر اپنے اجڑے ہوئے گاؤں کو آباد کرنے پر آمادہ ہے۔ ... ...

چونڈہ کی ساٹھ سالہ مجاہدہ

بھارتی فضائیہ کے طیارے زبردست بمباری کر رہے تھے۔ ایک بم ایک آٹا پیسنے والی

چھل پر گرا اور اس کو آگ لگ گئی۔ یہاں کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی قریب ہی تیل کا ایک سٹاک تھا۔ آگ اس پہ پہنچنے کے بعد پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔ اس اثنا میں ایک بوڑھی خاتون نظر آئی۔ یہ نہایت تیزی سے تیل کے سٹاک کے قریب پہنچی اور بڑی تیزی سے تیل کو ڈرموں سے نکال کر ایک جوہڑ میں پھینکنے لگی۔

یہ واقعہ چونڈہ کا ہے اور یہ خاتون ساٹھ سالہ کرم بی بی تھی اس خاتون کی جرأت، جواں ہمتی اور سوجھ بوجھ سے پوری بستی نذر آتش ہونے سے بچ گئی۔

چونڈہ پر بھارتی فضائیہ کے طیاروں نے زبردست بمباری کی ایک بم کرم بی بی کے قریب آٹا پیسنے والی ایک چکی پر آکر گرا اور اسے آگ لگ گئی۔ عمر رسیدہ کرم بی بی کو معلوم تھا کہ چکی کے قریب تیل کے ڈرموں کا سٹاک ہے۔ اگر آگ ان ڈرموں تک پہنچ گئی تو اس سے ساری بستی جل کر راکھ ہو جائے گی۔ وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ چکی کے قریب پہنچی اور ڈرموں سے تیل نکال نکال کر ایک جوہڑ میں پھینک آئی اور بستی کو آگ لگنے اور تباہ ہونے سے بچا لیا۔

... ...

چند واقعات

رحمت بی بی نے بتایا کہ علی الصبح دو بھارتی فوجی میرے گھر کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور میرے خاوند سے پوچھنے لگے کہ پاکستان کی فوج کے مورچے کہاں ہیں۔ جب اس نے یہ بتانے سے انکار کر دیا تو دونوں فوجیوں نے میرے خاوند کو سنگین مار مار کر شہید کر دیا۔

سیالکوٹ کے سرحدی گاؤں چاردہ کی خاتون رحمت بی بی یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنے شوہر کی شہادت کا غم نہیں۔ وہ تو اللہ کی راہ میں شہید ہوا ہے۔ اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔ اب میں اپنے بچوں کی پرورش کرونگی

تاکہ وہ جوان ہو کر نہ صرف مادرِ وطن کی حفاظت کریں بلکہ بھارتی درندوں سے انتقام بھی لے سکیں۔

حسین بخش نے بتایا کہ بھارتی فوجیوں نے اس کے گاؤں میں داخل ہونے کے بعد تمام نوجوانوں کو پکڑ لیا جن میں میرا جڑواں بھائی بھی شامل تھا۔ ان کے ہاتھ تاروں سے باندھ دیئے گئے اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ اس کے بعد بھارتی فوجیوں نے ان سب کو گاؤں کے چوک میں کھڑا کر کے گولی کا نشانہ بنا دیا۔

ان درندوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ نوجوانوں کی لاشوں کو پیروں سے روندا۔ تھوڑی دیر کے بعد فوجیوں کے قہقہے بلند ہوتے۔ جیسے انہوں نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ کماد کے کھیت میں چھپ کر یہ دردناک منظر دیکھ رہا تھا بھارتی فوج نہتے لوگوں کو قتل کرنے کے بعد گھروں میں گھس گئی تاکہ بچے کھچے دیہاتیوں کا بھی صفایا کر سکے۔

اب مجھے کسی بات کا افسوس ہے تو صرف یہ کہ میں اللہ کی راہ میں قربان ہونے کی سعادت سے محروم رہا جبکہ میرا بھائی یہ سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

... ...

نعرۂ تکبیر

تحصیل پسرور کا موضع کنگرے سرحد سے صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے سات ستمبر کی شب کو اس گاؤں کے باشندوں کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ صبح کے وقت ان پر قیامت ٹوٹنے والی ہے، اور انہیں ایک ایسے معرکہ سے نبرد آزما ہونا پڑے گا جس میں بہت مصائب پوشیدہ تھے۔ آٹھ ستمبر کو گاؤں کے تمام لوگ نمازِ فجر ادا کر رہے تھے۔ گاؤں کی عورتیں گھر کے معمول کے مطابق کام کاج میں مصروف تھیں اور بچے میٹھی نیند سو رہے تھے۔ بعض اصحاب نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد مسجد سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک ایک قریبی گاؤں کا ایک شخص بھاگتا اور ہانپتا آیا۔ اس نے مسجد میں جمع لوگوں کو بتایا کہ بھارت کے مرہٹہ اور

ڈوگرہ فوجیوں کی بھاری تعداد نے موضع لنگڑے کو گھیرے میں لے لیا ہے اور اب وہ گاؤں میں داخل ہوا ہی چاہتے ہیں۔ وقتی طور پر مسجد میں موجود اصحاب قدرے پریشان ہوئے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور مسجد کے امام صاحب نے وہیں پر لوگوں کو جنگِ بدر کا واقعہ مختصراً سنا دیا اور اس گاؤں کے تمام لوگوں نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس موقعہ پر مسجد میں اس گاؤں کا ایک جیالا امانت علی شاہ بھی موجود تھا۔ وہ فوراً ہی گاؤں میں گیا اور اس نے تمام عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ایک محفوظ راستے سے پسرور کی جانب روانہ کر دیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے پسرور پہنچنے کی کوشش کریں۔ امانت علی شاہ عورتوں اور بچوں کے متعلق مطمئن ہونے کے بعد واپس مسجد میں آ گیا۔ تمام لوگ آکر وہیں جمع ہو گئے تھے اور انہوں نے لاٹھیاں، برچھیاں، کلہاڑیاں اور جو بھی اسلحہ ملا جمع کر رکھا تھا۔ ابھی وہ دشمن کے مقابلہ کے لیے مشورے ہی کر رہے تھے کہ اچانک مشرق کی جانب سے بھارتی فوج کا ایک دستہ وہاں آ گیا۔ بھارتی حملہ آوروں نے گاؤں کے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا اور ایک مرہٹے افسر نے امام مسجد اور دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر انہیں کہا کہ وہ فوری طور پر گولی کا نشانہ بنا دیا جائیں گے لیکن اگر وہ "رام رام" اور "جے ہند" کہیں تو ان کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔ مرہٹے کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی خاتم المرسلینؐ کے شیدائیوں کے چہرے غصہ اور جوش سے سُرخ ہو گئے۔ انہوں نے فوراً نعرۂ تکبیر بلند کیا اور سید امانت علی شاہ نے آگے بڑھ کر ایک ہی وار سے ملعون مرہٹے کو جہنم واصل کر دیا۔

بھارتی فوجی اس صورتِ حال پر مشتعل ہو گئے لیکن گاؤں والے بھی ان کے سامنے نہ جھکے اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر بدستور نعرۂ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کرتے رہے اسی موقعہ پر ایک ڈوگرہ افسر آگے بڑھا اور اس نے دوبارہ گاؤں والوں کو "رام رام" اور "جے ہند" کہنے کو کہا تو امانت علی شاہ نے اس ڈوگرے کے منہ پر تھپڑ مارا اور اس ملعون نے فوراً ہی گولی مار کر اسلام کے اس جیالے فرزند کو شہید کر دیا۔ آخری لمحوں تک امانت علی شاہ کے لبوں پر کلمۂ توحید تھا۔ اور وہاں پر موجود گاؤں کے دوسرے لوگ بھی خوفزدہ

ہوئے بغیر نعرۂ تکبیر بلند کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھی مسلح دشمن کے سامنے نہ جھکا۔

بزدل دشمن

دشمن بزدل ہے اس کی بزدلی اور کمینگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے پچھلے پہر رات کی تاریکی میں ہم پر توپوں اور ٹینکوں سے حملہ کیا۔ وہ چپکے سے ہمارے سرحدی دیہات پر حملہ آور ہوئے مگر ہمارے جانبازوں کے ہاتھوں اپنے ساتھیوں کی لاشیں اور اسلحہ میدانِ جنگ ہی میں چھوڑ کر انہیں پسپا ہونا پڑا۔ اگر بھارتی سورما دن کے وقت ہم پر حملہ آور ہوتے تو ملک کی شیر دل افواج سے پنجہ آزما ہونے سے پیشتر ہی پاکستان کے دیہات کا ہر فرد ان کا منہ توڑ جواب دے سکتا تھا۔

... ...

علم و ادب اور شعراء کرام کا جہاد

پاکستان کے جس ادب پر ترقی پسند سُرخ رنگ تھوپے ہوئے تھا۔ جہاد کا اعلان ہوتے ہی ایسے ایسے اشعار اور ادب پارے تخلیق ہوئے جو حب الوطنی اور اسلام دوستی کی درخشاں مثالیں بن گئے۔ ہم یہاں چند نمونے اشعار کے پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے اپنے ہوا بازوں کو ان الفاظ میں خطاب کیا:

پروفیسر غلام جیلانی اصغر

مری فضاؤں کے پاسدارو
فرازِ گردوں کے شاہسوارو
میرے سپوتو میرے جیالو
تمہاری زد میں ہیں ماہ و انجم

فرازِ کوہ و کمر سے نکلو۔
عروج بامِ فلک سے اترو
سمٹ کے جھپٹو! جھپٹ کے سمٹو
ہر ایک جانب سے موت بن کر
عدو سے لپٹو

مرے شفق کے حسیں شگوفے
مرے افق کی جبیں کے تارے
لہو میں گل رنگ ہو گئے ہیں
فضائے صبحِ وطن کا پہلو
کئی ستاروں سے بھر گیا ہے
گرج رہی ہیں ہماری توپیں
عدو کا چہرا اتر گیا ہے

فضا میں دیکھو جہاز ابھرا
ذرا ذرا سا وہ سہما سہما
خود اپنی آواز سے ہراساں
ادھر سے نکلے ادھر سے جھپٹے
فضائے ملت کے سب نگہبان
کہیں بھی راہِ مفر نہیں ہے
مرے سپوتوں نے باندھ دی ہیں
فضا میں آہن کی اب حصاریں

کہاں سے نکلو گے سورماؤ
یہاں سے کوئی مفر نہیں ہے

لہو کی اک جھیل آسماں پر کراں سے تا بہ کراں نظر میں
بھڑکتے شعلے لپک پڑے ہیں ہر ایک گوشہ سے بام و در سے
ستارے اپنی سناں سنبھالے بڑھے کہ دشمن کو نوچ ڈالیں
وہ ایک جلتا ہوا سا شعلہ زمین کی جانب لڑھک گیا ہے

فضا میں اب کوئی خم نہیں ہے
جو تیرگی تھی وہ چھٹ گئی ہے
جو سوچ خوں تھی پلٹ گئی ہے

دبے دبے چور آ گیا تھا
کہ میری صبحِ وطن کی سرخی میں زہر گھولے
میری عروسِ وطن کی افشاں کے سارے تاروں کو نوچ ڈالے
میرے تبسم نواز ہونٹوں کی مسکراہٹ کو بیچ ڈالے
میرے چمن کے دمیدہ غنچوں کو روند ڈالے
میری صبیح چہروں کے چاند لے کر
خود اپنی نفرت کی تیرگی سے گہن لگا دے
میرے جواں کھیت بیچ ڈالے میری زمیں کا سہاگ لے کر
میرے مصور کا نقش لے کر میرے مغنی کا راگ لے کر
میرے تخیل کا رنگ لے کر میرے تصور کی آگ لے کر
انہیں بجھا دے!

میری مقدس زمین کے سینے کو چاک کر دے
سجل بہاروں کا روپ لے کر
سنہرے خوشوں کی دھوپ لے کر
میرے گلستان کو خاک کر دے

میرے سپوتو میرے جیالو!
وقار ملت کے پاسدارو!
میری نگاہوں کے چاند تارو!
فرازِ گردوں کے شاہ سوارو!
سلام تم پر
میری فضاؤں کے تاجدارو!
کہ تم نے ناموسِ آدمیت کو
اپنے سینے کا خون دے کر
خود اپنی آنکھوں کا نور دے کر
خود اپنی کڑیل جوانیوں کا سرور دے کر
درندگی سے بچا لیا ہے!
سلام تم پر میرے شہیدو!
وطن کی عظمت کے جاں نثارو!
میرے مجاہد سلام تم پہ
وقارِ ملت کے پاسدارو!

... ...

نعیم صدیقی

نعیم صدیقی نے ہوشیار اور چوکنا رہنے کا درس اس طرح دیا:

دشمن ہے نامراد! ابھی جاگتے رہو!
صد فتنہ و فساد! ابھی جاگتے رہو!
کب رک گیا جہاد! ابھی جاگتے رہو!
ابھی جاگتے رہو!

بھارت کینہ کیش ہے ملینت میں ناگ ہے
ہے اسکے دل میں کینہ بھرا منہ میں جھاگ ہے
نس نس میں اسکی زہر ہے رگ رگ میں آگ ہے
ابھی جاگتے رہو!

جس جس محاذ پر بھی کھڑے ہو، کھڑے رہو
پہرے کی چوکیوں پہ برابر، جمے رہو
جاری ابھی جہاد ہے خنجر لیے رہو
ابھی جاگتے رہو!

کٹ جائے ساری رات قیام و قعود میں
سر عاجزی سے خم ہو رکوع و سجود میں
مصروف ہو زبان سلام و درود میں
ابھی جاگتے رہو!

... - ... - ...

غازی کا ترانہ

علامہ اقبال ہمارے قومی شاعر اور فلسفی ہیں۔ ان کا یہ ترانہ خوب خون گرمانے کا کام

کام دیتا ہے۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا خبر میں نظر میں اذان سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

... ...

رئیس امروہوی

مشہور شاعر رئیس امروہوی نے اپنے جانبازوں کو سلام کرتے ہوئے کہا:

خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام
شہریوں کو غازیوں کو شہسواروں کو سلام
خطۂ لاہور کیا رتبہ ہے تیری خاک کا
تو ہے استالن گراڈ اس سرزمین پاک کا
ارضِ شالامار راوی کے کناروں کو سلام
خطۂ لاہور تیرے . . . . . .

ایک ہی جھٹکے میں دشمن کی کلائی موڑ دی
تو نے دشمن کی کمر ضربِ گراں سے توڑ دی
اے شہیدوں کے چمن تیری بہاروں کو سلام
خطۂ لاہور تیرے . . . .

زورِ بازو پر ترے اہلِ وطن کو اعتماد
زندہ و پائندہ و تابندہ و رخشندہ باد
شانِ فتح و کامراں کے نظاروں کو سلام
خطۂ لاہور تیرے . . . .

رحمتیں زندہ دلانِ خطۂ لاہور پر
چار جانب گونجتا ہے نعرۂ فتح و ظفر
اپنے پیاروں کو دعائیں اپنے یاروں کو سلام
خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام

... ...

ساغر صدیقی

ساغر صدیقی نے اپنے رب سے فتح مبین کی اس طرح دعا کی :

خدایا! ہمیں فتح و نصرت عطا کر
جہانِ مسلماں کو وسعت عطا کر

ہے پھر صدق صبر و رضا کی ضرورت
ہمیں سرفروشی کی عادت عطا کر

ہر اک فرد خیبر شکن ہو ہمارا
جوانوں کو حیدرؓ کی قوت عطا کر

چٹانوں سے ٹکرائیں تیرے فدائی
سمندر کو پھیریں وہ جرأت عطا کر
صداقت کا پرچم رہے جگمگاتا
فضاؤں سے کھیلیں وہ فطرت عطا کر
میری بھیگی پلکوں کی فریاد سُن لے
مرے گلستاں کو لطافت عطا کر
مری عرض سُن کملی والے کا صدقہ
تجھے سبز گنبد کے ہالے کا صدقہ

... ...

عاصی کرنالی

مشہور شاعر عاصی کرنالی نے مجاہدینِ وطن کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

مجاہدینِ وطن! غازیانِ پاکستان! — شکستِ کفر کا ضامن تمہارا عزمِ جواں
نفس نفس ہے مسلماں کا خنجرِ خونریز — نظر نظر ہے مسلماں کی تیغِ شعلہ فشاں
جمے ہوئے ہیں بہرحال غازیوں کے قدم — گڑے ہوئے ہیں بہرسمت عظمتوں کے نشاں
وہ اور ہوں گے جنہیں جستجو ہے منزل کی — تمہارے پاؤں پہ تو منزلیں ہیں سجدہ کناں
تمہارے عزم میں اندازِ حیدرؓ و شبیرؓ — تمہارے فقر میں کردارِ بوذرؓ و سلمانؓ
نہ فکرِ کثرت و قلت نہ خوفِ باطل و کفر — کہ حق ہے برتر از اندیشہ ہائے سود و زیاں
قدم جمیں سرِ میدان تو آہنی دیوار — قدم بڑھیں سوئے باطل تو آتشیں طوفاں
بڑھے چلو سوئے دشمن بزورِ عزم و یقیں — کہ غارتِ خس و خاشاک ہے یہ سیلِ رواں

تمہارے دم سے فزوں شان و احترامِ وطن
مجاہدینِ صداقت! تمہیں سلامِ وطن

شورش کاشمیری

شاعر شعلہ بیان شورش کاشمیری نے دشمن کو ان الفاظ میں للکارا جب وہ کھیم کرن کے محاذ جنگ کا دورہ کر کے واپس مڑے۔

شبھ نام مہاراج کا چاون کہ چون ہے
وہ مار پڑی ہے کہ نشہ اس کا ہرن ہے
یہ کارگہ کیم کرن، کھیم کرن ہے
یہ کارگہ کیم کرن کھیم کرن ہے

آئے تھے بڑے زور سے منہ زور مہاشے
یوں بیٹھ گئے جس طرح پانی میں بتاشے
کھادی کا جو ملبوس تھا اب ان کا کفن ہے
یہ کارگہ کیم کرن کھیم کرن ہے

یہ لوگ کبھی ڈٹ کے لڑے تھے نہ لڑے ہیں
لاشوں کے ذخیرے ہیں کہ میداں میں پڑے ہیں
پیوند زمیں لال بجھکڑ کا بجن ہے
یہ کارگہ کیم کرن کھیم کرن ہے

ہر گام پہ عبرت ہے مکیں ہے نہ مکاں ہے
باقی ہے کوئی چیز تو مرگھٹ کا دھواں ہے
دھرتی ہے بھگوڑوں کی شغالوں کا وطن ہے
یہ کارگہ کیم کرن کھیم کرن ہے

ہرگز نہیں بھارت کے مہاشوں کو خدا یاد
مرنے کا سلیقہ ہے نہ جینے کی ادا یاد
قزاق ہیں قزاق یہی ان کا چلن ہے

یہ کار گہِ کیم کرن کیم کرن ہے

گنگا ہو کہ جمنا یہی کرتے ہیں اشارا
دل بھی ہمارا ہے علی گڑھ بھی ہمارا
شورش دل و دیدہ میں نہاں ان کی لگن ہے

یہ کار گہِ کیم کرن کیم کرن ہے

... ...

خلیق قریشی

مشہور شاعر فیصل آباد خلیق قریشی نے ان الفاظ میں اپنے مجاہدین کو سلام محبت پیش کیا۔

رنگِ چمن کو حسنِ چمن کو مرا سلام گل کو مرا سلام چمن کو مرا سلام
دیوار بن گئے ہیں جو اعداء کی راہ میں ان غازیانِ کوہ شکن کو مرا سلام
اسلام کے افق پہ ہوئی جس سے روشنی صبحِ وطن کی پہلی کرن کو مرا سلام
یہ پرکشا فضاؤں میں شاہین و شاہباز ان کی اڑان ان کی پھبن کو مرا سلام
اس رہ میں جن کو جامِ شہادت ہو نصیب ہے ان کے لالہ رنگ کفن کو مرا سلام
حاصل ہے جسکو سرورِ بطحاؐ کا التفات اس سرزمینِ فخرِ زمن کو مرا سلام
جو گونجتا ہے نعرۂ تکبیر سے مدام اس خوش نصیب کوہ و دمن کو مرا سلام

تائیدِ ایزدی ہے خلیقؔ اس کے ساتھ ساتھ
جانباز پاسبانِ وطن کو مرا سلام

... ...

ضیاء الحسن ضیاء

شاعر حریت ضیاء الحسن ضیاء نے اپنی فوج کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا،

کفر سے ہے برسرِ پیکار دینداروں کی فوج
خوگرِ حمد و ثناءِ حق کے پرستاروں کی فوج

کثرت و قلت کے غم سے ہو کے یکسر بے نیاز
نادگانِ حق کا لشکر اور جرّاروں کی فوج

اپنی آزادی کی خاطر آج ہے سینہ سپر
سرزمین پاک کے جانباز احراروں کی فوج

روند ڈالے گی سپاہِ کفر کا کبر و غرور
پرچمِ حق و صداقت کے علمداروں کی فوج

صفحۂ گیتی پہ جن کی عظمتیں مرقوم ہیں
آج سرگرمِ عمل ہے ان جہانداروں کی فوج

رزمگاہِ خیر و شر میں سرفراز و سربلند
سرخوش ہو گی خدا آگاہ خودداروں کی فوج

ایک دن ہو کر رہے گی کامیاب و کامراں
جاں نثاروں کے عساکر اور وفاداروں کی فوج

... ...

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی نے ان الفاظ میں اپنے وطن عزیز کا نغمہ گایا اور اپنی جرأت و حریت کا رجز پڑھا۔

۱

عدو نے اب تو بہت پاس آ کے دیکھ لیا
وطن پہ آنچ جب آئے تو ہم قیامت ہیں

جو چھیڑے کوئی ہم اللہ کے فقیروں کو
زمیں کا کشمکش میں ہم آسماں کی دہشت ہیں

۲

محبت اپنا طریقہ ہے امن اپنا اصول
مگر ہم امن و محبت نہیں کچھ اور بھی ہیں
سپردگی ہی سہی دوستی کی شرط مگر
ہمارے پیار میں خود آگہی کے طور بھی ہیں

۳

ہمارا صبر ہے قوت کی شان استغناء
ہمارے صبر کو للکار کر بچا نہ کوئی
یہاں وہاں وہ اٹھائے پھریں ہدف اپنے
ہمارا تیر ہدف سے بھٹک سکا نہ کوئی

۴

وطن کی خاک ہمیں اپنی جاں سے پیاری ہے
ہماری جاں تو ہے صرف ایک پھول گلشن میں
ہمیں یقین ہے کہ جب تک وطن سلامت ہے
کوئی کمی نہیں پھولوں کی اس کے دامن میں

... ...

پروفیسر آسی ضیائی

پروفیسر آسی ضیائی نے بھارت کی آنکھیں کھولیں۔

کھول آنکھ، ذرا ہوش میں آ، رنگِ فضا دیکھ
جنگاہ میں ہر سمت قیامت سی بپا دیکھ

کیا، سوچا تھا، ہو جائیگا اور ہو گیا کیا، دیکھ
منصوبۂ ناپاک کو مٹی میں ملا دیکھ
انجامِ دغا بازی و پندار و جفا دیکھ

کھاتے ہیں لکھو، اپنے، یہ تباہی کے سب آثار
یہ ٹوٹے ہوئے ٹینک، یہ چھوڑے ہوئے ہتھیار
طیاروں کے یہ پھیپھڑے، لاشوں کے یہ انبار
تو سمجھا تھا، ہے نفع کا سودا تیری یلغار
پسپائی کے بعد، اب، یہ خسارہ بھی لگا دیکھ

تیرا سا پڑوسی بھی کسی کا نہ ہو، زنہار
برما ہی نہ خوش تجھ سے، نہ لنکا کو کوئی پیار
نیپال مگر سند تو بھوٹان بھی بیزار
اور چین سے تو آپ ہوا بر سرِ پیکار
ہمسایہ تیرا کون نہیں تجھ سے خفا، دیکھ

یہ کون سی جا ہے، تجھے کچھ اسکی خبر ہے!
یہ ارضِ مقدس ہے، یہ پاکوں کا نگر ہے
یہ امن گہِ خیر ہے، یہ دافعِ شر ہے
اسلام کا یہ دیس ہے، اللہ کا یہ گھر ہے
آنکھیں ہوں تو ہر ذرے میں یاں نورِ خدا دیکھ

تاریخ نے دہرائی ہے پھر اپنی روایت
مولا نے جو کی اپنے غلاموں کی ہدایت
وہ فضل کیا جس کی نہیں حد و نہایت
کس منہ سے بجا لائے کوئی شکرِ عنایت
اللہ کی نصرت سرِ میدانِ وغا دیکھ

پھر سندھ کے فاتح کی اپنی تیغ جہندہ
پھر غزنوی و غوری و خلجی ہوئے زندہ
پھر بابر و ابدالی ہیں کفار کشندہ
پھر پانی پت آیا ہے بمیدان چوندہ
غازی ہیں قدیم، ان کا نیا طورِ غزا دیکھا

... ...

ملت کے جاں نثار اسلام کے شیدائی ہمارے سپاہی

ہزاروں کو جرأت کے تمغے ملے۔ انہوں نے خالد و طارق کی مثالیں قائم کیں۔ ہماری فوج قابلِ فخر جوانوں پر مشتمل ہے۔ ایک ایک فرد برق پتاں ہے۔ ہم صرف ایک حوالدار کی مثال پیش کرتے ہیں۔

حوالدار محمد انور

محمد انور ہماری بہادر فوج کے ان ہزاروں جوانوں میں سے ایک ہے، جنہوں نے بقول صدر مملکت اپنے خون سے پاکستان کی نئی تاریخ لکھی ہے۔ محمد انور اور اس کے ہزاروں ساتھی دشمن کے مقابلے میں لاہور کے اردگرد لوہے کی دیوار بن گئے تھے، تاکہ لاہور مسکراتا رہے۔ اس نے لاہور کی مسکراہٹ پر اپنی ایک ٹانگ بھی قربان کر دی تھی۔ گولیوں کی بارش میں اسے صرف اپنے فرض کی تکمیل کی فکر تھی۔ موت بامقصد ہونی چاہیئے۔ اگر میں اپنے کمانڈر کے حکم کی تکمیل کے بغیر دشمن کی گولی کا شکار ہو جاتا۔ تو میری روح کو کبھی اطمینان نصیب نہ ہوتا: یہ اس جانباز سپاہی کا فلسفۂ حیات ہے۔ اگرچہ وہ ضلع میرپور کی تحصیل بھمبر کے ہائی سکول سے میٹرک پاس نہیں کر سکا۔ لیکن حیات و ممات کے بارے میں اس کا فلسفیانہ نقطۂ نظر میرے لیے بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ محمد انور کو انٹرویو کی افادیت کا قائل کرنے کے لیے بھی مجھے بڑی مشکل پیش آئی۔ اس کا موقف یہ تھا کہ اس نے یہ سب کچھ کسی انعام یا صلے

کے لالچ میں نہیں کیا۔ بلکہ اس کے پیشِ نظر صرف خداوند کریم کی رضا جوئی تھی۔ میں نے کہا کہ اس کی داستان قارئین میں حب الوطنی کے جذبات ابھارے گی۔ اس لیے اس کا شائع ہونا ضروری ہے۔ تب کہیں جاکر وہ اپنے کارنامے کی تفصیل بیان کرنے پر آمادہ ہوا۔

اس نے بتایا کہ ـــــــ ، ار ستمبر کو آٹھ بجے محاذ سے اطلاع ملی کہ وائرلیس گاڑی کا ریڈیو ایئر شیل لگنے سے تباہ ہو گیا۔ جنگی نقطۂ نظر سے یہ گاڑی محاذ پر لڑنے والی فوجوں کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کمانڈر نے محمد انور کے سامنے ساری صورتِ حال رکھ دی۔ اس گاڑی کا درست ہونا بڑا ضروری تھا۔ اس وقت ہیڈکوارٹر اور محاذ پر لڑنے والے جوانوں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ محمد انور بھی اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اس کا حل صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہاں جاکر گاڑی میں نیا ریڈیو ایئر نصب کیا جائے۔ چنانچہ رات کے نو بجے محمد انور چار جوانوں کی ایک پارٹی کے ساتھ محاذ پر روانہ ہو گیا۔ دشمن نے زبردست حملے کا آغاز کر رکھا تھا۔ مخالف سمت سے مسلسل آگ اور لوہے کی بارش ہو رہی تھی۔ لیکن کچے راستے پر جیپ لڑکھڑاتی ہوئی برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ سولہ ایم ایم ہوٹزر توپ کے گولے پھلجھڑی سے پھوٹتی ہوئی چنگاریوں کی طرح برس رہے تھے۔ دشمن کا نشانہ خصوصیت سے اس وقت ایک ٹینک تھا۔ جو جیپ کے آگے آگے جا رہا تھا۔ ایک میل آگے چل کر ٹینک پر گولہ باری اتنی شدید ہو گئی کہ محمد انور کے ساتھیوں کو جیپ چھوڑ کر پناہ لینی پڑی۔ ٹینک مست ہاتھی کی طرح برابر آگے بڑھتا گیا۔ جب ٹینک ایک میل آگے نکل گیا تو جانبازوں کی یہ پارٹی پھر اپنی منزل کی جانب رواں ہو گئی۔ رات بے انتہا تاریک تھی۔ توپوں کے دہانوں سے نکلی ہوئی چمک تاریکی سے برابر آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ اندھیرے میں جیپ کے آگے بڑھنے کی رفتار بڑی سست تھی۔ آخر وہ نالہ آگیا جہاں وائرلیس گاڑی تھی۔ جیپ کو گاڑی سے تیس گز دور کھڑا کرکے محمد انور اور اس کے ساتھی رینگ کر وائرلیس گاڑی تک پہنچ گئے۔ اپریٹر محمد اکبر اور ممتاز گاڑی میں موجود تھے۔ انہوں نے اصل خرابی بتادی۔ دشمن وہاں سے صرف سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ ذرا سا کھٹکا اسے خبردار کر سکتا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ابھی اس پارٹی کو کام شروع کیے ہوئے

صرف پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ دشمن کو ان کی موجودگی کا علم ہو گیا۔ چنانچہ دشمن کے ٹینک نے گولہ باری شروع کر دی۔ محمد انور نے کہا کہ اگرچہ مجھے زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن میں کام کی تکمیل سے قبل نہیں مرنا چاہتا تھا۔ میں نے رب العزت سے دعا کی کہ الٰہی زندگی تیری امانت ہے۔ مجھے اس کی کوئی فکر نہیں مگر یہ امانت اس وقت لینا جب میں اپنا فرض ادا کر چکوں۔ محمد انور نے کہا کہ یہ لمحات میری زندگی کے نازک ترین لمحات تھے۔ میرے ساتھیوں نے کہا کہ واپس چلیں۔ یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا خود کشی کے مترادف ہے۔ مگر میں نے جام شہادت نوش کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ دشمن کے تین چار گولے ہمارے دائیں بائیں گرے۔ اتنی دیر میں ریڈی ایٹر کھولا جا چکا تھا۔ اچانک گولا میرے قریب آ کر گرا اور میری دائیں ٹانگ زخمی ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے دوسرا گولا لگا اور میری بائیں ٹانگ اڑ گئی۔ گھٹنے سے ٹخنے تک ہڈی بالکل چکنا چور ہو چکی تھی۔ میں نے زخم کو ٹٹولا۔ ٹانگ ایک طرف کو مڑ چکی تھی۔ اپنی حرکت آسان کرنے کے لیے میں نے ہڈی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے نکال کر باہر پھینک دیئے اور سٹین گن کا سلنگ کھول کر ران کو کس کر باندھ دیا۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک محمد غنی شہید ہو چکا تھا۔ دو آدمی زخمی ہو چکے تھے۔ محمد اکبر کی بھی ٹانگ اڑ چکی تھی۔ اس قدر گہرے زخم کے باوجود میرے ہوش و حواس قائم تھے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں زندہ واپس نہیں جا سکتا۔ مگر میں زندگی کے باقی ماندہ قیمتی لمحات کو بامقصد بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں زخموں کی طرف دھیان دیئے بغیر ریڈی ایٹر نصب کرنے میں مصروف ہو گیا۔ نصف گھنٹے تک میں نے مرمت کا کام مکمل کر لیا۔ سیٹ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا میرے ساتھی جو زخمی نہیں تھے ہیڈ کوارٹر کو جنگ کی صورت حال سے آگاہ کر رہے تھے۔ ہیڈ کوارٹر سے ہمیں حکم ملا کہ ہم فوراً واپس آ جائیں۔ محمد انور نے کہا کہ میرے حواس بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ میں پھر اسی طرح رینگ کر جیپ تک پہنچ گیا۔ جیپ پر بیٹھے ہوئے ساتھی ہمارا حشر دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی بہادری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ موت کی اس بارش میں ہمارا انتظار کرتے رہے۔ میری حالت اس وقت بالکل خراب ہو چکی تھی مجھے جیپ پر سوار کیا گیا۔ راستہ بے حد خراب تھا میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ٹخنے کے اوپر

پنڈلی کی ہڈی کا ایک حصہ بری طرح جھول رہا تھا۔ جس سے مجھے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے ننگی ہڈی کو ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس سے یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا۔ جب ہم شالامار باغ کے قریب پہنچے تو دن کے پانچ بج چکے تھے۔ جیپ آہستہ چل رہی تھی۔ لوگوں پر اس منظر کا عجیب ردِ عمل ہو رہا تھا۔ مجھے لاہور کے شہریوں کے مطمئن چہرے دیکھ کر اپنے زخم بھول گئے۔ ضلع میرپور کے دور دراز گاؤں چھاوا میں میری بیوی اور دو بچے الیاس اور خضر رہتے ہیں۔ میں خدا کا شکر بجالایا کہ میری قربانی بامقصد ہے۔ میں اس لیے جان دے رہا ہوں تاکہ لاہور کے شہریوں کا اطمینان کوئی نہ چھین سکے میرے بچے سدا مسکراتے رہیں اور سہاگنوں کا سہاگ قائم رہے میں اس خیال میں خوش تھا کہ ان سہاگنوں کے گروہ میں میری بیوی اگر بیوہ ہو گئی جب بھی فخر سے سر اونچا کر کے چل سکے گی۔ ایک دوکان پر رک کر میں نے گرم پانی پیا۔ کچھ لوگوں نے ہمیں دیکھ تکبیر بلند کی۔ اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ ساتھ میں نے بعض کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک بھی دیکھی۔ لیکن اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ محمد انور نے کہا کہ اب میری داستان ختم ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں نے دن رات محنت کر کے خدا کے فضل سے میری جان بچالی ہے مجھے کہا گیا ہے کہ میں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا ہے۔ میری زبردست حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ مگر میں نے یہ سب کچھ اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا ہے۔ میں اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر جوابدہی سے ڈرتا تھا۔

... ...

پاکستان کی فوج میں سے میں نے صرف ایک سپاہی کی مثال دی ہے جب کہ یہ فوج ایسے ہی جوانوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی فوج نے جہاد ستمبر کو تحریک تحفظ پاکستان بنا دیا۔ پورا ملک اور اس کی آبادی فوج کا حصہ بن گئی اور ملت اور فوج نے جس کمال درجے کی یکجہتی کا مظاہرہ کیا اس نے اس ملک و قوم کے زندہ رہنے کا حق ثابت کر دیا۔

... ...

افسوس کہ اتنے عظیم جہاد اور معرکہ حریت کو اس کے فطری نتائج تک پہنچائے بغیر اور ملک و ملت کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے مغربی کافر ملکوں کے دباؤ کے تحت یہ جہاد ختم کر دیا گیا۔ صرف سترہ دن کی معرکہ آرائی نے جس قوم کو پاؤں کے ناخن سے سر کی چوٹی تک زندہ اور مجاہد بنا دیا تھا اس نسخہ کیمیا کو صرف سترہ دن آزمانے کے بعد ترک کر دیا گیا۔ لاکھوں وعظ اور ہزاروں تقریروں نے جو کام نہ کیا تھا وہ اصلاح ملت کی اس سترہ روزہ جنگی تربیت گاہ نے کیا۔ ان سترہ ایام میں ملک کے کسی تھانے میں کوئی جرم رپورٹ نہیں ہوا۔ کوئی شے مہنگی نہیں ہوئی۔ کہیں سے احساس محرومی کی آواز بلند نہیں ہوئی۔ کہیں سے طبقاتی کشمکش کے عفریت نے سر نہیں اٹھایا۔ پوری قوم صاف ستھری جانباز قوم بن کر کھڑی ہو گئی۔ اتنی حیرت ناک اصلاح کا عمل اور کسی تدبیر نے نہ کیا تھا جو اس جہاد حریت نے کیا۔

لیکن صدر ایوب نے مغربی ملکوں کے دباؤ میں آ کر ملت کے مطالبہ جہاد کو ٹھکراتے ہوئے اس بابرکت جہاد کو بند کر دیا۔ مولانا مودودی اور تمام قابل ذکر دینی سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے جہاد کو جاری رکھنے کے مطالبات کیے۔ بیانات دیئے۔ اپنے تعاون کا بار بار یقین دلایا۔ پوری قوم نے خود اپنا عملی تعاون پیش کیا لیکن صدر ایوب نے قوم کا مطالبہ منظور نہ کیا اور بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جہاد حریت سترہ دن کی جنگ کے بعد امریکہ اور روس کے دباؤ کے تحت بند کر دیا۔ اس طرح اس نے پوری قوم کی توہین کی کشمیر کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا اور روس میں جا کر ایک ایسا رسوا کن معاہدہ تاشقند کیا جو بعد میں اس کی آمریت کی قبر کھودنے کا ذریعہ بنا۔ اس معاہدے کے ذریعے ہی قوم نے دیکھ لیا کہ صدر ایوب ایک اچھا منتظم تو ضرور ہے لیکن ایک اچھا کمانڈر اور مجاہد نہیں ہے اگر وہ کچھ دن اور جنگ لڑتا تو بھارت گھٹنے ٹیک کر کشمیر پر سے اپنا سامراج اٹھا لیتا اور کشمیر کے پچاسی فیصدی مسلمان اپنا حق خود ارادیت حاصل کر لیتے۔ ایوب خاں کی بزدلی نے کشمیر کی تقدیر کو ایک طویل مدت کے لیے پھر غلامی کے حوالے کر دیا۔ ایوب خاں کا یہی تاریخی جرم اس کی تاریخی سزا کا پیش خیمہ بن گیا۔

(۷)

پاکستان تحریک جمہوریت

۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۹ء

پس منظر

پاکستان ایک عظیم جمہوری تحریک کے ذریعے وجود میں آیا تھا۔ شاید اس سے بڑی جمہوری تحریک کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں برصغیر کے تمام مسلمانوں نے راس کماری سے خیبر تک حصہ لیا۔ اس تحریک کی موافقت اور مخالفت میں سارے مسلمان متحرک تھے۔ مسلمانوں کی غیر معمولی کثیر تعداد تحریک پاکستان کے ساتھ تھی اور قلیل مسلمان دوسرے مختلف پلیٹ فارموں پر بٹے ہوئے تھے۔

اس تحریک کی قرارداد کل ہند سطح پر ایک عظیم جلسہ عام میں سارے ہندوستان سے آئے ہوئے اکابر مسلمان رہنماؤں نے متفقہ طور پر پاس کی تھی۔ اس تحریک کا رہنما ایک عظیم پارلیمنٹیرین۔ ماہر قانون۔ دستور شخص تھا جسے جمہوری طور پر اکثریتی مسلمانوں کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور وہ تنہا مسلمانوں کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے ملک گیر سطح پر بات کر سکتا تھا ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے ذریعے پورے برصغیر کے مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت نے تحریک پاکستان کی حمایت اور اس کے علمبردار قائد کے نصب العین سے اتفاق کیا تھا۔

اس جمہوری جدوجہد کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں نے خالص جمہوری طریقے سے دلائل اور سیاسی تحریک کے ذریعے اپنے حق خود ارادیت کو انگریزوں اور ہندوؤں سے بزور منوایا تھا اور جمہوری طریقے پر ہی یہ طے پایا تھا کہ جن جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہ علاقے انڈیا سے جدا کر کے مسلمانوں کو پاکستان کے طور پر دے دیے جائیں گے۔

اگرچہ تقسیم کے وقت جمہوری فیصلے کا احترام کرنے میں انگریز اور ہندو دونوں قومیں بدکرداری، عدم رواداری، بددیانتی اور غیر جمہوری طرز عمل کا شکار ہوئیں اور ان کے بددیانتی پر مبنی غیر جمہوری طرزِ عمل سے مسلمانوں کو شدید نقصان بھی پہنچا لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پاکستان خالص ایک جمہوری جدوجہد کے ذریعے وجود میں آیا تھا اور اس کی تشکیل میں مسلمان جمہور کے سوا کسی دوسرے عامل فوج، جاگیردار، سرمایہ دار یا بیوروکریسی کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہ خالص ایک جمہوری عمل تھا جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا تھا۔

پاکستان بن جانے کے بعد بلاشبہ دستور ساز اسمبلی بعض داخلی کمزوریوں اور سمجھوتوں کے سبب دستور سازی کا کام جلد مکمل نہ کر سکی لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اسمبلی نے متفقہ طور پر سب سے پہلے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو ایک دستوری قرارداد مقاصد پاس کر کے مملکت کا مقصد وجود متعین کیا۔ پھر اس مقصد کی روشنی میں ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو ایک جمہوری پارلیمانی دستور تیار کر کے ملک میں نافذ کر دیا چنانچہ نئے دستور کی روشنی میں ملک بھر میں چراغاں کیا گیا۔ اس دستور کے تحت ایک کابینہ بنی جس نے جمہوری طور پر ہی نئے دستور کے تحت ۱۵ فروری ۱۹۵۹ء کو عام انتخابات کے انعقاد کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ اب ان انتخابات کے بعد نئے منتخب نمائندوں کو ملکی انتظام چلانا اور قانون سازی کا کام کرنا تھا۔ اکثر جمہوری ممالک کا یہی طریقہ ہے۔

لیکن مملکت پاکستان کی ہر چیز جمہوری طریقے پر طے پا جانے کے بعد ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں کمانڈر انچیف ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر کے جمہوریت کی ہر پیش رفت پر پانی پھیر دیا۔ کابینہ توڑ دی، اسمبلیاں ختم کر دیں۔ دستور منسوخ کر دیا اور تمام دستوری اور جمہوری ارتقاء کو یک قلم منسوخ کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس مارشل لاء نے جمہوری طور پر ملک کو برسوں پیچھے پھینک دیا اور اسے دنیا بھر میں فوجی آمریت والے ملک کی حیثیت سے بدنام کر دیا۔ ملک کے تنخواہ دار کمانڈر انچیف نے مطلق العنان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر مارشل لاء نافذ کر دینے سے قومی سطح پر مندرجہ ذیل خلاف جمہوریت جرائم کا ارتکاب کیا۔

۱۔ منتخب اسمبلیاں توڑ دیں۔

۲۔ جمہوری سیاسی پارٹیاں ختم کردیں۔

۳۔ ملک کا متفقہ پاس شدہ دستور منسوخ کر دیا۔

۴۔ عدلیہ کے متوازی فوجی عدالتیں لگا کر عوام کو بلا ثبوت اور بلا جواز غیر معمولی سخت سزائیں سنائیں۔

۵۔ سرکاری ملازموں کی اپنی پسند کے مطابق چھانٹی کی۔

۶۔ اپنے دستور میں حدود اختیارات سے سراسر تجاوز کیا اور جس فوج کو خونِ جگر پلا پلا کر عوام نے سرحدوں کی حفاظت کے لیے تیار کیا تھا اس فوج کو قوم پر غلبہ اور ملک پر قبضہ کرنے کے لیے غیر قانونی طور پر استعمال کیا۔

۷۔ اعتماد شکنی (BREECH OF TRUST) کا ارتکاب کیا اور ملک کا چوکیدار ہوتے ہوئے ملک پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ اس کارروائی کی حیثیت وہی تھی کہ ایک شخص اپنے گھر کی رکھوالی اور حفاظت کے لیے کسی شخص کو چوکیدار رکھے اور اسے چوروں ڈاکوؤں کو بھگانے کے لیے بندوق لے کر دے لیکن کسی رات وہی چوکیدار مالک کی دی ہوئی بندوق لے کر اسی صاحب خانہ کے سینے پر سوار ہو جائے اور بندوق کے زور سے گھر پر قبضہ کر لے۔

۸۔ قوم کی طرف سے مقررہ تاریخ انتخابات یک طرفہ طور پر منسوخ کر کے قوم کو چوالیس ماہ تک مارشل لاء کے شکنجے میں جکڑے رکھا۔ قوم کو یہ سزا اس لیے دی گئی کہ اس نے ان صاحب کو اپنی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا تھا۔

۹۔ ملک کے پارلیمانی طرز حکومت کو اپنی مرضی سے تبدیل کر کے صدارتی طرزِ حکومت نافذ کر دیا جس کے لیے بے شمار الکھاڑ پچھاڑ کی گئی۔

۱۰۔ عوام سے بالغ رائے دہی کا حق چھین کر انہیں بے شعور اور ناسمجھ قرار دیتے ہوئے بنیادی جمہوریت کا پہلا سبق دینے کا اعلان کر دیا۔

۱۱۔ آزادی اخبارات کی آزادیٔ صحافت چھین کر پریس کو حکومت کے قبضہ میں کر لیا۔

۱۳۔ صوبوں کو دیے گئے اختیارات سلب کر لیے جس سے بے جا طور پر احساس محرومی پہلی بار پیدا ہوا جو بعد میں بڑھتا ہی چلا گیا۔

غرض ایوب خاں نے پوری قوم کو اپنی مفتوحہ غلام قوم شمار کرتے ہوئے اس پر ایسے ایسے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تجربات کرنے شروع کیے جن کے دور رس نتائج برآمد ہوئے اور جو ملک قرار دادِ مقاصد پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں عوام کے مطالبے اور خواہشات کے مطابق ایک متوازن دستور پاس کر کے ایک نظریاتی ترقی یافتہ مملکت کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اس کی ساری نظریاتی عمارت ڈھا کر اس پر اپنی مرضی سے ایک سیکولر عمارت کی بنیاد رکھ دی۔

سیاست کے میدان میں سیاسی پارٹیوں پر پابندی اور بہت سے سیاستدانوں کو ایبڈو کرنے کے بعد اپنے ہی مقرر کردہ کمیشن کی دستوری سفارشات کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اپنا شخصی اور ذاتی طور پر وضع کیا ہوا ۱۹۶۲ء کا صدارتی دستور نافذ کیا۔ جس میں اپنی صدارت کے علاوہ دوسرے ہر کسی کے لیے منتخب ہونے کے راستے مسدود کر دیئے۔ اپنی ایک سیاسی پارٹی حکومت کے ذرائع و وسائل سے بنائی اور اس کا نام بھی مسلم لیگ ہی رکھا اور خود ہی فیلڈ مارشل ہوتے ہوئے اس کا صدر بن گیا۔ اس پارٹی کے سوا دوسری ساری پارٹیوں کو زندہ رہنے کے جملہ امکانات ختم کر دیئے۔ جماعت اسلامی نے اس کی مرضی کے خلاف لاہور میں صرف ایک اجتماع ہی کرنا چاہا تو لاؤڈ اسپیکر پر ملک گیر پابندی لگا دی۔ پھر غنڈوں سے اس کے اجتماع پر حملہ کروا کر ایک بے گناہ انسان کو شہید کر دیا اور ایک وزیر داخلہ صرف اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ جماعت اسلامی کے خلاف ہر روز پریس کانفرنس کرتا ہے اور بالآخر جماعت اسلامی پاکستان کو ملک گیر سطح پر خلاف قانون قرار دے کر اس کے لاکھوں روپے کے خدمتِ خلق کے اداروں پر قبضہ کر کے اس کے کچھ سامان کو تھانوں میں ضائع کرا دیا اور کچھ سامان ریڈ کراس کے حوالے کر دیا۔ گویا کسی جماعت کا خدمتِ خلق کا کام بھی اسے پسند نہ تھا۔ اس جماعت کے سینکڑوں افراد کو جھوٹے الزامات کے تحت مہینوں تک جیلوں میں بند رکھا جب تک سپریم کورٹ نے حکومت کے خلاف اور جماعت اسلامی کے حق

میں فیصلہ نہ کر لیا۔

اس شخص نے ملک میں عوام کے بنیادی حقوق بحال کرنے سے بھی انکار کر دیا اور جب سیاسی جماعتوں نے دس میل لمبا محضر نامہ اکابرین ملت اور عوام کے دستخطوں سے تیار کر کے قومی اسمبلی کے اجلاس ڈھاکہ میں پیش کیا تب چاروناچار ان بنیادی حقوق کو بحال کیا گیا جو ہر آزاد قوم کے افراد کا فطری حق ہے۔ ریاست میں کرپشن کا راستہ سب سے پہلے ایوب خاں نے ہی کھولا۔ پہلی ہی اسمبلی میں اپوزیشن بنچوں پر ۴۷ افراد بیٹھے اور اسمبلی کی پہلی تین سالہ مدت ختم ہونے سے پہلے پہلے صرف چند ایک ممبران ہی اپوزیشن میں رہ گئے باقی سب ایک ایک کر کے سرکاری بنچوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ وزراء کو ذاتی ملازم کی حیثیت دے دی گئی اور اسمبلی کے پاس صرف ۲۵ فیصدی بجٹ پاس کرنے کے اختیارات باقی رہ گئے۔ نیز بنیادی جمہوریت کے انتخابات کے ذریعے ایک حلقہ ایک ممبر کے لیے لازم قرار دے کر گھر گھر دشمنی اور قتل و غارت کا سامان کر دیا۔

عدالتی نظام میں عوام کو بنیادی حقوق سے ہی برسوں تک محروم رکھا اور جب یہ حقوق دیئے ہی گئے تو جج زمانے کے سارے مظالم اور جرائم کو تحفظ دے دیا گیا۔ فوجداری قوانین کے ایک بڑے حصے کو عدالتوں کے دائرۂ اختیار سے نکال کر جرگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ انتظامی فیصلوں کو چاہے وہ ظلم و زیادتی پر ہی مبنی ہوں انہیں عدالتوں میں چیلنج کر کے انصاف حاصل کرنے کا راستہ بند کر دیا۔ وکلاء کے طبقہ کو دبایا گیا کہ وہ کسی سیاسی مقدمے میں وکیل نہ بنیں۔ انہیں لالچ دے کر سرکار کے خلاف جھگڑنے سے روکا گیا تاکہ انتظامیہ جو ظلم چاہے کرے کوئی شخص عدلیہ کے ذریعے اس ظلم کا مداوا نہ کر سکے۔ عدالتی کارروائیوں کی اخبارات میں اشاعت بند کر دی تاکہ عوام کا دباؤ نہ پڑ سکے اور عدالتوں کو عوام کی اخلاقی تائید حاصل نہ ہو سکے۔ آزادیٔ اظہار پر سخت پابندیاں لگا دی گئیں۔ اخبارات کوئی خبر سنسر اور وزارت اطلاعات کی اجازت کے بغیر شائع نہ کر سکتے۔ جس نے سرکاری مرضی کے خلاف کوئی خبر شائع کر دی اس سے بھاری ضمانت طلب کر لی۔ اخبارات کے علاوہ چھاپہ خانوں پر پابندیاں لگا دیں۔ دفعہ ۱۴۴ کا ملک کے ہر ضلع میں کثرت سے استعمال کیا گیا تاکہ کوئی شخص

تحریر کے ذریعے تنقید نہ کر سکے۔ لاؤڈ سپیکر پر پابندی۔ تحفظ امن عامہ آرڈیننس کے ذریعے ہر شخص کو ہر کہیں بلا وجہ گرفتار کر کے جیل میں ڈالا جا سکتا۔ یونیورسٹی آرڈیننس کے ذریعے تعلیم گاہوں کو آزادی کی روح سے محروم کر دیا گیا۔ اس طرح پوری قوم کو غلام اور پورے ملک کو قبرستان بنا دیا گیا۔ البتہ دوسری طرف صدر ایوب کی تعریف کے قصیدے تمام ذرائع ابلاغ سے اس کثرت سے دن رات سنائے جاتے کہ لوگوں کے دل بیزار اور کان پک گئے۔ حکومت کی تعریف و توصیف بعض اخبارات اور سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کا پیشہ ہی بن گیا اور وہی ان کا ذریعہ معاش بن گیا۔

مذہبی طور پر مغرب زدہ سرکاری افسران کی بیگمات کے زیر اثر ایک ایسا ملکی قانون بنا کر نافذ کیا جو انگریزوں کے شاردا ایکٹ سے بھی زیادہ بے ہودہ اور غیر اسلامی تھا۔ علماء کرام نے مشترکہ طور پر اس کا تجزیہ کر کے شائع کیا کہ اس میں متعدد آیاتِ قرآنی اور احادیث کی رو سے تنقید کی انہیں جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ مخلوط تعلیم کو عام کیا۔ فیملی پلاننگ کے سنٹر قائم کر کے گھر گھر تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ ملک میں طبقاتی تعلیم کو رائج کیا اور مسلمانوں کی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے مغربی تہذیب کے ناپاک سانچے میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ علماء کرام کو عید کے چاند کے بارے میں رائے دینے کے جرم میں گرفتار کیا اور جیلوں میں ڈالا۔ ایک آرڈیننس کے ذریعے انہوں نے زنا کو قابلِ راضی نامہ بنا دیا۔ ناچنے گانے والے طائفے تیار کر کے بیرونی ممالک کو اسلامی کلچر و ثقافت کے نمونے کے طور پر ارسال کیے۔ موسیقی کو داخل نصاب کیا۔ شراب کی کھپت میں بے پناہ اضافہ کر دیا جو صرف ایک سال میں ڈیڑھ لاکھ گیلن سے بڑھ کر پانچ لاکھ گیلن تک چلی گئی۔ پاکستان ہوائی کمپنی میں لڑکیاں بھرتی کیں تاکہ مسافروں کا دل بہلایا جائے۔ اور انہیں غیر ملکی مہمانوں کو شراب پلانے پر مامور کیا اور تحقیقاتِ اسلامیہ کا ڈائریکٹر ایک ایسے نام نہاد مسلمان مستشرق کو مقرر کیا جو اسلامی عقائد اور نظریات تک میں مسلمانوں سے اختلاف رکھتا تھا۔ اور قرآن مجید کے الفاظ کی پابندی کی بجائے اس سے برآمد ہونے والے عام اصولوں کی پابندی کو کافی سمجھتا تھا۔ اسلامی مشاورتی کونسل کی تمام سفارشات کو صرف

تجاویز کی حیثیت دی گئی اور اس کی کسی سفارش پر کبھی عمل نہیں کیا اس طرح پوری حکومتی مشینری کا مزاج مکمل طور پر سیکولرازم پر قائم کر دیا چنانچہ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ پاکستان مذہبی ملک کے نام سے بنا تھا لیکن وہ مکمل سیکولر انداز میں چلایا جاتا ہے۔ جب کہ انڈیا سیکولرازم کا دعویٰ کرتا ہے اور اسے مکمل مذہبی انداز میں چلایا جاتا ہے۔

صدر ایوب خاں نے معاشی ترقی کا بہت ڈھنڈورا پیٹا۔ لیکن فی الحقیقت ملک کو غیر ملکی قرضوں سے لاد کر اسے مغربی ملکوں کا غلام بنا دیا۔ دوسری طرف شکر، چائے اور خوراک کی تمام اشیاء میں کمی واقع ہوئی۔ گرانی غیر معمولی بڑھ گئی۔ بارش کے پانی کے استعمال کے لیے ضلع وار چھوٹے چھوٹے ڈیم ملکی سرمائے سے بنانے کی بجائے غیر معمولی بڑے بڑے ڈیم غیر ملکوں کے قرضے سے بنائے جس کے نتیجے میں فائدہ کم اور اخراجات زیادہ ہوئے۔

ڈیموں کی تعمیرات میں بے پناہ کرپشن پیدا ہوئے یہاں تک کہ سارا سرمایہ سمٹ کر بائیس خاندانوں میں جمع ہو گیا جو ایوب خاں کے منظور نظر خاندان تھے۔ اس کے باوجود مہنگائی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ بے روزگاری بڑھ گئی۔ غیر ملکی قرضوں کا سود کروڑوں تک چلا گیا۔ نظم و نسق کے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ایوب خاں کا یہ ظلم ناقابلِ فراموش ہے اس نے پنجاب کے تین بڑے دریا ستلج، بیاس اور راوی کسی پارلیمنٹ سے پوچھے بغیر ہندوستان کے ہاتھ فروخت کر دیئے اور اپنے پاس صرف چناب جہلم اور سندھ رکھ لیے۔ یہ قوم سے اتنی بڑی غداری تھی جس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ کشمیر کے بارے میں اتنی کمزور پالیسی وضع کی کہ ایک طرف بھارت سے دب کر معاہدہ تاشقند کر کے جیتی ہوئی جنگ میز پر ہار دی اور دوسری طرف اس سے بھی پہلے نہرو سے مشترکہ دفاع کی پیش کش کر کے بھارت کی پانچ گنا فوج کے تحت پاکستان کی فوج دینے اور بھارت کی ماتحتی اور زیر دستی قبول کرنے کی پیشکش کر دی وہ تو اللہ تعالیٰ نے نہرو کی مت مار دی اور اس نے ایوب خان کی اس کھلی حمایت میں کوئی چال پوشیدہ محسوس کر کے مشترکہ دفاع سے انکار کر دیا ورنہ آج پاکستان بھارت کی کنفیڈریشن میں ایک ماتحت اور زیر دست ملک کی حیثیت سے جا چکا ہوتا۔ لیکن نہرو کے انکار سے پاکستان بھارت کا طفیلی ملک بننے سے

بک گیا۔

... ...

ان سب کارناموں کی کل ذمہ داری ایوب خاں پر اس لیے پڑتی ہے کہ اس نے اپنی کتاب "فرینڈز نات ماسٹرز" میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ملک کو اپنے نظریات کے مطابق چلانے کے لیے ۱۹۵۴ء سے ہی پروگرام بنا رہے تھے اور ۱۹۵۸ء میں چھاپہ مار کر قبضہ کرنے کے لیے اگرچہ انہوں نے سکندر مرزا کو استعمال کیا لیکن بیس دن کے بعد ہی اسے رخصت کر کے سارا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد ملک کی ایسی نقشہ گری کی ساری ذمہ داری ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔

یہ وہ کارنامے ہیں جن کی وجہ سے پاکستان کی ملت اسلامیہ میں یہ احساس ابھر آیا کہ جو ملک ہم نے ملت کے تین ٹکڑے کر کے حاصل کیا تھا جس کا ایک ٹکڑا بطور یرغمال ہم نے ہندوؤں کی غلامی میں دے دیا تھا اور جو ہندو کی تنگ ذہنی کی وجہ سے اب تک شب و روز سزا بھگت رہا ہے۔ جس ملک کو ہم نے مسلمانوں کی آزادی، حریت، جمہوری اقدار اقتدار میں عوام کی مرضی کی بھرپور شرکت، ترقی، خوشحالی، اسلام کی سربلندی اور نفاذ کے لیے حاصل کیا تھا۔ اس قوم کو ایوب خاں نے اپنے خاندان کا غلام اور ایک مجبور و مقہور قوم بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ملت کے ضمیر میں یہ احساس ابھرا کہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ایوب خاں کی غلامی میں آنے سے کیا حاصل ہوا؟ صرف گورے انگریز کی بجائے کالے انگریز کی غلامی اور ایک کافر کی بجائے مسلمان کے ہاتھ سے اپنے دین ایمان غیرت حمیت اور قومی خودداری کی تباہی! بس یہ احساس تھا جس کی شدت میں آ کر قوم کی گلیوں میں سے وہ نعرہ اٹھا جسے پھر بچے بچے کی زبان پر "ایوب کتا ہائے ہائے" کے عنوان سے ساری دنیا نے سنا یہ ایوب خاں کے خلاف ملت کے غصے کی آواز تھی۔ پھر تو ایوب خاں کے ان مظالم اور کارناموں کے سبب ساری قوم ہی اٹھ کھڑی ہوئی لیکن یہ واقعہ کیسے رونما ہوا اس کی ایک تفصیل موجود ہے۔

سب سے پہلے قومی اسمبلی میں موجود اپوزیشن کے افراد کے درمیان باہمی اتفاق و

اتحاد کا معاہدہ ہوا۔ پھر اس یک جہتی کو آگے بڑھاتے ہوئے ۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو ڈھاکہ میں جماعت اسلامی۔ پاکستان مسلم لیگ (کونسل)، نظامِ اسلام پارٹی۔ عوامی لیگ اور نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کے نمائندوں نے جمہوریت کی بحالی کے لیے ایک مشترکہ نظام کار وضع کیا اور تحریک جمہوریت پاکستان (پی۔ ڈی۔ ایم) کے نام سے ایک تحریک برپا کی۔ جس کے اغراض و مقاصد اور طریق کار درج ذیل تصور کیے گئے۔

تحریک کا لائحہ عمل

مندرجہ بالا بیان کردہ پارٹیوں کے اجلاس میں درج ذیل لائحہ عمل مطالبات کی صورت میں طے کیا گیا۔

۱

یہ بات ملک کے دستور میں ثبت کی جائے گی کہ

:: پاکستان کی حکومت پارلیمانی طرز کے وفاق پر مشتمل ہو گی جس میں،

:: بالغ رائے دہی کی اساس پر براہِ راست منتخب مقننہ کو ویسی ہی بالادستی حاصل ہوگی جیسی دستور ۱۹۵۶ء میں درج ہے۔

:: (باشندگان ملک کو) کامل اور مکمل بنیادی حقوق حاصل ہوں گے۔

:: پریس کو پوری اور مکمل آزادی حاصل ہو گی۔

:: عدلیہ کو غیر جانبداری سے کام کرنے کے لیے ہر تحفظ حاصل ہو گا۔

۲

مندرجہ ذیل شعبے وفاقی حکومت کی تحویل میں ہوں گے۔

۱۔ دفاع

۲۔ امور خارجہ

۳۔ کرنسی اور وفاقی مالیات

۴۔ بین الصوبائی مواصلات، تجارت نیز وہ امور جن پر اتفاقِ رائے ہو گا۔

۳

دیگر تمام شعبوں میں باقی ماندہ اختیارات (RESIDUARY POWERS) دونوں حصہ ہائے ملک میں دستور کے تحت قائم، صوبائی حکومتوں کو حاصل ہوں گے اور اس بارے میں انہیں مکمل صوبائی خود اختیاری حاصل ہو گی۔

۴

حکومت پاکستان ازروئے دستور پابند ہو گی کہ دس سال کی مدت کے اندر اندر ملک کے دونوں حصوں کے درمیان موجودہ اقتصادی نا مساوات کو دور کرے۔ اس دوران میں مشرقی پاکستان کے کمائے ہوئے زرمبادلہ کو اس کے ذمے دفاع، امور خارجہ اور مرکزی ادائیگیاں کے سلسلے میں جن میں موجودہ اور آئندہ ملکی قرضے بھی شامل ہیں، حصہ رسدی وضع کر کے تمام تر مشرقی پاکستان ہی میں صرف کیا جائے گا نیز صوبوں کو اپنے حاصل کردہ زرمبادلہ کو کلیتہً اپنے حسب منشا استعمال کرنے کا اختیار ہو گا اور جب تک نا مساوات رفع نہ ہو جائے حکومت پاکستان غیر ملکی امداد اور بیرونی قرضوں کی تقسیم میں مشرقی پاکستان کو ترجیح دے گی اور مالیات کی پالیسیوں میں اس امر کو ملحوظ رکھے گی کہ سرمایہ مشرقی پاکستان سے منتقل نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے لیے بنکوں کے سرمائے اور منافع انشورنس کے حصص اور صنعتی منافعوں کے متعلق خاص طور پر وقتاً فوقتاً قانون نافذ کیے جائیں گے۔

۵

:: کرنسی زرمبادلہ اور مرکزی بنکاری

:: بین الصوبائی تجارت۔

:: بین الصوبائی مواصلات

:: غیر ملکی تجارت

کے انتظام کے لیے ایک بورڈ مقرر کیا جائے گا۔ جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے ارکان کی تعداد مساوی ہو گی اور بورڈ کے ان ارکان کا چناؤ ہر صوبے کے مرکزی اسمبلی کے ارکان علیحدہ علیحدہ کریں گے۔

۶

سفارتی محکموں اور خود مختار اداروں سمیت سپریم کورٹ اور دوسری مرکزی ملازمتوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کو مساوی حصہ دیا جائے گا۔ اس مساوات کی تکمیل کے لیے آئندہ تقرریاں اس طریقے سے کی جائیں گی کہ دونوں حصہ ہائے ملک کے افسروں کی تعداد سال کی مدت میں مساوی ہو جائے۔

۷

حکومتِ پاکستان از روئے دستور ذمہ دار ہو گی کہ ملک کے دونوں حصوں میں افواج کی جنگی قوت یکساں ہو۔ اس غرض کے لیے :

:: مشرقی پاکستان میں ایک ملٹری اکاڈمی، اسلحہ ساز فیکٹریاں، کیڈٹ سکول اور کالج کھولے جائیں گے۔

:: مشرقی پاکستان سے بری، بحری اور فضائی تینوں افواج میں بھرتی کی جائیگی اور پاکستان بحریہ کا مرکز مشرقی پاکستان منتقل کر دیا جائے گا۔

ان امور پر پوری طرح عمل درآمد کرنے کے لیے ایک ڈیفنس کونسل قائم کی جائے گی جس میں دونوں صوبوں کے ارکان کی تعداد مساوی ہو گی۔

۸

اس دستاویز میں "دستور" سے مراد ۱۹۵۶ء کا دستورِ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ جو فی الفور نافذ کیا جائے گا۔ نفاذِ دستور کے بعد چھ ماہ کے اندر اندر مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات منعقد کیے جائیں گے اور قومی پارلیمنٹ کا اولین کام یہ ہو گا کہ وہ اس دستاویز کی دفعہ ۲ تا ۷ میں مندرج تبدیلیوں کو دستور کا جزو بنائے۔ تحریک میں شامل تمام جماعتیں اور تنظیمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر پابند ہیں کہ وہ اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔

... ...

اس لائحہ عمل کو بروئے کار لانے کے لیے ایک مرکزی مجلس انتظامیہ بنائی گئی۔ اور

صدر، نائب صدر، سیکریٹری اور قانون کے مناصب مقرر کیے گئے تا کہ ہم آہنگی اور یکجہتی سے بحالِ جمہوریت کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا جاسکے۔

اس تحریک میں شمولیت کے لیے جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ نے جو قرارداد پاس کی اس کا متن درج ذیل ہے۔

قرارداد

"چونکہ جماعت اسلامی پاکستان[1] اس مقصد وحید کے لیے قائم ہوئی ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی کو اس کی اصلی روح اور شکل کے ساتھ مکمل طور پر اس ملک میں قائم کیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ایک ایسی آزاد جمہوری فضا درکار ہے جس میں رائے عامہ کو کسی نظام کے حق میں ہموار کرنا اور اس کی تائید سے نظامِ مطلوب کو قائم کر دینا ممکن ہو اسلام بجائے خود بھی ہر استبدادی نظام کو خلافِ حق سمجھتا ہے اور اس قسم کا نظام اسلامی نظام کے قیام و نفاذ میں ہی مانع ہے۔ اس لیے یہ جماعت ابتداء ہی سے اس امر کے لیے دل سے خواہاں اور عملاً کوشاں رہی ہے کہ پاکستان پر کسی شخص یا مخصوص گروہ کا آمرانہ استبداد مسلط نہ ہو۔ بلکہ ملک کے باشندوں کو پوری آزادی کے ساتھ اپنی مرضی سے اپنے حکمران منتخب کرنے اور ناپسند حکمرانوں کو بدلنے اور ان کی جگہ دوسرے بہتر حکمرانوں کو لے آنے کے اختیارات حاصل رہیں۔ جماعت اسلامی نے اسی بنا پر ان تمام کوششوں میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے جو مارشل لاء اٹھنے کے بعد ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لیے کی جاتی رہی ہیں اور وہ اوّل روز سے اس بات کی قائل رہی ہے کہ ملک کو آمریت سے نجات دلا کر جمہوریت کو از سرِ نو بحال کرنے کے لیے اپوزیشن پارٹیوں کا اتحاد ضروری ہے۔

اب کہ جماعت اسلامی اور دوسری اپوزیشن پارٹیوں کے نمائندوں نے مل کر بحالیٔ جمہوریت

---

[1] لاہور مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۶۷ء شائع شدہ ہفت روزہ ایشیاء ۲۸ مئی ۱۹۶۷ء۔

کی متحدہ جدوجہد کے لیے تحریک جمہوریت پاکستان کے نام سے ایک آٹھ نکاتی پروگرام اور ان کو عمل میں لانے کے لیے ایک نظام کار پر اتفاق کر لیا ہے۔ مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان اشتراک عمل کے اس معاہدہ کو قبول کرتی ہے جس پر ۳۰ اپریل ۶۷ء کو جماعت اسلامی نظام اسلام پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (کونسل) عوامی لیگ اور نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کے نمائندوں نے ڈھاکہ میں دستخط کیے ہیں۔

پی ڈی ایم میں شرکت کی مزید وضاحت

جماعت اسلامی نے شرکت اور اتحاد کی قرارداد پاس کرتے ہوئے چند امور کی مزید وضاحت کی۔

۱۔ جماعت اسلامی صرف جمہوریت کی بحالی کے لیے اس تحریک میں حصہ لے رہی ہے اس کے سوا دوسرے تمام اسلامی اور دینی مقاصد کے لیے وہ اپنی تمام سرگرمیاں حسب سابق جاری رکھے گی۔

۲۔ اشتراک عمل کا یہ معاہدہ اس امر میں مانع نہ ہوگا کہ یہ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد ہر جماعت انتخابات میں اپنا منشور اور پروگرام عوام کے سامنے پیش کرے اور جس جماعت کو بھی عوام کی اکثریت کی تائید حاصل ہو وہ اس شرط کے ساتھ ملک کا نظام چلائے کہ دوسروں کے لیے اسی طرح عوام کی تائید حاصل کرنے کا دروازہ کھلا رہے۔

۳۔ جماعت اسلامی نے تحریک جمہوریت کے مقاصد میں ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی کو شامل کرنے سے جس بناء پر اتفاق کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہی دستور جمہوری طریقے سے بنا تھا اور اسی کو غیر قانونی طریقہ سے منسوخ کر کے آمریت ملک پر مسلط ہوئی تھی اور جمہوریت کی بحالی کا منطقی تقاضا یہی تھا کہ وہ دستور بحال ہو جسے آمریت نے کسی جائز اور آئینی حق کے بغیر منسوخ کر دیا تھا۔ علاوہ بریں جماعت نے اس دستور کی بحالی سے اس بناء پر بھی اتفاق کیا ہے کہ ۵۶ء میں وہ اسے قبول کر چکی تھی کیونکہ اس میں وہ تمام آئینی بنیادیں موجود تھیں جو ملک میں رائے عامہ کی تائید سے اسلامی نظام زندگی

قائم کرنے کے لیے درکار ہیں لیکن جب وہ دستور بنا تھا۔ اس وقت بھی جماعت اسلامی اس کی بہت سی چیزوں کو قابل اصلاح سمجھتی تھی اور آج بھی قابل اصلاح سمجھتی ہے۔ مثلاً بعض امتناعی ہنگامی صورتِ حال میں بنیادی حقوق کا معطل کیا جانا، مارشل لاء نافذ کرنے اور انڈمنٹی ایکٹ پاس کرنے کا مطلق اور غیر محدود اختیار، دو سال یا اس سے زیادہ مدت کے سزا یافتہ لوگوں کا اسمبلی کی رکنیت کے لیے نااہل ہونا قطع نظر اس سے کہ انہوں نے کس اخلاقی جرم میں سزا پائی ہو یا سیاسی الزام میں اور صدر کو معافی کے مطلق اختیارات جو حدود اللہ کی معافی تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ جماعت اسلامی یہ امید رکھتی ہے کہ اس طرح کی خلاف حق و انصاف گنجائش دستور میں رکھنے کے نقصانات بہت سے تلخ تجربات کے بعد اب تمام سیاسی کارکنوں پر واضح ہو چکے ہوں گے۔ اور وہ بحالی جمہوریت کے بعد پہلی فرصت میں ان نقائص کی اصلاح کرنے کے لیے جماعت اسلامی سے اتفاق کریں گے۔

۴۔ جماعت اسلامی کے نزدیک جمہوریت کا بحال ہونا اس کے بغیر قطعی بے معنی ہے کہ ملک کی تمام وہ جماعتیں جن کے کسی وقت بھی برسر اقتدار آنے کا امکان ہو۔ حسب ذیل اصولوں پر متفق ہو جائیں اور خدا و خلق کے سامنے اس بات کا عہد کریں کہ آئندہ وہ پوری ایمانداری کے ساتھ ان کی پابندی کریں گی۔

(الف) ملک کے عوام کی عظیم اکثریت جس نظام اور نظریہ پر اعتقاد رکھتی ہے اور جس کو پاکستان کی بنیادی آئیڈیالوجی مانا جا چکا ہے کوئی جماعت اقتدار سے کام لے کر جبراً اس کو بدلنے اور اپنی پسند کا نظام و نظریہ زبردستی ملک پر ٹھونسنے کا حق نہیں رکھتی۔

(ب) ملک کی حکومت کا نظام چلانا باشندگان ملک کے نمائندوں کا کام ہے اور حق و انصاف کی رو سے ملازمین حکومت کا کوئی کام اس کے سوا نہیں کہ جب تک وہ ملازم ہیں اور قوم کے خزانے سے تنخواہ پا رہے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی ہدایات کے تحت ملک کا انتظام کرتے رہیں۔ جنہیں باشندگان ملک نے اپنے ملک کی حکمرانی کے لیے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہو۔ ملازمین کا اپنی اس حیثیت سے تجاوز کرنا اور سیاسی برسر اقتدار پارٹی

آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی مرضی سے سربراہ کار مقرر کیے جائیں اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات چلائیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو حاصل رہے اس وقت تک وہ سربراہ کار رہیں؟ یا یہ کہ کوئی شخص یا گروہ خود سربراہ کار بن بیٹھے اور اپنی مرضی سے معاملات چلائے اور اس کے تقرر اور علیحدگی اور کارپردازی میں سے کسی چیز تک بھی ان لوگوں کی مرضی و رائے کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو۔ اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور مبنی بر انصاف ہے تو ہمارے لیے دوسری صورت کی طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہیے۔ اور ساری بحث اس پر ہونی چاہیے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے۔

دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل میں لانے کی جو بے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں۔ ان کی تفصیلات سے قطع نظر کر کے اگر انہیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پرکھا جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں تو کوتاہی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں۔

اوّل یہ کہ "جمہور" کو مختارِ مطلق اور حاکم مطلق (SOVEREIGN) فرض کر لیا گیا اور اس بناء پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں مختار مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی جمہور کیسے حاکمیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بناء پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکمیت ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم (SOVEREIGN) نے مقرر کیا ہے اس قانون کی پابندی جمہور اور اس کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بنا پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب بنتی ہے۔

اٹھانی شروع کر دی اس کے نتیجے میں بڑے بڑے جلسے بھی ہونے لگے۔ ان جلسوں میں بعض لوگوں نے سوالات بھی اٹھائے۔ مثلاً ایک سوال یہ اٹھایا گیا کہ "تحریک جمہوریت پاکستان کے آٹھ نکات میں اسلامی نظام کے بارے میں تو کوئی وضاحت موجود نہیں ہے۔" اس کا جواب دیتے ہوئے ایک مقرر نے کہا:

"بڑی مشکل یہ ہے کہ ذرائع خبر رسانی کو حکومت نے پوری طرح اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے۔ اس لیے پورے حالات سے آگاہ ہونا اہل ملک کے لیے ممکن نہیں رہا تحریک جمہوریت کا جو پروگرام پریس کو بھیجا گیا تھا۔ وہ کسی اخبار نے پورے کا پورا شائع نہیں کیا۔ اس میں جو بات طے ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ:

ا۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کو از سرِ نو نافذ کیا جائے گا۔

ب۔ علیحدگی کے سوا مشرقی پاکستان کے تمام مطالبات پورے کیے جائیں گے۔

ج۔ جدوجہد خالص جمہوری طریق پر کی جائے گی اور کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جائیگا جو قرآن و سنت کے منافی ہو۔

چنانچہ جب ہم ۱۹۵۶ء کے دستور کا نام لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن و سنت پر مبنی ایک اسلامی نظام کا مطالبہ کر رہے ہیں کیونکہ اس آئین میں یہ بات واضح طور پر درج ہے کہ یہاں قرآن و سنت پر مبنی قانون نافذ کیا جائے گا۔

اسی طرح کسی نے جمہوریت کے بارے میں سوال کیا ہے کہ آخر وہ کہاں تک اسلامی ہے جبکہ اس میں جمہور کو قانون سازی کا حق ہے۔ ان کی نمائندگی چند چالاک افراد کرتے ہیں عوام تو ناخواندہ ہیں۔ وہی چالاک لوگ ان پر مسلط ہو کر حکومت کرتے ہیں ایسی حکومت کی خرابیوں کو اسلام کیسے روک سکتا ہے؟

اس کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ آپ نے جمہوریت کے بارے میں جو تنقید کی ہے اس کے تمام نکات اپنی جگہ درست ہیں۔ لیکن اس مسئلے میں آخری رائیں قائم کرنے سے پہلے چند اور نکات کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اولین سوال یہ ہے کہ انسانی معاملات کو چلانے کے لیے اصولاً کون سا طریقہ صحیح ہے؟

آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی مرضی سے سربراہِ کار مقرر کیے جائیں اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات چلائیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو حاصل رہے اس وقت تک وہ سربراہ کار رہیں؟ یا یہ کہ کوئی شخص یا گروہ خود سربراہ کار بن بیٹھے اور اپنی مرضی سے معاملات چلائے اور اس کے تقرر اور علیحدگی اور کارپردازی میں سے کسی چیز تک بھی ان لوگوں کی مرضی و رسائی کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو۔ اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور مبنی بر انصاف ہے تو ہمارے لیے دوسری صورت کی طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہیے، اور ساری بحث اس پر ہونی چاہیے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے۔

دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل میں لانے کی جو بے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں۔ ان کی تفصیلات سے قطع نظر کر کے اگر انہیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پرکھا جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں تو کوتاہی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں۔

اوّل یہ کہ "جمہور" کو مختارِ مطلق اور حاکمِ مطلق (SOVEREIGN) فرض کر لیا گیا اور اس بناء پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں مختارِ مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی جمہور کیسے حاکمیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بناء پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخرکار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکمیت ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم (SOVEREIGN) نے مقرر کیا ہے اس قانون کی پابندی جمہور اور اس کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بناء پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب بنتی ہے۔

دوم یہ کہ کوئی جمہوریت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک کہ عوام میں اسکا بوجھ سہارنے کے لائق شعور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ اسلام اسی لیے عام مسلمانوں کی فرداً فرداً تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایک فرد مسلمان میں ایمان اور احساس ذمہ داری اور اسلام کے بنیادی احکام کا اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چیز جتنی کم ہو گی جمہوریت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے اور یہ جتنی زیادہ ہو گی امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم یہ کہ جمہوریت کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار ایک بیدار اور مضبوط رائے عامہ پر ہے اور اس طرح کی رائے عام اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرہ اچھے افراد پر مشتمل ہو۔ ان افراد کو صالح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں منسلک کیا گیا ہو اور اس اجتماعی نظام میں اتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے اس میں نہ پھل پھول سکیں اور نیکی اور نیک لوگ ہی اس میں ابھر سکیں اسلام نے اس کے لیے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر یہ تینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمہوریت پر عمل درآمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی بنائی جائے وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اسکی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اصلاح و ارتقاء کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ جمہوریت کو تجربے کا موقع ملے۔ تجربات سے بتدریج ایک ناقص مشینری بہتر اور کامل ترشکل چلی جائے گی۔"

جمہوریت کہاں تک اسلامی ہے

کسی صاحب نے خود مولانا مودودی سے سوال کیا کہ آپ نے جمہوریت کو قرآن و سنت کا منشا قرار دیا ہے آپ بخوبی واقف ہیں کہ فی زمانہ جمہوریت ایک مخصوص طرز حکومت کا نام ہے۔ جس کی بنیاد عوام کی غیر محدود حاکمیت کے تصور پر قائم ہے جسے ہم کسی طرح بھی کتاب و سنت کے منشا کے مطابق قرار نہیں دے سکتے۔ آپ جمہوریت کے لفظ کو اس

کے معروف معنی سے ہٹا کر استعمال کر رہے ہیں. اس سے پہلے آپ نے خود اسلامی طرز حکومت کے لیے تھیو ڈیمو کریسی کی اصطلاح وضع کی تھی۔ اب اس اصطلاح کو چھوڑ کر آپ ڈیماکریسی کی طرف کیوں رجعت کر رہے ہیں؟"

مولانا مودودی نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"جمہوریت کے متعلق میں بارہا اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ بات اچھی طرح واضح کر چکا ہوں کہ اسلام میں جمہوریت کا اصل جو ہر موجود ہے مگر جمہوریت کے اسلامی تصور اور جمہوریت کے مغربی تصور میں بڑا فرق ہے۔ اسلام عوام کی لامحدود حاکمیت کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی حاکمیت کے تحت عمومی خلافت کا قائل ہے۔ اس عمومی خلافت کے اختیارات چونکہ کسی شخص یا خاندان یا گروہ میں مرکوز نہیں ہوتے بلکہ بحیثیت مجموعی پوری ملت کو حاصل ہوتے ہیں اور وہی اس کی مجاز ہے کہ جس کو چاہے ان اختیارات کے استعمال کے لیے منتخب کرے اس لیے شخصی اور گروہی حکومت سے ممتاز کرنے کیلئے اسلام کے طرزِ حکومت کو جمہوری حکومت کہا جا سکتا ہے۔ یہی اسلام کا مخصوص تصور جمہوریت ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کا ایک ہی معروف اور متفق علیہ تصور رائج ہے۔ مغرب میں بھی جمہوریت کے مختلف تصورات مثلاً سرمایہ دارانہ جمہوریت، اشتراکی جمہوریت وغیرہ موجود ہیں۔ ان کے بالمقابل اسلام کے طرزِ حکومت کو اسلامی جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی اسلامی جمہوریت کو میں نے تھیوڈیماکریسی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس اصطلاح سے بھی مراد جمہوریت ہی کی ایک قسم ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔"

انہوں نے مزید کہا کہ جب تک ملک میں جمہوریت بحال نہیں ہوتی اور عوام کی آزاد مرضی سے اس ملک کا نظام نہیں بنتا۔ اس وقت تک نہ تو عوام کی مشکلات رفع ہو سکتی ہیں اور نہ ہی ان کی آرزوئیں اور امنگیں پوری ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اب اولین فریضہ یہی ہے کہ جمہوریت بحال ہو اور عوام کو ان کے حقوق واپس ملیں۔

... ...

جب اس جمہوری مہم کا آغاز ہو ہی گیا تو تحریک جمہوریت کے لیڈروں نے سب سے پہلے بار کونسلوں سے خطاب کا آغاز کیا۔ مولانا مودودی۔ مولانا فرید احمد۔ ممتاز دولتانہ۔ شوکت حیات۔ نوابزادہ نصراللہ خاں۔ چوہدری محمد علی نے پورے ملک کے دونوں حصوں کی بار کونسلوں کو طویل سفر کر کے خطاب کیا۔ یہ دورے کئی ماہ جاری رہے۔ ان دوروں میں کراچی بار کونسل کو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے خطاب کیا۔

بار کونسل سے خطاب[1]

جناب صدر اور محترم حاضرین!

تحریکِ جمہوریت پاکستان جس کو منظم شکل میں آئے ہوئے ابھی چند ہی مہینے ہوئے ہیں، ایک خاص مقصد کے لیے شروع ہوئی ہے۔ چونکہ آپ اس مقصد سے بڑی حد تک واقف ہیں اس لیے مجھے اس کی بہت زیادہ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصر طور پر جو بات میں عرض کروں گا۔ وہ یہ ہے کہ یہ مقصد درحقیقت صرف اس تحریک کے بانیوں یا اس کے چلانے والوں ہی کا نہیں ہے بلکہ پورے ملک کے باشندوں کا ہے۔ ملک کے باشندوں میں سے جن کو اس کا شعور حاصل ہے وہ تو ہمارے ساتھ ہیں۔ اور جنہیں اس کا شعور حاصل نہیں ہے انہیں ہم اس سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس غرض کے لیے ہم اس سے پہلے مشرقی پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں اور اب مغربی پاکستان کا دورہ شروع کر رہے ہیں۔ ہم پاکستان کے باشندوں کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ان کے وہ حقوق سلب کر لیے گئے ہیں جو اس سرزمین کے باشندے ہونے کی حیثیت سے خدا کی بنائی ہوئی فطرت نے انکو بخشے ہیں، اور ان سلب کردہ حقوق کو واپس لینا ان کا فرض ہے۔ اور جب تک انہیں یہ حقوق واپس نہ مل جائیں اس وقت تک ان کی زندگی کا کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا۔ اسی احساس نے ملک کی پانچ بڑی جماعتوں کو متحد کیا ہے اور یہی احساس ملک کی

---

[1] یہ خطاب ۱۶ مارچ ۱۹۶۸ء کو بمقام کراچی کیا گیا۔

عام آبادی میں پیدا کرکے ہم اسے اپنے فطری حقوق کی جد و جہد کے لیے متحد کرنا چاہتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس تحریک میں کئی جماعتیں شریک ہیں۔ ہر ایک کا اپنا ایک پروگرام ہے۔ ہر ایک اپنا ایک منشور رکھتی ہے۔ ہر ایک اپنے کچھ مقاصد رکھتی ہے۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کا کوئی پروگرام بھی اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتا جب تک کہ ملک کے باشندوں کی طرف حکمرانی کے اختیارات منتقل نہ ہو جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے کے قائل نہ ہوں بلکہ آئینی اور جمہوری طریقوں کے پابند ہوں وہ اپنے نظریے اور پروگرام کو عمل میں لانے کا صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ عوام میں اپنے خیالات کی تبلیغ کریں۔ اور رائے عامہ کو اس بات کا قائل کریں کہ ملک کے مسائل کا جو حل وہ پیش کر رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ لیکن یہ طریقِ کار اسی صورت میں بارآور ہو سکتا ہے جب کہ فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہو، اور ان کی رائے ہموار ہو جانے کے معنی یہ ہوں کہ ملک کا نظام اس نظریے اور پروگرام پر چلے گا جسے انہوں نے پسند اور قبول کیا ہے۔ ایسی حالت اگر ملک میں موجود ہو کہ لوگ جس چیز کو ناپسند کریں وہ رد ہو جائے اور جس چیز کو وہ پسند کریں وہی جمہوری طریقے پر نافذ ہو تو پھر پارٹیوں اور جماعتوں کے متحد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس صورت میں ہر جماعت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا منشور لے کر عوام کے سامنے جائے اور لوگوں کی رائے اپنے نظریے اور پروگرام کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر ملک کے اندر صورتِ حال یہ نہ ہو، اگر لوگوں کو سرے سے فیصلے کے اختیارات ہی حاصل نہ ہوں، اگر ان کی رائے کا ہموار ہونا یا نہ ہونا، دونوں بے معنی ہوں، تو اس صورت میں مختلف جماعتوں کا کوئی نظریہ اور پروگرام رکھنا اور ملک کے مسائل کا کوئی حل پیش کرنا بھی بے معنی ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس صورت میں ان میں سے کسی کو بھی یہ موقع حاصل نہیں ہو سکتا کہ اپنے پروگرام کو عملی شکل دے سکے اور اس کے مطابق ملک کے مسائل کو حل کر کے دکھائے۔ اسی وجہ سے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ سب سے پہلے ہم سب متحد

ہو کر یہاں جمہوریت کو بحال کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد ہی اس بات کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ جس گروہ یا شخص کا جو نظریہ بھی ہو وہ اس کے لیے جمہوری طریقے پر کام کر سکے۔ اور ملک کے چند حکمراں نہیں بلکہ عوام یہ طے کر سکیں کہ وہ اپنے معاملات کس کے ہاتھ میں دیں اور کس کے ہاتھ میں نہ دیں۔ ورنہ ہر صاحب عقل خود سمجھ سکتا ہے کہ جہاں فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہو ہی نہیں بلکہ چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہو وہاں کوئی پروگرام اور مسائلِ زندگی کا کوئی حل پیش کرنے کا آخر حاصل ہی کیا ہے۔

اب میں مختصر طور پر آپ سے یہ عرض کروں گا کہ جو نظام اس وقت ہمارے ملک میں قائم ہے۔ وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ یعنی وہ کسی حق پر قائم نہیں ہوا ہے، بلکہ زبردستی طاقت کے بل پر سراسر ناروا طریقہ سے قائم ہوا ہے۔ ایک رات یکایک ہمارے ملک میں انقلاب ہو گیا — انقلاب کا لفظ میں اس معنے میں استعمال کر رہا ہوں کہ انقلاب کہتے ہیں تلپٹ ہونے کو، اور فی الواقع اس رات ملک کا نظام تلپٹ ہو گیا — ملک میں جو سب سے بڑی مسلح تنظیم تھی، یعنی فوج، اس کے سربراہ نے یکایک کسی حق اور قانونی اختیار کے بغیر آئین کو منسوخ کر کے، پارلیمنٹ کو توڑ کر ملک کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پورے چار سال تک مارشل لاء نافذ رکھا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ مارشل لاء دراصل میں کوئی LAW نہیں ہوتا بلکہ LAWLESS LAW ہوتا ہے۔ اس پورے زمانے میں ملک کے اندر درحقیقت کوئی قانون نہیں تھا، بس سپریم کمانڈر کی مرضی ہی قانون تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی مرضی کا ایک دستور یہاں مسلط کر دیا جو اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ وہ بے نظیر اس لیے ہے کہ اس دستور کو ملک کے باشندوں نے خود اپنے ملک کے لیے نہیں بنایا ہے، بلکہ ملک کے ایک ملازم نے اس کو ملک پر مسلط کیا ہے۔ اس کے آغاز ہی میں یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ دستور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب نے ملک کے باشندوں کو دیا ہے۔ اس فقرے سے یہ بات آپ ہی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس دستور میں ملک کے باشندوں نے یہ طے نہیں کیا ہے کہ ان کے خدمت گار ان کی خدمت کن شرائط اور حدود کے تحت کریں گے۔ بلکہ ملک کے ایک بہت بڑے خدمت گار نے یہ طے کیا ہے کہ اس کے اختیارات کیا

ہوں گے اور جن باشندوں سے وہ تنخواہ لے رہا ہے انہیں وہ کیا حقوق دے گا؟ اگرچہ دستور کے دیباچے میں یہ دعوٰی کیا گیا ہے کہ باشندوں نے خود فیلڈ مارشل صاحب کو دستور بنانے کا اختیار دیا تھا، مگر آخر یہ بات کس کو معلوم نہیں ہے کہ یہ اختیار دیا نہیں گیا تھا بلکہ مارشل لاء کی حالت میں لیا گیا تھا ـــــ اس حالت میں لیا گیا تھا جب کہ سیاست پر گفتگو کرنا بھی جرم تھا! ظاہر بات ہے کہ جو نظام اس طریقے سے قائم ہوا ہو، کوئی معقول آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ نظام حق پر قائم ہوا ہے۔ اگر کوئی اس کے برحق ہونے کا دعوٰی کرے تو میں اس سے پوچھتا ہوں کہ جس شخص نے ملک کے نظام کو تلپٹ کر کے حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے اس کو یہ کام کرنے کا کیا حق حاصل تھا؟ کیا وہ قانون سے آزاد یا بالاتر تھا؟ یا کسی قانون نے اسے یہ اختیارات دیئے تھے؟ یا ملک کے باشندوں نے اس سے یہ درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں؟ یا وہ ملک کے لوگوں کا نمائندہ تھا۔ اور لوگوں نے اسے اس بات کا مجاز کر دیا تھا کہ جب اس کی رائے میں حالات تقاضا کریں تو وہ ملک کی فوج استعمال کر کے راتوں رات برسرِ اقتدار آ جائے، ظاہر بات ہے کہ ایسی کوئی صورت نہیں تھی۔ دراصل جس بناء پر اس نے یہ کام کیا وہ صرف یہ تھی کہ ملک میں جو سب سے بڑی منظم مسلح طاقت تھی وہ اتفاق سے اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی، اس طاقت کو استعمال کر کے اس نے از روئے قانون قائم شدہ نظام کو بلکلیت اپنی مرضی کے مطابق، نہ کہ قوم کی مرضی کے مطابق، بدل دیا اور سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اسے آخر جائز اور برحق تبدیلی کیسے کہا جا سکتا ہے؟

یہ کام جب کر ڈالا گیا تو اسے جائز ثابت کرنے کے لیے دو دلیلیں تصنیف کی گئیں جو آج تک دہرائی جا رہی ہیں۔ ایک یہ کہ جمہوریت یہاں ناکام ہو چکی تھی۔ دوسرے یہ کہ ملک کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ جمہوریت کی اس ناکامی کی وجہ سے ہم اپنی آزادی کھو بیٹھیں گے۔

ان دو وجوہ سے یہ دعوٰی کیا گیا کہ چونکہ ملک کی حفاظت کی آخری ذمہ داری (ULTIMATE RESPONSIBILITY) مسلح افواج پر عائد ہوتی ہے اسلیے فوج

نے ملک کا چارج لے لیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں دلیلیں بھی غلط ہیں اور ان پر مبنی دعویٰ بھی غلط۔ جمہوریت حقیقت میں یہاں عملاً قائم ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا غلط ہے کہ وہ ناکام ہو گئی۔ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں اپنے ملک کی حکمرانی کے اصل اختیارات ہوں اور وہ یہ فیصلہ کرنے والے ہوں کہ کن لوگوں کے سپرد وہ اپنے معاملات کریں اور کن کے سپرد نہ کریں۔ پھر وقتاً فوقتاً ایک مقرر مدت کے بعد ان کو یہ فیصلہ کرنے کا موقع ملے کہ جن لوگوں کے سپرد انہوں نے اپنے معاملات کیے تھے وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں۔ وہ انہیں تبدیل کرنا چاہیں تو تبدیل کر سکیں۔ دوسرے لوگوں کو لانا چاہیں تو ان کو لے آئیں۔ یہ ہے جمہوریت کی حقیقت۔ لیکن یہاں تقسیم کے بعد سے آج تک یہ صورت حال سرے سے کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کو آزادی حاصل ہوئی اس وقت فی الواقع عملاً جو تغیر واقع ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رو سے حاکمیت (SOVEREIGNTY) کے جو اختیارات تاج برطانیہ کو حاصل تھے، اگست ۱۹۴۷ء میں وہ اس نے ملک کے باشندوں کی طرف نہیں بلکہ ملک کی دستور ساز اسمبلی کی طرف منتقل کر دیئے۔ اس کے بعد یہ دستور ساز اسمبلی کا کام تھا کہ وہ ایک دستور بنائے اور اس کے ذریعے سے حکمرانی کے اختیارات کو ملک کے باشندوں کی طرف منتقل کر دے۔ جب تک دستور ساز اسمبلی ملک کا دستور نہ بنا دیتی اس وقت تک ملک کے باشندوں کی طرف حکمرانی کے وہ اختیارات منتقل نہیں ہو سکتے تھے۔

نو سال تک ہمارے ہاں کوئی دستور نہیں بنایا گیا، بلکہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ ہی میں کچھ ترمیمات کر کے اس کے مطابق حکومت کا نظام چلایا جاتا رہا۔ قانون دان لوگ جانتے ہیں کہ اس ایکٹ کی بنیاد ہی عوام کی حکومت کے تصور سے خالی تھی۔ اس کے اندر بنیادی حقوق تک موجود نہ تھے۔ وہ دراصل مرکزی حکومت کی حاکمیت کے تصور پر مبنی تھا۔ اور انڈین انڈی پینڈنس ایکٹ سے فرق اس قدر واقع ہوا تھا کہ برٹش پارلیمنٹ کی جگہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اس حاکمیت کی وارث ہو گئی تھی اس کے معنی یہ ہیں کہ نو سال تک یہاں فی الواقع جمہوریت کی بنیادی اینٹ تک نہیں رکھی گئی تھی۔ پھر جب ۱۹۵۶ء میں ملک کا جمہوری دستور

بنایا گیا تو حکمرانی کے اختیارات صرف نظریے کے اعتبار سے (THEORETICALLY) باشندوں کی طرف منتقل ہوئے مگر عملاً باشندے ان اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل اس وقت تک نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ عام انتخابات (جنرل الیکشنز) ہو جاتے۔ عام انتخابات منعقد ہونے پر ہی ملک کے باشندے یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو سکتے تھے کہ وہ کس پر اعتماد کر کے اپنے معاملات اس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں، اور ان کی خواہشات کے مطابق جو لوگ ان کے حقیقی نمائندے ہوتے وہ ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتے تھے۔ تب کہیں جا کر جمہوریت کام کرنا شروع کرتی۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ جمہوریت پیدا ہوتی، ایک رات ہمارے ملک کے بہادر سپہ سالار نے قوم کے پیٹ پر لات مار کر اس کا اسقاط کرا دیا۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کی رو سے انتخابات کی نوبت ہی نہ آنے دی گئی۔ اسی کراچی شہر میں، ملک فیروز خان نون کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں ۱۹۵۸ء کے موسم گرما میں، ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں طے کیا گیا تھا کہ فروری ۱۹۵۹ء میں جنرل الیکشنز ہوں گے۔ مگر اس کا وقت آنے سے پانچ مہینے پہلے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فوجی انقلاب برپا کر دیا گیا اور ملک کے لوگوں کو اس حق سے محروم کر دیا گیا کہ حکمرانی کے جو اختیارات پہلی مرتبہ ۱۹۵۶ء کے دستور کی رو سے نظریے کے طور پر ان کو ملے تھے، انہیں وہ عملاً استعمال کر کے اپنے حکمران براہ راست خود چنیں۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ اس جمہوریت کی ولادت کب ہوئی تھی جس کی ناکامی کا افسانہ ہمیں شب و روز سنایا جاتا ہے۔ اس کے تو کام کرنے کا وقت ابھی آیا بھی نہ تھا کہ اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔

دوسرا بہانہ یہ پیش کیا گیا کہ ملک میں بڑے خطرناک حالات پیدا ہو گئے تھے، اس لیے ان سے ملک کو بچانے کی خاطر فوج کو چارج لینا پڑا۔ اب ذرا دیکھیے کہ وہ خطرناک حالات تھے کیا؟ ان کی مثال میں جو نمایاں ترین چیز پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں ایک ہنگامہ ہو گیا تھا جس میں ڈپٹی سپیکر مارا گیا تھا۔ اس طرح کے کے شاید ایک دو واقعات اور ڈھونڈ کر نکالے جا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سا جمہوری ملک ہے جس میں اس طرح کے واقعات نہ پیش آتے ہوں؟ پھر کیا دنیا میں

ہر جگہ یہی ہوتا ہے کہ ذرا کوئی ہنگامہ ہوا اور ملک کی فوج اپنے ہی ملک پر چڑھ دوڑی؟ ہم میں اور دوسرے ملکوں میں فرق دراصل جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ جمہوری ممالک میں طرح طرح کے فسادات اور بدامنیاں رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن ان ممالک میں کوئی سرکاری ملازم ایسا نہیں ہوتا جو اس تاک میں بیٹھا ہو کہ کب ذرا سا کوئی ہنگامہ ہو اور میں ملک پر قبضہ کروں۔ اس وجہ سے وہاں وہ صورتِ حال پیش نہیں آتی جو یہاں پیش آئی۔ ہم سے زیادہ بڑی فوجیں رکھنے والے ممالک موجود ہیں اور ایسے ممالک موجود ہیں جن میں ایک ایک کمانڈر کے ماتحت اس سے زیادہ فوج ہے جتنی ہماری کل مجموعی طاقت ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ موقع ہے ملک پر قبضہ کر لینے کا۔ ابھی امریکہ میں نیگروز اور سپید آبادی کے درمیان بڑے بڑے ہنگامے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ تو بیک وقت ستر شہروں میں عظیم الشان ہنگامے برپا ہوئے۔ لیکن وہاں کوئی کمانڈر یہ دعویٰ لے کر کھڑا نہیں ہوا کہ جمہوریت فیل ہو گئی ہے اور ملک کی حفاظت کی آخری ذمہ داری میری ہے اس لیے آج سے میں ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے رہا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں جو لوگ اپنے ملک کی ملازمت کرتے ہیں ان کے اندر ان کی قومی تعلیم و تربیت نے کم از کم اتنے بنیادی اخلاق ضرور پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ اپنے قانونی اور آئینی حدود سے تجاوز کرنے کو بددیانتی سمجھتے ہیں اور اتنی حب الوطنی بھی پیدا کر دی ہے کہ وہ اس طرح کی بازیاں کھیل کر اپنی قوم کو غیر آئینی انقلابات کے خطرے میں ڈالنے کا خیال تک نہیں کر سکتے۔ اور اگر ان کے ہاں کوئی افسر ایسا نکل بھی آئے جو اس طرح کے ارادے دل میں رکھتا ہو، تو وہ کبھی یہ امید نہیں کر سکتا کہ سول یا ملٹری کے دوسرے ملازمین ملک کو طالع آزمائی کا بازیچہ بنانے میں اس کا ساتھ دیں گے بلکہ اس کی زبان سے ایسی کوئی بات سنکر برداشت ہی کر جائیں گے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم یہاں ایسی تعلیم و تربیت سے محروم ہیں۔ اس لیے نہ یہاں بنیادی اخلاق موجود ہیں، نہ وہ حب الوطنی اور ان چیزوں کے فقدان کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ فرض کر لیجئے، وہ دونوں بہانے صحیح بھی ہوں جو اس اقدام کو

حق بجانب ثابت کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں، یعنی جمہوریت ناکام بھی ہو گئی ہو اور ملک کو خطرہ بھی لاحق ہو، تو کیا پھر بھی یہ بات حق ہے کہ ملک کا ایک ملازم اٹھ کر بطورِ خود ملک پر قابض ہو جائے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس معاملہ میں آخری ذمہ داری فوج کی ہے۔ فوج کی ذمہ داری ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کی ہے نہ کہ ملک کا نظام چلانے کی۔ ملک فوج کا نہیں، بلکہ اپنے باشندوں کا ہے، اور یہ باشندوں کا اپنا ہی کام ہے کہ وہ اپنے گھر کے معاملات کو چلائیں بھی، اور بگڑ رہا ہو تو اسے درست بھی کریں۔ ملازمین خواہ وہ فوج کے ہوں یا سول کے، ان کا کام یہ ہے کہ کسی وقت ملک کی جو حکومت ہو اس کی ہدایات کے تحت کام کریں۔ انہیں ایک قانون کے تحت اور چند شرائط کے تحت ملازم رکھا جاتا ہے۔ ان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس قانون اور ان شرائط کے حدود سے باہر جا کر کوئی اختیار استعمال کر سکیں۔ ان کے سپرد یہ کام ہرگز نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ملک کا نظام اپنے ہاتھ میں لے کر وہ اختیارات استعمال کریں جو کسی آئین و قانون کے تحت ان کو نہیں دیے گئے ہیں۔ اس بناء پر میں صاف کہتا ہوں کہ اخلاقی حیثیت سے یہ پورا نظام درحقیقت ایک شر پر قائم ہے خیر پر قائم نہیں ہے۔ یہ حق پر نہیں بلکہ زور اور زبردستی پر قائم کیا ہوا نظام ہے۔

اس نظام کے حق میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس سے دو بھلائیاں برآمد ہوئی ہیں جو کسی دوسری صورت سے نہ ہو سکتی تھیں۔ اور اس بنا پر بھی اس نظام کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پہلا دعویٰ یہ ہے کہ ہم نے ملک کے نظام کو استحکام (STABILITY) بخشا ہے پہلے بار بار وزارتیں تبدیل ہوتی تھیں اور بدلتی تھیں۔ لیکن اب پہلی مرتبہ ملک میں ایک مستحکم (STABLE) حکومت قائم ہوئی ہے جس کے بہت سارے منافع بیان کیے جاتے ہیں۔ دوسری چیز جس کا بار بار ڈھول پیٹا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اس اقتدار کی وجہ سے ملک کو بڑی ترقیات نصیب ہوئی ہیں۔ آئیے، ذرا ان دونوں دعوؤں کا بھی جائزہ لے لیں۔

جہاں تک استحکام کا تعلق ہے اس کے بارے میں میں صرف اتنی بات کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ کسی ملک اور قوم کی ہستی اگر کسی شخص واحد پر منحصر ہو تو یہ حقیقت میں قوم اور ملک کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے، بلکہ بہت بڑی ناپائیداری ہے خواہ اس کی مدت دس سال دراز ہو یا پچاس سال۔ اشخاص ایک محدود مدت کے لیے زندہ ہوتے ہیں اور قوم باقی رہتی ہے۔ اشخاص آتے ہیں اور جاتے ہیں اور قوم کا نظام صدیوں چلنے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کا انحصار کسی ایک شخص پر ہو تو ظاہر بات ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس شخص کو مرنا ہے۔ کسی نہ کسی وقت وہ شخص اس قابل نہیں رہتا ہے کہ ملک کے نظام کو چلا سکے۔ اس وقت ملک انتہائی انتشار کے خطرے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال اس وقت آپ کے سامنے ہے[1]۔ جس شخص واحد پر نظام حکومت کے استحکام کا انحصار رکھا گیا تھا ہمیں کوئی خوشی نہیں ہے بلکہ ہمیں افسوس ہے کہ وہ اس وقت بیمار ہے۔ اس کی بیماری کی خبر آتے ہی لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہونے شروع ہو گئے کہ اب اس کے بعد کیا ہونا ہے! اگر ایک صحیح دستوری جمہوری حکومت ملک میں موجود ہو تو کسی شخص کے مرنے یا بیمار پڑنے سے کوئی پریشانی سرے سے لاحق ہی نہیں ہوتی۔ دستور کے مطابق بالکل پرامن طریقے سے ایک آدمی کی جگہ دوسرا آدمی لے لیتا ہے۔ کوئی ضرورت پیش نہیں آتی کہ اس شخص کی بیماری کو چھپایا جائے۔ کوئی ضرورت پیش نہیں آتی کہ وہ شخص کبھی چلکر دکھائے کبھی بول کر دکھائے کہ نہیں میں ابھی کام کے قابل ہوں۔ کوئی حاجت اس کی پیش نہیں آتی کہ ملک میں کوئی ایک شخص بھی مستقبل کے بارے میں پریشان ہو۔ اس لیے کہ ملک کا نظام اپنی جگہ مستحکم ہوتا ہے۔ اشخاص آتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں اور ہر جانے والے کی جگہ لینے کے لیے ایک باقاعدہ دستوری طریقہ موجود ہوتا ہے۔ جس سے بالکل پرامن طور پر اقتدار دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں جس وجہ سے لوگوں کو مستقبل کے متعلق پریشانی لاحق ہو گئی وہ یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں جو دستور بنایا گیا ہے وہ حقیقت میں کوئی ایسا دستور ہے ہی

---

[1] واضح رہے کہ یہ تقریر مارچ ۱۹۶۸ء کی ہے جب صدر مملکت بیمار تھے۔

نہیں جس میں پُرامن انتقالِ اقتدار کے لیے کوئی ضمانت موجود ہو۔ اس دستور میں اگر یہ لکھ بھی دیا گیا ہو کہ صدر کے بعد فلاں شخص عارضی طور پر ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے گا اور پھر انتخابات کرانے کے بعد نیا مستقل صدر اس کی جگہ لے گا، تو یہ عملاً بے معنی ہے۔ اس سے فی الواقع یہ نتیجہ برآمد ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ آئندہ انتخاب بھی ہو گا اور جو شخص بھی ہو جائے اس کی طرف اقتدار خود بخود منتقل بھی ہو جائے گا۔ اس لیے کہ ۱۹۶۲ء کا دستور طاقت سے بنا ہے اور طاقت ہی پر منحصر ہے۔ دستور نے صدر کو اختیارات نہیں دیے ہیں بلکہ صدر نے اختیارات ہاتھ میں لے کر دستور بنایا ہے۔ اس دستور میں صدر کو جو کلی اور ہمہ گیر اختیارات دیے گئے ہیں وہ صرف کسی ایسے ہی شخص کو حاصل ہو سکتے ہیں جو پہلے سے اتنی طاقت رکھتا ہو کہ خواہ اسے یہ اختیارات کوئی دینا چاہے یا نہ چاہے، بہر حال یہ اختیارات اسے حاصل ہو کر ہی رہیں۔ اس نوعیت کے دستور کے تحت یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ جو شخص پہلے سے کوئی طاقت نہ رکھتا ہو، وہ صرف اس بنا پر ہمہ مقتدر بن جائے کہ لوگوں نے سے صدر منتخب کر لیا ہے، اور پھر سول اور ملٹری کی تمام قوتیں اس کے آگے محض آئین کے زور سے سرنگوں ہو جائیں۔ یہاں جس وقت بھی صدر کی جانشینی کا سوال پیدا ہوا اس وقت فیصلہ کن چیز یہ نہیں ہو گی کہ ملک کے باشندوں کا اعتماد کسے حاصل ہے، بلکہ یہ ہو گی کہ اس وقت طاقت کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے ہاتھ میں بھی طاقت ہو گی اسے اگر دستور اقتدار دے گا تو وہ دستور کے ذریعہ سے لے گا، ورنہ وہ دستور کو اٹھا کر پھینک دے گا اور اقتدار ہاتھ میں لے کر اپنا دستور خود بنائے گا۔ اس کے راستے میں ملک کا دستور کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ یہاں دستور کی پابندی کی نہیں بلکہ اسے اٹھا کر پھینک دینے کی سنت جاری ہو چکی ہے۔ یہ کام اگر پہلے حرام نہ تھا تو اب کون اسے حرام کر دے گا؟ انقلاب میں مانع ہو سکتا تھا تو پہلا دستور ہی ہو جاتا۔ آئندہ انقلاب کو وہ دستور آخر کس اخلاقی یا مادی طاقت سے روک دے گا جو بنا ہی ایک انقلاب کے نتیجے میں ہے؟

سوال یہ ہے کہ کیا اس کا نام استحکام ہے؟ اس طرح کے نظام میں دس بارہ یا بیس پچیس سال اگر کوئی ایک ہی شخص ملک کے معاملات کا سربراہ کار رہتا ہے تو اس کا نام استحکام

نہیں ہے۔

استحکام اس کا نام ہے کہ قوم میں خود اپنا نظام چلانے کی طاقت موجود ہو۔ قوم کا اپنا ارادہ بالاتر ہو۔ وہ خود اپنا فیصلہ کرنے والی ہو کہ کس کے ہاتھ میں وہ اختیارات دے اور کس کے ہاتھ میں نہ دے۔ انتخاب سے ایک دن پہلے تک جو شخص کوئی طاقت اور کسی قسم کے اختیارات نہ رکھتا ہو، وہ صرف اس بناء پر اقتدار کا مالک ہو جائے کہ قوم نے اسے اپنا حکمران منتخب کیا ہے۔ جو شخص بھی اس طرح منتخب ہو، سول اور ملٹری کی طاقتیں آپ سے آپ اسکے تابع امر ہو جائیں اور کوئی چون و چرا نہ کر سکے۔ یہ ہوتا ہے اصل مستحکم نظام۔ اس طریقے سے کسی ملک کا نظام حکومت باقاعدگی کے ساتھ صدیوں چل سکتا ہے۔

اس طریقے پر نہیں چل سکتا کہ شخص واحد پر ملک کے استحکام کا انحصار ہو اور اس کے ہٹتے ہی ملک طالع آزماؤں کا بازیچہ بن جائے۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا کہ موجودہ اقتدار کے تحت ملک کو استحکام میسر آگیا ہے، قطعی غلط ہے۔ درحقیقت جو چیز میسر آئی ہے وہ یہ ہے کہ ملک ہر طویل یا مختصر مدت کے بعد ایک نئے انقلاب کے خطرے میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ ہماری وہ پوزیشن بن گئی ہے جو شرق اوسط اور جنوبی امریکہ کے بعض ممالک کی ہے۔ اس صورتِ حال کے ناپائیدار ہونے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی آمر دس بیس سال ٹھہرے یا چند مہینوں میں رخصت کر دیا جائے۔ یہ کوئی خدمت نہیں ہے جو اس ملک کی انجام دی گئی ہے۔ درحقیقت یہ ایک بڑی بے وفائی ہے جو اس قوم کے ساتھ کی گئی ہے۔

دوسرا دعویٰ جو اس نظام کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دور میں ملک کو بڑی ترقیات نصیب ہوئی ہیں۔ اس پر پہلی بات تو میں یہ عرض کروں گا کہ بالفرض اگر ترقیات نصیب ہوئی بھی ہوں تو ان کی نوعیت بالکل ایسی ہے جیسے ایک جیل خانہ میں لوگوں کو اچھی کوٹھیاں فراہم کر دی جائیں، ان کے لیے روشنی اور کھانے پینے کا بہتر انتظام کر دیا جائے، اور قیدیوں کو اچھے کپڑے پہنا دیے جائیں۔ یہ اگر ترقیات ہیں تو جیل خانے کی ترقیات ہیں۔ کیا کوئی شخص جسے ناروا طریقے پر قید کر دیا گیا ہو اور جو کسی

جائز بنیاد پر قید کی سزا پانے کا مستحق نہ ہو، صرف اس وجہ سے جیلر کا شکر گزار ہو گا کہ تو نے جیل میں رکھا اور اچھی طرح رکھا؟ اصل شکایت تو یہی ہے کہ آپ نے ملک کو جیل خانہ بنا دیا ہے۔ جس طرح سے جیل میں قیدی کوئی احتجاج نہیں کر سکتے، کوئی اظہار رائے نہیں کر سکتے، کوئی جلسہ نہیں کر سکتے، جیل کے انتظام میں دخل نہیں دے سکتے، جیل کے حالات سے باخبر نہیں رہ سکتے، اور کوئی دو قیدی اس کے مجاز نہیں ہو سکتے کہ مل کر کوئی مطالبہ کریں اور اسے منوانے کے لیے دباؤ ڈالیں، وہی پوزیشن آپ نے سارے ملک کی بنا دی ہے۔ سارے ملک میں لوگوں کو اظہار رائے کی کوئی آزادی نہیں ہے۔ اجتماع کی کوئی آزادی نہیں ہے۔ ملک کے لوگوں کو ملک کے صحیح حالات سے باخبر رہنے کا کوئی موقع حاصل نہیں ہے۔ ملک کے معاملات چلانے میں ان کی رائے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اپنی شکایات اور اپنی تکلیفوں کے اظہار کا کوئی موقع میسر نہیں ہے۔ اس طرح پورے ملک کو جیل بنا دینے کے بعد اگر اس جیل خانے میں ترقیات ہو رہی ہوں تو یہ کون سی شکر کی بات ہے! پنجرے میں پرندے کو بند کر کے آپ موتی بھی چگوائیں تو پنجرہ آخر پنجرہ ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ترقیات بھی نہیں ہو رہی ہیں۔ ترقیات اس شکل میں ہو رہی ہیں کہ اربوں روپیہ بیرونی ممالک سے قرض حاصل کیا جا رہا ہے۔ پورے ملک کو رہن رکھ دیا گیا ہے۔ پوری قوم کا بال بال سودی قرضوں میں بندھ گیا ہے۔ اس معاملے میں زیادہ معلومات آپ کو چوہدری محمد علی صاحب دے سکتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے صحیح صورتِ حال بیان کر دی ہے۔ مجھے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ نام نہاد ترقیات اسی طرح کی ترقیات ہیں جیسی ترقیات کی نمائش پہلے ہمارے ہاں کے بگڑے ہوئے نواب، جاگیردار اور خاندانی رئیس مہاجن سے قرضے لے لے کر کیا کرتے تھے۔ سودی قرضوں میں ان کا اور ان کی آئندہ نسلوں کا بال بال بندھ جاتا تھا اور اس پر ٹھاٹھ کی کوٹھی بنتی تھی، عیش کے سامان فراہم ہوتے تھے اور بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں ہزاروں اور لاکھوں روپیہ خرچ کر کر کے کی جاتی تھیں۔ اسی طرح اب ایک غریب ملک کی اپنی دولت بھی اور باہر سے لیے ہوئے سودی قرضوں سے حاصل کی

ہوئی دولت بھی حقیقی ترقی کے کاموں پر کم اور نمائش شان و شوکت کے اظہار پر زیادہ صرف کی جا رہی ہے، اور اس دولت کا اچھا خاصا حصہ رشوت، غبن اور خیانت میں بھی اڑ رہا ہے خمیازہ ان قرضوں اور ان کے سود کا غریب عوام اور ان کے بیٹے اور پوتے بھگتیں گے۔ فائدہ اس کا ان چند لوگوں کو حاصل ہوگا جنہیں اتفاقات زمانہ نے ان غریبوں کی گردن پر سوار ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ان ترقیات کا کوئی فائدہ عوام کو پہنچا ہے یا نہیں، اس کا پیمانہ اگر کوئی ہے تو یہ کہ عوام کی خوشحالی میں کوئی اضافہ ہوا ہے یا نہیں۔ اس لحاظ سے آپ دیکھیں گے تو بلا کسی اشتباہ کے آپ کو یہ نظر آئے گا کہ ملک کی صنعتی و تجارتی ترقی کا سارا فائدہ وہ ایک مختصر سا طبقہ لوٹے لیے جا رہا ہے جو افسر شاہی اور بڑے کاروباری لوگوں کے گٹھ جوڑ سے ہمارے ہاں بن گیا ہے۔ باقی رہے عوام تو ان کی آمدنی میں اتنا اضافہ نہیں ہو سکا جتنا ان کے مصارف زندگی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس طرح ان ترقیات سے قوم کے چند لاٹے تو بے شک زیادہ سے زیادہ خوش حال ہو رہے ہیں، مگر قوم بحیثیت مجموعی بدحال ہو رہی ہے یہ ہے اس دوسرے دعوے کی حقیقت جو اس انقلاب کو حق بجانب اور مفید ثابت کرنے کے لیے بار بار دہرایا جاتا ہے۔

اب میں عرض کروں گا کہ مثبت طور پر (POSITIVELY) اس انقلاب نے ملک کو کیا نقصانات پہنچائے ہیں۔ اس کا اوّلین نقصان یہ ہوا ہے کہ حکومت کے جو اختیارات اصولاً تین بڑے اجزائے ریاست (ORGANS OF STATE) یعنی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ میں توازن کے ساتھ تقسیم ہونے چاہئیں، انہیں اس انقلاب نے صرف انتظامیہ میں بلکہ درحقیقت انتظامیہ کے بھی صرف ایک فرد میں مرکوز کر کے رکھ دیا ہے۔ کسی ملک کے نظام کے صحیح طور پر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ تینوں اجزائے ریاست آزاد ہوں، مستقل ہوں، کوئی دوسرے کی حدود میں تجاوز نہ کرے اور ہر ایک کو دوسرے کی بے جا مداخلت سے آزاد رہ کر کام کرنے کا پورا موقع حاصل رہے۔ لیکن یہاں ۱۹۶۲ء کے دستور کی رو سے جو نظام قائم کیا گیا ہے اور جو نظام اس کے تحت عملاً چلایا جا رہا ہے، اس میں مقننہ اور عدلیہ کو مفلوج کر دیا گیا ہے، اور انتظامیہ مختار کل (ALL IN ALL) بن گئی ہے۔ جہاں تک مقننہ کا تعلق ہے اس کا کام ملک کیلئے

قانون بنانا ہے۔ ملک کے لوگوں کے لیے قانون بنانے کے معاملے میں اگر ملک کے نمائندے آزاد نہ ہوں اور اصل فیصلہ انتظامیہ کے ہاتھ میں ہو تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں وہ ڈنڈا ہے جس سے وہ ملک کا نظام چلاتے ہیں انہی کے ہاتھ میں یہ اختیار بھی ہو کہ اپنے ڈنڈے کے استعمال کے لیے وہ خود ہی اپنی مرضی کے مطابق قانون بھی بنالیں۔ اس کے بعد اگر ملک کے نمائندوں سے اس پر انگوٹھا لگوایا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انتظامیہ کو یہ قانونی اختیارات درحقیقت ملک کے باشندوں کی طرف سے ان کے نمائندوں نے دیے ہیں، بلکہ یہ صرف جمہوریت کا فریب ہے جس کا باطن انصاف کی روح سے بالکل خالی ہے۔ آگے چل کر عدلیہ کے ذریعے سے لوگوں کو انصاف حاصل کرنے کا جو موقع ملتا ہے وہ اس لیے بے معنی ہو جاتا ہے کہ عدالتیں خود قانون ساز نہیں ہیں بلکہ وہ اس قانون کے مطابق فیصلے کرنے پر مجبور ہیں جو مقننہ سے بن کر آئے۔ اگر انتظامیہ مقننہ پر مسلط ہو گئی ہو اور قانون بنانے کے معاملے میں ملک کے نمائندے آزاد نہ ہوں تو عدلیہ کو سرے سے وہ منصفانہ قانون ہی نہیں ملے گا جس کے مطابق وہ انصاف کر سکے۔ یوں ہمارے ہاں مقننہ کے ساتھ عدلیہ بھی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ عدلیہ کو مفلوج کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں ان کو مجھ سے بڑھ کر آپ حضرات جانتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ وہ انتظامیہ جو اس دستور میں مختار کل بنائی گئی ہے وہ بجائے خود کس طرح وجود میں آتی ہے۔ اس کے بننے کی شکل بظاہر جمہوری رکھی گئی ہے۔ جس صدر کے ہاتھ میں انتظامیہ کے اختیارات مرکوز کیے گئے ہیں وہ انتخاب سے صدر بنتا ہے اور انتخاب ہی کے ذریعے سے مقننہ کے ارکان منتخب ہو کر آتے ہیں۔ لیکن انتخاب کا طریقہ یہ نہیں رکھا گیا ہے کہ ملک کے باشندے براہ راست بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر خود ان کو منتخب کریں بلکہ اس کے لیے راستہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ہزار ہزار آدمی ایک ایک شخص کو منتخب کر کے انتخابی ادارے (ELECTORAL COLLEGE) کا ممبر بنائیں اور پھر اس ادارے کے ممبر جو پہلے اسی ہزار تھے اب ایک لاکھ بیس ہزار کر دیے گئے ہیں، یہ فیصلہ کریں کہ

ہمارے ملک کا صدر کون ہو اور ہماری مرکزی اور صوبائی مقننہ کے ارکان کون ہوں۔ یہ راستہ کیوں اختیار کیا گیا ہے؟ اس کی کوئی معقول وجہ اس کے سوا ہرگز ثابت نہیں کی جا سکتی کہ ایک استبدادی نظام اس کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ ایک جمہوری نظام چلانا ہو تو اس کا سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ ملک کے لوگ اپنے ملک کا نظام چلانے والوں کو براہِ راست خود منتخب کریں۔

استبدادی نظام اگر جمہوریت کا لیبل لگا کر چلانا ہو تو اس کے لیے اس سے زیادہ چالاکی کا طریقہ اور کوئی نہیں ہے کہ پہلے تمام باشندوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان سے ایک ایک نمائندہ چنوایا جائے تاکہ تھانے داروں، تحصیلداروں اور پٹواریوں اور انتظامیہ کے دوسرے ملازمین کے ذریعہ سے دباؤ ڈال کر ان سے اپنی مرضی کے آدمی چنوائے جا سکیں پھر اس طریقے سے جو ابتدائی نمائندے منتخب کرائے جائیں انہیں پھر چھوٹے چھوٹے حلقوں میں بانٹ دیا جائے تاکہ ان سے صدر اور ارکان مقننہ کا انتخاب بسہولت کرایا جائے اس صورت میں دباؤ اور لالچ زیادہ اچھی طرح کارگر ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ظاہر بات ہے کہ حلقہ انتخاب جتنا بڑا ہو گا اور رائے دہندوں کی تعداد جتنی زیادہ ہو گی، دباؤ اور لالچ سے کام لینے کے امکانات اتنے ہی کم ہوں گے۔ اس طرح بہ ظاہر ایک جمہوری طریقے سے اس انتظامیہ نے اپنے اقتدار کو دائمی اور مستقل بنانے کا بندوبست کیا ہے۔ اور یہ ہے "بنیادی جمہوریت"! ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے لوگ اس جمہوریت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ہم ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ واقعی اسے ہم خوب سمجھتے ہیں، بلکہ ذہانت کی داد بھی دیتے ہیں۔

دوسرا نقصان عظیم جو اس ملک کو پہنچایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں آزادیٔ اظہارِ رائے کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ کوئی جمہوری نظام ایسی حالت میں چل ہی نہیں سکتا ہے، بلکہ جمہوری نظام کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا، جب کہ پریس آزاد نہ ہو اور لوگوں کو اظہارِ رائے اور اجتماع کے بنیادی حقوق حاصل نہ ہوں۔ یہاں پہلے تو ۱۹۶۲ء کے دستور میں بنیادی حقوق سرے سے عدالتوں کے ذریعے سے قابلِ حصول ہی نہیں رکھے گئے تھے بلکہ وہ ایک طرح کی ہدایات تھیں

جو صرف زینت دستور بنائی گئی تھیں بغیر اس کے کہ انہیں حاصل کرنے کا کوئی قانونی طریقہ مقرر کیا گیا ہو۔ پھر جب اس کا مطالبہ کیا گیا تو بہت سارے تحفظات کے ساتھ ۱۹۶۴ء کے آغاز میں بنیادی حقوق کو بحال کیا گیا، مگر ۱۹۶۵ء کی جنگ کا بہانہ ملتے ہی انہیں پھر سلب کر لیا گیا۔ اب اس وقت در حقیقت آپ کے ملک کے گیارہ بارہ کروڑ باشندوں کو کوئی بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ نہ وہ اظہار رائے کر سکتے ہیں، نہ جلسے کر سکتے ہیں، نہ پریس کو کوئی آزادی حاصل ہے نہ لوگوں کو ملک کے صحیح حالات کسی ذریعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ خبر رسانی کے ذرائع پر حکومت کا تسلط ہے۔ سارے ملک میں ہر طرف ایک ہی آواز گونج رہی ہے اور وہ حکمرانوں کے قصیدوں کی آواز ہے۔ اس یک طرفہ پروپیگنڈے کا دودھ پلا پلا کر ایک بے خبر، بے زبان اور بدھو قوم پرورش کی جا رہی ہے۔ اس طرح کا نظام اگر کسی ملک میں ایک مدت تک چلتا ہے تو اس ملک کے باشندے کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہی نہیں ہو سکتے۔

ایک قوم اپنے پاؤں پر اسی صورت میں کھڑی ہو سکتی ہے جب کہ وہ اپنے ملک کے حالات سے باخبر ہو۔ ان حالات پر ملک میں آزادانہ بحث مباحثہ ہو، لوگوں کے سامنے ہر نقطۂ نظر آزادی کے ساتھ آئے، اور لوگ مختلف مسائل اور معاملات کے متعلق رائے قائم کرنے کے قابل ہوں۔ لیکن جہاں پریس کا بھی گلا گھونٹ دیا جائے، پلیٹ فارم پر بھی دفعہ ۱۴۴ کا قفل لگا دیا جائے، اور خبر رسانی کے ذرائع پر بھی کنٹرول کر کے لوگوں کے لیے ملک کے صحیح حالات جاننے کے مواقع باقی نہ رہنے دیئے جائیں، ایسی جگہ کسی آزادی اور کسی جمہوریت کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے آج یہی ظلم یہاں اپنی ہی قوم پر کیا جا رہا ہے۔ یہاں کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ ملک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود اپنے ملازموں پر منحصر ہو کر رہ جائے اور اس کے باشندے کبھی اس قابل نہ ہو سکیں کہ اپنے معاملات کو خود سمجھیں اور اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوں۔ اس سے بڑھ کر بدخواہی کسی قوم کے ساتھ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے نابالغ بچوں میں تبدیل کر دیا جائے جس طرح ایک نابالغ بچہ اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سرپرست (GUARDIAN) ہو جو اس کی جائیداد کا انتظام کرے، اور وہ خود اپنا انتظام کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس طرح یہاں کوشش کی جا رہی ہے کہ اس قوم کو

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابالغ بنا کر رکھا جائے اور اسے ہمیشہ ایک سرپرست کی احتیاج لاحق رہے۔

تیسرا عظیم نقصان جو اس ملک کو پہنچایا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں خوشامدیوں اور ضمیر فروشوں کی ایک نسل تیار کی جا رہی ہے۔ میں عرض کروں گا کہ ایک قوم کے لیے یہ بدترین اخلاقی زہر ہے جس سے بڑھ کر اس کے لیے تباہ کن کوئی چیز نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو نہ بکے نہ ڈرے نہ دھوکا کھائے وہ ناپسندیدہ (UNDESIRABLE) آدمی ہے۔ مانگ صرف ان لوگوں کی ہے جو یا تو کسی قیمت پر اپنے آپ کو فروخت کریں، یا ڈر کر بک جائیں یا دھوکہ کھا کر حکمرانوں کے گن گانے لگیں۔ اسی طرح کے لوگوں کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اسی طرح کے لوگوں کے لیے تمام فوائد کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی لوگ لائسنس، پرمٹ اور تمغے پا رہے ہیں اور انہی پر طرح طرح کے انعامات کی بارش ہو رہی ہے۔ یوں گویا ساری دنیا کو دکھایا جا رہا ہے کہ ہمارا ملک بکاؤ مال کی بہت بڑی منڈی ہے جس میں اس مال کی فراہمی کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جتنا چاہیے اتنا ہی بکاؤ مال ملتا چلا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک قوم کی اس سے زیادہ بے وقری اور بے آبروئی کوئی نہیں ہو سکتی کہ دنیا بھر یہ جان لے کہ یہاں جو شخص بھی ایک مرتبہ طاقت کے ذریعے قابض ہو جائے اس کی بندگی کرنے کے لیے اس میں بے تحاشا آدمی نکلتے چلے آتے ہیں۔ یہ چیز ہر اس ظالم کی ہمت بڑھا دے گی جو کبھی ہمارے ملک پر حملہ آور ہونے کا خیال رکھتا ہو۔ یہ اسے امید دلائے گی کہ میں اس ملک پر قبضہ کر لوں تو مجھے بھی اسی طرح بے تحاشا بکاؤ مال ملتا چلا جائے گا اور الٹے وہ لوگ نمونہ بنائے جائیں گے جو میرے مقابلے میں آزادی کا نام لیں۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم اس نظام کو غلط، خلافِ حق اور نقصان دہ سمجھتے ہیں اور اسے پرامن طریقوں سے بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ یہ نظام درہم برہم ہو اور اس کی جگہ بدنظمی پھیل جائے، یا ایک انقلاب کی جگہ اس سے بدتر انقلاب آ جانے کا خطرہ ملک کو لاحق ہو۔ ہم تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک آمریت کو پرامن آئینی طریقوں سے

بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اس میں انشاء اللہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے بشرطیکہ ملک کے تمام سوچنے سمجھنے والے طبقے ہمارے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوں اور ملک کے عوام کا شعور بیدار کر کے انہیں اپنے کھوئے ہوئے حقوق حاصل کرنے کے لیے متحد کر دیا جائے۔ ہمیں یہ کوشش بھی نہیں کرنی ہے کہ ۱۹۶۲ء کے دستور کو توڑ کر کوئی نیا دستور بنایا جائے۔ اور اس کے بنانے میں پھر چند سال اس طرح ضائع کیے جائیں جس طرح آزادی کے بعد ضائع کیے گئے تھے۔ ہمارے پاس ۱۹۵۶ء کا دستور بنا بنایا موجود ہے جسے ملک کے نمائندوں نے بنایا تھا اور جسے کسی جائز قانونی حق کے بغیر منسوخ کر دیا گیا۔ ہمیں کوشش صرف یہ کرنی ہے کہ فیلڈ مارشل صاحب کے دستور کی جگہ ملک کے نمائندوں کا بنایا ہوا دستور پھر سے جاری ہو جائے۔ یہ بالکل ایک فطری اور معقول بات ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اسے تسلیم کرنے میں کسی معقول آدمی کو کوئی زحمت پیش آ سکتی ہے۔"

... ...

اس نوعیت کی تقاریر تمام سیاسی اکابرین پی۔ ڈی۔ ایم نے ملک کے مختلف علاقوں کی بار کونسلوں میں جا جا کر کیں۔ ملک کے دونوں حصوں مشرقی اور مغربی پاکستان کا دورہ کیا اور قانون دان دانشور طبقے تک اپنی بات پہنچائی۔

اس مہم نے جو سیاسی اور عوامی دباؤ پیدا کیا۔ اس کے نتیجے میں صدر ایوب کی حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کا بار بار نفاذ کچھ کم کر دیا۔ اس کے دو ظالم گورنروں نے بھی لوگوں کو بات کہنے سننے کا موقعہ دینا شروع کر دیا۔ چنانچہ بار کونسلوں اور معززین کے اندرون چہار دیواری خطابات کا دائرہ پھیل کر بالآخر چھوٹے چھوٹے اور پھر بعد میں بڑے بڑے جلسہ ہائے عام کی صورت اختیار کر گیا اور دسمبر ۱۹۶۷ء سے چل کر مئی ۱۹۶۸ء تک آتے آتے پی۔ ڈی۔ ایم کے تحت بڑے بڑے جلسے منعقد ہونے شروع ہو گئے۔ جن میں تمام اکابر سیاسی رہنما تقاریر کرتے رہے۔ ان تقاریر میں سے جو بے شمار کی گئیں ہم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان کی ایک مطبوعہ تقریر کا مکمل متن یہاں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ نمونہ سامنے آ جائے جس نوعیت کی سیاسی مہم صدر ایوب کے خلاف پی۔ ڈی۔ ایم چلا رہی تھی۔

جلسہ عام سے خطاب[1]

جناب صدر اور محترم حاضرین!

آپ کے سامنے تحریک جمہوریت کے اغراض و مقاصد تو انشاء اللہ اس تحریک کے دوسرے رہنما تشریح کے ساتھ بیان کریں گے، میں اس وقت صرف اس ملک کی قریب ترین تاریخ کے دو دوروں کا فرق آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس غرض کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس ملک کا ہر آدمی خواہ وہ کسی طبقے اور کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو، اس فرق پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور سوچے کہ اس فرق کی حقیقی وجہ کیا ہے؟

ایک دور ہماری آزادی سے پہلے کا ہے جب ہم اس ملک میں انگریز کے غلام تھے۔ دوسرا دور ہماری آزادی کے بعد کا ہے جب ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس غلامی سے نجات عطا فرمادی۔ ہماری آزادی سے پہلے ہماری غلامی کا دور ۱۸۵۷ء سے شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء تک قائم رہا، یعنی ۹۰ برس تک انگریزی حکومت یہاں قائم رہی۔ اس دور میں انگریزی قوم کے ہزارہا افراد اس ملک میں حکومت کرنے کے لیے انگلستان سے آتے رہے۔ فوجی بھی اور سول سروس کے آدمی بھی۔ اونچے مرتبے کے بھی اور ادنیٰ مراتب کے بھی۔ ان میں گورنر جنرل بھی تھے اور بعد کے دور میں آنے والے وائسرائے بھی۔ ان کی فوج کی قیادت بڑے بڑے جنرل کرتے رہے۔ ان کے سول کے محکمے بھی بڑے بڑے آئی سی ایس افسر چلاتے رہے جو حکمرانی کی صلاحیتوں کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ لیکن پورے ایک سو نوے برس کی مدت میں کسی گورنر جنرل، کسی وائسرائے، کسی کمانڈر انچیف، کسی فوجی جنرل، اور کسی گورنر یا سیکرٹری کے دماغ میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میری قوم یہاں سے چھ ہزار میل دور کے فاصلے پر رہتی ہے، یہ ایک عظیم الشان ملک ہے جو

---

[1] یہ جلسہ عام لاہور میں ۲۵ مئی ۱۹۶۸ء کو منعقد ہوا تھا جس میں مولانا مودودی نے یہ تقریر کی۔

سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور ہے اور اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ کیوں نہ میں اس پر قبضہ کر لوں اور یہاں اپنی ذاتی اور خاندانی ریاست قائم کر لوں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب یہ لوگ باد بانی جہازوں پر آتے تھے اور نہر سویز بھی نہیں کھدی تھی، راس امید (CAPE OF GOOD HOPE) کے راستے سے گھوم کر آتے تھے۔ اگر کوئی اپنی قوم سے منحرف ہو کر اس ملک پر قابض ہو جاتا تو انگلستان کے لوگوں کو ۶ مہینے سے پہلے یہ خبر نہ پہنچتی کہ ہمارے ایک گورنر یا گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف نے ہم سے بغاوت کر کے یہاں ایک مفتوحہ ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔ لیکن اس پورے دور میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں آئی کہ کسی کے دماغ میں یہ خیال تک آیا ہو۔

غور کیجئے اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قوم کے تمام افراد فرشتے نہیں تھے۔ ان کے اندر بھی بڑے بڑے خناس اور بڑے بڑے خر دماغ لوگ پائے جاتے تھے اور ہونے چاہئیں تھے۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایسا نہ ہو۔ دنیا کی ہر قوم میں برے سے برے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی وجہ تو تھی کہ ۱۹۰ برس کے اس پورے زمانہ میں کوئی شخص بھی یہ جرأت نہ کر سکا۔ بلکہ تاریخ ایسے کسی اشارے سے بھی خالی ہے کہ کسی نے یہ کام کرنے کا کبھی خیال ہی کیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں اور آپ بھی غور کریں گے تو غالباً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس کے بنیادی سبب صرف دو تھے۔

اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ انگریزی قوم میں بحیثیت قوم کے یہ عزم اور یہ پختہ ارادہ موجود تھا کہ اپنے تمام افراد کو اور اپنے ان تمام لوگوں کو جنہیں وہ فوج یا سول سروس میں کوئی منصب دیں، یا پبلک کے کسی کام کے لیے کوئی اختیار دیں، اپنی قومی روایات کا اپنے قومی ضابطے اور آئین کا، اور اپنے اجتماعی نظم و ضبط (ڈسپلن) کا پابند بنا کر رکھیں گے ان کے قومی طرزِ عمل سے ہر شخص کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر میں کوئی اقدام اپنی قوم کی مرضی کے خلاف کروں گا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا میں پوری قوم کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہا ہوں۔ میری قوم بالاتفاق میری مخالف ہو جائے گی۔ اور پوری قوم میں کوئی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو گا۔ ایک طرف میں ہوں گا اور دوسری طرف ساری قوم، اور

ظاہر بات ہے کہ ایک شخص اپنی قوم سے لڑ کر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ پہلی وجہ تھی جس نے کسی شخص کو کبھی اس قوم کے ارادے اور فیصلے سے ہٹنے نہ دیا۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس قوم کے جتنے ملازمین تھے، خواہ وہ فوجی ہوں یا سول، ان سب کے اندر اس قوم کی تعلیم و تربیت نے ایک قومی سیرت و کردار (نیشنل کیریکٹر) پیدا کر دیا تھا۔ نظم و ضبط (ڈسپلن) ان کے رگ و ریشے میں رچ بس گیا تھا۔ قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کا ایک تصور ان کے ذہن میں گہرا جما دیا گیا تھا۔ ان کو یہ تربیت ملی تھی اور اس کی رگ رگ میں یہ بات اتری ہوئی تھی کہ قوم کی مرضی کا مظہر وہ آئین اور ضابطہ ہے جس پر ملک کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ اس آئین اور ضابطے کے اندر ہی کسی کی اطاعت ہو سکتی ہے۔ اس کے حدود سے باہر جا کر کسی کو نہ حکم دینے کا حق پہنچتا ہے، نہ کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ آئین و قانون کے خلاف جو حکم دیا گیا ہو اس کی وہ اطاعت کرے۔ کوئی کمانڈر انچیف، کوئی فوجی جنرل، یا کوئی وائسرائے یا گورنر جنرل قوم سے بغاوت کر کے ہندوستان میں خود مختار ہونا چاہتا بھی تو ظاہر ہے کہ وہ اکیلا اپنی مرضی نہیں چلا سکتا تھا۔ لامحالہ اسے اپنی فوج کے دوسرے افسروں کو ملانا پڑتا۔ سول سروس کے عہدیداروں کو ساتھ لینا پڑتا۔ تب ہی وہ ملک کی حکومت اپنے قبضے میں لے سکتا تھا۔ لیکن وہ ہرگز یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اگر جلوتوں میں بھی کسی دوسرے انگریز فوجی افسر یا سول سروس کے کسی آدمی کے سامنے یہ بات کرے گا تو کوئی اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ بلکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بجائے اس کے کہ

اس کا ساتھ دے وہ فوراً دوسرے فوجی

افسروں کو اس کی خبر کر دے گا۔ اور اس کے اپنے ماتحت اسے گرفتار کر کے، قوم کی پارلیمنٹ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیں گے۔ فوجی نظم کی اطاعت کا سبق اپنی فوج کو انہوں نے پوری طرح دیا تھا۔ ایک ایک فوجی افسر اور سپاہی یہ سبق خوب پڑھے ہوئے تھے۔ افسروں کا حکم ماننا ان کی گھٹی میں اترا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ایک ایک آدمی کے ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ ساری اطاعت آئین کے اندر ہے۔ آئین کے باہر جا کر کسی کے

لیے کوئی اطاعت نہیں ہے، حتیٰ کہ بادشاہ بھی اگر آئین و قانون کی خلاف ورزی کا حکم دے تو اس کی تعمیل کرنے والا الٹا مجرم ہے، اور وہ یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ اس نے اپنے سے بالاتر کسی افسر یا بادشاہ کے حکم سے یہ جرم کیا ہے۔

یہ ہے قانون کی حکمرانی کا تصور ــــ اس تصور کو آپ ایک مثال سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں فرض کیجئے کہ کوئی آئی جی پولیس اپنے ماتحت سپاہیوں کو یہ حکم دے کہ عدالت میں پولیس کی طرف سے استغاثے کا جو مقدمہ (CASE) پیش کیا گیا ہے، اگر جج اس کے خلاف فیصلہ دے تو فوراً اس کو گولی مار دینا۔ کسی سپاہی کا یہ کام نہیں ہے کہ آئی جی پولیس کے اس حکم کی اطاعت کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو مجرم ہو گا۔ کیونکہ اسے پولیس کے سپاہیوں پر جو کچھ بھی اختیارات حاصل ہیں وہ آئین کی بناء پر ہیں۔ آئین کے حدود کے اندر ہیں۔ ان حدود سے باہر جا کر اس کو حکم دینے کا سرے سے کوئی اختیار ہی حاصل نہیں ہے کہ اس کی پیروی کرنیوالا مجرم ہونے سے بچ سکے۔

آئین و ضابطہ کی پابندی اور قانون کی حکمرانی کا یہ تصور انگریزی حکومت کی تمام ملازمتوں (SERVICES) میں بڑی گہری جڑوں کے ساتھ اترا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک معمولی ملازم بھی، جس کی تعلیم میٹرک کیا معنی، مڈل کے معیار کی بھی نہ ہوتی تھی، آئین کے حدود سے باہر کسی افسر کی اطاعت کے لیے تیار نہ تھا، اور اس قومی تربیت نے انگریز قوم کے بڑے بڑے خناسوں کو اس طرح باندھ رکھا تھا کہ وہ کسی بغاوت کا خیال تک اپنے دماغ میں پرورش کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ قانون کی حکمرانی کا یہ تصور کچھ انگریزوں کا ایجاد کردہ نہیں ہے۔ اس کے انگریزی تصور سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ اور ارفع صورت میں اسے اسلام میں پیش کیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کی تربیت ہی اسی اصول پر کی تھی۔ انگریزوں کے ہاں چونکہ حاکمیت قوم کی ہے اس لیے ان کے ہاں قوم کے بنائے ہوئے آئین اور دستور کی بالاتری کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کو یہ تعلیم و تربیت دی جاتی ہے کہ تم جس کی اطاعت بھی کرو گے اس آئین و دستور کے اندر

رہ کر کرو گے۔ اس کے حدود سے باہر جا کر کسی کی اطاعت نہ کرو گے۔ اس کے برعکس اسلام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور قوم خود بھی اس کی اطاعت کی پابند ہے، اس لیے اللہ کا قانون سب پر بالا ہے، کسی کو نہ اس سے ہٹ کر کوئی حکم دینے کا اختیار ہے، نہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ جو حکم خدا کے قانون کے خلاف دیا گیا ہو اس کی وہ تعمیل کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ (خالق کی نافرمانی میں کسی کے لیے بھی کوئی اطاعت نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا عہد لیا گیا ہے وہاں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ لا یعصیك فی معروف۔ یعنی نبیؐ کی فرمانبرداری معروف میں ہے۔ حالانکہ نبی کے متعلق کوئی یہ تصور تک نہیں کر سکتا کہ حضورؐ کبھی منکر کا بھی حکم دے سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی تک کی اطاعت کو معروف کی شرط سے مشروط فرما دیا، تاکہ کوئی شخص کبھی یہ سوچ بھی نہ سکے کہ دنیا میں کسی بندے کی اطاعت معروف کی حدوں سے باہر جا کر کی جا سکتی ہے۔ اس کی ایک عجیب و غریب مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیش آئی۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ایک فوجی دستے کو ایک مہم پر روانہ کیا۔ کچھ دور آگے جا کر اس دستے کے کمانڈر نے سپاہیوں کو جمع کر کے کہا میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میرے احکام کی اطاعت کس حد تک کرتے ہو۔ پھر اس نے آگ کا ایک الاؤ تیار کرایا اور فوج سے کہا کہ اس کے اندر کود پڑو۔ فوج نے انکار کر دیا اور اس سے کہا "آگ ہی سے بچنے کے لیے تو ہم نے اس دین کو قبول کیا تھا، تم آگ ہی میں ہمیں دھکیلتے ہو!" اس کے بعد یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا کہ ہمارے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اگر تم اس کا حکم مان لیتے تو ہمیشہ ہمیشہ آگ ہی میں رہتے۔" اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رول آف لاء کیا چیز ہے۔

قانون کی حکمرانی کا اسلامی تصور تو خیر، بہت ہی اعلیٰ و ارفع چیز ہے، میں نے یہاں آپ کو اس سے کمتر درجے کی ایک تاریخی نظیر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور اس لیے دلائی

ہے کہ ایک کافر قوم میں آئین وقانون کے احترام کا یہ نقشہ آپ خود دیکھ چکے ہیں۔ یہ آپ کی تاریخ کے قریب ترین دور کی نظیر ہے۔ وہ لوگ ابھی زندہ موجود ہیں جنہوں نے خود اس ملک میں یہ نقشہ دیکھا ہے۔ پھر اس کی طرف توجہ دلانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں آج تک انگریزی آئین ہی کو مانا جاتا ہے۔ ہماری عدالتوں میں انگریزی قانون ہی چل رہا ہے۔ برطانوی عدالتوں ہی کی نظیریں پیش کی جاتی ہیں اور ہمارے ہاں کے حکمران ہر وقت انگریزی ہی ھگارتے رہتے ہیں۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انگریزی قوم کی حکومت کو جس چیز نے ایسا زبردست استحکام بخشا تھا وہ کس چیز کا رہین منت تھا۔ یہ سارا کرشمہ دو ہی چیزوں کا تھا۔ ایک طرف قوم کے اندر اس ارادے کا پختہ ہونا کہ وہ کبھی کسی کو اپنے ڈسپلن سے باہر جانے کی اجازت نہ دے گی۔ اگر کوئی قوم کی مرضی اور اس کے آئین کے خلاف حرکت کرنے کی ہمت کرے گا تو پوری قوم اس کے مقابلے میں ڈٹ جائے گی اور اس کو نیچا دکھا کر چھوڑے گی۔ دوسری طرف اس کی تمام ملازمتوں (SERVICES) میں قانون کی حکمرانی کے اس تصور کا گہری جڑوں پر جما ہوا ہونا جس نے کبھی کسی بڑے سے بڑے افسر کو بھی اپنے دل میں یہ توقع پالنے کی ہمت نہ کرنے دی کہ وہ قوم کے آئین سے بغاوت میں اپنی ماتحت فوج یا سول سروس سے کوئی تعاون حاصل کر سکے گا۔______

یہ تو تھا جناب آپ کی غلامی کے دور کی تاریخ کا منظر جو بیس سال پہلے تک آپ یہاں دیکھتے رہے ہیں۔ اب ذرا وہ نقشہ دیکھئے جو آزاد ہونے کے بعد آپکی پچھلے بیس برس کی تاریخ پیش کر رہی ہے۔

آپ کو آزاد ہوئے ابھی چھ برس ہی ہوئے تھے کہ ۱۹۵۳ء میں آپ کی گاڑی کا کانٹا بدلنا شروع ہو گیا۔ یہ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی تھی جو گورنر جنرل کے حکم سے ہوئی تھی۔ میں اس وقت لاہور کے قلعے میں قید تھا۔ مجھے جو اخبارات وہاں ملتے تھے ان میں یہ خبر اس طرح سے آئی کہ گویا یہ ایک بڑا ہی ضروری اور مفید اقدام تھا جو گورنر جنرل صاحب نے بروقت کر دیا۔ اس کو جرأت مندانہ قدم (BOLD STEP) قرار دیا گیا۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس حرکت کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھی۔ حالانکہ یہ اس بات کی کھلی علامت تھی کہ

یہاں آئین اور آئینی روایات کو توڑنے کا آغاز ہو گیا ہے۔ میں ذرا اختصار کے ساتھ آپ کو بتاؤں گا کہ اس کے معنی حقیقت میں کیا تھے۔

ملک کو جو آزادی حاصل ہوئی تھی وہ ایک پوری قوم کی جدوجہد کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ اس جدوجہد کی بدولت جب انگریزی قوم اس بات پر آمادہ ہوئی کہ اپنا اقتدار یہاں سے اٹھالے اور اس قوم کی طرف اختیارات منتقل کر دے جس کی آزادی کا حق اس نے مانا تھا، تو اس کی پارلیمنٹ نے قانون آزادیٔ ہند (INDIAN INDEPENDANCE ACT) کے نام سے ایک قانون پاس کیا جس کے ذریعے سے اختیاراتِ حکمرانی اور اقتدار حکومت اہلِ پاکستان کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ اب قوم کی مرضی کی مظہر آپ کے ملک کی پارلیمنٹ اور مجلسِ دستور ساز تھی نہ کہ وہ گورنر جنرل جسے عارضی دستور کے مطابق محض ایک آئینی ضرورت کے طور پر شاہِ انگلستان اس غرض کے لیے مقرر کرتا تھا کہ جب تک آپ اپنا دستور خود بنا کر اپنے نظام مملکت کی آئندہ شکل طے کریں اس وقت تک وہ سربراہ مملکت کی حیثیت سے کام کرتا رہے۔ وہ حاکمیت کا حامل نہ تھا۔ اقتدار اس کی طرف منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ برطانوی حاکمیت کا وارث نہ تھا۔ بلکہ وہ درحقیقت قوم کا نمائندہ بھی نہ تھا۔ اسے ہماری مرکزی مجلسِ وزراء کی تجویز و سفارش پر شاہِ انگلستان صرف ایک آئینی سربراہ (CONSTITUTIONAL HEAD) کی حیثیت سے مقرر کرتا تھا۔ اقتدار کی حامل دراصل آپ کی نمائندہ مجلسِ دستور ساز تھی۔ اس کی طرف اقتدار منتقل کیا گیا تھا نہ کہ شاہِ برطانیہ کے نامزد کیے ہوئے اس شخص کی طرف۔ اس شخص کا محض اس بنیاد پر کہ وہ شاہِ برطانیہ کا نمائندہ ہے۔ یہ اختیار استعمال کرنا کہ وہ مجلس دستور ساز کی اکثریت کے لیڈر کو، جو قوم کا نمائندہ تھا، بیک جنبش قلم رخصت کر دے، صاف طور پر یہ معنی رکھتا تھا کہ اقتدار حکومت ابھی تک شاہ برطانیہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن چونکہ برطانوی حکومت کا کوئی ارادہ اس منتقل کیے ہوئے اقتدار کو واپس لینے کا نہ تھا اس لیے گورنر جنرل کی کارروائی نے اس وقت یہ شکل اختیار نہ کی کہ ہماری آزادی چھن کر پھر برطانیہ کے پاس واپس چلی جاتی۔ بلکہ اس نے یہ شکل اختیار کی کہ اختیارات قوم کے نمائندوں کے ہاتھ سے نکل کر سرکاری افسروں کے ہاتھ میں جانے شروع ہو گئے۔ جن کا سرغنہ یہ

گورنر جنرل تھا۔

حضرات: یہ تھا وہ مقام جہاں سے ہماری تاریخ کا کانٹا بدلا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ممکن کیسے ہوا؟ ایک ملازم نے اتنی بڑی جرأت کیسے کر ڈالی کہ قوم کے نمائندہ وزیراعظم کو اس کے منصب سے ہٹا دے، درآنحالیکہ قوم نے اسے یہاں شاہی اختیارات استعمال کرنے کے لیے منتخب نہ کیا تھا؟ اور جب اس نے یہ جرأت کی تو وہ اس پر عملدرآمد کرانے میں کامیاب کیسے ہو گیا؟ اس سوال پر آپ جتنا بھی غور کریں گے اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہ پا سکیں گے کہ ہمارے اندر وہ مضبوط قومی عزم و ارادہ مفقود تھا۔ جو انگریزی قوم میں اپنے افراد اور ملازمین کو اپنی اجتماعی مرضی اور اپنے آئین و ضابطہ کا پابند بنا کر رکھنے کے لیے پایا جاتا تھا۔ اور گورنر جنرل نے صاف طور پر یہ دیکھ لیا تھا کہ ملک کی سروسز اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی وفاداری قوم، اس کے آئین اور اس کی پارلیمنٹ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اپنے طبقے کے ایک ایسے شخص کے ساتھ ہے جس کے منصوبے کو کامیاب کر کے وہ اس ملک میں اپنی بالاتری قائم کرنے کی امید رکھتی ہیں۔ یہ بات اگر نہ ہوتی تو وہ کبھی یہ جرأت نہ کر سکتا تھا اور جرأت کرتا بھی تو وزیراعظم کی برطرفی کا جو حکم اس نے دیا تھا وہ اس کے منہ پر مار دیا جاتا اور چند گھنٹوں کے اندر وہ گورنر جنرل کے منصب سے ہٹا کر پھینک دیا جاتا۔ حکومت برطانیہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی کہ اس کے بادشاہ کا مقرر کیا ہوا نمائندہ یہاں شاہی اختیارات استعمال کرے۔ پاکستان کی مجلس وزراء کا صرف ایک تار بھیج دینا کافی تھا۔ شاہ برطانیہ کی طرف سے اس کی علیحدگی اور مجلس وزراء کے تجویز کردہ دوسرے گورنر جنرل کی تقرری کا حکم آنے میں ذرا سی تاخیر بھی نہ ہوتی۔

پس درحقیقت اس پہلے غیر جمہوری اقدام میں غلام محمد کی کامیابی اور خواجہ ناظم الدین کی بے بسی کا اصل سبب نہ تو یہ تھا کہ غلام محمد بذات خود کوئی بڑا طاقت ور آدمی تھا اور نہ یہ کہ حکومت برطانیہ اس کی پشت پر تھی۔ بلکہ وہ صرف یہ تھا کہ ایک طرف قوم اپنی اجتماعی مرضی اور اپنے آئین کو بالاتر رکھنے کے عزم سے خالی تھی، اور دوسری طرف غلام محمد کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ فوج اور سول سروس اس کا ساتھ دے گی نہ کہ پارلیمنٹ کی اکثریت کے اس لیڈر کا

گورنر جنرل تھا۔

حضرات: یہ تھا وہ مقام جہاں سے ہماری تاریخ کا کانٹا بدلا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ممکن کیسے ہوا؟ ایک ملازم نے اتنی بڑی جرأت کیسے کر ڈالی کہ قوم کے نمائندہ وزیراعظم کو اس کے منصب سے ہٹا دے، درآنحالیکہ قوم نے اسے یہاں شاہی اختیارات استعمال کرنے کے لیے منتخب نہ کیا تھا؟ اور جب اس نے یہ جرأت کی تو وہ اس پر عملدرآمد کرانے میں کامیاب کیسے ہو گیا؟ اس سوال پر آپ جتنا بھی غور کریں گے اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہ پا سکیں گے کہ ہمارے اندر وہ مضبوط قومی عزم و ارادہ مفقود تھا۔ جو انگریزی قوم میں اپنے افراد اور ملازمین کو اپنی اجتماعی مرضی اور اپنے آئین و ضابطہ کا پابند بنا کر رکھنے کے لیے پایا جاتا تھا۔ اور گورنر جنرل نے صاف طور پر یہ دیکھ لیا تھا کہ ملک کی سروسز اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی وفاداری قوم، اس کے آئین اور اس کی پارلیمنٹ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اپنے طبقے کے ایک ایسے شخص کے ساتھ ہے جس کے منصوبے کو کامیاب کر کے وہ اس ملک میں اپنی بالاتری قائم کرنے کی امید رکھتی ہیں۔ یہ بات اگر نہ ہوتی تو وہ کبھی یہ جرأت نہ کر سکتا تھا اور جرأت کرتا بھی تو وزیراعظم کی برطرفی کا جو حکم اس نے دیا تھا وہ اس کے منہ پر مار دیا جاتا اور چند گھنٹوں کے اندر وہ گورنر جنرل کے منصب سے ہٹا کر پھینک دیا جاتا۔ حکومت برطانیہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی کہ اس کے بادشاہ کا مقرر کیا ہوا نمائندہ یہاں شاہی اختیارات استعمال کرے۔ پاکستان کی مجلس وزراء کا صرف ایک تار بھیج دینا کافی تھا۔ شاہ برطانیہ کی طرف سے اس کی علیحدگی اور مجلس وزراء کے تجویز کردہ دوسرے گورنر جنرل کی تقرری کا حکم آنے میں ذرا سی تاخیر بھی نہ ہوتی۔
پس درحقیقت اس پہلے غیر جمہوری اقدام میں غلام محمد کی کامیابی اور خواجہ ناظم الدین کی بے بسی کا اصل سبب نہ تو یہ تھا کہ غلام محمد بذات خود کوئی بڑا طاقت ور آدمی تھا اور نہ یہ کہ حکومت برطانیہ اس کی پشت پر تھی۔ بلکہ وہ صرف یہ تھا کہ ایک طرف قوم اپنی اجتماعی مرضی اور اپنے آئین کو بالاتر رکھنے کے عزم سے خالی تھی، اور دوسری طرف غلام محمد کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ فوج اور سول سروس اس کا ساتھ دے گی نہ کہ پارلیمنٹ کی اکثریت کے اس لیڈر کا

مگر اتنی بڑی غداری جو یہاں علی الاعلان کی گئی اس کو بھی یہاں خوب سراہا گیا۔ خوشامدیوں نے یہ کہا بھی اور اخبارات میں یہ لکھا بھی گیا کہ غلام محمد صاحب نے ملک کو بچالیا۔ اگرچہ بعد میں اس ملک کے بچانے والے کچھ اور حضرات بھی تشریف لائے ہیں مگر ماشاء اللہ پہلا بچانے والا وہی تھا۔ اس "بچانے" کے معنی یہ تھے کہ اس نے قوم کو آزاد ہونے سے بچا لیا۔ اگر برطانوی حکومت یہاں واپس آنے کی خواہشمند ہوتی تو اس کے گورنر جنرل کا شاہی حق امتیاز اس قوم کی آزادی سے بچا کر پھر اس کی غلامی میں واپس لے جاتا۔ لیکن چونکہ وہاں ایسا کوئی ارادہ موجود نہ تھا، اس لیے یہ قوم آزادی سے بچ کر اس شخص واحد کی غلام ہو گئی جو کسی کا نمائندہ نہ تھا، جسے کسی نے یہ شاہی حق امتیاز استعمال کرنے کے لیے منتخب نہ کیا تھا، اور جسے یہ جرأت صرف اس لیے ہوئی تھی کہ اس نے اپنے پہلے تجربے میں قوم کو کمزور اور سروسز کو اپنی تائید و حمایت پر آمادہ پایا تھا۔ یہ تھا قوم کو بچانا۔ دوسرے الفاظ میں اس نے قوم کو اپنے لیے بچالیا اور ہمارے ہاں اس کو سراہا گیا کہ تو نے خوب کیا کہ جو ملک آزاد ہوا جا رہا تھا اسے بچا کر اپنے قابو میں کر لیا۔

کیا آپ اس کی وجہ قومی کیریکٹر کے فقدان کے سوا کچھ اور بتا سکتے ہیں؟ دستور ساز اسمبلی آخر کیوں بے بس ہو گئی؟ گورنر جنرل کے توڑنے سے وہ کیوں ٹوٹ گئی؟ اسکے ٹوٹنے کے بجائے گورنر جنرل خود کیوں نہ ٹوٹ گیا؟ اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ سروسز کی وفاداریاں غلام محمد کے ساتھ تھیں۔ قوم کے ساتھ نہیں تھیں۔ اس کی نمائندہ پارلیمنٹ اور دستور ساز اسمبلی کے ساتھ نہیں تھیں۔ ملک کے آئین اور اس کی آزادی کی اصل روح کے ساتھ نہیں تھیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غلام محمد کا حکم سرے سے نافذ ہی نہیں ہو سکتا تھا جس وقت اس نے یہ حکم دیا تھا اسی وقت اسے مطلع کر دیا جاتا کہ تم ایسا کوئی حکم دینے کے مجاز نہیں ہو۔ بس تاخیر کے بغیر وہ گورنر جنرل کے منصب سے ہٹایا جا سکتا تھا اور اس کی معزولی کا حکم شاہ برطانیہ سے حاصل کرنے کے لیے صرف ایک اشارہ کافی تھا لیکن جس قوم کی آزادی پر یہ کھلم کھلا ڈاکہ مارا گیا تھا وہ بے بس تھی اور جو سروسز اس قوم کے خزانے سے تنخواہ پا رہی تھیں، وہ قوم اس کے آئین سے وفاداری کے بجائے گورنر جنرل کی

وفادار تھیں۔

حضرات، میں اس وقت ملتان جیل میں قید تھا اور اخبارات میں یہ ساری روداد پڑھ پڑھ کر ان حالات پر اوٹ رہا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سابق دستور ساز اسمبلی کے صدر صاحب جگہ جگہ مارے مارے پھرتے تھے کہ کس طرح سے اس معاملے کو عدالت میں لایا جائے اور اس اندیشے سے چھپتے پھر رہے تھے کہ عدالت میں معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی ان کی گرفتاری نہ عمل میں آجائے۔ آپ نے غالباً صدر ایوب کی وہ کتاب بھی پڑھی ہو گی جو "فرینڈز نوٹ ماسٹرس" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں خود انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کی بے بسی کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ امریکہ سے واپسی پر محمد علی بوگرہ اس قدر بدحواس اور اور پریشان تھے کہ ہوائی جہاز میں مجھ سے بار بار آکر کہتے تھے کہ جناب کمانڈر انچیف صاحب کراچی پہنچ کر آپ میری حفاظت فرمایئے گا۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی! وجہ صرف یہ تھی کہ تمیز الدین خاں صاحب بھی جانتے تھے اور بوگرہ صاحب بھی کہ پولیس اور فوج اور سول سروس کی وفاداریاں گورنر جنرل کے ساتھ ہیں وہ قوم کی آزادی اور اس کے آئین کی حفاظت کے بجائے گورنر جنرل کے شاہی حق امتیاز کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھ رہی ہیں۔ اگرچہ کمانڈر انچیف اس گورنر جنرل کو مسخرہ سمجھتا تھا۔ اس نے خود اپنی کتاب میں ایک مسخرے کی حیثیت سے اس کی ایکٹنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی تائید و حمایت اس مسخرے گورنر جنرل ہی کو حاصل تھی۔ اس صورت میں اسمبلی کا صدر کیا کر سکتا تھا اور وزیر اعظم کیا کر سکتا تھا۔

ان تجربات کے بعد اب اسٹیج اس آخری ایکٹ کے لیے تیار تھا جو ۸، اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو بڑے ڈرامائی انداز میں انجام دیا گیا۔ یہ اس تاریخی عمل کی تکمیل تھی جو اپریل ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا تھا۔ اس نے آپ کی آزادی کے اس ہیولیٰ کو دفن کر دیا جو غلام محمد اور سکندر مرزا کی دستبرد سے بچ بچا کر دوسری دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۵۶ء کے دستور کی شکل میں تیار کیا تھا۔ قبل اس کے کہ انتخابات اس ہیولیٰ کو عملاً آزاد قومی حکومت کی صورت دیتے، فوج کے کمانڈر انچیف نے اٹھ کر اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا اور قوم کی مرضی

سے بنے ہوئے دستور کی جگہ مارشل لاء نے لی جس کا نام ہے کمانڈر کی مرضی۔ ظاہر ہے کہ ایسا اقدام کوئی کمانڈر انچیف تنہا بطور خود نہیں کر سکتا جب تک اسے یہ اطمینان نہ ہو کہ فوج اس کا ساتھ دے گی اور ملک کے نظم ونسق کو چلانے میں سول سروس بھی اس کی خدمت کرے گی۔ یہی نہیں بلکہ اس کو یہ اطمینان حاصل ہونا بھی ضروری تھا کہ اول تو قوم اپنے آئین کی حفاظت کے لیے کوئی جنبش نہ کرے گی، اور اگر اس نے ایسا کیا بھی تو سروسز کمانڈر انچیف کے حکم کی اطاعت کریں گی، نہ کہ ملک کے آئین کی، اس لیے قوم کی ایسی ہر کوشش کو دبا دینے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے گی۔ اب آخر کوئی وجہ تو تھی کہ کمانڈر انچیف کو اس اقدام سے پہلے ان تمام باتوں کا اطمینان حاصل ہوا، اور یہ اقدام کرنے کے بعد ثابت ہو گیا کہ اس کا اطمینان کوئی غلط اندازہ نہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ وہی وجہ ہمارے لیے ماتم کا اصل مقام ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے ہاں آئین اور نظم کی اطاعت اور قانون کی حکمرانی کا بالکل ابتدائی تصور تک موجود نہیں ہے۔ ہمارے افراد کو جن میں بڑے بڑے عالی مقام لوگ شامل ہیں کوئی ایسی تعلیم وتربیت نہیں ملی ہے جس نے ان میں کوئی قومی کیرکٹر پیدا کیا ہو۔ انہیں اپنے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ وہ بڑے مہذب (CULTURED) لوگ ہیں، حالانکہ تہذیب محض انگریزی جھگارنے اور انگریزوں کے سے کپڑے پہننے اور انہی کی طرح سے رہنے سہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ آئین وقانون کی پابندی، نظم وضبط اور اپنے حدود کو سمجھنے اور ان سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے اور اس اعتبار سے بیسویں صدی کی اس تیسری چوتھائی میں بھی یہ لوگ تہذیب کے اس مقام تک نہیں پہنچے ہیں جس پر اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگریزی قوم کا ایک سول ملازم فائز تھا۔

اور آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل تو کر لی، مگر ہمارے اندر قومی حیثیت سے وہ ابتدائی اوصاف بھی پیدا نہیں ہوئے ہیں جن کی بدولت کوئی قوم اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکتی ہے جس قوم میں وہ اوصاف موجود تھے، اس نے چھ ہزار میل کے فاصلے پر، اٹھارہویں صدی کے تاریک دور میں بھی اپنے ملازموں کو قابو میں رکھا اور ان اوصاف ہی کا یہ کرشمہ آپ خود اپنی تاریخ میں دیکھ چکے

ہیں۔ کہ اس نے صرف اپنی آزادی ہی کی حفاظت نہیں کی، بلکہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کو، اور روئے زمین کے بیسیوں دوسرے دور دراز علاقوں کو مدت دراز تک اپنا غلام بنا کر رکھا۔ مگر ہم میں من حیث القوم ان اوصاف کی اتنی کمی ہے کہ ہم خود اپنے ملک میں پورے چھ سال بھی اپنے ملازموں کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ ہمارے تیسرے گورنر جنرل نے ہماری آزادی سلب کرنے کی ابتداء کر دی، اور ہمارے پہلے ہی کمانڈر انچیف نے اس عمل کی تکمیل کر ڈالی۔

حضرات، یہ دونوں دَور میں نے آپ کے سامنے اس لیے پیش کیے ہیں کہ آپ ان کا مقابلہ کر کے ان کا فرق خود دیکھ لیں۔ اگر اس فرق کا کوئی انکار کر سکتا ہو تو ضرور کرے۔ یہ تاریخ کے علم میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا۔ اور اگر یہ ناقابلِ انکار ہے تو میں ہر سوچنے سمجھنے والے انسان سے یہ پوچھتا ہوں کہ اس فرق کے جو اسباب میں نے بیان کیے ہیں کیا وہی اس کے اسباب ہیں یا کسی کی سمجھ میں کوئی اور بھی اس کا سبب آتا ہے؟ کوئی صاحب اس کے کسی دوسرے سبب کی نشاندہی کر سکتے ہوں تو ضرور کریں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ شاید اس کی کوئی اور معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بعد ایک بات میں اپنی قوم سے، اور ایک بات اس ملک کی سرو سرزمینِ (یعنی ان کے کلیدی مناصب رکھنے والے بلند مرتبہ افسروں) سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں۔

اپنی قوم کے لوگوں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ اپنی آزادی کی حفاظت اس وقت تک قطعاً نہیں کر سکتے جب تک آپ کے اندر یہ مضبوط اور غیر متزلزل قومی ارادہ پیدا نہ ہو جائے کہ آپ اپنے افراد کو اور اپنے ملازمین کو اپنی اجتماعی مرضی کا تابع بنا کر چھوڑیں گے۔ اور کسی کو اس سے منحرف نہ ہونے دیں گے۔ آپ کے ملک میں آپ کی اپنی ہی پسند کا آئین چلے گا۔ کسی شخص یا گروہ یا طبقے کے بنائے ہوئے آئین کو آپ ہرگز نہ مانیں گے اور جو آئین آپ کی مرضی سے بنے اس کی پیروی اس سرزمین میں ہر شخص کو کرنی پڑے گی اور اس سے انحراف کرنے والے کے ساتھ آپ قطعاً کوئی رعایت، کوئی مداہنت اور کوئی مصالحت نہ کریں گے۔ یہ عزم اور یہ ارادہ آپ کے اندر پیدا نہ ہوا تو آئے دن کوئی نہ کوئی طاقتور

آپ پر مسلط ہوتا رہے گا، اور آپ کی حیثیت بھیڑ بکریوں کے ایک گلّے کے سوا کچھ نہ ہوگی جسے ہر لاٹھی والا جدھر چاہے ہانک کر لے جا سکے گا۔

اور سروسز سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ تعلیم یافتہ لوگ ہیں، دین کی نہیں تو کم از کم دنیا کی سمجھ رکھنے کا تو آپ کو بڑا دعویٰ ہے۔ خدارا کبھی اس بات پر غور کریں کہ جن انگریزوں سے آپ نے تعلیم اور حکمرانی کی تربیت پائی ہے ان کی سروسز کے اخلاق و کردار کے مقابلے میں آپ کس قدر گھٹیا اور قابلِ شرم کردار پیش کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قوم اور اس کے آئین اور اس کی پارلیمنٹ کے وفادار تھے، اور اس کا مظاہرہ ایک دو دن نہیں، پورے ۱۹۰ سال انہوں نے آپ کی اس سرزمین میں کر کے دکھا دیا۔ بلکہ ہندوستان چھوڑتے وقت بھی انہوں نے یہ کردار دکھایا کہ جب ان کی پارلیمنٹ نے ٹھیک آئینی طریقے سے اتنی بڑی سلطنت سے دستبردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تو ان کی سول سروس نے بھی اور ان کی فوج نے بھی پورے ڈسپلن کے ساتھ اس فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ ایک انگریز افسر بھی ایسا نہ تھا جو اڑ کر بیٹھ گیا ہو اور اس نے کہا ہو کہ میں لڑے بغیر اتنی بڑی سلطنت ہاتھ سے دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مگر آپ نے بیس سال کے اندر ہی دنیا بھر کو یہ دکھا دیا کہ آپ کے اندر نہ قوم کی وفاداری ہے، نہ اس کے آئین کی، نہ اس کی پارلیمنٹ کی۔ آپ نے ہر موقع پر ان اشخاص کا ساتھ دیا ہے جنہوں نے آئین کو توڑ کر، قوم کی مرضی کو نظر انداز کر کے، اور پارلیمنٹ کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر یہاں اپنی مرضی چلانے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے انگریز سے قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کا نہ صرف سبق سیکھا تھا، بلکہ اسی اصول پر اسے کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر آپ نے ہر آزمائش کے موقع پر یہ ثابت کر دیا کہ آپ کو اس اصول کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ قوم کا جو مقام آپکی نگاہ میں ہے اس کو تو میں خوب جانتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جس قوم کی قربانیوں کی بدولت آپ کو یہ مناصب ملے ہیں، اس کی کتنی کچھ پروا آپ کو ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جس امت مسلمہ کے آپ فرزند ہیں اس کے دین کا تصورِ دیانت و امانت آپ کی نظر میں کتنا کچھ وزن رکھتا ہے۔ اس لیے میں ان چیزوں کے نام پر آپ سے کوئی اپیل کرنے کی جرأت

نہیں رکھتا۔ البتہ آپ کے اندر خود اپنی عزت کا اگر کوئی احساس ہے تو میں اس سے اپیل کرکے آپ کو یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہوں کہ آپ نے دنیا کے سامنے اور تاریخ کے صفحات پر انگریزی فوج اور سول سروس کے افسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو کس پلے کا انسان ثابت کیا ہے؟ یہ بحث کا معاملہ نہیں ہے۔ آپ میں سے ہر شخص اپنے ضمیر و قلب سے خود ہی پوچھے اور اپنا مقام متعین کرے۔"

... ...

تحریک جمہوریت کا زور

بالآخر تحریک جمہوریت زور پکڑتی چلی گئی۔ حکومت کے کارندوں نے جبر و تشدد، آنسو گیس، گولیاں، گرفتاریاں، مقدمات اور مار پیٹ کے سارے حربے استعمال کیے۔ ظاہر ہے کہ آمر ایوب خاں پاکستان نے دونوں حصوں میں دو نہایت درجہ ظالم حجاج بن یوسف ٹائپ کے گورنر مقرر کر رکھے تھے۔ مشرقی حصے میں عبدالمنعم خان تھا اور مغربی حصے میں امیر محمد خان کالاباغ تھا۔ یہ دونوں اپنے آپ کو ایوب خاں کے خنجر قرار دیتے اور اسی انداز میں کام کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کو ان دونوں گورنروں نے ہی غلامانہ انگریزی دور کے قرمٹیر کلا عزایکولیشن ۱۹۰۲ء کو استعمال کرکے خلاف قانون قرار دیا تھا جس کا استعمال سپریم کورٹ نے اول روز سے ہی خلاف قانون قرار دے کر آمرانہ حکومت کو اختیارات ناجائز طور پر استعمال کرنے کا سنہرا سرٹیفکیٹ دیا۔

جب تحریک اپنے عروج پر پہنچی اور ملک کا سارا انتظامی ڈھانچہ مفلوج ہوگیا تو آمر ایوب خاں نے پاکستان تحریک جمہوریت سے مذاکرات کی پیش کش کی جسے قبول کر لیا گیا۔ مذاکرات میں ایوب خاں نے تحریک کے بیشتر مطالبات قبول کر لیے اور تحریک کے سربراہوں سے قومی حکومت بنانے کی پیشکش کی جو نئے انتخابات کرائے۔ ایوب خاں نے آئندہ صدارت کے انتخابات میں حصہ لینے سے بھی انکار کر دیا اور اس کا اعلان ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے بھی کرایا۔ یہ اس کی مایوسانہ نادانی تھی جس کے نتیجے میں سول اور فوجی بیوروکریسی

پر اس کا رعب و دبدبہ اور دباؤ ختم ہو گیا چنانچہ فوجی بیوروکریسی نے اسے ہٹا کر کسی دوسرے آمر کو لانے کے لیے سازشیں شروع کر دیں۔ ایسے حالات میں قومی حکومت بنانے سے تحریکِ جمہوریت کے رہنماؤں نے انکار کر دیا۔ میرے خیال میں یہ ان کی بصیرت کی کمی اور نادانی تھی جس کے نتیجے میں تحریک کے فطری نتائج تک پہنچنے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اگر وہ قومی حکومت بنا لیتے تو یحییٰ خان کے آنے کا راستہ بھی بند ہو جاتا اور بعد میں مسٹر بھٹو کے آنے کے امکانات بھی معدوم ہو جاتے۔ ایوب خاں کی انتظامی کمزوری اور تحریکِ جمہوریت کے رہنماؤں کے تذبذب اور فکری انتشار نے فوجی بیوروکریسی کے لیے سازشی اقدام کرنے کا راستہ صاف کر دیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی ملتِ اسلامیہ نے اپنی آزادی اور حقوق کی بحالی کے لیے جس جرأت مردانگی اور ایثار و قربانی سے ایک بے مثال جمہوری تحریک چلائی اس نے آمر ایوب خان کی ناقابلِ شکست آمریت کے پرخچے اڑا دیئے اور بیورکریسی کی آمریت جمنے کے راستے ہمیشہ کے لیے مسدود ہو گئے۔

اس عظیم تحریکِ جمہوریت کے دوران ملک کی دو جماعتوں بھاشانی کی این۔ اے پی اور مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی نے جمہوری راستے کی بجائے تخریب کاری اور گھیراؤ جلاؤ کا راستہ اختیار کیا۔ جگہ جگہ توڑ پھوڑ کی۔ آگیں لگائیں۔ لاہور، ملتان اور کئی مقامات پر قرآنِ پاک نذرِ آتش کیے تاکہ عوام کو مشتعل کر کے انارکی مزاج اور طوائف الملوکی کی طرف تحریکِ جمہوریت کا رخ موڑ دیا جائے۔ چونکہ دونوں حضرات سوشلزم کے علمبردار تھے۔ اس لیے ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ طوائف الملوکی اس قدر بڑھ جائے جس کے نتیجے میں یا تو مارشل لاء آجائے جو جنرل یحییٰ خاں کی ضرورت تھی اور اس کا مسٹر بھٹو سے گہرا یارانہ تھا اور مولانا بھاشانی یحییٰ خان کے ہاتھوں میں کھلونا تھے ورنہ وہ انارکی کو اس حد تک لے جانا چاہتے تھے کہ اس میں سے اشتراکی انقلاب کا راستہ نکالا جا سکے تاکہ ملک پر ایک بھٹو آمریت مسلط کی جا سکے۔

یہ دونوں حضرات طبعاً کسی جمہوریت کے قائل نہ تھے۔ لیکن تحریکِ جمہوریت کے عظیم الشان زور نے ان کے اشتراکی انقلاب کا راستہ روک دیا۔ البتہ یحییٰ خان مارشل لاء لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کے مارشل لاء نے بعد میں بھٹو کے لیے کامیابی کا راستہ کھولا۔

غرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ برصغیر کی ملت اسلامیہ جابروں کے مقابلے میں ہمیشہ شمشیر برہنہ رہی ہے چنانچہ اس نے اپنی آزادی کے تحفظ اور اپنے حقوق کی بحالی کے لیے اپنے فوجی آمر کے خلاف ایک کامیاب جنگ کر کے اسے شکستِ فاش سے دوچار کیا اور عوام کی بالادستی کا علم بلند کر دیا۔ اس طرح ملت اسلامیہ نے آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کی سیکولرازم کے مقابلے میں اسلام کی اور محکومی و غلامی کے مقابلے میں آزادی و حریت کی جنگ جیت لی۔

---

(۸)

تحریک ختم نبوّت

۱۹۰۲ء تا ۱۹۷۴ء

مرزا غلام احمد قادیانی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو پشت ہا پشت سے اجمت پر سپہ گری کے پیشے سے وابستہ تھا۔ اس خاندان کے بزرگوں نے پہلے سکھوں کی فوجی ملازمت میں شامل ہو کر تحریکِ مجاہدین کے جاں نثارانِ اسلام کے خلاف جنگ کی پنجاب کی یہ تاریخی بدقسمتی یادگار رہے گی کہ یہاں کے مسلمان سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تاریخی جہادی جدوجہد میں شریک ہو کر اسلام کی سربلندی کے لیے جانفروشی و جانبازی سے محروم رہے جبکہ پورے ہندوستان کے ہر علاقے میں سے مسلمان مجاہدین نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ لیکن بدبختی کا پہلو یہ ہے کہ پنجاب پر جابرانہ قابض سکھوں کی فوج میں شامل ہو کر ان مجاہدین پر حملہ آور ہونے اور ان کا مقدس خون بہانے کا جرم جن نام نہاد پنجابی مسلمانوں سے سرزد ہوا ان میں مرزا صاحب کے خاندان کے بزرگ اور اکابرین بھی شامل تھے۔

سکھوں کی چاکری کے بعد اس خاندان کو جن کفار کی چاکری پر فخر و مباہات ہے وہ سات سمندر پار سے آئے ہوئے کفار انگلستان یعنی انگریز ہیں۔ ان کی مدد کے لیے اس خاندان کے بزرگ باقاعدہ امدادی دستے بن کر وہاں گئے اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے ساتھ شامل ہو کر مسلمانوں کا تختہ اُلٹنے اور ان کی جہادی جدوجہد کو دبانے میں انگریزوں کی بھرپور مدد کی۔ اس کارنامے کو فخریہ بیان کرنے اور انگریزوں کی وفاداری اور توصیف و توصیف بیان کرنے میں خود ان کے اپنے قول کے مطابق ان کی الماریوں کی الماریاں بھری ہوئی ہیں۔

اس طرح مرزا صاحب کے خاندان میں وہ ظالم جابر اور مسلمانوں کی شدید دشمن کافر قوموں کا حق نمک خواری اور وفاداری بشرط استواری کا گہرا وفادارانہ جذبہ ان کے خون میں رچ بس گیا ہے۔ اس خاندانی پس منظر میں ہم ان کی تحریک قادیانیت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

تحریک مجاہدین مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کا غیر معمولی مظہر تھی۔ مسلمانوں میں یکایک یہ جذبۂ جہاد اس لیے ابھرا تھا کہ برصغیر میں ملت اسلامیہ کو مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ ان کی زندگیوں میں قرآن وسنت پر مبنی اسلامی قانون کے نفاذ کے تعطل کا امکان پیدا ہو گیا تھا اور انگریزوں کی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور ملک گیری کے نتیجے میں مختلف علاقے ان کے تصرف میں چلے جا رہے تھے جن کو اسلامی قانون سے محروم کر کے ان پر انگریزی قانون یا جاہلی رواجی قانون نافذ کیا جا رہا تھا۔ اسی لیے بنگال کے مسلمانوں میں بے چینی کے اسباب کا جائزہ لینے کے لیے حکومت ہند کے مقرر کردہ سیکرٹری ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "مسلمان اسلامی قانون کے سوا کسی دوسرے قانون کی ماتحتی میں زندگی گزارنے کو جاہلی اور غیر اسلامی زندگی سمجھتے ہیں۔ اس لیے اسلامی قانون کے نفاذ اور اجراء کے لیے وہ جہاد کا راستہ اختیار کرتے ہیں اسی لیے سرحد میں چلنے والی تحریک مجاہدین کو برصغیر کے ہر حصے سے مسلمان امداد بہم پہنچاتے ہیں۔ گویا مسلمانوں میں جذبہ جہاد کا ابھار ان کے اس تصور سے ابھرتا تھا کہ اسلامی قوانین کے نفاذ سے محروم زندگی گزارنا غیر اسلامی زندگی ہے اور جب تک مسلمان کو غیر اسلامی زندگی پر مطمئن اور جذبۂ جہاد سے محروم نہ کیا جائے اس وقت تک مسلمانوں میں انگریزوں کی غلامی میں رہنے کے لیے پُرسکون جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔ گویا اپنے سیاسی تسلط اور غلبے کو پوری طرح کامیابی سے نافذ کرنے کے لیے مسلمانوں میں سے جذبۂ جہاد کو ختم کرنا اس دور میں انگریزوں کی ایک ناگزیر سیاسی ضرورت تھی۔

چنانچہ انگریزوں کے ساتھ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کا گہرا وفادارانہ تعلق کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب قادیانیت میں لکھتے ہیں۔

انگریز کا وفادار خاندان

"۔۔۔۔۔ مرزا صاحب[1] کا خاندان انگریزی حکومت سے جو پنجاب میں نئی نئی قائم ہوئی تھی شروع سے وفادارانہ و مخلصانہ تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان کے متعدد افراد نے اس نئی حکومت کی ترقی اور اس کے استحکام میں جاں بازی اور جاں نثاری سے کام لیا تھا اور بعض نازک موقعوں پر اس کی مدد کی تھی۔" مرزا صاحب کتاب البریہ کے شروع میں "اشتہار واجب الاظہار" میں لکھتے ہیں:

"میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیرخواہ ہے، میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں وفادار اور خیرخواہ آدمی تھا، جن کو دربار گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسانِ پنجاب میں ہے اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکارِ انگریزی کو مدد دی تھی، یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکارِ انگریزی کی امداد میں دیے تھے۔ ان خدمات کی وجہ سے جو چٹھیات خوشنودی حکام ان کو ملی تھیں، مجھے افسوس ہے کہ بہت سی ان میں سے گم ہو گئیں، مگر تین چٹھیات جو مدت سے چھپ چکی ہیں، ان کی نقلیں حاشیہ میں درج کی گئی ہیں۔ پھر میرے دادا صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدماتِ سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموں کے گذر پر مفسدوں کا سرکارِ انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکارِ انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا ۔۔۔۔۔"

مسلمانوں میں فتح و نصرت جدوجہد اور غلبہ اسلام۔ مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور طاقتِ حیات

---

[1] قادیانیت مولفہ مولانا علی میاں ص ۲۲-۱۳۔

کا واحد ذریعہ ہمیشہ جہاد رہا ہے۔ پھر انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت بھی مسلمانوں سے ہی حاصل کی تھی اور گزشتہ ہزار سال سے مسلمان ہندوستان میں ایک حکمران قوم کی حیثیت سے آباد تھے۔ ان کا جذبۂ جہاد ان کی بقائے زندگی کا ضامن تھا۔ مسلمانوں نے دنیا بھر میں جذبۂ جہاد کے زور سے فتوحات حاصل کی تھیں۔ اور جہاں جہاں غیر مسلم قوموں نے ان کے خلاف جنگ آزمائی کی اور انہیں علاقوں اور آزادی سے محروم کرنا چاہا وہاں مسلمانوں نے جہادی تحریکیں برپا کر کے ایسی جابرانہ کاروائیوں کا سخت مقابلہ کیا۔ روس کے علاقہ داغستان میں امام شامل نے ایک مدت دراز تک روس اور فرانسیسی استیلا کے خلاف جدوجہد کی۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی کے درویشوں نے جہاد کے ذریعے انگریز جرنیلوں کو ناکام کیا اور جہاں جہاں فرنگی استعمار نے قدم جمانے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی جہادی تحریکوں نے اس کا راستہ روکا۔ اس لیے استعماری قوموں کو اس کی اشد ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کا توڑ تلاش کیا جائے تاکہ وہ استعمار کی غلامی پر راضی ہو سکیں لیکن ظاہر ہے کہ جو جذبہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے نتیجے میں پیدا ہوا ہو اسے ختم کرنا آسان کام نہیں ہے۔

انگریزوں کی ضرورت۔ایک حواری نبی

ظاہر ہے کہ ایسی تعلیمات جو مقدس کتابوں پر مشتمل ہوں اور کسی قوم کی روایات کا حصہ ہوں انہیں چند مضامین یا تقاریر سے زائل نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزوں کو توفی الحقیقت انکے اپنے عقیدے کے مطابق بائبل کے رسولوں اور نبیوں کی مانند ایک ایسے حواری نبی کی ضرورت تھی جو اپنے وحی و الہام کی بنیاد پر جہادی تعلیمات کا رد کرے اور انہیں منسوخ کرے تاکہ اسکے ماننے والے کے عقیدے میں سے جہاد کا عقیدہ خارج ہو جائے۔

چنانچہ ایک برطانوی دستاویز "دی ارایول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا" میں درج ہے کہ ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ سے برطانوی مدبروں اور مسیحی رہنماؤں کا ایک وفد اس بات کا جائزہ لینے کے لیے برصغیر آیا کہ مسلمانوں کو رام کرنے کی ترکیب اور برطانوی سلطنت سے انکی

وفاداری پیدا کرنے کے راستے تلاش کرنے پر غور کیا جائے۔ اس وفد نے ۱۸۷۰ء میں دو رپورٹیں پیش کیں جن میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے روحانی رہنماؤں کی اندھا دھند پیروکار ہے۔ اگر اس وقت ہمیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اپاسٹالک پرافٹ (APOSTOLIC PROPHET) حواری نبی ہونے کا دعویٰ کرے تو بہت سے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو جائیں گے لیکن مسلمانوں میں سے ایسے کسی شخص کو ترغیب دینا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو پھر ایسے شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں بطریق احسن پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ اب کہ ہم پورے ہندوستان پر قابض ہیں تو ہمیں ہندوستانی عوام اور مسلمان جمہور کی داخلی بے چینی اور باہمی انتشار کو ہوا دینے کیلئے اس قسم کے عمل کی اشد ضرورت ہے[1]۔

غرض یہی وہ سامراجی ضرورت تھی جس کی تکمیل مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت اور تنسیخ جہاد کے اعلان نے کی اور بقول علامہ اقبال یہی حالات تھے کہ "قادیانی تحریک فرنگی اقتدار کے حق میں الہامی سند بن کر سامنے آئی[2]"

انگریز کو مرزا غلام احمد سے بڑھ کر کوئی اور موزوں شخص ان کے مقاصد کیلئے مل ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کافروں کی حمایت اور مسلم دشمنی اس کو خاندانی ورثہ میں ملی تھی ۔۔۔

انگریزوں کی اس پریشانی کا اندازہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" OUR INDIAN MUSSALMANS سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مسلمانوں میں جہاد کا تصور ان کی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ انگریزوں نے ایک طویل استبداد کے بعد یہ محسوس کیا کہ بھیانہ تشدد اجتماعی ہو یا انفرادی مسلمانوں سے اس جذبہ کو محو نہیں کر سکتا، تو انہوں نے جہاد کے خلاف مباحث پیدا کر کے علماء سے فتوے حاصل کرنا

---

[1] حوالہ از قادیانیت مولانا احسان الٰہی ظہیر ص ۱۳۶، اخذ کردہ از علیم اسرائیل ص ۹۰۸

[2] حرف اقبال ص ۱۲۵۔

شروع کیے اور کلام اللہ کی تفسیروں کا مزاج بدلوانا چاہا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی محولہ کتاب سے ان علماء وفضلاء کا پتہ چلتا ہے جو اس وقت تنسیخ جہاد کا فتویٰ دے رہے تھے۔ کتاب کے آخر میں مکۂ معظمہ کے حنفی، شافعی اور مالکی مفتیوں کا فتویٰ درج ہے جو ان سے حاصل کیا گیا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں شدومد سے تقسیم کیا گیا۔ استفتاء تھا کہ ہندوستان کے عیسائی حکمران اسلام کے تمام احکام مثلاً صوم وصلوٰۃ اور حج وزکوٰۃ وغیرہ میں مداخلت نہیں کرتے تو کیا ہندوستان دارالاسلام ہے کہ نہیں؟

ہر سہ مفتیوں نے ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کا فتویٰ دیا اور لکھا کہ ہندوستان دارالحرب نہیں اور جہاد دارالحرب میں جائز ہے۔ ایک دوسرا استفتاء بھاگل پور میں کمشنر کے پرسنل اسسٹنٹ سید امیر حسین کی طرف سے تھا۔

غرض انگریز کی یہ اشد سیاسی ضرورت تھی کہ وہ جہاد کے خلاف فتوے حاصل کرکے شائع کرے تاکہ مسلمانوں میں سے جذبۂ جہاد کا تدارک ہو سکے اور ان کا استعمار محفوظ ہو جائے۔

اب ہم مرزا غلام احمد قادیانی کی اس حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہ کس طرح انگریز کے مطلوبہ مقصد کو پورا کرنے کے لیے کام آیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی

مرزا غلام احمد قادیانی ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ (پنجاب) کی کچہری میں ایک معمولی تنخواہ پر ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۸ء ملازم تھے۔ انہوں نے ملازمت کے دوران سیالکوٹ کے پادری مسٹر بٹلر ایم۔ اے سے رابطہ پیدا کیا۔ وہ آپ کے پاس عموماً آتا اور دونوں اندر خانہ بات چیت کرتے بٹلر نے وطن جانے سے پہلے آپ سے تخلیہ میں کئی ایک طویل ملاقاتیں کیں۔ پھر اپنے ہم وطن ڈپٹی کمشنر کے ہاں گیا۔ اس سے کچھ کہا اور انگلستان چلا گیا۔ ادھر مرزا صاحب استعفیٰ دے کر قادیان آگئے۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد، مذکورہ وفد ہندوستان پہنچا اور لوٹ کر محولہ رپورٹیں مرتب کیں۔ ان رپورٹوں کے فوراً بعد ہی مرزا صاحب نے اپنا سلسلہ شروع کر دیا۔

برطانوی ہند کے سنٹرل انٹیلی جنس کی روایت کے مطابق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے چار اشخاص کو انٹرویو کے لیے طلب کیا۔ ان میں سے مرزا صاحب نبوت کیلئے نامزد کیے گئے اور انہوں نے کام کا آغاز کر دیا۔

مرزا صاحب کی پہلی تصنیف براہین احمدیہ (صفحات ۵۶۲) چار حصوں میں شائع ہوئی۔ ۱۸۸۰ء میں پہلے دو حصے میں شائع ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں تیسرا اور ۱۸۸۴ء میں چوتھا۔ آپکے دوسرے بیٹے مرزا بشیر احمد ایم اے کی تالیف سلسلہ احمدیہ کے مطابق آپ کو ماموریت کا تاریخی الہام مارچ ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ اس سے پہلے آپ نے ۱۸۸۰ء میں ملہم من اللہ ہونے کا اعلان کیا اور اپنے مجدد ہونے کا نعرہ چھوڑا۔ دسمبر ۱۸۸۸ء میں اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیح موعود ہونے کی خبر دی اور ظلی نبی ہونے کی اصطلاح ایجاد فرمائی۔ پھر ۱۹۰۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا اور نومبر ۱۹۰۴ء میں کرشن ہونے کا اعلان فرمایا۔ یہی وہ سال تھے جب انگریزی سیاست اپنے استعماری عزائم کو پروان چڑھانے کے لیے پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کا شکار کر رہی تھی اور اس کے سامنے بیرون ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کو اپنے دام میں لانے کا منصوبہ بھی تھا۔ مرزا غلام احمد ان چاروں نکات کے جامع ہو کر سامنے آگئے جو انگریزوں کے ذہن میں تھے۔ انہوں نے انگریزی سلطنت کے استحکام و اطاعت کی بنیاد ہی اپنے الہام پر رکھی۔[۱]

چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی کے جھوٹے دعووں پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور اسلامی مفکر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ختم نبوت کی تحریک ۱۹۵۳ء کے نتیجے میں حکومت کی قائم کردہ ایک تحقیقاتی عدالت میں اپنا بیان دیتے ہوئے فرمایا:

"قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا آغاز بیسویں صدی کی ابتداء سے ہوا۔ انیسویں صدی کے خاتمہ تک اگرچہ مرزا غلام احمد صاحب مختلف قسم کے دعوے کرتے رہے تھے جن کی بنا پر مسلمانوں میں ان کے خلاف عام بے چینی پیدا ہو چکی تھی۔ مگر اس وقت تک

---

[۱] مرزائیت اور اسلام مولفہ شورش کاشمیری ص ۔ ۱۲۔

انہوں نے کوئی ایک قطعی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے نبوت کا صریح اور قطعی دعویٰ کیا جس سے ان کے ماننے والوں اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک مستقل نزاع شروع ہو گئی۔

اس نزاع کی وجہ یہ تھی کہ نبوت اسلام کے بنیادی مسائل میں سے انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ ایک شخص کے دعوائے نبوت کے بعد ہر مسلمان کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے میں سے کسی ایک رویہ کا فیصلہ کرے جو لوگ اس پر ایمان لائیں وہ آپ سے آپ ایک الگ امت بن جاتے ہیں اور ان کے نزدیک ایسے سب لوگ کافر ہو جاتے ہیں جنہوں نے اس کو نہ مانا ہو لے۔"

مولانا مودودی نے تحقیقاتی عدالت میں اپنے تیسرے بیان میں مرزا کے دعویٰ کی تاریخی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"مرزا غلام احمد صاحب ۱۸۸۰ء میں ایک مبلغ اور مناظر اسلام کی حیثیت سے مسلمانوں میں نمودار ہوئے۔ اس وقت سے لے کر اپنی وفات (۲۶ مئی ۱۹۰۸ء) تک اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں انہوں نے جن عقائد اور خیالات کا اظہار کیا ان کو بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان مراحل کو تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کر دیں تاکہ ہر مرحلے کے بیانات سے ان کا فرق اچھی طرح سمجھا جا سکے۔

تاریخی ترتیب۔ نبوت کی طرف پیش قدمی

۱۔ ۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۸ء اس دور میں مرزا صاحب محض ایک مبلغ اسلام اور غیر مسلم حملہ آوروں کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت کرنے والے مناظر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان کو پورا اصرار تھا کہ ان کے عقائد تمام مسائل میں وہی ہیں جو عام مسلمانوں کے ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں طرح طرح کے مختلف دعوے دیکھ کر مسلمان کھٹکتے تھے مگر مرزا

لے قادیانی مسئلہ ص ۲۹۔

صاحب اپنے اقوال کی توجیہات کرکے مسلمانوں کو مطمئن کر دیتے ہیں۔

۲۔ دسمبر ۱۸۸۸ء میں انہوں نے بیعت کے لیے اشتہار دیا اور ۱۸۸۹ء کے آغاز سے بیعت لینی شروع کی۔ اس وقت انہوں نے صرف "مجدد وقت" اور "مامور من اللہ" ہونے کا دعویٰ کیا اور مسیح علیہ السلام سے اس بنا پر اپنی مماثلت ظاہر کی کہ جس فروتنی اور مسکینی کی حالت میں وہ تھے۔ اس حالت میں مرزا صاحب ہیں۔ عام مسلمان مرزا صاحب کے متعلق اچھے خیالات رکھتے تھے۔ البتہ یہ دیکھ کر کھٹکتے تھے کہ مرزا صاحب اپنے آپ کو تمام اولیائے امت سے افضل کہتے ہیں۔ (سیرۃ المہدی مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد صاحب۔ حصہ اول صفحہ ۱۴۔ ۳۱۔ ۸۹۔ تبلیغ رسالت جلد اول صفحہ ۱۱۔ ۱۴۔ ۱۵)

۳۔ ۱۸۹۱ء میں انہوں نے مسیح علیہ السلام کی موت کا اعلان اور خود مسیح موعود اور مہدی معہود ہونے کا دعویٰ کیا جس سے مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی (سیرۃ المہدی صفحہ ۳۱، ۸۹)

اس دور کے آغاز میں مرزا صاحب خود لکھتے ہیں کہ: "پھر میں تقریباً بارہ برس تک، جو ایک زمانہ دراز ہے، بالکل اس سے بے خبر اور غافل رہا کہ خدا نے مجھے بڑی شد و مد سے براہین (یعنی براہین احمدیہ) میں مسیح موعود قرار دیا ہے اور میں حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کے رسمی عقیدے پر جما رہا۔ جب بارہ برس گزر گئے تب وہ وقت آیا کہ میرے پر اصل حقیقت کھول دی جائے۔ تب تواتر سے اس بارے میں الہامات شروع ہوئے کہ تو ہی مسیح موعود ہے۔" (اعجاز احمدی ضمیمہ نزول المسیح صفحہ ۶)

دوسری جگہ لکھتے ہیں: "اگرچہ خدا نے براہین احمدیہ میں میرا نام عیسیٰ رکھا اور یہ بھی مجھے فرمایا کہ تیرے آنے کی خبر خدا اور رسول نے دی تھی، مگر چونکہ ایک گروہ مسلمانوں کا اس اعتقاد پر جما ہوا تھا اور میرا بھی یہی اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر سے نازل ہوں گے اس لیے میں نے خدا کی وحی کے ظاہر پر عمل کرنا نہ چاہا بلکہ اس وحی کی تاویل کی اور اپنا اعتقاد وہی رکھا جو عام مسلمانوں کا تھا اور اسی کو براہین احمدیہ میں شائع کیا لیکن بعد اس کے اس بارہ میں بارش کی طرح وحی نازل ہوئی کہ وہ مسیح موعود جو آنے والا ہے تو ہی ہے۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۹)

۴۔ ۱۹۰۰ء میں مرزا صاحب کے خاص خاص مرید وں نے ان کو صاف صاف نبی کہنا شروع کیا اور ان کو وہی حیثیت دینی شروع کر دی جو قرآن کی رُو سے انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ مرزا صاحب کبھی ان کے اس قول کی تصدیق و تائید کرتے تھے اور کبھی نبوت کے الفاظ کی توجیہہ ناقص نبی، جزوی نبی، محدث وغیرہ الفاظ سے کر کے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے جو نبوت کے دعوے پر ایمان لانے میں متامل تھے۔ اس دَور میں ۵۔ اگست ۱۹۰۰ء کو مرزا صاحب کے ایک مرید خاص مولوی عبدالکریم صاحب نے خود مرزا صاحب کی موجودگی میں ایک خطبۂ جمعہ پڑھا جس میں انہوں نے احمدیوں کو مخاطب کر کے کہ "اگر تم مسیح موعود کو ہر ایک امر میں حکم نہیں ٹھہراؤ گے اور اس پر ایمان نہیں لاؤ گے جیسا صحابہ نبی کریم پر ایمان لائے تو تم بھی ایک گونہ غیر احمدیوں کی طرح اللہ کے رسولوں میں تفریق کرنے والے ہو گے"۔ مرزا صاحب نے جمعہ کے بعد ان الفاظ میں اس کی توثیق کی کہ "یہ بالکل میرا مذہب ہے جو آپ نے بیان کیا"۔ (کلمۃ الفصل، صاحبزادہ بشیر احمد صاحب، صفحہ ۱۶۷) مگر اس توثیق کے باوجود مرزا صاحب خود نبوت کے صریح دعوے سے مجتنب رہے۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کے بقول اس زمانہ میں مرزا صاحب کا عقیدہ یہ تھا کہ "آپ کو حضرت مسیح پر جزوی فضیلت ہے اور آپ کو جو نبی کہا جاتا ہے تو یہ ایک قسم کی جزوی نبوت ہے اور ناقص نبوت" (القول الفیصل صفحہ ۲۴۔ نیز مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو منکرینِ خلافت کا انجام از جلال الدین صاحب شمس صفحہ ۱۹)

۵۔ ۱۹۰۱ء میں مرزا صاحب نے اپنے نبی اور رسول ہونے کا صاف صاف اعلان کیا اور اپنی اکثر تحریروں میں اس نبوت و رسالت کو "ناقص"، "جزوی" اور "محدثیت" وغیرہ الفاظ سے محدود کرنا ترک کر دیا (سیرۃ المہدی حصہ اول صفحہ ۳۱) جلال الدین شمس صاحب اپنی کتاب "منکرینِ خلافت کا انجام" میں اس کے متعلق یہ تصریح کرتے ہیں کہ ۱۹۰۱ء سے پہلے کی بعض تحریرات میں حضرت اقدس (یعنی مرزا صاحب) نے اپنے نبی ہونے سے انکار کیا اور لکھا کہ آپ نبی نہیں بلکہ محدث ہیں۔ لیکن ۱۹۰۱ء کے بعد کی

تحریرات میں آپ نے اپنی نبوت کو نہ جزئی قرار دیا نہ ناقص نہ محدثیت والی نبوت، بلکہ صاف الفاظ میں اپنے آپ کو نبی لکھتے رہے۔" (صفحہ ۱۹) اسی کے متعلق مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب فرماتے ہیں: ۱۹۰۱ء میں اپنے عقیدے میں تبدیلی کی ہے اور ۱۹۰۰ء ایک درمیانی عرصہ ہے جو دونوں خیالات کے درمیان برزخ کے طور پر حد فاصل ہے ..... پس یہ ثابت ہے کہ ۱۹۰۱ء کے پہلے کے حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے، اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت پکڑنی غلط ہے۔"

(حقیقۃ النبوۃ صفحہ ۱۲۱)

۶۔ ۱۹۰۴ء میں مرزا صاحب نے منجملہ اور دعاوی کے ایک دعوے یہ بھی کیا کہ وہ کرشن ہیں۔ (لیکچر سیالکوٹ از مرزا صاحب، مورخہ ۲ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۴)[1]

جھوٹی نبوت کا سہارا۔ نظامِ باطل

مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے جھوٹے دعوے جن مقصد کے لیے تھے وہ مقصد ایک طرف مسلمانوں میں سے مسئلہ جہاد کو ساقط کر کے انہیں فرنگی کے طاغوتِ اکبر کی غلامی پر تہِ دل سے راضی کرنا تھا اور دوسری طرف خود اپنے لیے فرنگی آقاؤں کی خوشنودی اور نظرِ کرم حاصل کرنا تھا۔ وہ اپنے آپ کو انگریزوں کا بہترین وفادار اور خیرخواہ ثابت کر کے اپنے آپ کو ان کے تحفظ میں دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے لیے ان سے زیادہ سے زیادہ دنیوی منافع اور مادی اغراض حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ ان کے زیرِ سایہ نبوت کی ایک شاندار گدی قائم کر کے دنیا کمائیں اور انگریز کے زیرِ سایہ آرام و راحت کی مشائخ و روساء والی پُر تعیش زندگی گزار سکیں اور لاکھوں افراد کے مقتدا بن جائیں۔

لیکن مسلمانوں نے ایسی جھوٹی نبوتوں کے چراغ کبھی نہیں جلنے دیے۔ چاہے وہ مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت ہو جس کے خلاف ابوبکر صدیقؓ کے اسلامی لشکر نے پیش قدمی کی یا

---

[1] قادیانی مسئلہ ص ۹۱ تا ۹۵۔

مرزا غلام احمد قادیان کی جھوٹی نبوت ہو جس کے رد کے لیے دورِ غلامی میں بھی گوریوں کے سامنے اپنے سینے کھولتے رہے اور علامہ اقبالؒ جیسے اکابرینِ ملت بھی سربکف ہو کر ان کے خلاف معروفِ جہاد رہے۔

چنانچہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنے تیسرے بیان میں اس جھوٹی نبوت کے لیے نظام طاغوت کے بودے سہارے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"جو لوگ مسلمانوں کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے دور سے لے کر آج تک اس طرح کے مدعیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ جہاں حکومت مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہو وہاں نئی نئی نبوتوں کے چراغ نہ کبھی جلنے دیے گئے ہیں اور نہ آئندہ کبھی امید کی جا سکتی ہے کہ جلنے دیے جائیں گے ایسے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ صرف ایک غیر مسلم حکومت ہی میں آدمی کو یہ آزادی مل سکتی ہے کہ حکومت کو اپنی وفاداری و خدمت گزاری کا پورا اطمینان دلانے کے بعد مذہب کے دائرے میں جو دعویٰ چاہے کرے اور مسلمانوں کے دین، ایمان اور معاشرے میں جیسے فتنے چاہے اٹھاتا رہے۔ اس لیے ایسے مدعی ہمیشہ اسلام کی حکومت پر کفر کی حکومت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شکارگاہ مسلمان قوم ہی ہے، کیونکہ وہ اسلام کے نام پر اپیل کرتے ہیں اور قرآن و حدیث کے اسلحہ سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ان کا مفاد یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمان قوم ایک کافر اقتدار کے پنجے میں بے بس ہو کر ان کی شکارگاہ بنی رہے اور یہ اس کافر اقتدار کے پلے وفادار بن کر اس کا شکار کرتے رہیں۔ ایک آزاد خود مختار مسلمان قوم ان کے لیے بڑی سنگلاخ زمین ہے جسے وہ دل سے پسند نہیں کرتے اور نہیں کر سکتے۔"

اس کے ثبوت میں مرزا غلام احمد صاحب اور ان کی جماعت کے بکثرت بیانات میں سے یہاں صرف چند کا نقل کر دینا کافی ہے:

"بلکہ اس گورنمنٹ کے ہم پر اس قدر احسان ہیں کہ اگر ہم یہاں سے

نکل جائیں تو نہ ہمارا مکہ میں گزارا ہو سکتا ہے اور نہ قسطنطنیہ میں۔ تو پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے بر خلاف کوئی خیال اپنے دل میں رکھیں"۔ (ملفوظات احمدیہ جلد اوّل ص ۱۴۶)

• میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں نہ روم میں نہ شام میں نہ ایران میں نہ کابل میں مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لیے دعا کرتا ہوں"۔

(تبلیغ رسالت، مرزا غلام احمد صاحب جلد ششم ص ۶۹)

• یہ تو سوچو کہ اگر تم اس گورنمنٹ کے سائے سے باہر نکل جاؤ تو پھر تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ ایسی سلطنت کا بھلا نام تو لو جو تمہیں اپنی پناہ میں لے لے گی۔ ہر ایک اسلامی سلطنت تمہیں قتل کرنے کے لیے دانت پیس رہی ہے۔ کیونکہ ان کی نگاہ میں تم کافر اور مرتد ٹھہر چکے ہو، سو تم اس خداداد نعمت کی قدر کرو اور تم یقیناً سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ نے سلطنت انگریزی تمہاری بھلائی کے لیے ہی اس ملک میں قائم کی ہے اور اگر اس سلطنت پر کوئی آفت آئے تو وہ آفت تمہیں بھی نابود کر دے گی ——— ذرا کسی اور سلطنت کے زیر سایہ رہ کر دیکھ لو کہ تم سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ سنو، انگریزی سلطنت تمہارے لیے ایک رحمت ہے، تمہارے لیے ایک برکت ہے اور خدا کی طرف سے تمہاری وہ سپر ہے۔ پس تم دل و جان سے اس سپر کی قدر کرو اور ہمارے مخالف جو مسلمان ہیں ہزار ہا درجہ ان سے انگریز بہتر ہیں کیونکہ وہ ہمیں واجب القتل نہیں سمجھتے۔ وہ تمہیں بے عزت نہیں کرنا چاہتے۔" (اپنی جماعت کے لیے ضروری نصیحت" از مرزا غلام احمد صاحب، مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دہم ص ۱۲۳)

• ایرانی گورنمنٹ نے جو سلوک مرزا علی محمد باب بانی فرقہ بابیہ اور

اس کے بے کس مریدوں کے ساتھ محض مذہبی اختلافات کی وجہ سے کیا اور جو ستم اس فرقے پر توڑے گئے وہ ان دانشمند لوگوں پر مخفی نہیں ہیں جو قوموں کی تاریخ پڑھنے کے عادی ہیں اور پھر سلطنت ترکی نے جو ایک یورپ کی سلطنت کہلاتی ہے جو برتاؤ بہاء اللہ بانی فرقہ بابیہ بہائیہ اور اس کے جلا وطن شدہ پیروؤں سے ۱۸۶۳ء سے لے کر ۱۸۹۲ء تک پہلے قسطنطنیہ پھر ایڈریا نوپل اور بعد ازاں عکہ کے جیل خانے میں کیا وہ بھی دنیا کے اہم واقعات پر اطلاع رکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہے۔ دنیا میں تین ہی بڑی سلطنتیں کہلاتی ہیں[۱]۔ اور تینوں نے جو تنگدلی اور تعصب کا نمونہ اس شائستگی کے زمانے میں دکھایا وہ احمدی قوم کو یہ یقین دلائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ احمدیوں کی آزادی تاج برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہے ــــــ لہٰذا تمام سچے احمدی جو حضرت مرزا صاحب کو مامور من اللہ اور ایک مقدس انسان تصور کرتے ہیں بدوں کسی خوشامد اور چاپلوسی کے دل سے یقین کرتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ ان کے لیے فضلِ ایزدی اور سایۂ رحمت ہے اور اس کی ہستی کو وہ اپنی ہستی خیال کرتے ہیں۔"

(الفضل، ۱۲، ستمبر ۱۹۱۴ء)

یہ عبارات اپنی زبان سے خود کہہ رہی ہیں کہ کفار کی غلامی جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے، مدعیانِ نبوت اور ان کے پیروؤں کے لیے وہی عین رحمت اور فضلِ ایزدی ہے، کیونکہ اس کے زیر سایہ ان لوگوں کو اسلام میں نئی نئی نبوتوں کے فتنے اٹھانے اور مسلم معاشرے کی قطع و برید کرنے کی آزادی حاصل ہو سکتی ہے اور اس کے برعکس مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت، جو مسلمانوں کے لیے ایک رحمت ہے، ان لوگوں کے لیے وہی ایک آفت ہے۔

---

[۱] غالباً مسلمانوں کی تین بڑی سلطنتیں مراد ہیں، یعنی ترکی، ایران اور افغانستان۔

کیونکہ با اختیار مسلمان بہر حال اپنے ہی دین کی تخریب اور اپنے ہی معاشرے کی قطع و برید کو بخوشی برداشت نہیں کر سکتے۔

طاغوت وقت کے زیر سایہ پرورش پانے والی اس جھوٹی نبوت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں:

" قرآن مجید کی روشن تعلیمات اور روح اسلام کے بالکل برخلاف اور انبیاء و مرسلین صحابہ و تابعین اور ان کے متبعین کے اسوۂ حسنہ کے بالکل برعکس مرزا غلام احمد صاحب جن کو مامور من اللہ اور مرسل من عند اللہ ہونے کا دعویٰ ہے اپنے عہد کے طاغوتِ اکبر انگریزی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ وہ اس حکومت کی تائید و حمایت میں سرگرم نظر آتے ہیں جو اسلامی مملکت کی غاصب اور اسلامی اقتدار کی سب سے بڑی حریف اور اپنے زمانے میں فساد و الحاد کی سب سے بڑی علمبردار تھی۔ وہ ایسے کھلے لفظوں میں اس حکومت کی مدح و ثناء کرتے ہیں۔ جس کے لیے ایک صاحب ضمیر انسان تیار نہیں ہو سکتا۔ ان کو شروع سے اس مسئلے کا اتنا اہتمام تھا کہ ان کی کوئی تصنیف مشکل سے اس سے خالی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی اور سب سے اہم تصنیف "براہینِ احمدیہ" کے حصہ اول میں جس طرح اس حکومت کی تعریف و توصیف کی ہے اور اس کے احسانات و خدمات گنائے ہیں اور جس طرح اسلامی انجمنوں کو مسلمانوں کی طرف سے وفاداری کا محضر پیش کرنے اور جہاد کو منسوخ و ممنوع قرار دینے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ عبرت ناک ہے۔ یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ اس موضوع پر انہوں نے ایک وسیع کتب خانہ تیار کر دیا۔ جس میں انہوں نے بار بار اپنی وفاداری اور اخلاص اور اپنی خاندانی خدمات اور انگریزی حکومت کی تائید و حمایت میں اپنی سرگرمی اور انہماک کا ذکر کیا ہے اور ایک ایسے زمانے میں جب مسلمانوں میں دینی حمیت کو بیدار کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ انہوں نے بار بار جہاد کے حرام و ممنوع ہونے کا اعلان کیا۔ یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ ہم صرف چند عبارتیں اور اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

ے قادیانیت مولفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۲۹ تا ۱۳۵۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید و حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ اگر وہ اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب، مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔"[1]

وہ اپنی کتاب شہادت القرآن کے آخر میں لکھتے ہیں:

"میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں، ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے، دوسرے اس سلطنت کی کہ جس نے امن قائم کیا ہو جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سائے میں پناہ دی ہو، سو وہ سلطنت حکومتِ برطانیہ ہے۔"[2]

ایک درخواست میں جو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء کو پیش کی گئی تھی، لکھتے ہیں:

"دوسرا امر قابلِ گذارش یہ ہے کہ میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں کہ تمام مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی

---

[1] تریاق القلوب صفحہ ۱۵۔

[2] اشتہار گورنمنٹ کی توجہ کے لائق صفحہ ۳۔ کتاب شہادۃ القرآن کے آخر میں۔

محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ دُور کروں جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں پر میری تحریروں کا بہت ہی اثر ہوا اور لاکھوں انسانوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"میں نے بیسیوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں اس غرض سے تالیف کی ہیں کہ اس گورنمنٹ محسنہ سے ہرگز جہاد درست نہیں بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے چنانچہ میں نے یہ کتابیں بصرفِ زرِ کثیر چھاپ کر بلادِ اسلام میں پہنچائیں اور میں جانتا ہوں کہ ان کتابوں کا بہت سا اثر اس ملک پر بھی پڑا ہے اور جو لوگ میرے ساتھ مریدی کا تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسی جماعت تیار ہوتی جاتی ہے کہ جن کے دِل اس گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی سے لبالب ہیں۔ ان کی اخلاقی حالت اعلیٰ درجہ پر ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ وہ تمام اس ملک کیلئے بڑی برکت ہیں اور گورنمنٹ کے لیے دلی جانثار۔"[2]

وہ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی، وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے بلادِ اسلام میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ

---

[1] تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۰۔

[2] عریضہ بعالی خدمت گورنمنٹ عالیہ انگریزی من جانب مرزا غلام احمد قادیانی صاحب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ششم صفحہ ۶۵۔ مولفہ میر قاسم علی صاحب قادیانی۔

انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے۔ لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعا گو رہے اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو فارسی، عربی میں تالیف کرکے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں، یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکے اور مدینے میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور بلادِ شام، مصر، کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا، اشاعت کر دی گئی۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلط خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکتا۔[1]

سارے مسائل میں مرزا صاحب کی خصوصی توجہ مسئلہ جہاد پر مرکوز تھی جو انگریزی حکومت کے لیے (صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں جن کا بڑا حصہ برطانیہ کے زیرِ اقتدار آچکا تھا) خاص تشویش اور اضطراب کا باعث تھا۔ مرزا صاحب نے جہاد کے دائمی طور پر منسوخ اور ممنوع ہو جانے کا اعلان فرمایا اور اس کو اپنے مسیح موعود ہونے کا نشان قرار دیا۔ چنانچہ منارۃ المسیح کے اعلان میں فرماتے ہیں:

"آسمان کے دروازوں کے کھلنے کا وقت آگیا۔ اب سے زمینی جہاد بند کیے گئے اور لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا، جیسا کہ حدیثوں میں پہلے لکھا گیا تھا کہ جب مسیح آئے گا تو دین کے لیے لڑنا حرام کیا جائے گا سو آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھا کر کافروں کو قتل کرتا ہے

---

[1] ستارہ قیصرہ صفحہ ۳۔

وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے۔ صحیح بخاری کو کھولو اور
اس حدیث کو پڑھو جو مسیح موعود کے حق میں ہے، یعنی جب مسیح
آئے گا تو جہادی لڑائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سو مسیح آچکا اور وہی ہے جو
تم سے بول رہا ہے[1]۔"

جہاد کے اس موقوف ہونے کو وہ اپنی "بعثت" کا مقصد اعظم قرار دیتے ہیں۔ تریاق القلوب کے ضمیمہ "اشتہار واجب الاظہار" میں لکھتے ہیں:

"میں اس لیے ظاہر نہیں ہوا کہ جنگ و جدل کا میدان گرم کروں بلکہ
اس لیے ظاہر ہوا ہوں کہ پہلے مسیح کی طرح صلح اور آشتی کے دروازے
کھول دوں اگر صلح کاری کی بنیاد درمیان نہ ہو تو پھر ہمارا سارا سلسلہ فضول
ہے اور اس پر ایمان لانا بھی فضول[2]۔"

ایک جگہ اور بھی صفائی اور اختصار کے ساتھ لکھا ہے:

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے، ویسے ویسے
مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی
مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے[3]۔"

مرزا صاحب نے اپنے عربی رسالہ "نور الحق" میں پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ان کا وجود انگریزی حکومت کے لیے ایک قلعہ اور حصار اور تعویذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی خدمات گناتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"مجھے حق ہے کہ میں دعویٰ کروں کہ میں ان خدمات میں منفرد ہوں
اور مجھے حق ہے کہ میں ان تائیدات میں یکتا ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں
یہ کہوں کہ میں اس حکومت کے لیے تعویذ اور ایسا قلعہ ہوں جو اس کو

---

[1] اشتہار چندہ منارة المسیح بہ ضمیمہ خطبہ الہامیہ۔

[2] تریاق القلوب صفحہ ۳۲۲۔ [3] تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۷۔

آفات و مصائب سے محفوظ رکھنے والا ہے اور میرے رب نے مجھے
بشارت دی اور فرمایا کہ اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا جب تک تم
ان میں ہو پس حقیقتہً اس حکومت کے پاس بجز اکوئی ہمسر اور نصرت و
تائید میں میرا کوئی مثیل نہیں۔ اگر خدائے اس حکومت کو نگاہ اور مردم شناسی
عطا کی ہے تو وہ اس کی تصدیق کرے گی۔[1]

مرزا صاحب نے اس درخواست میں جو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو ۲۴ر فروری ۱۸۹۸ء میں
پیش کی تھی، یہاں تک لکھا ہے:

"میرا یہ التماس ہے کہ سرکارِ دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس
کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت
کر چکی اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے
سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی
کے خیر خواہ اور خدمت گزار ہے اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت
حزم و احتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ
فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا
لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت اور مہربانی کی نظر سے
دیکھیں۔"[2]

کسی درخواست میں اپنے اور اپنی جماعت کے لیے "سرکار انگریزی کی نمک
پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ اور مورد مراحم گورنمنٹ کے الفاظ
بھی آئے ہیں۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنے رسالہ قادیانی مسئلہ میں مرزا صاحب کے پادریوں کے خلاف
مناظروں میں ان کی تیز و تند زبان کے لیے عذر کی معذرت انگریزی حکام کے سامنے پیش کرنے کا منظر

---

[1] نور الحق صفحہ ۳۴ [2] تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۹۔

ان کے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"مجھ سے پادریوں کے مقابل پر جو کچھ وقوع میں آیا یہی ہے کہ حکمت عملی سے بعض وحشی مسلمانوں کو خوش کیا گیا اور میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ میں تمام مسلمانوں میں سے اول درجے کا خیر خواہ گورنمنٹ انگریزی کا ہوں کیونکہ مجھے تین باتوں نے خیر خواہی میں اول درجے پر بنا دیا ہے۔

۱۔ والد مرحوم کے اثر نے۔

۲۔ اس گورنمنٹ عالیہ کے احسانوں نے۔

۳۔ خدا تعالیٰ کے الہام نے" (ص ۱۰۹۔۱۱۰)

اپنی وفاداری کا اظہار اپنی کتاب "شہادۃ القرآن" مطبوعہ پنجاب پریس سیالکوٹ طبع ششم کے ضمیمہ میں اس طرح کرتے ہیں :

"سو میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں۔ دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو، جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سائے میں ہمیں پناہ دی ہو سو وہ سلطنت حکومتِ برطانیہ ہے" (ص ۳)

"تبلیغ رسالت" جلد ہفتم مطبوعہ فاروق پریس قادیان (اگست ۱۹۲۲ء) میں مرزا صاحب کی ایک درخواست "بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر دام اقبالہ" درج ہے جس میں وہ پہلے اپنے خاندان کی وفاداریوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ چٹھیاں نقل کرتے ہیں جو ان کے والد مرزا غلام مرتضیٰ کو کمشنر لاہور، فنانشل کمشنر پنجاب اور دوسرے انگریز افسروں نے ان کی وفادارانہ خدمات کے اعتراف میں عطا کی تھیں۔ نیز ان خدمات کو گنایا ہے جو ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں نے انجام دیں۔ پھر لکھتے ہیں :

"میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں

اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دُور کروں جو ان کو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔" (ص ۱۰)

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"اور میں نے نہ صرف اسی قدر کام کیا کہ برٹش انڈیا کے مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی اطاعت کی طرف جھکایا بلکہ بہت سی کتابیں عربی اور فارسی اور اردو میں تالیف کر کے ممالک اسلامیہ کے لوگوں کو بھی مطلع کیا کہ ہم لوگ کیونکر امن اور آرام اور آزادی سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔" (ص ۱۰)

پھر وہ اپنی کتابوں کی ایک لمبی فہرست دیتے ہیں جن سے ان کی وفادارانہ خدمات کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں :

"گورنمنٹ تحقیق کرے کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہزاروں مسلمانوں نے جو مجھے کافر قرار دیا اور مجھے اور میری جماعت کو جو ایک گروہ کثیر پنجاب اور ہندوستان میں موجود ہے ہر ایک طور کی بد گوئی اور بد اندیشی سے ایذا دینا اپنا فرض سمجھا اس تکفیر اور ایذا کا ایک مخفی سبب یہ ہے کہ ان نادان مسلمانوں کے پوشیدہ خیالات کے برخلاف دل وجان سے گورنمنٹ انگلشیہ کی شکر گزاری کے لیے ہزارہا اشتہارات شائع کیے گئے اور ایسی کتابیں بلاد عرب وشام وغیرہ تک پہنچائی گئیں۔ یہ باتیں بے ثبوت نہیں۔ اگر گورنمنٹ توجہ فرمادے تو نہایت بدیہی ثبوت میرے پاس ہیں۔ میں زور سے کہتا ہوں اور میں دعوٰی سے گورنمنٹ کی خدمت میں اعلان کر دیتا ہوں کہ باعتبار مذہبی اصول کے مسلمانوں کے تمام فرقوں میں سے گورنمنٹ کا اوّل درجے کا وفادار اور جانثار یہی نیا فرقہ ہے جس کے اصولوں میں سے کوئی اصول گورنمنٹ کے لیے خطرناک نہیں۔" (ص ۱۲)

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں :

"اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرتا ہے۔" (ص ۱۷)

یہ عبارات درج کرنے کے بعد مولانا مودودی کہتے ہیں:

"تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو نظر انداز کر دیجئے کہ یہ زبان اور یہ تحریر کسی نبی کی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ ہم یہاں جس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اس مذہب کی تبلیغ و تلقین اور "مدافعتِ اسلام" کے وہ مقاصد و محرکات ہیں جو بانی مذہب نے خود بیان کیے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی یہ نام نہاد خدمتِ دین، کسی قدر کی مستحق رہ جاتی ہے؟ اس پر بھی اگر کوئی شخص اس خدمتِ دین کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے تو ہم اس سے گزارش کریں گے کہ ذرا قادیانیوں کے اپنے ان اعترافات کو آنکھیں کھول کر پڑھے:

"عرصۂ دراز کے بعد اتفاقاً ایک لائبریری میں ایک کتاب ملی جو چھپ کر نایاب بھی ہو گئی تھی۔ اس کتاب کا مصنف ہے۔ ایک اطالوی انجینئر جو افغانستان میں ذمہ دار عہدہ پر فائز تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ صاحب زادہ عبداللطیف صاحب (قادیانی) کو اس لیے شہید کیا گیا کہ وہ جہاد کے خلاف تعلیم دیتے تھے اور حکومتِ افغانستان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اس سے افغانوں کا جذبۂ حریت کمزور ہو جائے گا اور ان پر انگریزوں کا اقتدار چھا جائے گا ___ ایسے معتبر راوی کی روایت سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اگر صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہید خاموشی سے بیٹھے رہتے اور جہاد کے خلاف کوئی لفظ بھی نہ کہتے تو حکومتِ افغانستان کو انہیں شہید کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔" (مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب کا خطبۂ جمعہ مندرجہ الفضل مورخہ ۶، اگست ۱۹۳۵ء)

"افغانستان گورنمنٹ کے وزیر داخلیہ نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا ہے۔ کابل کے دو اشخاص ملا عبدالحلیم چہار آسیائی و ملا نور علی دکاندار قادیانی

عقائد کے گرویدہ ہو چکے تھے اور لوگوں کو اس عقیدہ کی تلقین کر کے انہیں اصلاح کی راہ سے بھٹکا رہے تھے۔ ان کے خلاف مدت سے ایک اور دعویٰ دائر ہو چکا تھا اور مملکتِ افغانیہ کے مصالح کے خلاف غیر ملکی لوگوں کے سازشی خطوط ان کے قبضہ سے پائے گئے جن سے پایا جاتا ہے کہ وہ افغانستان کے دشمنوں کے ہاتھ بک چکے تھے۔" (اخبار الفضل بحوالہ امان افغان مورخہ ۳۔ مارچ ۱۹۲۵ء)

• "دنیا ہمیں انگریزوں کا ایجنٹ سمجھتی ہے، چنانچہ جب جرمنی میں احمدیہ عمارت کے افتتاح کی تقریب میں ایک جرمن وزیر نے شمولیت کی تو حکومت نے اس سے جواب طلب کیا کہ کیوں تم ایسی جماعت کی کسی تقریب میں شامل ہوئے جو انگریزوں کی ایجنٹ ہے۔" (خلیفہ قادیان کا خطبۂ جمعہ۔ مندرجہ اخبار الفضل مورخہ یکم نومبر ۱۹۳۴ء)

• "ہمیں امید ہے کہ برٹش حکومت کی توسیع کے ساتھ ہمارے لیے اشاعت اسلام کا میدان بھی وسیع ہو جائے گا اور غیر مسلم کو مسلم بنانے کے ساتھ ہم مسلمان کو پھر مسلمان کریں گے۔" (لارڈ ہارڈنگ کی سیاحتِ عراق پر اظہارِ خیال۔ مندرجہ الفضل مورخہ ۱۱۔ فروری ۱۹۱۰ء)

• "فی الواقع گورنمنٹ برطانیہ ایک ڈھال ہے جس کے نیچے احمدی جماعت آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس ڈھال کو ذرا ایک طرف کر دو اور دیکھو کہ زہریلے تیروں کی کیسی خطرناک بارش تمہارے سروں پر ہوتی ہے۔ پس کیوں ہم اس گورنمنٹ کے شکر گزار نہ ہوں۔ ہمارے فوائد اس گورنمنٹ سے متحد ہو گئے ہیں اور اس گورنمنٹ کی تباہی ہماری تباہی ہے اور اس گورنمنٹ کی ترقی ہماری ترقی۔ جہاں جہاں اس گورنمنٹ کی حکومت پھیلتی جاتی ہے، ہمارے لیے تبلیغ کا ایک میدان نکلتا آتا ہے۔"

(الفضل ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

"سلسلۂ احمدیہ کا گورنمنٹ برطانیہ سے جو تعلق ہے وہ باقی تمام جماعتوں سے نرالا ہے۔ ہمارے حالات ہی اس قسم کے ہیں کہ گورنمنٹ اور ہمارے فوائد ایک ہو گئے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ برطانیہ کی ترقی کے ساتھ ہمیں بھی آگے قدم بڑھانے کا موقع ملتا ہے اور اس کو خدانخواستہ اگر کوئی نقصان پہنچے تو اس صدمے سے ہم بھی محفوظ نہیں رہ سکتے"۔

(خلیفۂ قادیان کا اعلان مندرجہ اخبار الفضل، ۲۷ جولائی ۱۹۱۸ء)

ان اقتباسات سے قادیانیت کے بنیادی خدوخال اور قادیانی جماعت کی پوری تصویر آپ کے سامنے آجاتی ہے۔ اس تصویر کے بنیادی خدوخال یہ ہیں۔

۱۔ پچاس برس سے زیادہ مدت ہوئی، جب کہ انگریزی دورِ حکومت میں مسلمان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، پنجاب میں ایک شخص نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھا۔ جس قوم کو اللہ کی توحید اور رسالت محمدی کے اقرار نے ایک قوم، ایک ملت اور ایک معاشرہ بنایا تھا اس کے اندر اس شخص نے یہ اعلان کیا کہ مسلمان ہونے کے لیے توحید و رسالتِ محمدی پر ایمان لانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ میری نبوت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، اور جو اس پر ایمان نہ لائے وہ توحید و رسالتِ محمدی پر ایمان رکھنے کے باوجود کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

۲۔ اس بنیاد پر اس نے مسلم معاشرے میں کفر و ایمان کی نئی تفریق پیدا کی اور جو لوگ اس پر ایمان لائے ان کو مسلمانوں سے الگ ایک امت اور ایک معاشرے کی شکل میں منظم کرنا شروع کر دیا۔ اس نئی امت اور مسلمانوں کے درمیان اعتقاداً اور عملاً ویسی ہی جدائی پڑ گئی جیسی ہندوؤں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تھی۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ نہ عقیدے میں شریک رہی نہ عبادت میں، نہ رشتے ناطے میں، اور نہ شادی و غم میں۔

۳۔ بانیٔ مذہب کو اول روز سے یہ احساس تھا کہ مسلم معاشرہ اپنی اس قطع و برید کو بخوشی برداشت نہیں کرے گا اور نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس نے اور اس کے جانشینوں نے

ذمہ صرف ایک پالیسی کے طور پر انگریزی حکومت کی پختہ وفاداری و خدمت گزاری کا رویہ اختیار کیا بلکہ عین اپنے موقف کے فطری تقاضے سے ہی انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کا مفاد لازماً غلبۂ کفر کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں نہیں، تمام دنیا میں اس بات کے خواہشمند رہے اور عملاً اس کے لیے کوشاں رہے کہ آزاد مسلمان تو میں بھی انگریزوں کی غلام ہو جائیں تاکہ ان میں اس نئے مذہب کی اشاعت کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

۴۔ اس طرح بیرونی اقتدار سے گٹھ جوڑ کر کے اس جماعت نے مسلمانوں کی ان تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا جو گزشتہ نصف صدی میں اسے مسلمانوں سے خارج کرنے کے لیے کی گئیں اور انگریزی حکومت اس بات پر مُصر رہی کہ یہ گروہ مسلمانوں سے الگ، بلکہ ہر چیز میں ان کا مخالف ہونے کے باوجود ان ہی میں شامل رہے گا۔ اس تدبیر سے مسلمانوں کو دُہرا نقصان اور قادیانی جماعت کو دُہرا فائدہ پہنچایا گیا۔

الف۔ عام مسلمانوں کو علماء کی تمام کوششوں کے باوجود یہ باور کرایا جاتا رہا کہ قادیانیت اسلام ہی کا ایک فرقہ اور قادیانی گروہ مسلم معاشرے کا ہی ایک حصّہ ہے۔ اس طرح قادیانیت کے لیے مسلمانوں میں پھیلنا زیادہ آسان ہو گیا کیونکہ اس صورت میں ایک مسلمان کو قادیانیت اختیار کرتے ہوئے یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے نکل کر کسی دوسرے معاشرے میں جا رہا ہے۔ قادیانیوں کو اس سے یہ فائدہ پہنچا کہ وہ مسلمانوں میں سے برابر آدمی توڑ توڑ کر اپنی تعداد بڑھاتے رہے اور مسلمانوں کو یہ نقصان پہنچا کر ان کے معاشرے میں ایک بالکل الگ گروہ اور مخالف معاشرہ سرطان کی طرح اپنی جڑیں پھیلاتا رہا جس کی بدولت ہزارہا خاندانوں میں تفرقے برپا ہو گئے خصوصیت کے ساتھ پنجاب اس کا سب سے زیادہ شکار ہوا کیونکہ یہ بلا اسی صوبے سے اٹھی تھی اور یہی وجہ ہے کہ آج پنجاب ہی کے مسلمان اس کے خلاف سب سے بڑھ کر مشتعل ہیں۔

ب۔ انگریزی حکومت کی منظورِ نظر بن کر قادیانی جماعت انگریزی حکومت کی فوج، پولیس،

عدالت اور دوسری ملازمتوں میں اپنے آدمی دھڑا دھڑ بھرتی کراتی چلی گئی، اور یہ سب کچھ اس نے مسلمان بن کر ملازمتوں کے اس کوٹے سے حاصل کیا جو مسلمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ مسلمانوں کو اطمینان دلایا جاتا رہا کہ یہ ملازمتیں تمہیں مل رہی ہیں، حالانکہ وہ بڑی کثیر تعداد میں ان قادیانیوں کو دی جا رہی تھیں جو مسلمانوں کے مدمقابل بن کر اپنی جتھہ بندی کیے ہوئے تھے۔ ایسا ہی معاملہ ٹھیکوں، تجارتوں اور زمینوں کے بارے میں بھی کیا گیا۔

ھ۔ اب یہ گروہ اپنے اس گہرے احساس کی بناء پر کہ پاکستان کا مسلم معاشرہ جداگانہ قائم ہونے کے بعد زیادہ دیر تک اسے برداشت نہ کرے گا بہت تیزی کے ساتھ اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ ایک طرف اس کے تمام وہ افراد جو ذمہ دار سرکاری عہدوں پر ہیں حکومت کے ہر شعبے میں اپنے آدمی بھر رہے ہیں۔ اور معاشی وسائل و ذرائع پر بھی قادیانیوں کا زیادہ سے زیادہ قبضہ کرا رہے ہیں تاکہ تھوڑی مدت ہی میں ان کی طاقت اتنی مضبوط ہو جائے کہ پاکستان کے مسلمان آزاد و مختار ہونے کے باوجود ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ دوسری طرف وہ اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ کم از کم بلوچستان پر قبضہ کرکے پاکستان کے اندر اپنی ایک ریاست بنالیں۔

قادیانیت ایک مستقل مذہب

قادیانیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مستقل مذہب ہے جس کا اپنا ایک نام نہاد نبی ہے جس کے اپنے شعائر ہیں۔ جس کے اپنے مصالح اور اپنے مقاصد ہیں حقیقت یہ ہے کہ قادیانیت کے بارے میں یہ سراسر غلط فہمی ہے کہ وہ مسلمانوں کے صدہا دینی و علمی اختلافات اور مکاتب فکر میں سے ایک دینی و علمی اختلاف رائے اور ایک خاص مکتب فکر ہے اور اس کے پیرو امت اسلامیہ کے مذہبی فرقوں اور جماعتوں میں سے ایک مذہبی فرقہ و جماعت ہیں اور یہ اسلام کی کلامی و فقہی تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔[1]

---

[1] مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب قادیانیت ص ۱۶۸ تا ۱۷۱۔

لیکن قادیانیت کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنے سے یہ غلط فہمی اور خوش گمانی دور ہو جاتی ہے اور ایک منصف مزاج انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیت ایک مستقل مذہب اور قادیانی ایک مستقل امت ہیں جو دینِ اسلام اور امتِ اسلامیہ کے بالکل متوازی چلتے ہیں فی الحقیقت مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے اس بیان میں کوئی مبالغہ اور غلط بیانی نہیں ہے کہ "حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفاتِ مسیح یا اور چند مسائل میں ہے۔ اللہ کی ذات، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔"[1]

اور یہ کہ

"حضرت خلیفۂ اول نے اعلان کیا تھا کہ ان کا (مسلمانوں کا) اسلام اور ہے اور ہمارا اور ہے۔"[2]

اسلام کی تاریخ میں اس سے پہلے ایک اور تحریک کی نظیر ملتی ہے جس نے اسلام کا نام لیتے ہوئے اور اپنے دائرہ عمل کو مسلمانوں کے اندر محدود رکھتے ہوئے اسلام کے نظامِ عقائد و افکار اور نظامِ زندگی کے بالکل متوازی ایک نظامِ اعتقاد و فکر اور ایک نظامِ زندگی کی بنیاد ڈالی اور اسلام کے دائرہ میں "ریاست اندرونِ ریاست" کی تعمیر کی کوشش کی۔ یہ تحریکِ باطنیت ہے یا اسماعیلیت جس سے قادیانی تحریک کو حیرت انگیز مماثلت حاصل ہے۔[3]"

... ...

---

[1] خطبہ جمعہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب مندرجہ اخبار "الفضل" مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء۔ [2] ایضاً مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۱۳ء [3] ملاحظہ ہو "ہمارا اسماعیلی مذہب اور اس کا نظام" از ڈاکٹر زاہد علی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد

قادیانی تحریک اسلام کے دینی نظام اور زندگی کے ڈھانچے کے مقابلہ میں ایک نیا دینی نظام اور زندگی کا نیا ڈھانچہ پیش کرتی ہے۔ وہ دینی زندگی کے تمام شعبوں اور مطالبوں کی بطورِ خود خانہ پُری کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے پیروؤں کو جدید نبوت، جدید مرکزِ محبت و عقیدت، نئی دعوت، نئے روحانی مرکز اور مقدسات، نئے مذہبی شعائر، نئے مقتدا، نئے اکابر، نئی تاریخی شخصیتیں عطا کرتی ہے۔ غرض یہ کہ وہ قلب و دماغ اور فکر و اعتقاد کا نیا مرکز قائم کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کو ایک فرقہ اور فقہی یا کلامی دبستان یا مکتبِ خیال سے زیادہ ایک مستقل مذہب اور نظامِ زندگی کی شکل عطا کرتی ہے۔ اس کے اندر اس بات کا ایک واضح رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ نئی مذہبی بنیادوں پر ایک نئے معاشرے کی تعمیر کرے اور مذہبی زندگی کو ایک نئی شکل اور مستقل وجود بخشے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ جو افراد خلوص اور جوش کے ساتھ اس تحریک و دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس کے دائرہ میں آ جاتے ہیں، ان کے فکر و اعتقاد کا مرکز بدل جاتا ہے اور ان کی زندگی میں قدیم دینی مرکزوں اور اداروں (اپنے وسیع معنی میں) اور شخصیتوں کی جگہ پر جدید دینی مرکز اور ادارے اور شخصیتیں آ جاتی ہیں اور وہ ایک نئی امت بن جاتے ہیں جو اپنے جذبات، طریقِ فکر، عقیدت و محبت میں ایک مستقل شخصیت اور وجود کے مالک ہوتے ہیں۔ انفرادیت اور تقابل کا یہ رجحان قادیانیت کے اندر شروع سے کام کر رہا ہے اور وہ اب بلوغ و پختگی کے اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ قادیانی اصحاب بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اسلامی شعائر و مقدسات کے ساتھ قادیانی شعائر اور مقدسات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کا ہم پلہ اور مساوی قرار دیتے ہیں۔ صحابۂ کرامؓ کو اسلام کے دینی نظام میں جو مرکزی مقام حاصل ہے، وہ ظاہر ہے لیکن قادیانی اصحاب مرزا صاحب کے رفقاء اور ہم نشینوں کو صحابۂ رسولؐ ہی کا درجہ دیتے ہیں، ایک قادیانی ذمہ دار اس ذہنیت کی اس طرح ترجمانی کرتے ہیں:

"ان دونوں گروہوں (صحابۂ کرام اور رفقائے مرزا غلام احمد صاحب) میں تفریق کرنی یا ایک کو دوسرے سے مجموعی رنگ میں افضل قرار دینا ٹھیک نہیں۔ یہ دونوں فرقے درحقیقت ایک ہی جماعت ہیں،

صرف زمانہ کا فرق ہے۔ وہ بعثتِ اُولیٰ کے تربیت یافتہ ہیں اور یہ بعثتِ ثانیہ کے۔[1]

اس طرح وہ مرزا غلام احمد صاحب کے مدفن کو مرقدِ رسولؐ اور گنبدِ خضراء کا مماثل وشبیہہ بتلاتے ہیں: "الفضل" نے ۱۸ دسمبر ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں قادیان کے شعبۂ تربیت کا یہ بیان شائع کیا تھا جس میں ان شرکائے جلسہ کی دینی بے حسی اور بدذوقی کی شکایت کرتے ہوئے جو قادیان حاضر ہونے کے باوجود مرزا صاحب کے مدفن پر حاضری نہیں دیتے کہا گیا ہے:

"کیا حال ہے اس شخص کا جو قادیان دارالامان میں آئے اور دو قدم چل کر مقبرۂ بہشتی میں حاضر نہ ہوا۔ اس میں وہ روضۂ مطہرہ ہے جس میں اس خدا کے برگزیدہ کا جسم مبارک مدفون ہے جسے افضل الرسل نے اپنا سلام بھیجا اور جس کی نسبت حضرت خاتم النبیینؐ نے فرمایا یُدفن معی فی قبری۔ اس اعتبار سے مدینہ منورہ کے گنبدِ خضرا کے انوار کا پورا نقش یہاں موجود ہے۔"

مرزا محمود صاحب نے اپنے ایک خطبۂ جمعہ میں ارشاد فرمایا:

"چونکہ حج پر وہی لوگ جا سکتے ہیں جو مقدرت رکھتے اور امیر ہوں حالانکہ الٰہی تحریکات پہلے غرباء میں پھیلتی اور پنپتی ہیں اور غرباء کو حج سے شریعت نے معذور رکھا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور ظلّی حج مقرر کیا تاکہ وہ قوم جس سے وہ اسلام کی ترقی کا کام لینا چاہتا ہے اور تاکہ وہ غریب بھی ہندوستان کے مسلمان اس میں شامل ہو سکیں۔"[2]

اس بارے میں اتنا غلو ہونے لگا کہ قادیان کے سفر کو حج بیت اللہ پر ترجیح دی

---

[1] الفضل ۲۸ مئی ۱۹۱۸ء [2] الفضل یکم دسمبر ۱۹۲۲ء

جانے لگی اور یہ اس ذہنیت کا لازمی و قدرتی نتیجہ ہے کہ قادیانیت ایک زندہ اور جدید مذہب اور اس کا مرکز ایک زندہ اور جدید مذہب کا روحانی مرکز تسلیم ہو جس سے نئی زندگی اور نئی مذہبی توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی بناء پر ایک قادیانی بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ:

• جیسے احمدیت کے بغیر پہلا یعنی حضرت مرزا صاحب کو چھوڑ کر جو اسلام باقی رہ جاتا ہے، وہ خشک اسلام ہے۔ اسی طرح اس حج ظلّی کو چھوڑ کر مکہ والا حج بھی خشک حج رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں پر آج کل حج کے مقاصد پورے نہیں ہوتے۔[1]

انفرادیت کا رجحان اور ایک مستقل دین اور نئی تاریخ کے آغاز کا احساس اتنا بڑھ گیا کہ قادیانی حضرات نے اپنی نئی تقویم کی بنیاد ڈال دی اور سال کے مہینوں کے نئے ناموں سے تاریخ لکھنے لگے۔ قادیانیت کے سرکاری ترجمان "الفضل" میں مہینوں کے جو نام چھپتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

صلح، تبلیغ، امان، شہادت، ہجرت، احسان، وفا، ظہور، تبوک، اخاء، نبوت، فتح۔

... ...

ان مذہبی تصورات اور انفرادیت کے رجحانات کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب و تحریک قادیانیت کا ذہنی، روحانی و سیاسی مرکز بجائے جزیرۃ العرب اور مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ کے، جو اسلام کا گہوارہ اور اس کی زندگی کا سرچشمہ اور ابدی مرکز ہیں، قادیان بننے لگا جو اس نئے مذہب و تحریک کے ظہور اور نشو و نما کا مرکز ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہو گا کہ قادیانیت اور اس کے پیروؤں کی وابستگی عرب و حجاز سے روز بروز کم ہوتی چلی جائے گی اور اس کی دلچسپیاں اور توجہات ہندوستان میں محدود ہونے لگیں گی جس کی سرزمین سے یہ دعوت و تحریک اٹھی

---

[1] پیغام صلح جلد ۲۱، نمبر ۲۲۔ [2] ماخوذ از قادیانیت مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۵ تا ۱۱۔

اور جس کی خاک سے اس کا بانی اور داعی پیدا ہوا اور بالآخر اسی میں نشوونما پاکر اور اپنی زندگی کی منزلیں طے کر کے دفن ہوا۔ یہ اس آغاز اور طریقِ فکر کا قدرتی نتیجہ ہے جو اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوگا اور جس طرح درخت کے پھل پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ اس تحریک و دعوت کے مزاج اور اس کے طریقِ کار کے اس منطقی نتیجہ پر بھی تعجب کا کوئی موقع نہیں۔

... ...

قادیانیت کے اس مزاج اور اس کے اس رُخ کا ہندوستان کے ان قوم پرستوں نے پُرجوش خیر مقدم کیا جن کو ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ پرانی شکایت ہے کہ ان کی اصلی وابستگی سرزمین حجاز سے ہے اور وہ ہمیشہ عرب کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس عنصر کے نزدیک ہندوستانی قومیتِ متحدہ کے لیے یہ بات تشویش اور انتشار کا باعث ہے کہ ملک کی آبادی کا ایک اہم اور کثیر التعداد عنصر ایک بیرونی ملک سے روحانی وقلبی تعلق رکھے اور اس کا دینی مرکز اس کی روحانی شخصیتیں اس کے مقاماتِ مقدسہ اور اس کا عزیز ترین تاریخی سرمایہ ہندوستان کی بجائے کسی اور ملک یا حصہ زمین میں ہو۔ ہندوستان کے اس قوم پرست عنصر نے قادیانیت کا اس حیثیت سے پُرجوش استقبال کیا ہے کہ وہ ایک خالص ہندوستانی تحریک ہے اور اس کا روحانی مرکز ہندوستان سے باہر ہونے کی بجائے ہندوستان کے اندر ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کی مشترک قومیت کے نقطۂ نظر سے یہ ایک بڑا مسرت بخش اور اطمینان آفریں رجحان اور امید کی ایک کرن ہے۔ ایک ہندو اخبار کے ایک ہندو مضمون نگار ڈاکٹر شنکر داس نے بڑی خوبی کے ساتھ اس عنصر کی ترجمانی کی ہے اور اس تبدیلی کو بیان کیا ہے جو احمدیت ایک مسلمان کے ذہن اور رُخ میں کردیتی ہے۔ انہوں نے اس نکتہ کو سمجھنے میں بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے کہ قادیانیت ایک اسلامی فرقہ نہیں بلکہ ایک مستقل مذہب اور ایک متوازی ملت ہے جو خالص ہندوستانی بنیادوں پر ایک نئے مذہب اور ایک نئے معاشرہ کی تعمیر کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

سب سے اہم سوال جو اس وقت ملک کے سامنے درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر کس طرح قومیت کا جذبہ پیدا کیا جائے کبھی ان کے ساتھ سودے، معاہدے اور پیکٹ کیے جاتے ہیں۔ کبھی لالچ دے کر ساتھ ملانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ قوم تصور کیے بیٹھے ہیں اور وہ دن رات عرب کے ہی گیت گاتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ ہندوستان کو بھی عرب کا نام دے دیں۔

اس تاریکی میں، اس مایوسی کے عالم میں ہندوستانی قوم پرستوں اور محبانِ وطن کو ایک ہی امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے اور وہ آشا کی جھلک احمدیوں کی تحریک ہے جس قدر مسلمان احمدیت کی طرف راغب ہوں گے وہ قادیان کو اپنا مکہ تصور کرنے لگیں گے اور آخر میں محبِ ہند اور قوم پرست بن جائیں گے۔ مسلمانوں میں احمدیہ تحریک کی ترقی ہی عربی تہذیب اور پان اسلامزم کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ آؤ ہم احمدیہ تحریک کا قومی نگاہ سے مطالعہ کریں۔ پنجاب کی سرزمین میں ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی اٹھتا ہے اور مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اے مسلمانو! خدا نے قرآن میں جس نبی کے آنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ میں ہی ہوں۔ آؤ! میرے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ اگر نہیں آؤ گے تو خدا تمہیں قیامت کے روز نہیں بخشے گا اور تم دوزخی ہو جاؤ گے۔ میں مرزا صاحب کے اس اعلان کی صداقت یا بطالت پر بحث نہ کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ مرزائی مسلمان بننے سے مسلمانوں میں کیا تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ ایک مرزائی مسلمان کا عقیدہ ہے کہ:

۱۔ خدا سمے سمے پر لوگوں کی رہبری کے لیے ایک انسان پیدا کرتا ہے

جو اس وقت کا نبی ہوتا ہے۔

۲۔ خدا نے عرب کے لوگوں میں ان کی اخلاقی گراوٹ کے زمانہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا۔

۳۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خدا کو ایک نبی کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس لیے مرزا صاحب کو بھیجا کہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔

میرے قوم پرست بھائی سوال کریں گے کہ ان عقیدوں سے ہندوستانی قوم پرستی کا کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایک ہندو کے مسلمان ہو جانے پر اس کی شردھا اور عقیدت رام کرشن، وید، گیتا اور رامائن سے اٹھ کر قرآن اور عرب کی بھومی میں منتقل ہو جاتی ہے اسی طرح جب کوئی مسلمان احمدی بن جاتا ہے تو اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ علاوہ بریں جہاں اس کی خلافت پہلے عرب اور ترکستان (ترکی) میں تھی اب وہ خلافتِ قادیان میں آ جاتی ہے اور مکہ مدینہ اس کے لیے روایتی مقاماتِ مقدسہ رہ جاتے ہیں۔

کوئی بھی احمدی چاہے عرب، ترکستان، ایران یا دنیا کے کسی بھی گوشہ میں بیٹھا ہو، وہ روحانی شکتی کے لیے قادیان کی طرف منہ کرتا ہے قادیان کی سرزمین اس کے لیے پنیہ بھومی (سرزمینِ نجات) ہے اور اسی میں ہندوستان کی فضیلت کا راز پنہاں ہے۔ ہر احمدی کے دل میں ہندوستان کے لیے پریم ہوگا کیونکہ قادیان ہندوستان میں ہے۔ مرزا صاحب بھی ہندوستانی تھے اور اب جتنے خلیفے اس فرقہ کی رہبری کر رہے ہیں، وہ سب ہندوستانی ہیں"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مسلمان احمدیہ تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ احمدیت، ہی عربی تہذیب اور اسلام کی دشمن ہے۔ خلافت تحریک میں بھی احمدیوں نے مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا، کیونکہ وہ خلافت کو بجائے ترکی یا عرب میں قائم کرنے کے قادیان میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات عام مسلمانوں کے لیے جو ہر وقت پان اسلامزم و پان عربی نظمش کے خواب دیکھتے ہیں، کتنی ہی مایوس کن ہو مگر ایک قوم پرست کے لیے باعث مسرت ہے[1]۔

چنانچہ شاعر حکیم مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے قادیانیت کے خلاف ایک مدلل اور مفصل مضمون لکھا جس میں ان کی امت اسلامیہ سے علیحدگی کو براہین کے ساتھ ثابت کیا تو سب سے پہلے جس نے جناب علامہ کی تردید میں قدم اٹھایا وہ مشہور ہندو لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے کئی مضامین قادیانیوں کی تائید و حمایت اور ان کی مدافعت میں لکھے حتیٰ کہ اس کے بعد جب ۲۹، مئی ۱۹۳۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو لاہور آئے تو قادیانی رضا کاروں نے باقاعدہ ان کا استقبال کیا اور انہیں سلامی دی اور جب اس پر اعتراض ہوا تو قادیانی خلیفہ مرزا محمود نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"قریب کے زمانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے ڈاکٹر اقبالؒ کے ان مضامین کا رد لکھا ہے جو انہوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیے جانے کے لیے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے قادیانیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ

---

[1] مضمون ڈاکٹر شنکر داس مہرہ بی۔ ایس سی، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس مندرجہ اخبار "بندے ماترم" مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۲ء۔ منقول از "قادیانی مذہب" از پروفیسر الیاس برنی۔

[2] علامہ احسان الٰہی ظہیر کی تالیف قادیانیت ص ۱۰ تا ۱۲۔

کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور خود ان کے گذشتہ رویہ کے خلاف ہے تو ایسے شخص کا جبکہ وہ صوبہ میں مہمان کی حیثیت سے آرہا ہو۔ قادیانیوں کی طرف سے استقبال بہت اچھی بات ہے۔[1]"

اس کے بعد ڈاکٹر علامہ اقبالؒ نے جواہر لال کی تردید کرتے ہوئے قادیانیت کے لیے ان کی تائید کا بھی جائزہ لیا اور لکھا:

"میں خیال کرتا ہوں کہ قادیانیت کے متعلق میں نے جو بیان دیا تھا، جس میں جدید اصول کے مطابق صرف ایک مذہبی عقیدہ کی وضاحت کی گئی تھی، اس سے پنڈت جواہر لال نہرو اور قادیانی دونوں پریشان ہیں غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانوں کو مذہبی اور سیاسی وحدت کے امکانات کو بالخصوص ہندوستان میں پسند نہیں کرتے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کے سیاسی تصورات نے ان کے درست احساس کو مُردہ کر دیا ہے، اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے دل میں خود اعتمادی اور خود مختاری کا خیال پیدا ہو۔ ان کا خیال ہے اور میری رائے میں غلط خیال ہے کہ ہندوستانی قومیت تک پہنچنے کا صرف یہی راستہ ہے کہ ملک کی مختلف تہذیبوں کو کلی طور پر مٹا دیا جائے جن کے باہمی تعامل سے ہندوستان میں ایک اعلیٰ اور پائیدار تہذیب ترقی پذیر ہو سکتی ہے۔ جس قومیت کی ان طریقوں سے تعبیر کی جائے گی اس کا نتیجہ باہمی تلخی بلکہ تشدد کے سوا اور کیا ہو گا۔ اس طرح یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں،

---

[1] خطبہ جمعہ خلیفۂ قادیان میاں محمود احمد۔ مندرجہ اخبار "الفضل" قادیان مورخہ ۱۱۔ جون ۱۹۳۶ء۔

کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی وقار کے بڑھ جانے سے ان کا یہ مقصد فوت ہو جائے گا کہ رسولِ عربیؐ کی امت سے قطع و برید کرکے ہندوستانی نبی کے لیے ایک جدید امت تیار کریں۔

حیرت کی بات ہے کہ میری اس کوشش سے کہ مسلمانانِ ہند کو یہ جتا دوں کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس وقت جس نازک دور سے وہ گزر رہے ہیں، اس میں ان کی اندرونی یکجہتی اور اتحاد کس قدر ضروری ہے اور نیز ان افتراق پرور اور انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر لازمی ہے جو اصلاحی تحریکوں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ موقع ملا کہ وہ اس قسم کی تحریکوں سے ہمدردی ظاہر فرما دیں[1]۔

غرض قادیانیت ایسی تحریک جب وجود میں آئی تو یہ ایک بدیہی بات تھی، کہ تمام مخالفِ اسلام قوتیں اس کی تائید و حمایت کریں، چنانچہ انہوں نے بالفعل اس کی امداد کی بھی، حسبِ منشاء انگریزی سامراج نے تو اسے افراد تک مہیا کیے۔ تاکہ وہ اس کی نشو و نما کر سکیں اور ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو انگریزی سامراج کے ملازم تھے یا وہ لوگ جنہیں ملک و ملت سے خیانت کے صلہ میں جاگیریں عطا ہوئی تھیں اور جن کا دین و مذہب ہی سامراج کی رضا جوئی اور ذلہ خواری ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف خود مرزا غلام احمد متنبیٔ قادیان نے بھی کیا ہے، جیسا کہ وہ رقمطراز ہے:

"جس قدر لوگ میری جماعت میں داخل ہیں، اکثر ان میں سے سرکارِ انگریزی کے معزز عہدوں پر ممتاز اور یا اس ملک کے نیک نام رئیس اور ان کے خدام اور احباب ہیں، یا تاجر اور یا وکلاء اور یا نو تعلیم یافتہ انگریزی

---

[1] علامہ اقبال کے مضمون "اسلام اور احمدی ازم" سے ایک اقتباس۔ یہ مضمون کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔

خواں اور یا ایسے نیک نام علماء اور فضلاء اور دیگر شرفاء ہیں جو کسی وقت سرکار انگریزی کی نوکری کر چکے ہیں یا اب نوکری پر ہیں یا اب ان کے اقارب اور رشتہ دار اور دوست ہیں جو اپنے بزرگ مخدوموں سے اثر پذیر ہیں اور سجادہ نشینانِ غریب طبع [۱]۔"

... ...

نئے مذہب قادیانیت نے سب سے زیادہ زور جہاد کی تنسیخ پر دیا جو مسلمانوں میں قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں ظلم وشرک کے خلاف اور حریت وتبلیغ کے لیے سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ لیکن جہاد سے انگریزوں کی خوفزدگی کے سبب قادیانی مذہب نے جہاد کی تنسیخ پر سب سے زیادہ زور دیا۔

برصغیر میں انگریزی استعمار سب سے زیادہ مسلمانوں کے عقیدۂ جہاد سے ہی خوفزدہ تھا۔ استعماری طاقتیں یہ سمجھتی تھیں کہ جب تک مسلمان جہاد کے عقیدہ پر قائم ہیں اس وقت تک ان پر مکمل طور پر تسلط حاصل نہیں کیا جا سکتا اور پھر یورپ اور شرقِ اوسط کی صلیبی جنگوں کے زخم ابھی تک ان کی راتوں کی نیند حرام کیے ہوئے تھے۔ اسی لیے انہوں نے سب سے پہلے جس چیز پر توجہ دی وہ مسلمانوں کے اندر سے اسی عقیدۂ جہاد کی بیخ کنی کی سازشیں تھیں۔ غلام قادیانی کی نبوت بھی اسی سازش کے سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ چنانچہ مرزا غلام احمد پر سب سے پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ یہی تھی کہ اب جہاد کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔

مرزا غلام احمد لکھتا ہے :

"اللہ تعالیٰ نے بتدریج جہاد کی شدت کو کم کر دیا ہے۔ چنانچہ موسیٰ [۲]

---

[۱] درخواست بحضور نواب لیفٹنٹ گورنر بہادر دام اقبالہ بنجاب منجانب مرزا غلام احمد قادیانی مورخہ ۲۴۔ فروری ۱۸۹۷ء مندرجہ تبلیغ رسالت ج ۷، ص ۱۸۔ مرتبہ قاسم علی قادیانی۔

[۲] قادیانیت از علامہ احسان الٰہی ظہیر ص ۷۰۔ ۷۱۔

کے زمانہ میں بچوں کو بھی قتل کر دیا جاتا تھا، لیکن آنحضرت کے زمانہ میں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا قتل ممنوع قرار پایا اور اب میرے زمانہ میں جہاد کو قطعی طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے[1]"

اور :

"آج کے بعد تلوار کے ساتھ جہاد کو ختم کر دیا گیا ہے، چنانچہ آج کے بعد کوئی جہاد نہیں۔ پس نہیں جو کوئی اب کفار پر ہتھیار اٹھائے گا اور اپنے آپ کو غازی کہلائے گا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مخالف قرار پائے گا جنہوں نے آج سے تیرہ سو سال پہلے اعلان کر دیا تھا کہ مسیح موعود کے زمانہ میں جہاد منسوخ ہو جائے گا پس میں مسیح موعود ہوں اور میرے ظہور کے بعد اب کوئی جہاد نہیں، ہم نے صلح اور امن کا پرچم لہرا دیا ہے[2]"

قادیانی ایک غیر مسلم اقلیت

مسلمانوں کے دینی عقائد، ملی وجود اور اخلاقی تصورات سے بالکل متضاد اور متصادم گروہ کی حیثیت میں جب قادیانی ایک جدید مذہب کی حیثیت سے اٹھے تو مسلمانوں کے صاحب بصیرت اہل علم نے انہیں مسلمانوں سے جداگانہ غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا اس کا سبب یہ تھا کہ انہیں مسلمانوں کے دشمنوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان کے مفادات مسلمانوں کے مفادات سے متصادم تھے۔ ان کے تمام تر عقائد اسلام کے مسلمہ عقائد سے مختلف اور متضاد تھے لیکن وہ اپنی مکاری اور چالبازی سے مسلمانوں کے اندر رہ کر اور اپنے آپ کو ایک اصلاح پسند فرقہ ظاہر کر کے مسلمانوں کی ملت کو اندر ہی اندر توڑ توڑ کر اپنی جدید

---

[1] اربعین نمبر ۴، ص ۱۵، مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی۔

[2] اربعین ص ۴۷۔

ملت سازی کا کام کر رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کو عیسائیوں کی مانند ایک سابقہ نبی کی سابقہ امت قرار دیتے اور جدید نبی کا انکار کرنے والے منکرین اور کافرین قرار دیتے لیکن اس بات پر بضد رہتے کہ انہیں مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ قرار دیا جائے اس لیے کہ جس عمارت کو ڈھانے کے کام پر وہ مامور تھے اور جس کی ٹوٹی ہوئی اینٹیں اکھاڑ اکھاڑ کر وہ اپنی ملت اور مذہب کی تعمیر کرنا چاہتے تھے اس تخریب کاری کے عمل کے لیے ان کی ضرورت یہی تھی کہ انہیں مسلمانوں کے اندر رہ کر اعتماد کی فضا میں یہ کام کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقعہ میسر رہے۔

ان کے اسی طرزِ عمل کو دیکھ کر پہلے تو مسلمان علماء ان سے بحث و مناظرہ کرتے رہے اور دلائل سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ظاہر ہے کہ سمجھانے سے تو وہ سمجھ سکتا ہے جو نادانی اور ناسمجھی سے ایک کام کر رہا ہو اور اسے سمجھنے کے لیے دلائل کی ضرورت ہو لیکن جو گروہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ایک اسکیم بنا کر ایک ملت کے خلاف سازشی کارروائیاں کر رہا ہو اسے کون سمجھا سکتا ہے۔ ان کی اسی چالبازی ڈھٹائی اور دینِ اسلام سے غداری کی بنا پر مسلمان اہلِ علم کا لب و لہجہ ان کے بارے میں سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اس لیے کہ فی الحقیقت وہ اسلام کی عمارت کو ڈھانا ملیامیٹ کرنے اور مسلمانوں میں انتشار، تفرقہ، تصادم اور فتنہ پیدا کرنے کے عمل پر مامور تھے اور جس قدر وہ اس کام میں کامیابی حاصل کرتے تھے ان کا مشن پورا ہوتا تھا۔

چنانچہ علماء کے بحث و مناظرے سے ہٹ کر سب سے پہلے ملت اسلامیہ کے ترجمان حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اس صورتحال کا تجزیہ کر کے ایک فیصلہ کن بات کہی اور قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اپنے طور پر اس فتنے سے امتِ محمدیہ کو آگاہ کرنے کے لیے بے شمار مضامین لکھے جو احمدیت اور اسلام کے نام سے مسلسل شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے دلائل سے اس فتنے کے معاشرتی، عمرانی، مذہبی اور اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پنڈت جواہر لال نہرو جو دیس بنی کے ذریعے ہند و مسلم متحدہ قومیت کے امکانات اس نبوت میں دیکھتے تھے اور قادیانیت کی تائید کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے

اس کی بھی تردید کی اور علمی میدان میں قادیانیت کو بالکل بے دست و پا اور اس کے مکروہ عزائم کو بالکل عریاں کر دیا۔ یہاں ان کی نگارشات میں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

وہ اسٹیٹسمین کی ۱۰ جون کی اشاعت میں فرماتے ہیں[۱]

"اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کی حدود مقرر ہیں یعنی وحدت الوہیت پر ایمان انبیاء پر ایمان اور رسول کریمؐ کی ختم رسالت پر ایمان دراصل یہ آخری یقین ہی وہ ایک حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں؟ مثلاً برہمو سماجی خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریمؐ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انہیں ملت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعے وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریمؐ کی ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ وہ ایک الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ . . . . . . میری رائے میں تو قادیانیوں کے سامنے اب صرف دو راہیں ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کریں ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تا کہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں"

(حرفِ اقبال ص ۱۲۷، ۱۲۸ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء)

---

[۱] ماخوذ از مرزائیت اور اسلام مصنفہ شورش کاشمیری ص ۶۱-۶۲۔

علامہ ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے اسے حفظِ نفس کے جذبے سے بھی عاری کر دیا ہے۔ بعض ایسے ہی نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دیا ہے۔" (حرف اقبال ص ۱۱۶)

پھر وہ ہندوستان کی غیر مسلم حکومت سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حکومت کو موجودہ صورتحالات پر غور کرنا چاہیئے اور اس معاملہ میں جو قومی وحدت کے لیے اشد اہم ہے عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے ..... سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے ....؟ وہ طریقہ یہی ہے کہ اصل جماعت جس شخص کو متغلب بالدین (دین کے ساتھ کھیل) کرتے پائے، اس کے دعاوی کو تقریر و تحریر کے ذریعے سے جھٹلایا جائے پھر کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے، حالاں کہ اس کی وحدت خطرے میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو، اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔

اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن یہ توقع رکھنی بے کار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظرانداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے بعض لوگ ایکدوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں

لہٰذا ان کے فتووں کا کوئی اعتبار نہیں رہا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے شاعر مشرق تحریر فرماتے ہیں:

"اس مقام پر یہ دوہرانے کی غالباً ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کے بے شمار فرقوں کے مذہبی تنازعوں کا ان بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ جن کے مسائل پر سب فرقے متفق ہیں اگرچہ وہ ایک دوسرے پر الحاد کے فتوے ہی دیتے ہیں۔"

(حرفِ اقبال ص ۱۱۷، ۱۱۸)

پھر حکیم الامت قادیانی مسئلہ کا حل تجویز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرلے، یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔"

(حرفِ اقبال ص ۱۱۹)

علامہ اقبال نے مزید فرمایا:

"مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہیں جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نبوت پر رکھے اور خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کیلئے ایک خطرہ تصور کریگا اور یہ اسلیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔" (اسلام اور احمدیت)

علامہ نے ضربِ کلیم میں قادیانیوں کی اس نبوت کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

ان کی رائے تھی کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے اسی لیے انہوں نے فرمایا:

"ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نئی نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ تصور کرے گا۔ اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔ قادیانیت باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔ یہ اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہے۔ گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے ..."

(حرفِ اقبال)

حالات کا یہی دباؤ تھا جس کی وجہ سے بالآخر قادیانیوں کے خلیفہ دوم مرزا بشیر الدین نے اپنی جداگانہ مذہبی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک وقت خود اپنے آپ کو الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ اس لیے کہ اس امر کا خود ان کو بھی احساس ہے مرزائی مذہب مسلمانوں سے بالکل الگ مذہب ہے جس کا امتِ اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں، اور اپنی یہ پوزیشن خود مرزائیوں کو معلوم ہے کہ ان کا اور مسلمانوں کا مذہب ایک نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر سے الگ ایک مستقل امت ہیں۔ چنانچہ انہوں نے غیر منقسم ہندوستان میں اپنے آپ کو سیاسی طور پر بھی مسلمانوں سے الگ ایک مستقل اقلیت قرار دینے کا خود مطالبہ کیا تھا۔ مرزا بشیر الدین محمود کہتے ہیں:

"میں نے اپنے نمائندے کی معرفت ایک بڑے ذمہ دار انگریز افسر کو کہلوا بھیجا کہ پارسیوں اور عیسائیوں کی طرح ہمارے حقوق بھی تسلیم کیے جائیں جس پر اس افسر نے کہا کہ وہ تو اقلیت ہیں اور تم ایک مذہبی فرقہ ہو۔ اس پر میں نے کہا کہ پارسی اور عیسائی بھی تو مذہبی فرقہ ہیں۔ جس طرح ان کے حقوق علیحدہ تسلیم کیے گئے ہیں، اسی طرح ہمارے بھی

تسلیم کیے جائیں۔ تم ایک پارسی پیش کر دو، اس کے مقابلے میں دو دو احمدی پیش کرتا جاؤں گا۔"

(مرزا بشیر الدین محمود کا بیان مندرجہ الفضل ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء)

کیا اس کے بعد بھی اس مطالبے کی معقولیت میں کسی انصاف پسند انسان کو کوئی ادنیٰ شبہہ باقی رہ سکتا ہے کہ مرزائی امت کو سرکاری سطح پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا جانا انصاف کا بنیادی تقاضا ہے۔ ان کو اقلیت قرار دینے سے مسلمانوں اور قادیانیوں دونوں کے ساتھ انصاف ہو جائے گا اور تنازع باقی نہ رہے گا۔

...

ختم نبوت جو مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے اس پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی کہتے ہیں[1]:

"اسلام کے خلاف وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اٹھیں، ان میں قادیانیت کو خاص امتیاز حاصل ہے وہ تحریکیں یا تو اسلام کے نظام حکومت کے خلاف تھیں یا شریعتِ اسلامی کے خلاف، لیکن قادیانیت درحقیقت نبوتِ محمدی کے خلاف ایک سازش ہے۔ وہ اسلام کی ابدیت اور امت کی وحدت کو چیلنج ہے۔ اس نے ختم نبوت سے انکار کر کے اس سرحدی خط کو بھی عبور کر لیا، جو اس امت کو دوسری امتوں سے ممتاز و منفصل کرتا ہے اور جو کسی مملکت کے حدود کو حاضر کرنے کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔"

اسی لیے علامہ اقبال نے لکھا ہے:

"یہ ظاہر ہے کہ اسلام جو تمام جماعتوں کو ایک رشتہ میں پرونے کا دعویٰ رکھتا ہے ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا، جو اسکی

---

[1] قادیانیت از مولانا ندوی ص ۱۸۳ تا ۱۸۷۔

موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں اسلامی سوسائٹی کیلئے مزید افتراق کا باعث بنے[1]"

مولانا ندوی اس کے بعد لکھتے ہیں :

"مرزا غلام احمد صاحب کی جدوجہد اور تحریک کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ نبوت کی حرمت وعظمت اور اس منصب کی آبرو اور شرف اٹھ جائے۔ انہوں نے نبوت کے اجراء وتسلسل پر جو زورِ قلم صرف کیا اور اس کی جس طرح تبلیغ و اشاعت کی، انہوں نے الہام کو جو اہمیت دی اور اس پر جس طرح نبوت کی بنیاد رکھی، اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے کہ نبوت بازیچۂ اطفال بن جائے وہ اگرچہ نبوت کے اجراء وتسلسل کی تقریر محض اپنی نبوت کے امکان وثبوت کے لیے کرتے ہیں اور ختمِ نبوت کا انکار محض اپنی حد تک ہے ورنہ آنے والوں کے لیے وہ اپنے ہی کو خاتم النبیین سمجھتے ہیں"

علامہ اقبال کے بلیغ الفاظ میں :

"خود بانیٔ احمدیت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبرِ اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کہ پیغمبرِ اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے! تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے مترادف ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی نہیں، میں آخری نبی ہوں۔ اس امر

---

[1] قادیانی اور جمہور مسلمان۔ حرفِ اقبال، صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳۔

> کے سمجھنے کے بجائے کہ ختمِ نبوت کا اسلامی تصور نوعِ انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر رکھتا ہے۔ بانیٔ احمدیت کا خیال ہے کہ ختمِ نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا، خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے جب میں بانیٔ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعوائے نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختمِ نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے[1]۔

ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے بارے میں رسول اکرمؐ کے بعد نبوت اور پھر ختمِ نبوت کا جھوٹا دعویٰ پیش کرتا ہو۔ وہ اور اس کا پیروکار گروہ مسلمانوں کے ساتھ ایک امت کی صورت میں کیسے رہ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نیا مذہب ہے اور جھوٹا مذہب ہے اس لیے اسے اقلیت قرار دے کر مسلمانوں سے الگ کرنا لازم ہے۔

... ...

قادیانی علیحدہ اقلیت کیوں

قادیانی ملت کو مسلمانوں سے علیحدہ ایک اقلیت کیوں قرار دیا جائے اس سلسلے میں حکیم الامت علامہ اقبال سے لے کر دیگر بابصیرت اہلِ علم تک بے شمار دلائل دے چکے ہیں اور ان کو اقلیت قرار دیا جانا مسلمانوں کا ایک متفقہ مطالبہ چلا آتا ہے لیکن پھر بھی ہم

---

[1] پنڈت نہرو کے سوالات کا جواب، حرفِ اقبال، صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱۔

یہاں ان دلائل کو یکجا کر کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی زبان سے بیان کرتے ہیں تاکہ مقدمہ پوری طرح جامعیت سے سامنے آ سکے۔

مولانا مودودیؒ تحقیقاتی عدالت میں بیان دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ قادیانیوں کا مسلمانوں سے الگ ایک امّت ہونا اس پوزیشن کا ایک لازمی منطقی نتیجہ ہے جو انہوں نے خود اختیار کی ہے۔ وہ اسباب ان کے اپنے ہی پیدا کردہ ہیں جو انہیں مسلمانوں سے کاٹ کر ایک جداگانہ ملت بنا دیتے ہیں۔

پہلی چیز جو انہیں مسلمانوں سے جدا کرتی ہے وہ ختم نبوت کی نئی تفسیر ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی متفق علیہ تفسیر سے ہٹ کر اختیار کی۔ ساڑھے تیرہ سو سال سے تمام مسلمان بالاتفاق یہ مانتے رہے ہیں اور آج بھی یہی مانتے ہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی نبی مبعوث ہونے والا نہیں ہے ختم نبوت کے متعلق قرآن مجید کی تصریح کا یہی مطلب صحابہ کرامؓ نے سمجھا تھا اور اسی لیے انہوں نے ہر اس شخص کے خلاف جنگ کی جس نے حضورؐ کے بعد دعوائے نبوت کیا۔ پھر یہی مطلب بعد کے ہر دور میں تمام مسلمان سمجھتے رہے ہیں جس کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے درمیان کبھی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کیا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہو۔ لیکن قادیانی حضرات نے تاریخ میں پہلی مرتبہ "خاتم النبیین" کی یہ نرالی تفسیر کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم "نبیوں کی مہر" ہیں اور اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ حضورؐ کے بعد اب جو بھی نبی آئے گا اس کی نبوت آپ کی مہر تصدیق لگ کر مصدقہ ہو گی۔"

لہ قادیانی مسئلہ ص ۱۰ تا ۲۰۔

اس کے ثبوت میں قادیانی لٹریچر کی بکثرت عبارتوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، مگر ہم صرف تین حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

• خاتم النبیین کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی مُہر کے بغیر کسی کی نبوت کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔ جب مُہر لگ جاتی ہے تو وہ کاغذ سند ہو جاتا ہے اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح آنحضرت کی مُہر اور تصدیق جس نبوت پر نہ ہو وہ صحیح نہیں ہے۔"

(ملفوظات احمدیہ مرتبہ محمد منظور الٰہی صاحب قادیانی، حصہ پنجم ص ۲۹۰)

• ہمیں اس سے انکار نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاتم النبیین ہیں مگر ختم کے معنی وہ نہیں جو "احسان" کا سوادِ اعظم سمجھتا ہے اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ اعلیٰ وارفع کے سراسر خلاف ہے کہ آپ نے نبوت کی نعمتِ عظمیٰ سے اپنی امت کو محروم کر دیا۔ بلکہ یہ ہیں کہ آپ نبیوں کی مُہر ہیں۔ اب وہی نبی ہو گا جس کی آپ تصدیق کریں گے ...... انہی معنوں میں ہم رسولِ کریمؐ کو خاتم النبیین سمجھتے ہیں۔"

(الفضل، قادیان، مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء)

• خاتم مُہر کو کہتے ہیں۔ جب نبی کریمؐ مُہر ہوئے تو اگر ان کی امت میں کسی قسم کا نبی نہیں ہو گا تو وہ مُہر کس طرح ہوئے یا مُہر کس پر لگے گی؟"

(الفضل قادیان، مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۲۲ء)

تفسیر کا یہ اختلاف صرف ایک لفظ کی تاویل و تفسیر تک ہی محدود نہ رہا بلکہ قادیانیوں نے آگے بڑھ کر صاف صاف اعلان کر دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک نہیں، ہزاروں نبی آسکتے ہیں۔ یہ بات بھی ان کے اپنے واضح بیانات سے ثابت ہے جن میں سے صرف چند کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

• "یہ بات بالکل روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہے۔"

(حقیقۃ النبوت مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان ص ۲۲۸)

• "انہوں نے (یعنی مسلمانوں نے) یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا کے خزانے ختم ہو گئے ۔۔۔ ان کا یہ سمجھنا خدا تعالیٰ کی ۔۔۔ قدر ہی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے، ورنہ ایک نبی کیا میں تو کہتا ہوں ہزاروں نبی ہوں گے۔"

(انوارِ خلافت، مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب، ص ۶۲)

• "اگر میری گردن کے دونوں طرف تلوار بھی رکھ دی جائے اور مجھے کہا جائے کہ تم یہ کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو میں اسے ضرور کہوں گا کہ تو جھوٹا ہے، کذاب ہے، آپ کے بعد نبی آسکتے ہیں اور ضرور آسکتے ہیں۔"

(انوارِ خلافت ص ۶۵)

مرزا غلام احمد دعوائے نبوت

اس طرح نبوت کا دروازہ کھول کر مرزا غلام احمد صاحب نے خود اپنی نبوت کا دعویٰ کیا اور قادیانی گروہ نے ان کو حقیقی معنوں میں نبی تسلیم کیا۔ اسکے ثبوت میں قادیانی حضرات کی بے شمار مستند تحریرات میں سے چند یہ ہیں:

• "اور مسیح موعود (یعنی مرزا غلام احمد صاحب) نے بھی اپنی کتابوں میں اپنے دعوائے رسالت ونبوت کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے جیسا کہ آپ لکھتے ہیں کہ "ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم رسول اور نبی ہیں۔"

(دیکھو بدر، ۵، مارچ ۱۹۰۸ء)

یا جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ "میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں اگر

میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا۔ اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے تو میں کیوں کر اس سے انکار کر سکتا ہوں۔ میں اس پر قائم ہوں اس وقت تک کہ اس دنیا سے گزر جاؤں۔"

(دیکھو خط حضرت مسیح موعود بطرف ایڈیٹر اخبار عام لاہور)

یہ خط حضرت مسیح موعود نے اپنی وفات سے صرف تین دن پہلے یعنی ۲۳، مئی ۱۹۰۸ء کو لکھا اور آپ کے یوم وصال ۲۶، مئی ۱۹۰۸ء کو اخبار عام میں شائع ہوا۔" (کلمۃ الفصل مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد صاحب قادیانی مندرجہ ریویو آف ریلیجنز نمبر ۳، جلد ۱۴، ص ۱۱۰)

"پس شریعت اسلامی نبی کے جو معنی کرتی ہے اس کے معنی سے حضرت صاحب (یعنی مرزا غلام احمد صاحب) ہرگز مجازی نبی نہیں ہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔"

(حقیقۃ النبوت، مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان ص ۱۷۴)

دعوائے نبوت کے لازمی نتائج

نبوت کے دعوے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اس نبوت پر ایمان نہ لائے وہ کافر قرار دیا جائے۔ چنانچہ قادیانیوں نے یہی کیا۔ وہ ان مسلمانوں کو اپنی تحریر و تقریر میں علانیہ کافر قرار دیتے ہیں جو مرزا غلام احمد صاحب کو نبی نہیں مانتے۔ اس کے ثبوت میں ان کی چند صریح عبارتیں:

"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔" (آئینہ صداقت، مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان ص ۳۵)

"ہر ایک ایسا شخص جو موسیٰ کو مانتا ہے مگر عیسیٰ کو نہیں مانتا یا عیسیٰ کو مانتا ہے مگر محمد کو نہیں مانتا، یا محمد کو مانتا ہے مگر مسیح موعود کو نہیں مانتا وہ نہ صرف کافر بلکہ پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"

(کلمۃ الفصل، مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد صاحب قادیانی، مندرجہ ریویو آف ریلیجنز ص ۱۱۰)

"ہم چونکہ مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور غیر احمدی آپ کو نبی نہیں مانتے اس لیے قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کہ کسی نبی کا انکار بھی کفر ہے غیر احمدی کافر ہیں۔"

(بیان مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب باجلاس سب جج عدالت گورداسپور مندرجہ اخبار الفضل مورخہ ۲۶/۲۹ جون ۱۹۲۲ء)

قادیانیوں کا مسلمانوں سے جدا مذہب

وہ صرف یہی نہیں کہتے کہ مسلمانوں سے ان کا اختلاف محض مرزا صاحب کی نبوت کے معاملے میں ہے، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا خدا، ہمارا اسلام، ہمارا قرآن، ہماری نماز، ہمارا روزہ، غرض ہماری ہر چیز مسلمانوں سے الگ ہے۔

۲۱ اگست ۱۹۱۷ء کے الفضل میں خلیفہ صاحب کی ایک تقریر "طلباء کو نصائح" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے اپنی جماعت کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان کیا اختلاف ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

"ورنہ حضرت مسیح موعود نے تو فرمایا ہے کہ ان کا (یعنی مسلمانوں کا) اسلام اور ہے اور ہمارا اور، ان کا خدا اور ہے اور ہمارا اور، ہمارا حج اور ہے ان کا حج اور، اسی طرح ان سے ہر بات میں اختلاف ہے۔"

۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کے الفضل میں خلیفہ صاحب کی ایک اور تقریر شائع ہوئی ہے جس میں وہ اس بحث کا ذکر کرتے ہیں جو مرزا غلام احمد صاحب کی زندگی میں اس مسئلے پر چھڑ گئی تھی کہ

احمدیوں کو اپنا ایک مستقل مدرسہ دینیات قائم کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اس وقت ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ نہیں کرنا چاہیئے، اور ان کی دلیل یہ تھی کہ "ہم میں اور دوسرے مسلمانوں میں چند مسائل کا اختلاف ہے، ان مسائل کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے حل کر دیا ہے اور ان کے دلائل بتا دیے ہیں، باقی باتیں دوسرے مدرسوں سے سیکھی جا سکتی ہیں۔" دوسرا گروہ اس کے برعکس رائے رکھتا تھا۔ اس دوران میں مرزا غلام احمد صاحب آ گئے اور انہوں نے یہ ماجرا سن کر اپنا فیصلہ دیا۔ اس فیصلے کو خلیفہ صاحب ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

"یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل میں ہے۔ آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرض آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں ان سے ہمیں اختلاف ہے۔"

نئے مذہب کے نتائج

اس ہمہ گیر اختلاف کو اس کے آخری منطقی نتائج تک بھی قادیانیوں نے خود ہی پہنچا دیا اور مسلمانوں سے تمام تعلقات منقطع کر کے ایک الگ امت کی حیثیت سے اپنی اجتماعی تنظیم کر لی۔ اس کی شہادت قادیانیوں کی اپنی تحریرات سے ہمیں یہ ملتی ہے:

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سختی سے تاکید فرمائی ہے کہ کسی احمدی کو غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیئے۔ باہر سے لوگ اس کے متعلق بار بار پوچھتے ہیں، میں کہتا ہوں تم جتنی دفعہ بھی پوچھو گے اتنی دفعہ ہی میں یہی جواب دوں گا کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنی جائز نہیں، جائز نہیں، جائز نہیں۔"

(انوارِ خلافت، مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان، ص ۸۹)

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں اور ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں۔"

(انوارِ خلافت، ص ۹۰)

• اگر کسی غیراحمدی کا چھوٹا بچہ مر جائے تو اس کا جنازہ کیوں نہ پڑھا جائے، وہ تو مسیح موعود کا منکر نہیں؟ میں یہ سوال کرنے والے سے پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا جاتا؟ ——— غیراحمدی کا بچہ بھی غیراحمدی ہوا، اس لیے اس کا جنازہ بھی نہیں پڑھنا چاہیئے "

(انوارِ خلافت، ص ۹۳)

• حضرت مسیح موعود نے اس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیراحمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی کئی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیراحمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اس نے غیراحمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفۂ اوّل نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی باوجود یکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔"

(انوارِ خلافت، ص ۹۳-۹۴)

• حضرت مسیح موعود نے غیراحمدیوں کے ساتھ صرف وہی سلوک جائز رکھا ہے جو نبی کریم نے عیسائیوں کے ساتھ کیا۔ غیراحمدیوں سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں، ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا، ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں! دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک دینی، دوسرے دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ وناطہ ہے۔ سو یہ دونوں ہمارے لیے حرام قرار دیے گئے۔ اگر کہو کہ ہم کو ان کی لڑکیاں لینے کی بھی اجازت ہے۔ تو میں کہتا ہوں

نصاریٰ کی لڑکیاں لینے کی بھی اجازت ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ غیر احمدیوں
کو سلام کیوں کہا جاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث سے ثابت
ہے کہ بعض اوقات نبی کریم نے یہود تک کو سلام کا جواب دیا ہے۔"
(کلمۃ الفصل، مندرجہ ریویو آف ریلیجنز ص ۱۲۹)

یہ قطع تعلق صرف تحریر و تقریر ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ پاکستان کے لاکھوں آدمی اس بات کے شاہد ہیں کہ قادیانی عملاً بھی مسلمانوں سے کٹ کر ایک الگ امت بن چکے ہیں۔ نہ وہ ان کے ساتھ نماز کے شریک، نہ جنازے کے، نہ شادی بیاہ کے۔ اب اس کے بعد آخر کون سی معقول وجہ رہ جاتی ہے کہ ان کو اور مسلمانوں کو زبردستی ایک امت میں باندھ رکھا جائے؟ جو علیحدگی نظریے اور عمل میں فی الواقع رونما ہو چکی ہے اور پچاس برس سے قائم ہے، آخر اب اسے آئینی طور پر کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ قادیانی تحریک نے ختم نبوت کی ان حکمتوں اور مصلحتوں کو اب تجربے سے ثابت کر دیا ہے جنہیں پہلے محض نظری حیثیت سے سمجھنا لوگوں کے لیے مشکل تھا۔ پہلے ایک شخص یہ سوال کر سکتا تھا کہ آخر کیوں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد دنیا سے ہمیشہ کے لیے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ لیکن اب اس قادیانی تجربے نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ امت مسلمہ کی وحدت اور استحکام کے لیے ایک نبی کی متابعت پر تمام کلمہ گویانِ توحید کو مجتمع کر دینا اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے اور نئی نئی نبوتوں کے دعوے کس طرح ایک امت کو پھاڑ کر اس کے اندر مزید امتیں بنانے اور اس کے اجزاء کو پارہ پارہ کر دینے کے موجب ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ تجربہ ہماری آنکھیں کھول دے اور ہم اس نئی امت کو مسلمانوں سے کاٹ کر الگ کر دیں تو پھر کسی کو نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھنے اور امت مسلمہ کے اندر پھر سے قطع و برید کا سلسلہ شروع کرنے کی ہمت نہ ہوگی ورنہ ہمارے اس ایک قطع و برید کو برداشت کر لینے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ایسے ہی دوسرے بہت سے حوصلہ مندوں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ ہمارا آج کا تحمل کل دوسروں کے لیے نظیر بن جائے گا اور معاملہ ایک قطع و برید پر ختم نہ ہوگا۔ بلکہ آگے دن ہمارے معاشرے کو نئی نئی پراگندگیوں کے

خطرے سے دوچار ہونا پڑے گا۔

قادیانیوں کو علیحدہ امت قرار دینے کا مطالبہ یہ ہے وہ اصل دلیل جس کی بنا پر ہم قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔[1]

عدالتوں اور عالمی اسلامی اداروں کے فیصلے

قادیانیوں کی ایک طرف مسلمانوں میں موجودگی اور دوسری طرف اسلام کی تعلیمات و عقائد سے صریحاً انحراف نے بے شمار معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور سیاسی مسائل پیدا کر دیے۔ ان کی حیثیت مسلمان معاشرے میں ایک ایسی لکھی کی تھی جسے معدہ کسی صورت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا اور اسے ہر حالت میں اُگلنے اور باہر نکالنے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے۔

چنانچہ خود قادیانیوں کی طرف سے پیدا کردہ بے شمار معاشرتی مسائل عدالتوں میں جانے لگے اور عدالتوں نے ان کے بارے میں اپنے فیصلے سنائے۔ عدالتی نظام اپنا ایک خاص مزاج رکھتا ہے۔ وہ تاویلات کے مقابلے میں قانون کے الفاظ اور ان کی روح کو دیکھتا ہے۔ ہم یہاں ان چند عدالتی فیصلوں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان مقدمات کے نتیجے میں عدالتوں میں سنائے گئے۔

فیصلہ مقدمہ بہاولپور

باجلاس جناب منشی محمد اکبر خاں صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ڈسٹرکٹ جج ضلع بہاول پور بمقدمہ مسماۃ غلام عائشہ بنت مولوی الٰہی بخش سکنہ احمد پور شرقیہ۔ ریاست بہاول پور۔ بنام عبدالرزاق ولد مولوی جان محمد سکنہ موضع مہند تحصیل احمد پور شرقیہ ریاست بہاول پور۔ دعویٰ دلاپانے ڈگری استقرار یہ شعر تنسیخ نکاح فریقین بوجہ ارتداد شوہر مدعا علیہ تاریخ فیصلہ

---

[1] قادیانی مسئلہ از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ص ۲۰۔ ۲۱۔

۱۰ فروری ۱۹۳۵ء

عدالت مذکور نے مقدمہ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد آخر میں اپنا فیصلہ مندرجہ ذیل الفاظ میں تحریر کیا اور سنایا :

" اوپر کی تمام بحث سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مسئلہ ختم نبوت اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بایں معنی نہ ماننے سے کہ آپ آخری نبی ہیں ارتداد واقع ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ عقائد اسلامی کی رو سے ایک شخص کلمہ کفر کہہ کر بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

مدعا علیہ مرزا غلام احمد صاحب کو عقائد قادیانی کی رو سے نبی مانتا ہے اور ان کی تعلیم کے مطابق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ امت محمدیہ میں قیامت تک سلسلہ نبوت جاری ہے یعنی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین بمعنی آخری نبی تسلیم نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی دوسرے شخص کو نیا نبی تسلیم کرنے سے جو قباحتیں لازم آتی ہیں ان کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اس لیے مدعا علیہ اس اجماعی عقیدۂ امت سے منحرف ہونے کی وجہ سے مرتد سمجھا جائے گا اور اگر ارتداد کے معنی کسی مذہب کے اصولوں سے بکلی انحراف کے لیے جاویں تو بھی مدعا علیہ مرزا صاحب کو نبی ماننے سے ایک نئے مذہب کا پیرو سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس صورت میں اس کے لیے قرآن کی تفسیر اور معمول بہ مرزا صاحب کی وحی ہوگی۔ نہ کہ احادیث و اقوال فقہا جن پر کہ اس وقت تک مذہب اسلام قائم چلا آیا ہے اور جن میں سے بعض کے مستند ہونے کو خود مرزا صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے

علاوہ ازیں احمدی مذہب میں بعض احکام ایسے ہیں کہ شرع محمدی پر مستزاد ہیں اور بعض اس کے خلاف ہیں مثلاً چندہ ماہواری کا دینا

جیسا کہ اوپر دکھایا گیا ہے زکوٰۃ پر ایک زائد حکم ہے۔ اسی طرح غیر احمدی کا جنازہ نہ پڑھنا۔ کسی احمدی کی لڑکی غیر احمدی کو نکاح میں نہ دینا۔ کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز نہ پڑھنا شرع محمدی کے خلاف اعمال ہیں۔

مدعا علیہ کی طرف سے ان امور کی توجیہیں بیان کی گئی ہیں کہ وہ کیوں غیر احمدی کا جنازہ نہیں پڑھتے، کیوں ان کو نکاح میں لڑکی نہیں دیتے۔ لیکن یہ توجیہیں اس لیے کارآمد نہیں کہ یہ امور ان کے پیشواؤں کے احکام میں مذکور ہیں۔ اس لیے وہ ان کے نقطۂ نگاہ سے شریعت کا جزو سمجھے جائیں گے جو کسی صورت میں بھی شرع محمدی کے موافق تصور نہیں ہو سکتے اس کے ساتھ جب یہ دیکھا جائے کہ وہ تمام غیر احمدی کو کافر سمجھتے ہیں تو ان کے مذہب کو مذہب اسلام سے ایک جدا مذہب قرار دینے میں کوئی شک نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں مدعا علیہ کے گواہ مولوی جلال الدین شمس نے اپنے بیان میں مسیلمہ وغیرہ کاذب مدعیان نبوت کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ گواہ مذکور کے نزدیک دعوائے نبوت کاذبہ ارتداد ہے اور کاذب مدعی نبوت کو جو مان لے وہ مرتد سمجھا جاتا ہے۔

مدعیہ کی طرف سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا صاحب کاذب مدعی نبوت ہیں اس لیے مدعا علیہ بھی مرزا صاحب کو نبی تسلیم کرنے سے مرتد قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا ابتدائی تنقیحات جو ۴۔ نومبر ۱۹۲۶ء عیسوی کو عدالت منصفی احمد پور شرقیہ سے وضع کی گئی تھیں بحق مدعیہ ثابت قرار دیجا کر یہ قرار دیا جاتا ہے کہ مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے اور اگر مدعا علیہ کے عقائد کو بحث مذکورہ بالا کی

روشنی میں دیکھا جائے تو بھی مدعا علیہ کے او عا کے مطابق مدعیہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی امتی نبی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ اس کے علاوہ جو دیگر عقائد مدعا علیہ نے اپنی طرف منسوب کیے ہیں وہ گو عام اسلامی عقائد کے مطابق ہیں لیکن ان عقائد پر وہ انہی معنوں میں عمل پیرا سمجھا جائے گا۔ جو معنی کہ مرزا صاحب نے بیان کیے ہیں اور یہ معنی چونکہ ان معنوں کے مغائر ہیں جو جمہور امت آج تک لیتی آئی ہے اس لیے بھی وہ مسلمان نہیں سمجھا جا سکتا ہے اور ہر دو صورتوں میں وہ مرتد ہی ہے اور مرتد کا نکاح جو ارتداد سے فسخ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈگری بدیں مضمون بحق مدعیہ صادر کی جاتی ہے کہ وہ تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے اس کی زوجہ نہیں رہی۔ مدعیہ خرچہ مقدمہ بھی ازاں مدعا علیہ لینے کی حقدار ہو گی۔

اس ضمن میں مدعا علیہ کی طرف سے ایک سوال یہ پیدا کیا گیا ہے کہ ہر دو فریق چونکہ قرآن مجید کو کتاب اللہ سمجھتے ہیں اور اہل کتاب کا نکاح جائز ہے اس لیے بھی مدعیہ کا نکاح فسخ قرار نہیں دینا چاہیے۔ اس کے متعلق مدعیہ کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ جب دونوں فریق ایک دوسرے کو مرتد کہتے ہیں تو ان کو اپنے اپنے عقائد کی رو سے بھی ان کا باہمی نکاح قائم نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے نہ کہ مردوں سے بھی۔ مدعیہ کے دعویٰ کی رو سے چونکہ مدعا علیہ مرتد ہو چکا ہے اس لیے اہلِ کتاب ہونے کی حیثیت سے بھی اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح قائم نہیں رہ سکتا۔ مدعیہ کی یہ حجت وزن دار پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس بنا پر بھی وہ ڈگری پانے کی مستحق ہے۔"

... ...

مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے کا جواب

مرزائیوں کی طرف سے مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے کا حوالہ بڑے زور شور سے دیا جاتا ہے۔ فاضل جج نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے۔

مدعا علیہ کی طرف سے اپنے حق میں چند نظائر قانون کا بھی حوالہ دیا گیا تھا ان میں سے پٹنہ اور پنجاب ہائی کورٹ کے فیصلہ جات کو عدالت عالیہ چیف کورٹ نے پہلے واقعات مقدمہ ہذا پر حاوی نہیں سمجھا اور مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے کو عدالت معلیٰ اجلاس خاص نے قابل پیروی قرار نہیں دیا۔ باقی رہا عدالت عالیہ چیف کورٹ بہاولپور کا فیصلہ بمقدمہ مسمات جندوڈی بنام کریم بخش اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ فیصلہ جناب مہتہ اودھوداس صاحب جج چیف کورٹ کے اجلاس سے صادر ہوا تھا اور اس مقدمے کا صاحب موصوف نے مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے پر ہی انحصار رکھتے ہوئے فیصلہ فرمایا تھا اور خود ان اختلافی مسائل پر جو فیصلہ مذکور میں درج تھے کوئی محاکمہ نہیں فرمایا تھا مقدمہ چونکہ بہت عرصے سے دائر تھا اس لیے صاحب موصوف نے اسے زیادہ عرصہ معرض تعویق میں رکھنا پسند نہ فرما کر باتباع فیصلہ مذکور اسے طے فرما دیا۔ دربار معلےٰ نے چونکہ اس فیصلہ کو قابل پابندی قرار نہیں دیا جس فیصلہ کی بنا پر وہ فیصلہ صادر ہوا اس لیے فیصلہ زیر بحث بھی قابل پابندی نہیں رہتا۔

فریقین میں سے مختار مدعیہ حاضر ہے اسے حکم سنایا گیا۔ مدعا علیہ کارروائی مقدمہ ہذا ختم ہونے کے بعد جبکہ مقدمہ زیر غور تھا فوت ہو گیا ہے اس کے خلاف یہ حکم زیر آرڈر ۲۲، رول ۶، ضابطہ دیوانی تصور ہو گا۔ پرچہ ڈگری مرتب کیا جائے اور مثل داخل دفتر ہو۔

۷۔ فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ

بمقام بہاولپور

دستخط:۔

محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج ضلع بہاول نگر

ریاست بہاولپور (بعروف انگریزی)

فیصلہ مقدمہ راولپنڈی

باجلاس جناب شیخ محمد اکبر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج راولپنڈی سول اپیل ۱۹۵۵ء

امتہ الکریم بنت کرم الٰہی راجپوت بجوعہ مکان نمبر ۵۰۰/۱۵ محلہ ٹرنک بازار راولپنڈی

(مرزائی)

بنام

لیفٹیننٹ نذیر الدین ملک خلف ماسٹر محمد دین اعوان محلہ کرشن پورہ راولپنڈی

(مسلمان)

تاریخ فیصلہ ۳/ جون ۱۹۵۵ء

عدالت مذکورہ نے مقدمہ کی تفصیلات پر بحث کرنے کے بعد آخر میں اپنا فیصلہ مندرجہ ذیل الفاظ میں تحریر کیا اور فیصلہ سنایا۔

" مندرجہ بالا صورت میں میں حسب ذیل نتائج پر پہنچا ہوں۔

۱۔ مسلمانوں میں اس پر اجماع ہے کہ پیغمبر اسلامؐ خدا کے آخری نبیؐ تھے۔ اور ان کے بعد کسی اور نبی کو نہیں آنا ہے۔

۲۔ مسلمانوں میں اس پر اجماع ہے کہ قادیانی غیر مسلم ہیں۔

۳۔ مسلمانوں میں اس پر اجماع ہے کہ جسے ہمارے نبیؐ کے آخری ہونے پر ایمان نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔

۴۔ مرزا غلام احمد نے خود اپنے اعلانات کے مطابق یہ دعویٰ کیا کہ ان پر ایسی وحی آتی ہے جو وحی نبوت کے برابر ہے۔

۵۔ خود مرزا غلام احمد نے اپنی پہلی کتابوں میں معیار رکھے ہیں وہ خود ان کے دعویٰ نبوت کی تکذیب کرتے ہیں۔

۶۔ انہوں نے اپنے مکمل پیغمبر ہونے کا دعوےٰ کیا۔ ظلی اور بروز کا سارا قصہ محض ڈھونگ ہے۔

مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے کا جواب

مرزائیوں کی طرف سے مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے کا حوالہ بڑے زور شور سے دیا جاتا ہے۔ فاضل جج نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے۔

مدعا علیہ کی طرف سے اپنے حق میں چند نظائر قانون کا بھی حوالہ دیا گیا تھا ان میں سے پٹنہ اور پنجاب ہائی کورٹ کے فیصلہ جات کو عدالت عالیہ چیف کورٹ نے پہلے واقعات مقدمہ ہذا پر حاوی نہیں سمجھا اور مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے کو عدالت متعلق اجلاس خاص نے قابل پیروی قرار نہیں دیا۔ باقی رہا عدالت عالیہ چیف کورٹ بہاول پور کا فیصلہ بمقدمہ مسمات جندوڈی بنام کریم بخش اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ فیصلہ جناب مہتہ اودھو داس صاحب جج چیف کورٹ کے اجلاس سے صادر ہوا تھا اور اس مقدمے کا صاحب موصوف نے مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے پر ہی انحصار رکھتے ہوئے فیصلہ فرمایا تھا اور خود ان اختلافی مسائل پر جو فیصلہ مذکور میں درج تھے کوئی محاکمہ نہیں فرمایا تھا مقدمہ چونکہ بہت عرصے سے دائر تھا اس لیے صاحب موصوف نے اسے زیادہ عرصہ معرض تعویق میں رکھنا پسند نہ فرما کر باتباع فیصلہ مذکور اسے طے فرما دیا۔ دربار معلے نے چونکہ اس فیصلہ کو قابل پابندی قرار نہیں دیا جس فیصلہ کی بناء پر کہ وہ فیصلہ صادر ہوا اس لیے فیصلہ زیر بحث بھی قابل پابندی نہیں رہتا۔

فریقین میں سے مختار مدعیہ حاضر ہے اسے حکم سنایا گیا۔ مدعا علیہ کارروائی مقدمہ ہذا ختم ہونے کے بعد جبکہ مقدمہ زیر غور تھا فوت ہو گیا ہے اس کے خلاف یہ حکم زیر آرڈر ۲۲، رول ۶، ضابطہ دیوانی تصور ہو گا۔ پرچہ ڈگری مرتب کیا جائے اور مثل داخل دفتر ہو۔

۷۔ فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ

بمقام بہاول پور

دستخط:۔

محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج ضلع بہاول نگر

ریاست بہاول پور (بحروف انگریزی)

۷۔ نبی کریمؐ کے بعد کسی پر وحی نبوت نہیں آ سکتی۔ اور جو ایسا دعویٰ کرتا ہے اسلام کے دائرہ سے خارج ہے۔

مندرجہ بالا استدلال اور نتائج کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ابتدائی سماعت کرنے والی عدالت کا فیصلہ صحیح ہے اور میں سارے فیصلے کی توثیق کرتا ہوں۔ مسمات امت الکریم کی اپیل میں کوئی وزن نہیں اور میں اپیل خارج کرتا ہوں۔

جہاں تک لیفٹیننٹ نذیر الدین کی اپیل کا تعلق ہے اس کے متعلق مسٹر ظفر محمود ایڈووکیٹ نے مجھے بہت کم باتیں بتائیں۔ امت الکریم کے جہیز کا سامان ان کے قبضے میں پایا گیا۔ اس کی قیمت لگائی جا چکی ہے۔ ان کی اپیل میں بھی کوئی وزن نہیں ہے اس لیے اسے بھی خارج کرتا ہوں۔ چوں کہ دونوں فریقوں کی اپیل خارج ہو گئی ہے۔ اس لیے میں خرچے کے متعلق کوئی حکم نہیں دیتا۔

دستخط
شیخ محمد اکبر
سیشن جج بمقام راولپنڈی
۳ جون ۱۹۵۵ء

... ...

مقدمہ جیمس آباد کا فیصلہ

فیملی سوٹ نمبر ۹/۱۹۶۹ء

مسماۃ امتہ الہادی دختر سردار خان مدعیہ
بنام
حکیم نذیر احمد برقؔ مدعا علیہ

مندرجہ بالا بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدعیہ جو ایک مسلمان عورت ہے کی شادی مدعا علیہ کے ساتھ جس نے شادی کے وقت خود اپنا قادیانی ہونا تسلیم کیا ہے۔ اور اس طرح خود غیر مسلم قرار

پایا ہے. غیر موثر ہے۔ اور اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ مدعیہ اسلامی تعلیمات کے مطابق مدعا علیہ کی بیوی نہیں۔

تنسیخ نکاح کے بارے میں مدعیہ کی درخواست کا فیصلہ اس کے حق میں کیا جاتا ہے اور مدعا علیہ کو ممانعت کی جاتی ہے کہ وہ مدعیہ کو اپنی بیوی قرار دے۔ مدعیہ اس مقدمے کے اخراجات بھی وصول کرنے کی حقدار ہے۔

یہ فیصلہ ۱۳ جولائی کو شیخ محمد رفیق گریجہ کے جانشین جناب نیئر احمد حمیدی نے جو ان کی جگہ جیمس آباد کے سول اور فیملی کورٹ جج مقرر ہوئے ہیں کھلی عدالت میں پڑھ کر سنایا۔

ماریشس سپریم کورٹ میں سب سے بڑا مقدمہ

• مسجد روز ہل کے مقدمہ کو تاریخ ماریشس کا سب بڑا مقدمہ کہا جاتا ہے کیوں کہ پورے دو سال تک سپریم کورٹ نے بیانات لیے، شہادتیں سنیں، اور پہلی مرتبہ یہ فیصلہ دیا کہ،

• مسلمان الگ امت ہیں اور قادیانی الگ!

یہ مقدمہ لڑنے کے لیے مسلمانوں اور قادیانیوں دونوں نے دوسرے ممالک سے مشہور وکلاء منگوائے قادیانیوں سے مسجد واپس لینے کے سلسلہ میں روز ہل کے جن مسلمانوں نے کام کیا ان میں محمود اسحاق جی، اسمٰعیل حسن جی، ابراہیم حسن جی قابل ذکر ہیں یہ لوگ وہاں کے تجارتی حلقوں میں بڑا مقام رکھتے تھے انہوں نے جو مقدمہ دائر کیا اس کی بنیاد یہ تھی۔

دعویٰ

روز ہل کی مسجد جہاں مسلمانوں کے حنفی (سنی) فرقہ کے لوگ نماز پڑھتے تھے یہ مسجد انہوں نے تعمیر کروائی تھی اور مسلسل قابض چلے آ رہے تھے اس پر قادیانیوں نے قبضہ کر لیا ہے جن کا تعلق

امتِ اسلامیہ سے نہیں ہے، قادیانی ہم مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے، ہمارے پیچھے ان کی نماز نہیں ہوتی، ایسی صورت میں ان کو مسجد سے باہر نکالا جائے۔

چنانچہ ۲۶ فروری ۱۹۱۹ء کو یہ مقدمہ دائر ہوا، قادیانیوں کے خلاف ۲۱ شہادتیں پیش کی گئیں ان شہادتوں میں مولانا عبداللہ رشید نواب کی شہادت خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ آپ نے عدالتِ عالیہ میں نہایت جرأت و بے باکی سے قادیانیوں کو بے نقاب کیا اور سینکڑوں کتب، اخبارات، رسائل و جرائد پیش کر کے عدالت کو یہ باور کرانے کی کامیاب کوشش کی کہ قادیانی اور مسلمان الگ الگ امتیں ہیں، مرزا غلام احمد کی کتب اور حوالے مولانا رشید نے پیش کیے۔

قادیانیوں کی طرف سے مولوی غلام محمد بی اے نے وکلاء کی مدد کی اور جوابِ دعویٰ تیار کیا۔ مولوی غلام محمد اس مقصد کے لیے خاص طور سے قادیان گیا تھا۔ مسلمانوں کے وکلاء میں مسٹر رولرٹ کے سی، اسی سوئیر کے سی، اے اسٹوف اور اسی نیاریک تھے، جبکہ قادیانیوں کا وکیل مسٹر آر پزانی تھا۔

عدالتِ عالیہ کی کارروائی کے دوران ہزاروں مسلمان موجود ہوتے۔ اور ملک میں پہلی مرتبہ یہ علم ہوا کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کے بھیس میں اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔

چنانچہ ۱۹ نومبر ۱۹۲۰ء کو چیف جج سر اے ہربچیز روڈر نے یوں فیصلہ پڑھ کر سنایا۔

فیصلہ

"عدالتِ عالیہ اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ مدعا علیہ (قادیانی) کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ روز ہل مسجد میں اپنی پسند کے امام کے پیچھے نماز ادا کریں، اس مسجد میں صرف مدعی (مسلمان) ہی نماز ادا کر سکیں گے۔ اپنے اعتقادات کی روشنی میں۔"

اس عدالت کے ایک دوسرے جج جناب ٹی ، ای روز لی نے بھی اس فیصلے سے اتفاق کیا۔

... ...

عالمی اسلامی اداروں کے فیصلے

گزشتہ صفحات میں جو ناقابلِ انکار دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے اس بات پر پوری اُمّتِ اسلامیہ کا اجماع ہو چکا ہے کہ مرزائی مذہب کے متبعین کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ چنانچہ یہاں عالمِ اسلام کے مختلف مکاتبِ فکر اور مختلف حلقوں کے علماء کرام کے فتاویٰ کا خلاصہ ذیل میں پیش خدمت ہے۔

عالمِ اسلام کے علماء کرام کے فتاویٰ

مرزائیوں کے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہونے پر عالمِ اسلام میں جو فتوے دیے گئے ان کا شمار بھی مشکل ہے تاہم چند اہم مطبوعہ فتاویٰ کا حوالہ درج ذیل ہے :

۱۔ رجب ۱۳۳۲ھ میں ایک استفتاء برصغیر کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء سے کیا گیا تھا جو "فتویٰ تکفیر قادیان" کے نام سے شائع ہوا تھا ، اس میں دیوبند ، سہارن پور ، تھانہ بھون ، رائے پور ، دہلی ، کلکتہ ، بنارس ، لکھنؤ ، آگرہ ، مراد آباد ، لاہور ، امرتسر ، لدھیانہ ، پشاور ، راولپنڈی ، ملتان ، ہوشیار پور ، گورداسپور ، جہلم ، سیالکوٹ ، گوجرانوالہ ، گجرات ، حیدر آباد دکن ، بھوپال اور رام پور کے تمام مکاتبِ فکر اور تمام دینی مراکز کے علماء نے باتفاق مرزائیوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

(ملاحظہ ہو فتویٰ تکفیر قادیان شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند ضلع سہارنپور)

۲۔ اسی قسم کا ایک فتویٰ ۱۹۲۵ء میں دفتر اہلِ حدیث امرتسر کی طرف سے "فسخ نکاح مرزائیاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ، اور اس میں برصغیر کے مکاتبِ فکر کے علماء کے دستخط موجود ہیں۔

۳۔ مقدمہ بہاول پور میں جو فتاویٰ پیش ہوئے ان میں برصغیر کے علاوہ بلادِ عربیہ کے

فتاویٰ بھی شامل تھے۔ (دیکھئے فتاویٰ مندرجہ "بحث شرعیہ" شائع کردہ مجلس تحفظ ختم نبوت لاہور و ملتان)

۴۔ ایک فتویٰ "مؤسسة مكة للطباعة والاعلام" کی طرف سے سعودی عرب میں شائع ہوا ہے جس میں حرمین شریفین، بلادِ حجاز و شام کے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کا فیصلہ درج ہے اس کے چند جملے یہ ہیں:

"لاشك ان اذنابه من القاديانية واللاهورية كلها كافرون

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا غلام احمد کے تمام متبعین خواہ قادیانی ہوں یا لاہوری سب کافر ہیں۔"

(القاديانية فى نظر علماء الامة الاسلامية ص ۱۱، طبع مکہ مکرمہ)

پاکستان کے ۳۳ علماء کا مطالبہ

۱۹۵۳ء میں پاکستان کے دستور پر غور کرنے کے لیے تمام مکاتبِ فکر کے مسلمہ نمائندہ علماء کا جو مشہور اجتماع ہوا اس میں ایک دستوری ترمیم یہ بھی تھی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دے کر پنجاب اسمبلی میں ان کے لیے ایک نشست مخصوص کر دی جائے اور دوسرے علاقوں کے قادیانیوں کو بھی اس نشست کے لیے کھڑے ہونے اور ووٹ دینے کا حق دیا جائے۔ اس ترمیم کو علماء نے ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے:

ترمیم

"یہ ایک نہایت ضروری ترمیم ہے جسے ہم پورے اصرار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ملک کے دستور سازوں کے لیے یہ بات کسی طرح موزوں نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات اور مخصوص اجتماعی مسائل سے بے پروا ہو کر محض اپنے ذاتی نظریات کی بناء پر دستور بنانے لگیں۔ انہیں معلوم ہونا

چاہیئے کہ ملک کے جن علاقوں میں قادیانیوں کی بڑی تعداد مسلمانوں کے ساتھ ملی جلی ہے وہاں اس قادیانی مسئلے نے کس قدر نازک صورتحال پیدا کر دی ہے۔ ان کو پچھلے دور کے بیرونی حکمرانوں کی طرح نہ ہونا چاہیئے جنہوں نے ہندو مسلم مسئلہ کی نزاکت کو اس وقت تک محسوس کر کے ہی نہ دیا جب تک متحدہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ دونوں قوموں کے فسادات سے خون آلودہ نہ ہو گیا۔ جو دستور ساز حضرات خود اس ملک کے رہنے والے ہیں ان کی یہ غلطی بڑی افسوس ناک ہو گی کہ وہ جب تک پاکستان میں قادیانی مسلم تصادم کو آگ کی طرح بھڑکتے ہوئے نہ دیکھ لیں اس وقت تک انہیں اس بات کا یقین نہ آئے کہ یہاں ایک قادیانی مسلم مسئلہ موجود ہے جسے حل کرنے کی شدید ضرورت ہے اس مسئلہ کو جس چیز نے نزاکت کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے وہ یہ ہے کہ قادیانی ایک طرف مسلمان بن کر مسلمانوں میں گھستے بھی ہیں اور دوسری طرف عقائد عبادات اور اجتماعی شیرازہ بندی میں مسلمانوں سے نہ صرف الگ بلکہ ان کے خلاف صف آرا بھی ہیں۔ اور مذہبی طور پر تمام مسلمانوں کو علانیہ کافر قرار دیتے ہیں۔ اس خرابی کا علاج آج بھی یہی ہے اور پہلے بھی یہی تھا۔ رجیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے اب سے بیس برس پہلے فرمایا تھا) کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دے دیا جائے۔"

رابطہ عالم اسلامی کی قرارداد

مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں جو مرکز اسلام کی حیثیت رکھتا ہے، ربیع الاول ۱۳۹۴ھ مطابق اپریل ۱۹۷۴ء میں پورے عالم اسلام کی دینی تنظیموں کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا جس میں اسلامی ممالک بلکہ مسلم آبادیوں کی ۱۴۴ تنظیموں کے نمائندے شامل تھے۔ یہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجتماع تھا اس میں مرزائیت

کے بارے میں جو قرار داد منظور ہوئی، وہ مرزائیت کے کفر ہونے پر تازہ ترین اجماعِ امّت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قرار داد کے متن کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

"قادیانیت ایک باطل فرقہ ہے جو اپنی اغراضِ خبیثہ کی تکمیل کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی بنیادوں کو ڈھانا چاہتا ہے۔ اسلام کے قطعی اصولوں سے اس کی مخالفت ان باتوں سے واضح ہے۔

الف۔ اس کے بانی کا دعویٰ نبوت کرنا۔

ب۔ قرآنی آیات میں تحریف۔

ج۔ جہاد کے باطل ہونے کا فتویٰ دینا۔

قادیانیت کی داغ بیل برطانوی سامراج نے رکھی اور اس نے اسے پروان چڑھایا۔ وہ سامراج کی سرپرستی میں سرگرم عمل ہے۔ قادیانی اسلام دشمن قوتوں کا ساتھ دے کر مسلمانوں کے مفادات سے غداری کرتے ہیں اور ان طاقتوں کی مدد سے اسلام کے بنیادی عقائد میں تحریف وتبدیلی اور بیخ کنی کے لیے کئی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، مثلاً

الف۔ دنیا میں مساجد کے نام پر اسلام دشمن طاقتوں کی کفالت سے ارتداد کے اڈے قائم کرنا۔

ب۔ مدارس، سکولوں، یتیم خانوں اور امدادی کیمپوں کے نام پر غیر مسلم قوتوں کی مدد سے ان ہی کے مقاصد کی تکمیل۔

ج۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن کریم کے تحریف شدہ نسخوں کی اشاعت وغیرہ۔

ان خطرات کے پیشِ نظر کانفرنس میں طے کیا گیا کہ:

دنیا بھر کی تمام اسلامی تنظیموں اور جماعتوں کا فریضہ ہے کہ وہ قادیانیت اور اس کی ہر قسم کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی ان کے معابد، مراکز، یتیم خانوں وغیرہ میں کڑی نگرانی کریں اور ان کے تمام درپردہ سیاسی سرگرمیوں کا محاسبہ کریں اور اس کے بعد ان کے پھیلائے ہوئے جال، منصوبوں، سازشوں سے بچنے کے لیے عالمِ اسلام کے سامنے انہیں پوری طرح بے نقاب کیا جائے نیز۔

الف۔ اس گروہ کے کافر اور خارج از اسلام ہونے کا اعلان کیا جائے اور یہ کہ اس وجہ سے انہیں مقامات مقدسہ حرمین وغیرہ میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جاسکے گی۔ مسلمان احمدیوں سے کسی قسم کا معاملہ نہیں کریں گے اور اقتصادی، معاشرتی، اجتماعی، عائلی وغیرہ ہر میدان میں ان کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔

د۔ کانفرنس تمام اسلامی ملکوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ قادیانیوں کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر پابندی لگائیں۔ ان کے تمام وسائل اور ذرائع کو ضبط کیا جائے اور کسی قادیانی کو کسی اسلامی ملک میں کسی قسم کا بھی ذمہ دارانہ عہدہ نہ دیا جائے۔

ہ۔ قرآن مجید میں قادیانیوں کی تحریفات سے لوگوں کو خبردار کیا جائے۔ اور ان کے تمام تراجم قرآن کا شمار کرکے لوگوں کو ان سے متنبہ کیا جائے۔ اور ان تراجم کی ترویج کا انسداد کیا جائے۔

... ...

ملت کی تحریک احتساب و عتاب و راست اقدام

قادیانیوں کی ڈھٹائی اور چیرہ دستی اس حد تک پہنچی کہ ایک طرف وہ پوری ملت اسلامیہ کو کافر قرار دیتے، ان سے جداگانہ ملت کی حیثیت میں رہتے اور دوسری طرف اپنے انگریزی دور کے اثرات ملازمتوں اور بیوروکریسی میں رسوخ کے زور سے مسلمانوں کے نام پر ملازمتیں، تجارتیں ٹھیکے، کاروبار لائسنس، تعلیم اور ترقیات صنعت اور بین الاقوامی تعلقات میں مسلمانوں کا نمایاں حصہ وصول کرلے جاتے۔ انہوں نے اپنے سرکاری زور کو اپنے سامراجی مذہب کی اشاعت و تبلیغ کا ذریعہ بنالیا۔ انہوں نے قادیانی وزیر خارجہ کی مدد سے پاکستان کے تمام بیرون ملک سفارت خانوں اور اداروں پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مفادات کو قربان کرکے اپنے مفادات سمیٹنے کا راستہ اختیار کرلیا۔ انہوں نے ایک طرف بانیٔ پاکستان کے جنازے میں انہیں کافر قرار دے کر شرکت سے انکار کردیا اور دوسری طرف اسی پاکستان کو اپنے مفادات کے تحفظ کا بہترین آلۂ کار بنالیا۔ انہوں نے ملازمتیں دلوانے کے لالچ دے کر خام ذہن مسلمان

نوجوانوں کو قادیانی بنانے کا راستہ اختیار کر لیا۔ انہوں نے ان علماء کو اپنی بیوروکریسی کے ذریعے گرفتار کر کے سزا دینے کا اہتمام کر لیا جو قادیانی مذہب کی اس جداگانہ حیثیت پر تنقید کرتے اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرتے۔ انہوں نے بعض شدید درجہ ناقد علماء کو قتل کروایا اور بعض کے خلاف زباں بندی کے احکام جاری کروائے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ وہی امتیازی سلوک پاکستان میں روا رکھا جو ہندوستان میں ہندوؤں نے روا رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ حکومت میں بہت لمبے تھے اور وہ ان لمبے ہاتھوں سے اپنے ناقدین کو ٹھکانے لگانے کا فن جانتے تھے۔ ان کا رویہ غریب مسلمانوں کے خلاف معاندانہ، مخالفانہ اور تحقیر آمیز حاکمانہ ہو گیا۔ انہوں نے بلوچستان کے صوبے پر قبضہ کر کے وہاں قادیانی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے علماء حق کے خلاف جھوٹے الزامات اچھالے اور اپنے سرکاری اثرات سے ان کے راستے میں کانٹے بھر دئیے۔ انہوں نے اپنی نازیبا حرکات، معاشی امتیازات، سیاسی عزائم اور سرکاری اختیارات کے ذریعے مسلمانوں کو شدید درجہ مشتعل کر دیا۔ بالآخر ملت اسلامیہ مشتعل ہو گئی۔ بالآخر برس ہا برس کا غصہ اور مطالبۂ اقلیت ایک تحریک کی صورت میں اُٹھ کھڑا ہوا اور ۱۹۵۳ء میں ملت اسلامیہ نے اس جارح اقلیت کا احتساب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ملت کا عتاب غصہ بن کر نازل ہوا۔ ملت کا درد و غم تحریک بن کر اٹھا اور ملت اسلامیہ نے قادیانیوں کے خلاف راست اقدام کا فیصلہ کر لیا اور تمام دینی جماعتوں اور گروہوں نے مل کر اس تحریک کو اٹھایا۔ قادیانی نبی کے دعوائے نبوت کے بعد یہ پہلی عظیم تحریک تھی جو قادیانیوں کے عزائم کے خلاف اُٹھی۔

۱۹۵۳ء کی تحریک راست اقدام مرزائیت کے خلاف سب سے بڑی تحریک تھی۔ اس سے پہلے مرزائیت کی پیدائش سے لے کر کسی دور میں اتنا زبردست مظاہرہ کبھی نہ ہوا تھا۔ یہی تحریک تھی جس میں[1]

۱۔ مسلمانوں کے تمام فرقوں نے متحد العمل ہو کر احتجاج کیا۔

---

[1] ماخوذ از مرزائیت اور اسلام مؤلفہ شورش کاشمیری ص ۱۲۱ تا ۱۳۵۔

۱۔ حکومت نے مسلمانوں کی متفقہ آواز کو ٹھکرا کر اس سے ٹکر لی۔

۲۔ پنجاب میں پولیس کا نظام شل ہو گیا۔ صوبائی سیکرٹریٹ کا ماتحت عملہ خوفناک حکومتی تشدد کے خلاف تحریک میں احتجاجاً شامل ہو گیا۔ اس کے علاوہ لاہور میں ریلوے، ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے عملے نے بھی ہڑتال کی۔

۴۔ اکثر اضلاع کی انتظامیہ بے بس ہو گئی۔

۵۔ حکومت نے پاکستان کی بہادر فوج کو اپنی ہی قوم کے خلاف استعمال کیا۔

۶۔ فوج نے مارشل لاء کی شدت کو ہمہ جہت استعمال کیا۔

۷۔ ان علماء کو جو تحریک میں شامل تھے، ایک منتقمانہ ذہن کے ساتھ ہیمانہ سلوک کا مستحق گردانا گیا۔

۸۔ مسلمانوں کی ایک عظیم تعداد جیل میں بند کر دی گئی۔ بہت سے مسلمان پولیس اور فوج نے سرعام شہید کر دیے۔

۹۔ بعض پولیس افسر جو گنہگار راتیں گزارنے کے عادی تھے، انہوں نے مسلمانوں کو سرعام گولیوں سے بھون ڈالا اور ان کی لاشوں کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا۔

۱۰۔ مرزائیوں نے اپنی جیپوں اور کاروں میں سوار ہو کر بے گناہ مسلمانوں کو شہید کیا۔

۱۱۔ مرزائیوں کو ہر عنوان سے تحفظ دیا گیا۔

۱۲۔ سب سے احمقانہ ناٹک تحقیقاتی عدالت کا وہ ڈرامہ تھا جو پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کی صدارت میں کھیلا گیا۔ اس کے کل ۱۱۷ اجلاس ہوئے جن میں جسٹس منیر نے علماء کا استخفاف کیا اور جب ۳۸۷ صفحات پر مشتمل انگریزی میں رپورٹ تیار کی تو وہ اسلام کے نام پر قائم شدہ مملکت کے ایک صوبائی چیف جسٹس کی اسلام کے خلاف ایک شرمناک دستاویز تھی۔

اس تحریک کا آغاز کیوں ہوا۔ مرزا بشیرالدین محمود عالمی اقتدار کی شہ پر پاکستان میں اپنے اقتدار کا خواہاں تھا۔ مرزائی افسر اپنے عقائد کی آبادی میں منہمک تھے، سر ظفر اللہ خان وزارتِ خارجہ کی مسند پر فروکش ہو کر مختلف عہدوں پر قادیانیوں کی بھرتی کر رہا تھا۔ سفارت خانوں میں قادیانی

امت دو ہری نعمات کے لیے مامور تھی چنانچہ مختلف مکاتب فکر کے علماء متحد العمل ہو گئے اور مسلمانوں میں تحریک شباب پر پہنچ گئی۔ اس تحریک کے پھیلاؤ کا واحد سبب یہ تھا کہ مرزائی خطرہ واضح ہو چکا تھا۔ خواجہ ناظم الدین سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ انہوں نے مجلس عمل کے وفود سے صاف صاف کہا اور تحقیقاتی عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے بھی اعتراف کیا کہ وہ مجلس عمل کے مطالبات تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ کیونکہ خارجی دباؤ قادیانیوں کے حق میں تھا اور امریکہ ظفر اللہ خان کی علیحدگی پر پاکستان کی غذائی ضروریات کے لیے گندم دینے کو تیار نہ تھا۔ صرف یہی چیز ظاہر کرتی ہے کہ مرزائی رسوخ کا حال کیا تھا اور ظفر اللہ خان نے استعماری طاقتوں کو اپنے لیے کیونکر ڈھال بنا رکھا تھا۔

اس وقت آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کے مطالبات یہ تھے :

۱۔ قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔

۲۔ قادیانی سر ظفر اللہ خاں کو وزارت خارجہ سے سبکدوش کر دیا جائے۔

۳۔ مرزائی افسروں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹایا جائے۔

۴۔ ربوہ کی بقیہ اراضی پر مہاجرین کو آباد کیا جائے۔

لیکن وزیر اعظم نے اپنے عذرات کے تحت ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ان پارٹیز نے ایک مجلس عمل قائم کی اور اس طرز کے راست اقدام کا فیصلہ کیا کہ

۱۔ خواجہ ناظم الدین مطالبات تسلیم نہ کرنے کے عذر پر مستعفی ہو جائیں۔

۲۔ مرزائیوں کا کامل مقاطعہ کیا جائے۔

تمام پارٹیز سے پندرہ ارکان کی ایک مجلس عمل قائم کی جائے جو راست اقدام کی انچارج ہو اور راست اقدام یہ تھا کہ پانچ رضاکار مطالبات کے جھنڈے اٹھا کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں اور پر امن رہ کر لگاتار مظاہرہ کریں۔ اس قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل ہاؤس پر کیا جائے عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضاکاروں کے ساتھ بالکل نہ جائیں۔ تحریک ختم نبوت کے وفد نے خواجہ ناظم الدین سے ۲۲۔ فروری کو ملاقات کی۔ خواجہ صاحب نے دو ٹوک جواب دے دیا تو ۲۶۔ فروری کو اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے کراچی میں مجلس عمل کا ایک اجلاس ہوا، اس میں راست

اقدام کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اسی شب کی درمیانی رات کو حکومت نے تحریک کے تمام اہم لیڈروں کو بعض دوسرے رفقاء سمیت کراچی میں گرفتار کر لیا۔ ہر تحریک کا خاصہ ہے کہ جب اس کے راہنما اس طرح گرفتار کیے جاتے ہیں تو عوام بھڑک اٹھتے ہیں اور ان کا احتجاج ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔ ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، پنجاب آگ بگولا ہو گیا۔ تمام صوبہ میں تحریک کے نمایاں راہنما اور معروف کارکن بھی اسی رات پکڑ لیے گئے۔ لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، راولپنڈی، لائل پور اور منٹگمری میں تحریک کا طوفان برپا ہو گیا۔ لاہور کے احتجاجی جلوس کا جوش و خروش بے پناہ تھا لیکن سب پُرامن تھے وہ دہلی دروازہ سے نکلتے اور فلیمنگ روڈ سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جاتے پولیس انہیں اسمبلی ہال کے چوک میں روکتی اور گرفتاریاں کرتی۔ آخر پولیس نے اپنے وحشیانہ تشدد کا آغاز کیا اور مختلف اکابر کی گرفتاریوں کے بعد ان مورچوں پر حملہ آور ہو گئی جو اس غرض سے قائم تھے۔ اب کارکنوں کو بھی گرفتار کیا جانے لگا۔ پولیس کا انداز یہ تھا کہ وہ رضاکاروں کو پکڑتی اور ٹرکوں پر سوار کر کے انہیں دور جا کر چھوڑ دیتی۔ ۲ مارچ کو افسروں نے ایک میٹنگ کر کے اپنی امداد کے لیے فوج کو درخواست کی اسی رات دفعہ ۱۴۴ لگا کر جلوس وغیرہ نکالنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ادھر ۳ مارچ کو جناح باغ میں فوج پہنچ گئی اس کے ساتھ ہی بے شمار لوگ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں پکڑے گئے ادھر ٹولنٹن مارکیٹ مال روڈ پر ایک جلوس لاٹھی چارج سے منتشر کیا گیا، ایک ہجوم منٹگمری روڈ سے چیرنگ کراس کی طرف جا رہا تھا اس کو پولیس نے گولی چلا کر منتشر کیا، لاہور کی مسجد وزیر خاں میں مولانا عبدالستار نیازی نے تحریک کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا، کئی جگہ پولیس اور عوام میں مڈبھیڑ ہوئی، ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے راقم سے بیان کیا کہ ایک ایسی تحریک جو پُرامن ہو، لیکن پولیس اس کو ختم کرنے سے قاصر ہو، تو اس صورتحال میں پولیس خود تشدد اٹھا کر اپنے تشدد کا راستہ نکالتی ہے۔ یہی اس تحریک میں ہوا۔ دن بھر پولیس اور عوام میں کئی جگہ تصادم ہوا۔ ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سید فردوس کو توالی کو مسجد وزیر خاں سے باہر اہانت قرآن کے الزام میں لوگوں نے قتل کر دیا۔ اس کے جسم پر پولیس رپورٹ کے مطابق ۵۲ زخم تھے۔ ان کے علاوہ بعض پولیس افسر زخمی ہوئے ان سے ریوالور کے علاوہ بندوقیں چھین لی گئیں۔ کئی جگہ گولی چلائی گئی اور ان سے کافی نقصان ہوا

اس رات کرفیو نافذ کر دیا گیا، لیکن رات بھر شہر ہنگامہ زار بنا رہا۔ ۵۔ مارچ کو اندرونِ شہر
پولیس سے آزاد ہو گیا، کوئی پولیس افسر شہر میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ تھا، تقریباً لاہور شہر
انتظامیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جہاں پولیس کو موقع ملتا وہ گولی چلاتی اور جہاں عوام کا بس چلتا، وہ
توڑ پھوڑ کرتے، ایک جیپ میں قادیانیوں نے راہ چلتے اکا دکا مسلمانوں پر فائر کیا، اس کے
جواب میں مسلمانوں نے ایک آدھ قادیانی کو مار دیا پھر اومنی بسیں جلا دیں، اسی طرح دو پوسٹ
آفس لٹ گئے، پھر انہیں جلا دیا گیا۔ غرض پولیس کے بے پناہ تشدد نے عوام کو اس درجہ
برافروختہ کیا کہ پورا شہر الاؤ کی طرح بھڑک اٹھا۔ پولیس عضو معطل ہو کر رہ گئی۔ اس صورتحال
کے پیشِ نظر گورنر نے بعض عوامی نمائندوں کو بلا کر مشاورت کی اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
بھی تھے، انہوں نے امنِ عامہ کی بحالی کے لیے جو مسودہ تیار کیا وہ مسودہ گورنر اور وزیر اعلیٰ
نے منظور نہ کیا۔ وہ خود تو مطالبات کی حمایت میں تھا کہ حکومت ان پر غور کرے گی، لیکن حکومت
کسی حال میں ان پر غور کرنے کو تیار نہ تھی۔ صوبائی سیکرٹریٹ کے عملہ کی ہڑتال کا دوسرا دن
تھا، اس روز ریلوے ملازمین کے ایک حصے نے بھی ہڑتال کر دی پولیس نے بیان کیا کہ وہ
ایک ٹرین کو تباہ کر رہا ہے، سب سے زیادہ نقصان گوالمنڈی کے علاقہ میں ہوا کہ وہاں ایک
قادیانی انسپکٹر پولیس عبد الکریم نے بعض آدمیوں کو ہلاک کر دیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کنسٹیبلری نے
بھی دو آدمی بلاوجہ شہید کر ڈالے۔ اس رات گورنر نے فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ مارشل لاء
لگانے پر غور کیا۔ ۶۔ مارچ کو صورتِ حال بالکل بے قابو ہو گئی۔ سیکرٹریٹ کے عملہ نے یکجا ہو کر
مظاہرہ کیا کہ فائرنگ بند کرو۔ تمام اعلیٰ افسروں نے انہیں سمجھانا چاہا، لیکن وہ بدستور مظاہرے
کرتے رہے۔ گورنر ہاؤس کی بجلی کاٹ دی گئی، فون ناکارہ کر دیے گئے، ٹیلیفون ایکسچینج کے
ملازموں نے ہڑتال کر دی۔ ریلوے کے ملازموں نے انجن شیڈ پر قبضہ کر لیا۔ لاہور اور مغل پورہ
کے درمیان ریلوے پٹڑی اکھاڑ دی گئی۔ کئی جگہ ٹریفک سگنل توڑ دیے گئے جب صورتِ حالات اس
انتہا کو پہنچ گئی کہ پورا نظام حکومت معطل ہو گیا تو ڈیڑھ بجے دن مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس
دوران میں مسلم لیگ کی شہری و قصباتی شاخوں نے مجلسِ عمل کے مطالبات کی حمایت میں قراردادیں
منظور کیں اور مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس سلسلہ میں تاخیر نہ کرے جب فوج نے مارشل لاء

کے تحت اہل لاہور کو اپنے خوفناک عمل سے رگیدنا شروع کیا تو میاں ممتاز دولتانہ نے عوام کو تسلی دیتے ہوئے تحریک ختم نبوت کے رہنماؤں سے فی الفور گفتگو شروع کرنے کا وعدہ کیا اور اس امر کا یقین دلایا کہ ان کے وزراء مرکزی حکومت کے سامنے مجلس عمل کے مطالبات پیش کر کے انہیں تسلیم کرنے کی سفارش کریں گے لیکن میاں صاحب نے مرکزی حکومت کی تہدیدی ہدایت پر یہ بیان واپس لے لیا۔ اِدھر اُدھر سے فوج نے بے شمار لوگ گرفتار کر لیے، حتیٰ کہ مولانا مودودی کو بھی پکڑ کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان گرفتار شدگان کی سماعت کے لیے فوجی عدالتیں قائم کی گئیں۔ المختصر ایک قومی فوج نے اپنی ہی قوم سے اس طرز کا سلوک کیا جو فاتح اقوام، مفتوح اقوام سے جنگ کے بعد کرتی ہیں۔ لاہور کے علاوہ سیالکوٹ میں بھی رہنماؤں کی گرفتاری سے عوام مشتعل ہو گئے۔ ابتداء انتظامیہ نے کی کہ احتجاجی مظاہرے کو منتشر کرنے کے لیے پہلے ہی دن پولیس کے علاوہ فوج استعمال کی۔ دارالعلوم شہابیہ کے اندر پولیس داخل ہو گئی اور مجمع کو بزور منتشر کرنا چاہا۔ عوام نے مزاحمت کی، پولیس گولی چلاتی رہی، عوام دارالعلوم کی عمارت سے خشت باری کرتے رہے، خوب مقابلہ ہوا۔ پولیس گاڑیاں جلا دی گئیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جیپ کو نذرِ آتش کیا گیا۔ حتیٰ کہ میونسپل فائر بریگیڈ کو بھی جلا دیا گیا۔ یہ سب کچھ دارالعلوم اور اس کے گرد پیش پولیس کے گولی چلانے کا ردِ عمل تھا۔ اس کے نتیجہ میں ایک پولیس انسپکٹر کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا گیا۔ جب حالات ہاتھ سے نکل گئے تو ضلعی انتظامیہ نے فوج بلوائی۔ اس نے گولی شروع کی تو پہلے راؤنڈ ہی میں چار آدمی شہید اور دس مجروح ہوئے، پولیس کے حوصلے بالکل پست ہو گئے تھے فوج نے گرفتاریوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اکثر علماء نے مختلف مسجدوں میں مورچہ لگا لیا۔ غرض اضطراب کی لہر پورے صوبے میں پھیل گئی۔ بیشتر علماء گرفتار کر لیے گئے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار نیازی کو فوجی عدالت نے سزائے موت کا حکم سنایا جسے ملک گیر احتجاج کے بعد عمر قید سے بدل دیا گیا، لیکن قادیانیوں کے خلاف اقلیت قرار دینے کی تحریک جاری رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ جھوٹی نبوت کے اعلان کے بعد ملت اسلامیہ نے قادیانیوں کے جھوٹے مذہب کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور ان کی ملت اسلامیہ کے اندر

تخریب کاری کا ہمیشہ احتساب کیا جاتا رہا ہے اس لیے کہ یہ جدید ہندوستانی نبی کی امت ملت اسلامیہ کو کاٹ کاٹ کر بنائی جا رہی تھی۔

مرزا صاحب نے ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا پھر ۱۹۰۱ء میں اپنے نبی ہونے کا اعلان فرمایا گویا ہندوستان میں برطانوی عملداری تک تو قادیانی اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے تھے۔ انہیں مرزا صاحب کے الہام کی رو سے اپنے خود کاشتہ پودا ہونے کا احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ جس استعمار نے انہیں پیدا کیا وہی ان کا محافظ و پشتیبان ہے لیکن جب پاکستان بنا تو وہ کوئی اہم اقلیت نہ تھے اہم عنصر ضرور تھے۔ انہوں نے اولاً ہندوستان میں رہنے کی بہتیری کوشش کی ریڈکلف کو اپنا الگ میمورنڈم دیا۔ سر ظفر اللہ خان نے پاکستان کی سرحدی ترجمانی کے علاوہ اس یادداشت کی بھی بھرپور ترجمانی کی۔ جب اس طرح بات نہ بنی تو وہ قادیان میں تین سو تیرہ درویشوں کو چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ پاکستان میں سر ظفر اللہ خان کی وزارتِ خارجہ ان کے لیے ایک سہارا ہو گئی۔ جن لوگوں کو سیاسی اقتدار منتقل ہوا تھا وہ قادیانیت کے مذہبی پہلو سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قادیانی ان کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتے بلکہ حکومت سے وفاداری ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ جب پاکستان کی سیاست خواجہ ناظم الدین جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں آ گئی اور ان کی کابینہ میں وہ لوگ شامل ہو گئے جو سیاسی نہ تھے بلکہ برطانوی عملداری کے دنوں سے ملازم چلے آ رہے تھے تو قادیانیت اور محفوظ ہو گئی۔ ملک غلام محمد اور اسکندر مرزا نے اس کو مزید تحفظ دیا وہ سمجھتے تھے کہ قادیانی پاکستان جیسے مذہبی ملک میں ایک ایسی اقلیت ہیں کہ ان کے خلاف کسی سازش یا منصوبہ میں شریک نہیں ہو سکتے بلکہ ان پر مقتدرین کے تشخص و ترزلی تحفظ کا بار ڈالا جا سکتا اور سیاستاً اعتماد کیا جا سکتا ہے اس کے برعکس عام مسلمانوں کا اجتماعی مزاج یہ تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی مرزائیت کے ساتھ مصالحت کے لیے تیار نہ تھے۔ غرض پانچ سال کے اندر اندر ۱۹۵۳ء کی تحریک نے قادیانیت کو معنوی اعتبار سے لپیٹ کر دیا۔ مرزائی تبلیغ کے دروازے بند ہو گئے اور ان کی وہ نقاب اتر گئی جو ان کے سیاسی منصوبوں پر مذہب کا پردہ بنی ہوئی تھی۔[1]

---

[1] مرزائیت اور اسلام۔ از شورش کاشمیری ص ۱۹۱۔

اس طرح یہ تحریک نہایت درجہ مفید رہی اور ملت اسلامیہ اپنے مشن میں آگے بڑھ گئی لیکن اس سارے معاملے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کے دینی جذبات کو ان کے حکمران سمجھنے سے بالکل عاری تھے۔ عوام اور حکمران دونوں مختلف دنیاؤں میں رہتے تھے۔ حکمران بھی اس مسئلے کو خاص فرنگی سامراج کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مسلمانوں کے اضطراب۔ تحریک گرفتاریوں قربانیوں اور شہادتوں کے باوجود مغرب زدہ حکمران جاگیردار اقلیت اور سامراجی بیوروکریسی ان ساری قربانیوں اور مسلمانوں کے احتجاج سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی، ایک تحقیقاتی عدالت بنادی گئی جس کا جج جسٹس منیر کو بنایا گیا جو آمریت کا علمبردار، ملک غلام محمد مفلوج گورنر جنرل کا خوشامدی، مغرب زدہ الحاد پرست منحرف نام نہاد مسلمان اور شاید باطنی طور پہ قادیانی تھا جس نے اپنی عمر کی جنس ہونے کے باوجود کبھی شرافت، انسانیت اور اخلاق اسلامی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ ذاتی حیثیت میں وہ راشی۔ بدکردار بدنام اور انگریز کے سامراجی عزائم کے سانچے میں ڈھلا ہوا آدمی تھا۔ جس نے انگریز حکمرانوں کی خوشامد اور کاسہ لیسی میں عمر گزاری تھی۔ جو اپنی پوری عدالتی عمر میں اسلام سے دور اور فسق و فجور میں مبتلا زندگی گزارتا تھا اور اسلامی جج کے اخلاق و کردار کا اس میں شائبہ بھی نہ تھا جس کی اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے بے تعلقی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہ تھی جسے مغرب زدہ حکمرانوں نے اس کی انہیں مکروہ خصوصیات کے باعث تحقیقاتی عدالت کا جج بنایا تھا شاید پاکستان کی عدلیہ میں اس سے بدتر، بدنفس اور اسلام سے منحرف جج نے کبھی عدالت کی کرسی کو ناپاک نہ کیا ہوگا۔

اس نے مسلمانوں کے اضطراب کی حقیقی تحقیقات اور احتساب کی تحریک کے حقیقی محرکات کی تہہ تک پہنچ کر اس کے اسباب بیان کرنے کی بجائے اپنی رپورٹ میں اسلام کو نشانہ تضحیک اور علماء کرام کو نشانہ ملامت و استہزا بنایا۔ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف اس نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ کو ایک ایسی دستاویز بنانے کی کوشش کی جو تمام اسلامی امور و مسائل کے خلاف ایک ناپاک جانبدارانہ دستاویز کا کام دیتی ہے۔ لیکن جسٹس منیر کے جانے بوجھے کردار، رپورٹ کے متن اور اس پر علماء کرام کے تجزیاتی تبصرے نے اس کی قدر و قیمت اور بدنیتی پر مبنی ترتیب کی حقیقت کا سارا پول کھول دیا۔ تحریک تو مارشل لاء، ظلم و ستم لاکھوں افراد کی گرفتاریوں کے ذریعے وقتی طور پہ

رک گئی لیکن جذبات کا جو الا مکھی اندر ہی اندر کھولتا رہا اور تحریک مورد زائل ہونے کی بجائے اور پختہ ہونے کے لیے سینوں اور پروگراموں میں محفوظ ہو گیا۔ قوم نے قربانیوں کا راستہ اختیار کر لیا۔

... ...

۱۹۷۴ء کی عظیم تحریک محاسبہ

۱۹۵۳ء کی تحریک محاسبہ و مطالبہ اقلیت نے قادیانیوں کے عقائد و عزائم کو پوری طرح کھول کر مسلم عوام کے سامنے رکھ دیا۔ ہزارہا لوگوں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ جیلوں میں گئے نقصانات برداشت کیے، شہید ہوئے اور جان و مال بربادی و تباہی سے دوچار ہوئے اور قوم نے وسیع پیمانے پر جان لیا کہ اس کے وجود میں ایک ایسا ناسور موجود ہے جو اسے اندر ہی اندر کھا رہا ہے اور اگر وہ موجود رہا تو ملت کے انتشار و افتراق میں شب و روز اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور ملت کی بے خبری و بے تعلقی کے نتیجے میں ایسا حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حاصل کردہ مملکت پر ایک غدار دشمن اسلام مرتد اقلیت قابض ہو جائے اور پھر ملت مسلمہ کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔

اس احساس نے مسلمانوں میں جا بجا ایسے ادارے پیدا کر دیے جو مسلمانوں میں اس شعور کو بیدار رکھیں کہ ان کے وجود میں پیدا شدہ ناسور کو دور کیا جائے۔ جماعت اسلامی پاکستان کے اپنے دستوری مطالبات کی جدوجہد میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبے نے نویں نکتہ کی جگہ حاصل کر لی اور وہ اس کی دستوری جدوجہد کا عنوان بن گیا۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے ایک باقاعدہ تنظیم وجود میں آ گئی۔ مجلس احرار پہلے سے لے کر چل رہی تھی۔ دیگر دینی اور مذہبی جماعتوں نے بھی اس مطالبہ کو اپنا لیا اور پھر قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک تقریر و تحریر، نشر و اشاعت، جلسہ جلوس، مطالبات و خطبات کا موضوع بن گئی۔ بعض جرائد نے اسے مشن کا حصہ بنا لیا۔

جناب شورش کاشمیری کے ہفت روزہ جریدے چٹان لاہور نے تو اسے وجود کا حصہ بنا لیا

اس کے لیے چٹان وقف کر دیا۔ غرض پورے ملک میں قادیانیوں کا تعاقب شروع ہو گیا اور انہیں اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بہت زور پکڑ گیا اگرچہ ملک کے حکمران جو مغربی سانچے میں ڈھلے ہوئے اور مفادات کی شراب سے مخمور رہنے والے لوگ تھے۔ سنجیدگی سے اس مطالبے پر غور کرنے سے تامل برتتے چلے آ رہے تھے لیکن ان کی غفلت کے تناسب سے ہی اس مطالبے کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

یہ دور پاکستان کے ادوار میں حد درجہ ملی پستی اور قومی ذلت کا دور تھا۔ پاکستان کی آزادی پر امریکہ اپنی امدادوں کے ذریعے اثر انداز ہو رہا تھا۔ مسلم لیگی حکمران بقول مورخ مسلم لیگ ڈاکٹر صفدر محمود باہمی کشمکش اور کھینچا تانی سے ملک کی چولیں ہلا رہے تھے اور مغربی پاکستان میں ہر دوسرے تیسرے مہینے وزارتیں بدلتیں اور حکومتیں تبدیل ہوتی تھیں۔ اسکندر مرزا اور ملک غلام محمد انگریزی دور کے دو دیرینہ سرکاری ملازم اور بدکردار سیاستدان بن کر مسلم لیگ کی تنظیم سے تاش کے پتوں کی طرح کھیل رہے تھے۔ اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کو جیلوں میں بند اور موت کی سزائیں سنائی جا رہی تھیں۔ مسلم لیگی سیاستدان اپنے اخلاق کی پستی اور اپنے کردار کی کمینگی کے بدترین نمونے پیش کر رہے تھے۔ برصغیر کی مسلم ملت نے اپنی قربانیوں سے پاکستان بنا دیا تھا لیکن سیاستدان پاکستان کے وجود کو اپنی بے اصولیوں کے دھچکے لگا رہے تھے اس دور میں قادیانیوں کے اقلیت قرار دینے کی تحریک راست اقدام کے بارے میں مدیر چٹان شورش کاشمیری نے لکھا ہے:

"--- تحریک راست اقدام[1] ۱۹۵۳ء کے اختتام سے لے کر مارشل لاء ۱۹۵۸ء کے آغاز تک مرزائی اپنے سیاسی خاکوں میں رنگ بھرتے اور معاشی منصوبوں کو پروان چڑھاتے رہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی اولتی بدلتی صورت حال کا سب کو علم ہے۔ مرزائیوں نے ہر دور کے مطابق اپنی چال قائم رکھی، ایوب خاں کا طویل دور ان کے لیے تحفظ کا موجب بن گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ

---

[1] مرزائیت اور اسلام۔ از آغا شورش کاشمیری ص ۱۶۳۔۱۶۵۔

میں عوام کا پانسہ پلٹ کر ہندوستان کی طرف ہو گیا۔ وہ اندرونی دشمن کو بھول گئے۔ ان کی نگاہیں بیرونی دشمن پر جم گئیں۔ مرزائی مطمئن تھے کہ ایوب خاں کا دور ان کا معاون و مددگار ہے اور حکومت کی شطرنج پر انہی کے مہرے چل رہے ہیں۔ انہوں نے خواص کی اکثریت میں پھر سے ایک ایسا ذہن پیدا کیا کہ ان کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ملاؤں کا روایتی خروش ہے۔ مرزائی خود چاہتے تھے کہ علماء ان پر مذہبی تنقید کرتے رہیں اور وہ حکومت سے ہم آغوش ہو کر اپنے تئیں منظم کرتے جائیں۔ مولانا تاج محمود نے لولاک میں ربوہ کی سیاست کاری پر نقد و نظر کو ملحوظ و مقدم رکھا، لیکن مرزائی ایوب خان کی فضا میں اس قدر مستحکم ہو چکے تھے کہ ایسی ہر تنقید سے خود کو بالا سمجھتے تھے۔ ادھر ڈیفنس آف پاکستان رولز نے انہیں تحفظ دے رکھا تھا۔ نواب کالا باغ نے راقم کو بتایا تھا کہ بالائی سطح پر مرزائیوں کے تحفظ کے ارادے موجود ہیں اور ان کا ہاتھ لگانا آسان نہیں ہے۔ بہرحال میں نے ان کے تحفظات کی پوری روداد معلوم کی کہ کس طرح وہ پاکستان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ۳۔ اپریل ۱۹۶۷ء کو چنیوٹ (جس سے ربوہ ملحق ہے) میں ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کیا اور ان تمام حقائق کی پردہ کشائی کی جو اب تک صیغۂ راز میں تھے۔ راقم نے ایوب خاں سے عرض کیا کہ "مرزائیت کی تمام تاریخ سیاسی دینیات کی تاریخ ہے۔ میں ہر چیز پوری ذمہ داری سے عرض کروں گا اور اگر کوئی بات غلط ہو تو اس کی تصحیح کے لیے ہر لحظ حاضر ہوں۔ اس جلسے کے سرکاری رپورٹر کی معرفت گورنر پنجاب اور گورنر پنجاب کی وساطت سے صدر مملکت تک اپنی معروضات پہنچانے کا متمنی ہوں۔ مرزائی پاکستان میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے اور اپنے لیے عجمی اسرائیل بنانے کے لیے مغرب کی استعماری طاقتوں کے آلۂ کار ہیں۔ مرزائی دو حرف بر کہ پیغمبر استعمار کی سیاسی امت ہیں بلکہ بہ قول اقبال۔ احمدیت یہودیت کے قریب تر

ہے۔ راقم نے انہی دنوں لکھا کہ سر ظفر اللہ خاں انگریز کی شخصی یادگار ہیں۔ یہ اس خبر کے تبصرہ کا عنوان تھا جو ۴ نومبر ۱۹۶۷ء کے مشرق میں شائع ہوئی کہ افریقہ میں کیپ ٹاؤن کے ۳۲ ہزار مسلمانوں نے سر ظفر اللہ خان کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔

راقم کی اس تقریر اور چٹان میں مطابقاتی واقعاتی اشعار سے مرزائی امت بوکھلا گئی۔ روزنامہ الفضل کے ایڈیٹر روشن دین تنویر نے راقم کو زر خرید لکھا۔ اس پر راقم نے مرزا بشیر الدین محمود سے سوال کیا آپ بزعم خویش مسیح موعود کے "مصلح موعود" صاحبزادے ہیں۔ آپ کے یار روشن دین تنویر کے پاس کوئی شہادت یا دستاویز ہے تو سامنے لائیے اور ثابت کیجئے کہ ہم بکے ہیں۔ ارشاد ربانی یہ ہے کہ کسی پر اتہام مت لگاؤ اور نہ ایسا الزام گھڑو جس کا تمہارے پاس ثبوت موجود نہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے چٹان کے جواب میں الفضل کے صفحہ اول پر اپنے قلم سے مضمون لکھا اور راقم سے معافی مانگی کہ الفضل کے ایڈیٹر نے بلا ثبوت الزام عائد کیا ہے۔ راقم نے اس کے فوراً بعد "ربوہ کا راسپوٹین" کے عنوان سے اداریہ لکھا جس میں مرزا بشیر الدین محمود کی تصویر کھینچی کہ وہ کن معصیتوں کا مجموعہ ہے۔ ربوہ تو مہر بلب ہو گیا، لیکن لاہور میں اپنے ایک ہفتہ وار کو مرزا غلام احمد کی سنت کے مطابق گالیاں بکنے پر مامور کر دیا۔ پاکستان میں بیسیوں ہفتہ وار اور ماہنامے قادیانیت پر تبرائی قلم اٹھاتے اور جید علماء کی ایک قطار اس کی چیر پھاڑ کرتی، لیکن ان سے متعلق قادیانی کبھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ بلکہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کے تماشہ دیکھتے، لیکن چٹان کی ہر تحریر اور راقم کی ہر تقریر سے قادیانی امت پر رعشہ طاری ہو جاتا اور وہ تڑپ اٹھتے تھے۔

۲۴ مئی ۱۹۷۴ء میں اسلامی جمعیت طلباء کا ایک وفد مطالعاتی پروگرام پر ملتان سے پشاور

بذریعہ ٹرین جا رہا تھا۔ ربوہ کے ریلوے اسٹیشن پر اسلامی وفد نے ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اس پر کچھ ہنگامہ ہوا اور گاڑی گزر گئی۔ قادیانیوں نے اس گروپ کی واپسی کا سارا پروگرام معلوم کیا اور واپسی پر اسے بھرپور سزا دینے کا منصوبہ بنایا۔ غرض ربوہ کی اس منصوبہ بندی کا خلاصہ یہ تھا کہ مختلف تجربوں کی ترازو میں تول کر اب مسلمانوں کا وزن بھی معلوم کر لیا جائے کہ اب ان کی طاقت کیا ہے؟ اور وہ کس حد تک مزاحمت و مدافعت کر سکتے ہیں چنانچہ واپسی پر ربوہ ریلوے اسٹیشن پر ۲۹ مئی کو مرزا ناصر احمد کی شہ پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے لگ بھگ ان ایک سو طلبہ کو مرزائی غنڈوں نے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ ڈیڑھ درجن طلبہ ہلکان ہو گئے۔

جب گاڑی مرزا غلام احمد کے بزدلوں کی مشقِ ناز کے بعد لائل پور پہنچی۔ تو غم و غصہ کی ایک طوفانی لہر دوڑ گئی۔ دیکھتے آنکھوں شہر سے دس ہزار افراد پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی بھاری جمعیت کے ساتھ آ گئے۔ انہوں نے نہایت تدبر و فراست سے صورتِ حالات پر قابو پا لیا، ورنہ عوام کے جذبات آتش کدہ کے شعلوں کی طرح کھول رہے تھے۔

واقعات اس طرح ہیں کہ ربوہ میں گاڑی کی آمد سے پہلے ہی تقریباً پانچ ہزار افراد، لاٹھیوں، کلہاڑیوں، ہاکیوں، خنجروں، تلواروں اور پستولوں سے مسلح ہو کر پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے جب گاڑی ربوہ سے پہلے نشتر آباد کے اسٹیشن پر پہنچی تو اس کے قادیانی العقیدہ اسٹیشن ماسٹر نے ربوہ کے ہم عقیدہ اسٹیشن ماسٹر کو طلبہ کی بوگی کا نشان دیا اور تیاری کو مستعد کرنے کیلئے گاڑی کی روانگی میں تاخیر کی۔ پھر جب گاڑی ربوہ سٹیشن پر پہنچی تو ان ہزار ہا افراد نے طلبہ کی بوگی پر حملہ کر دیا۔ طلباء نے وحشیانہ ہجوم کو دیکھ کر بوگی کے دروازے بند اور کھڑکیاں مقفل کر لیں، لیکن مرزائی درندوں نے دروازے اور کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ اندر گھس گئے اور تمام طلبہ کو بری طرح زدوکوب کیا۔ ۳۰ طلبہ سخت زخمی ہوئے۔ نشتر میڈیکل کالج یونین کے صدر ارباب عالم کو اس بری طرح پیٹا گیا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ربوہ کے اسٹیشن ماسٹر نے سگنل ہونے کے باوجود گاڑی کو چلنے نہ دیا۔ وہ قادیانی غنڈوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ نوائے وقت کے نامہ نگار کی

روایت کے مطابق پچاس ساٹھ قادیانی سرگودھا سے سوار ہوئے کہ اس کارِ خیر میں حصہ لیں اور طلبہ کی نشاندہی کریں۔ ان حملہ آوروں میں تعلیم الاسلام کالج کے طلبہ، بعض اساتذہ، اکثر دو کاندار اور کئی ایک قصرِ خلافت کے معتقدین تھے۔ انہوں نے طلبہ کی پٹائی کے علاوہ ان کا سامان چھین لیا اور مالِ غنیمت گردان کر لے گئے۔ دلچسپ پہلو یہ تھا کہ مرزائی اپنے ساتھ بازاری فطرت کی تین چار سو عورتیں بھی لائے تھے، جو طلبہ کی پٹائی پر تالیاں پیٹتیں اور رقص کرتی رہیں۔ جب گاڑی لائل پور پہنچی، تو ایک طوفان برپا ہو گیا۔ مسلمانوں کا احتجاج کھول رہا تھا۔ مولانا تاج محمود اکیلا اکیلا اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کی اور طلبہ کو یقین دلایا کہ جو ضربیں ان کے جسم پر لگی ہیں وہ مرزائیت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوں گی۔ اور اب اس واقعہ کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جائے گا، بلکہ ربوہ کے شعبدہ بازوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کے دم لیں گے۔ اسی وقت مولانا تاج محمود اور مولانا فضل رسول نے ایڈیٹر چٹان، کو فون پر ان حالات سے مطلع کیا۔ ایڈیٹر چٹان نے اگلی صبح لاہور کے متعدد علماء اور سیاسی زعماء کا اپنے دفتر میں اجلاس بلوایا۔ اس بھرپور اجلاس میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور اس امر کا فیصلہ کیا گیا کہ دو روز میں سرکردہ علماء کو بلوا کر طے کیا جائے کہ آئندہ اقدام کیا ہو اور مرزائیت کو اس کے حقیقی مقام پر کیونکر پہنچایا جا سکتا ہے۔ لائل پور کے علماء و زعماء اور مقامی انتظامیہ (ڈپٹی کمشنر اور پولیس سپرنٹنڈنٹ) نے عوام کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کیا۔ چناب ایکسپریس زخمی طلبہ کو لے کر ملتان روانہ ہو گئی۔ وہاں مجروحین کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ اپنے ساتھی طلبہ کو دیکھ کر دوسرے طلبہ کو سخت غصہ آیا۔ انہوں نے قادیانی طلبہ کو زغے میں لے کر طارق ہوسٹل اور سیفیا ہوٹل سے ان کا سامان باہر نکال کر آگ لگا دی۔ پھر نشتر میڈیکل ہال اور شبستان ہوٹل پر حملہ کر دیا اور کچھ نقصان پہنچایا۔ لیکن پولیس نے دونوں اداروں کو بچا لیا۔ اگلے روز (۳۰ مئی) کو سانحہ ربوہ کی خبر اخبارات کے ذریعہ ملک میں پھیل گئی تو ہر جگہ مرزائیت کے خلاف لہر پیدا ہو گئی۔ اور قدیم مطالبہ میں گونج پیدا ہونے لگی کہ مرزائی مسلمانوں کا حصہ نہیں۔ انہیں خارج از اسلام قرار دے کر علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اس کے بعد راقم نے ۳۱ مئی سے ۶ ستمبر تک جب مرزائیت کو نیشنل اسمبلی نے اسلام سے خارج قرار دے کر علیحدہ اقلیت قرار دیا۔ اس تحریک کے متعلق تاریخ وار ایک اشاریہ بھی

مرتب کیا جس سے واقعات کی رفتار کے علاوہ عوام کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس جدوجہد میں کیونکر کامیابی حاصل کی اور مرزائیوں کے جماعتی وجود کا تعین کیونکر ہوا۔ بس ۳۰۔ مئی کے بعد تو پھر سارے صوبے میں آگ لگ گئی [۱]۔

مظاہرے شروع ہو گئے۔ جلسے جلوس اور مطالبات نے زور پکڑ لیا۔ یہ دور ذوالفقار علی بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کا دور تھا۔ ان مظاہروں کی کثرت سے امن وامان کا غیر معمولی مسئلہ بن چکا تھا اور مسلمان عوام کے جذبات اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ جب قومی اسمبلی میں اس مطالبے کی گونج پیدا ہوئی اور متعدد ممبران قومی اسمبلی نے مشترکہ طور پر قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی ایک قرارداد اسمبلی میں پیش کی جو قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے حوالے کی گئی۔ اس خصوصی کمیٹی نے دو ماہ میں ۲۸۔ اجلاس کیے۔ ۹۶ گھنٹہ کی نشستیں جمائیں۔ مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی پروفیسر غفور احمد، چوہدری ظہور الٰہی، مسٹر مولا بخش سمرو اور ان کے رفقاء نے صبح وشام کی مساعی سے وہ تمام لٹریچر جمع کیا، جو خصوصی کمیٹی کے لیے ضروری تھا۔ ان رہنماؤں کے سرکاری کمرے مجلس عمل کا سب آفس بنے رہے۔ مولانا محمد شریف جالندھری کی زیر سرکردگی اسلام آباد میں ماہرینِ قادیانیت کا عملہ شب وروز کام کرتا رہا۔ وہ تمام لٹریچر جو اس عرصہ میں مرزائیت کے متعلق شائع ہوا، قومی اسمبلی کے ارکان میں تقسیم کیا گیا۔ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے سے متعلق یادداشت تیار کی گئی، جس میں مرزائیت کی پوری تاریخ کے علاوہ، اس کے عقائد و اعمال کا پورا پورا نقشہ تھا۔ اس میں قادیانیت کی تاریخ کے علاوہ اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ ہماری دینی وحدت، سیاسی استحکام اور ہماری قومی سالمیت کی بقا کا مسئلہ ہے۔ ہم ان کو اس لیے بھی علیحدہ اقلیت کے طور پر تشخص کرنا چاہتے ہیں کہ ان سے ہماری قوم اور ہمارے ملک کو شدید خطرات ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ استعمار و اسرائیل کے ففتھ کالم ہیں۔

جب یہ قرارداد زیرِ بحث تھی اس دوران محرکینِ قرارداد نے ارکانِ اسمبلی سے ایک درد بھری اپیل کی انہوں نے اس تحریری اپیل میں لکھا:

---

[۱] مرزائیت اور اسلام مؤلفہ شورش کاشمیری ص ۲۳۰۔ ۲۳۱۔

— معزز اراکینِ اسمبلی!

ہر چند اختصار کو مدِ نظر رکھنے کے باوجود مرزائیت کے بارے میں ہماری گزارشات کچھ طویل ہو گئیں لیکن امتِ اسلامیہ پر مرزائیت کی ستم رانیوں کی داستان اس قدر طویل ہے کہ دو سو صفحات سیاہ کرنے کے باوجود ہمیں بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اس موضوع سے متعلق جتنی اہم باتیں معزز اراکین کے سامنے پیش کرنی ضروری تھیں۔ ان کا بہت بڑا حصہ ابھی باقی ہے۔ ملتِ اسلامیہ تقریباً نوے سال سے مرزائیت کے ستم سہہ رہی ہے۔ اس مذہب کی طرف سے اسلام کے نام پر اسلام کی جڑیں کاٹنے کی جو طویل مہم جاری ہے، اس کی ایک معمولی سی جھلک قرار داد میں آپ کے سامنے آ چکی ہے اسلام کے بنیادی عقائد کی دھجیاں بکھیری گئی ہیں، قرآنی آیات کے ساتھ کھلم کھلا مذاق کیا گیا ہے۔ احادیثِ نبویؐ کو کھلونا بنایا گیا ہے۔ انبیاءِ کرام صحابہؓ کے مقدس گروہ اہلِ بیت عظامؑ اور اسلام کی جلیل القدر شخصیتوں پر علانیہ کیچڑ اچھالا گیا ہے۔ اسلامی شعائر کی برملا توہین کی گئی ہے، انتہا یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی جیسے کردار کو اس رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے "پہلو بہ پہلو" کھڑا کرنے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے مقامِ عظمت و رفعت کے آگے فرشتوں کا سرِ نیاز بھی خم ہے جس کے نام نامی سے انسانیت کا بھرم قائم ہے اور جس کے دامنِ رحمت کی نیاز مندیوں کے آگے مشرق و مغرب کی حدود بے معنی ہیں۔

مرزائیت اس رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں کے خلاف نوّے سال سے سازشوں میں مصروف ہے، اس نے ہمیشہ اسلام کا روپ دھار کر امتِ مسلمہ کی پشت میں خنجر بھونکنے اور دشمنانِ اسلام کے عزائم کو امداد و تقویت دینے

لے ماخوذ از مرزائیت اور اسلام، مولفہ شورش کاشمیری، ص ۱۹۹۔۲۰۰۔

فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں فرزندانِ توحید کے قتلِ عام اور مسلم خواتین کی بے حرمتی پر گھی کے چراغ جلائے ہیں اور اس نے اپنے آپ کو امت مسلمہ کا ایک حصہ ظاہر کرکے اسلام دشمنوں کی وہ خدمات انجام دی ہیں جو اس کے کھلم کھلا دشمن انجام نہیں دے سکتے تھے۔

ملت مسلمہ نوے سال سے مرزائیت کے یہ مظالم جھیل رہی ہے، انہی مظالم کی بنا پر تمام مسلمانوں اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے اپنے زمانے کی انگریز حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ مرزائی مذہب کے متبعین کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر انہیں مسلمانوں کے جسدِ ملی سے علیحدہ کر دیا جائے، لیکن وہ ایک ایسی حکومت کے دور میں پیدا ہوئے تھے جس نے مرزائیت کا پودا خود کاشت کیا تھا اور جس نے ہمیشہ اپنے مفادات کی خاطر مرزائیت کی پیٹھ تھپکنے کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی۔ لہٰذا پوری ملتِ اسلامیہ اور خاص طور سے علامہ اقبال کی درد میں ڈوبی ہوئی فریادیں ہمیشہ حکومت کے ایوانوں سے ٹکرا کر رہ گئیں۔ مسلمان بے دست و پا تھے اس لیے وہ مرزائیت کے مظالم سہنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ آج اس مصورِ پاکستان کے خوابوں کی تعبیر پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یہاں ہم کسی بیرونی حکومت کے ماتحت نہیں تھے لیکن افسوس ہے کہ ۲۷ سال گزرنے کے بعد بھی ہم ملت اسلامیہ کی اس ناگزیر ضرورت، اس کے دیرینہ مطالبے اور حق و انصاف کے اس تقاضے کو پورا نہیں کر سکے اور اس عرصے میں مرزائیت کے ہاتھوں سینکڑوں مزید زخم کھا چکے ہیں۔

معزز اراکینِ اسمبلی! اب ایک طویل انتظار کے بعد یہ اہم مسئلہ آپ حضرات کے سپرد ہوا ہے اور صرف پاکستان ہی نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں، پوری مسلم دنیا آپ کی طرف دیکھ رہی ہے

اور ان خلد آشیاں مسلمانوں کی روحیں آپ کے فیصلے کی منتظر ہیں جنہوں نے غلامی کی تاریک رات میں مرزائیت کے پھیلائے ہوئے کانٹوں پر جان دے دی تھی، جو حق و انصاف کے لیے پکارتے رہے مگر ان کی شنوائی نہ ہو سکی اور جو ستائیس سال سے اس مسلم ریاست کی طرف دیکھ رہے ہیں جو آزادی کے خوابوں کی تعبیر ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے اور جو دو صد سالہ غلامی کے بعد مسلمانوں کی پناہ گاہ کے طور پر حاصل کی گئی ہے۔

معزز اراکین! مسلمان کسی پر ظلم کرنا نہیں چاہتے۔ مسلمانوں کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ اس مرزائی ملت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے جس نے اسلام سے کھلم کھلا خود علیحدگی اختیار کی ہوئی ہے جس نے اسلام کے مسلمہ عقائد کو جھٹلایا ہے، جس نے ستر کروڑ مسلمانوں کو برملا کافر کہا ہے اور جس نے خود عملاً اپنے آپ کو ملتِ اسلامیہ سے کاٹ لیا ہے۔ ان کی عبادت گاہیں مسلمانوں سے الگ ہیں، ان کے اور مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ کے رشتے دونوں طرف سے ناجائز سمجھے جاتے ہیں اور عدالتیں ایسے رشتوں کو غیر قانونی قرار دے چکی ہیں۔ مسلمان مرزائیوں کے اور مرزائی مسلمانوں کے جنازوں میں شرکت جائز نہیں سمجھتے اور ان کے آپس میں ہم مذہبوں کے سے تمام رشتے کٹ چکے ہیں۔ لہٰذا اسمبلی کی طرف سے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا اقدام کوئی اچنبھا یا مصنوعی تقدم نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت کا سرکاری سطح پر اعتراف ہوگا جو پہلے ہی عالم اسلام میں اپنے آپ کو منوا چکی ہے۔ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تجویز کوئی ایسی تجویز نہیں ہے جو کسی شخصی عداوت یا سیاسی لڑائی نے وقتی طور پر کھڑی کر دی ہو، بلکہ یہ قرآن کریم کی بیسیوں آیات کا خاتم الانبیاء کے سینکڑوں ارشادات کا امت کے تمام صحابہ و تابعین اور فقہاء و محدثین کا تاریخ اسلام کی تمام عدالتوں اور حکومتوں کا، مذاہب عالم کی پوری تاریخ کا، دنیا کے موجودہ ستر کروڑ مسلمانوں کا، پاکستان

کے ابتدائی مصدروں کا، خود مرزائی پیشواؤں کے اقراری بیانات کا اور ان کے نوے سالہ طرزِ عمل کا فیصلہ ہے اور اس کا انکار عین دوپہر کے وقت سورج کے وجود کا انکار ہے۔

چونکہ مرزائی جماعتیں اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے امتِ مسلمہ کے مفادات کے خلاف کارروائیوں میں مصروف رہتی ہیں اس لیے ان کے اور مسلمانوں کے درمیان اس وقت منافرت و عداوت کی ایسی فضا قائم ہے جو دوسرے اہلِ مذاہب کے ساتھ نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کا اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے کہ مرزائیوں کو سرکاری سطح پر غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ اس کے بعد دوسری اقلیتوں کی طرح مرزائیوں کے جان و مال کی حفاظت بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہو گی۔ مسلمانوں نے اپنے ملک کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ ہمیشہ انتہائی فیاضی اور رواداری کا سلوک کیا ہے، لہٰذا مرزائیوں کو سرکاری سطح پر غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے بعد ملک میں ان کے جان و مال کا تحفظ زیادہ ہو گا اور منافرت کی وہ آگ جو وقتے وقتے سے بھڑک اٹھتی ہے ملک کی سالمیت کے لیے کبھی خطرہ نہیں بن سکے گی۔ لہٰذا ہم آپ سے اللہ کے نام پر، شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کے نام پر، قرآن و سنت اور امتِ اسلامیہ کے اجماع کے نام پر حق و انصاف اور دیانت و صداقت کے نام پر دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کے نام پر یہ اپیل کرتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے اس مطالبے کو پورا کرنے میں کسی قسم کے دباؤ سے متاثر نہ ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر کریں جن کی شفاعت میدانِ حشر میں ہمارا آخری سہارا ہے۔ اگر ہم نے اپنی اس ذمہ داری کو پورا نہ کیا تو ملتِ اسلامیہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اقتدار و اختیار ڈھل جاتا ہے لیکن غلط فہمیوں کا داغ موت کے بعد تک نہیں مٹتا۔ اللہ تعالیٰ آپکو صحیح فیصلہ کی توفیق دے۔ (محرکین قرار داد)

اس قرارداد کی تقسیم کے بعد قومی اسمبلی نے مرزا ناصر احمد کو بلا کر ان پر ان کے عقائد کے بارے میں گیارہ دن تک ۴۲ گھنٹے جرح کی اور بالآخر مذہبی قانون نے مندرجہ ذیل بل قومی اسمبلی میں پیش کیا۔

اقلیت قرار دینے کا بل

ہرگاہ یہ قرین مصلحت ہے کہ بعد ازیں درج اغراض کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں مزید ترمیم کی جائے۔

لہٰذا بذریعہ ہذا حسب ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے:

۱۔ مختصر عنوان اور آغاز نفاذ (۱) یہ ایکٹ آئینی ترمیم (دوم) ایکٹ ۱۹۷۴ء کہلائے گا۔

(۲) یہ فی الفور نافذ العمل ہوگا۔

۲۔ آئین کی دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں، جسے بعد ازیں آئین کہا جائے گا۔ دفعہ ۱۰۶ کی شق (۳) میں لفظ فرقوں کے بعد الفاظ اور قوسین "اور قادیانی جماعت یا لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں)" درج کیے جائیں گے۔

۳۔ آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں ترمیم: آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں شق (۲) کے بعد حسب ذیل نئی شق درج کی جائے گی یعنی:

"(۳) جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جو آخری نبی ہیں، کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی بھی مفہوم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے، وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لیے مسلمان نہیں ہے۔

بیان اغراض و وجوہ

جیسا کہ تمام ایوان کی خصوصی کمیٹی کی سفارش کے مطابق قومی اسمبلی میں طے پایا ہے، اس بل کا

مقصد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اس طرح ترمیم کرنا ہے تاکہ ہر وہ شخص جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے، اسے غیر مسلم قرار دیا جائے۔

عبدالحفیظ پیرزادہ
وزیر انچارج

... ...

بل کے دوران بحث میں وزیر اعظم اور وزیر قانون سے اپوزیشن کے راہنماؤں نے کئی ملاقاتوں میں مذاکرات کیے اور چار پانچ دفعہ تعطل کے موڑ بھی آئے۔ آخری رات تصادم کا اندیشہ لاحق ہو گیا اور مجلس عمل کے راہنما سربکف ہو کر قید و بند کے لیے تیار ہو گئے، لیکن فضل ایزدی سے اتفاق رائے ہو گیا اور وزیر اعظم نے الفاظ کا حاک ونگ چھوڑ کر مجلس عمل کے پارلیمانی نمائندوں کی تجویز پر صاد کیا، چنانچہ ۷ ستمبر کو ۴ بج کر ۳۵ منٹ پر قادیانیوں کی دونوں شاخوں کو اقلیت قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے قائد ایوان کی حیثیت سے ۱۲ منٹ تک وضاحتی تقریر کی۔ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ وزیر قانون نے اس سلسلہ میں آئینی ترمیم کا تاریخی بل پیش کیا اور جب بل متفقہ رائے سے پاس ہو گیا تو حزب اقتدار و حزب اختلاف کے ارکان آپس میں فرط مسرت سے بغل گیر ہوئے۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتا اٹھے، حتیٰ کہ وزیر اعظم بھٹو اور ولی خاں بھی گرمجوشی سے ملے۔ اس کے بعد سینٹ نے بھی پونے نو بجے اجلاس شروع کر کے آٹھ بجکر ۴ منٹ پر صاد کیا۔ تمام ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ فرط مسرت سے دیوانہ ہو گئے۔ شیرینی تقسیم کی گئی اور جگہ جگہ آتش بازی چھوڑی گئی۔

اس طرح مسیلمہ کذاب کی اسرائیلی روح ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پاکستان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی اور اس کا استعماری وجود اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ برصغیر کی ملت اسلامیہ کی ۹۰ سالہ تحریک ختم نبوت بالآخر طویل جدوجہد کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

(۹)

تحریکِ نظامِ مصطفےٰ

مارچ ۱۹۷۷ء تا جولائی ۱۹۷۷ء

ایک احتجاجی سیاسی تحریک جو حکومت کی انتخابات میں غیر معمولی دھاندلیوں کے خلاف اٹھی تھی، حیرت انگیز طور پر تحریک نظام مصطفےٰ بن گئی۔ اس کے پیچھے ملت کے نفسیاتی محرکات تھے۔

۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو پاکستان قومی اتحاد نے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس لیے کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی سرکاری جماعت نے قومی اسمبلی کے انتخابات میں غیر معمولی اور ناقابلِ معافی دھاندلیاں کر کے اس ادارے کا تقدس نمائندہ وجود اور قومی حیثیت کو مجروح کیا تھا اور اسے اپنی خواہشات کا کھلونا بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بائیکاٹ اس لیے کامیاب رہا کہ اس اظہارِ ناراضگی کے پیچھے مسٹر بھٹو کا چھ سالہ دورِ حکومت تھا جس نے ملتِ مسلمہ کی تمام توقعات کو نہ صرف پاش پاش کر دیا تھا بلکہ ملت اسلامیہ کو جو مغربی سیکولر جمہوری طرزِ حکومت کے تحت اپنی سابقہ مملکت یعنی پورے ہندوستان پر اپنے دوبارہ غلبہ کی طرف سے مایوس ہو گئی تھی اور اس نے اپنے اکثریتی آبادی کے علاقوں میں غلبۂ اسلام کی امید پر سمٹ آنا ضروری سمجھا تھا اس خطہ میں بھی مسٹر بھٹو نے غلبۂ اسلام کی طرف سے اسے مایوس کر دیا تھا۔ جس ملت نے اپنے وجود کی تقریباً ایک تہائی قربانی دے کر یہ خطہ زمین از روئے غلبۂ اسلام کی تکمیل کے لیے حاصل کیا تھا۔ اس آرزو کو مسٹر بھٹو نے سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔ ملت نے محسوس کیا کہ وہ اپنی دیرینہ خواہش نفاذ اسلام تو کجا بروئے کار لائے گی۔

مسٹر بھٹو جیسے حکمران کی موجودگی میں شاید وہ اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے گی کہ اپنی اس باقی ماندہ ملت کو بچا سکے جو ہندو کے زیر نگیں چلی گئی تھی اسے مایوسی ہوئی کہ مسٹر بھٹو کی طرز کے حکمران کے ذریعے وہ اپنے ہندوستانی غلام بھائیوں کو سلامتی، عزت، آبرو، حقوق انسانی اور اسلامی شناخت کا تحفظ بھی فراہم کر سکے گی۔ اگرچہ ملت کا ایک خاص طبقہ مسلم لیگ کے بے ضمیر جاگیرداروں سے مایوس ہو کر مسٹر بھٹو کی جواں سال قیادت سے غیر معمولی توقعات وابستہ کر کے اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ لیکن وہ طبقہ پہلے بھی مسلمانوں کی ملی آرزوؤں کی طرف سے بالعموم بے نیاز رہا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو ملت کے طویل دورِ غلامی میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر شدید درجہ پس جانے کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ اسلام کے نظامِ مساوات اعتدال میں کسی ایسے ارذل اور ملی شعور سے بے بہرہ اور حیواتی سطح پر زندہ رہنے والے کسی طبقے کا پہلے کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یہ ہمارے دورِ غلامی کا پیدا کردہ تھا۔ لیکن اقبال نے جو کہا تھا کہ

ع دل توڑ گئی اس کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی ڈھونڈ اس کی پریشاں نظری کا

بلاشبہ اب ضرورت پیدا ہو گئی تھی کہ اس دل شکستہ طبقے کا عملی علاج بھی تلاش کیا جائے۔ اس سے پہلے ملتِ اسلامیہ میں ایسا کوئی طبقہ کبھی موجود نہیں رہا تھا جسے اپنے دین، ایمان، اسلام، ذات، شناخت، ماضی حال مستقبل کسی چیز کا بھی کوئی ہوش اور شعور باقی نہ رہ گیا ہو اور وہ حیواتی سطح پر صرف روٹی کپڑے اور مکان کا ہی احساس رکھتا ہو۔ ملی احساسات، ذاتی ذمہ داریاں، خدا اور رسول سے شعوری تعلق اور ملت کی اجتماعی ضروریات کا شعور ہمیشہ ملت کے ہر طبقہ میں موجود رہا ہے۔ بلاشبہ امراء کے بگاڑ، علماء سوء کی پیداوار اور معاشی طور پر غیر معمولی پست حالت میں گرفتار لوگوں میں ذاتی ضروریات و خواہشات کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اجتماعی ملی شعور کا مکمل فقدان ملتِ اسلامیہ میں طبقاتی سطح پر کبھی اجتماعی شکل اختیار نہیں کر سکا۔ یہ ہمارے امراء کے جبر و تشدد اور عیش و عشرت نے پیدا کیا۔ جاگیرداروں کے ظلم و تشدد نے پیدا کیا اور علماء سوء کی دنیا پرستی نے پیدا کیا۔

مسٹر بھٹو نے اپنی الیکشن مہم میں ملت کے کسی دکھ درد کو سامنے رکھ کر اس کا پائیدار علاج تو کوئی تجویز نہ کیا۔ البتہ اس مخصوص مصیبت زدہ طبقے کی معاشی مصیبت کو سامنے رکھ کر اس کا مؤثر حل پیش کرنے کی بجائے اس کی مصیبت کے تلخ جذبات اور احساسات کو اپنے حق میں استعمال کرنے اور انہیں بھڑکا کر ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا منصوبہ ضرور بنایا۔ انہوں نے سیاست میں ایسی حرکات کا اضافہ کیا جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے۔ حیرت زدہ کرنے۔ اور مسحور کرنے اور انہیں شعور کی بجائے فریب دے کر اور ہر قسم کی بولی بول کر ورغلانے جانے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی تھیں۔ وہ خود طبقہ امراء اور جاگیرداروں میں سے تھے۔ حکومت کے ذریعے ہی عوام سے متعارف ہوئے تھے۔ وہ آمر ایوب کے آٹھ سال وزیر رہے تھے۔ یہ بات تو عوام کو بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ بھارتی شہریت کے حامل ہوتے ہوئے بھی پاکستان کی کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ ان کی شناخت ملی اور وطنی حلقوں میں مشتبہ تھی۔ البتہ ملک ٹوٹنے کے بعد انہوں نے نئے انتخابات کرائے۔ بغیر مارشل لاء کی مدد سے دسمبر ۱۹۷۱ء سے نئے سول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حکومت کا آغاز کر کے ۵، جولائی ۱۹۷۷ء تک جس نوعیت کی حکومت کا نمونہ پیش کیا۔ اس حکومت نے ملک کے اندر ملت کے صاحب فہم و بصیرت افراد کو ملک و ملت۔ آزادی۔ اسلام۔ ایمان۔ شرافت حتیٰ کہ انسانیت تک کی حفاظت کی طرف سے مکمل مایوس کر دیا۔ ان کی حکومت ایک دردمند پاکستانی مسلمان حکمران جیسی حکومت نہ تھی بلکہ کسی منہ زور ظالم فاتح اور غیر ملکی لٹیرے جیسی حکومت تھی۔ وہ خود بھی کہتے تھے کہ اب مجھے کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ جو مجھے ہٹانے کی کوشش کرے گا تو پہاڑ ہل جائیں گے اور دریا خون سے بھر جائیں گے۔ انہوں نے ایک دیوانے انسان کی طرح بے لگام حکومت کی۔ پوری مدتِ حکومت میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی جلسہ انہوں نے نہ ہونے دیا۔ جس کا اعتراف ان کے پیپلز گارڈ پنجاب کے سالار اعلیٰ طارق وحید بٹ نے اپنی کتاب میری آواز میں بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم جمہوری طریقے سے جلسے الٹ دیا کرتے تھے اور کسی کا جلسہ بھی ہونے نہیں دیتے تھے۔ اپوزیشن پارٹیوں پر مسلسل جبری پابندی اور دفعہ ۱۴۴ کا مسلسل نفاذ بھٹو دور کی جمہوریت کا یادگار نمونہ تھا۔

ان کا دور ظلم وستم کا دور تھا۔ وہ ایک جلد باز، منتقم مزاج، مکمل سیکولرسٹ، مذہبی اور دینی معلومات، ضروریات اور تعلیمات سے مکمل بے خبر، بے حس اور بے تعلق انسان تھے۔ ان میں اور جنرل ڈائر میں صرف نام کا فرق تھا۔ وہ اسلام کی الف۔ب سے بھی ناواقف تھے۔ وہ صرف حکومت کرنے کے دلدادہ تھے۔ اور حکومت میں بھی وہ بدکردار شہزادوں اور ظالم اور خونخوار لیٹرے بادشاہوں کا انداز اپناتے تھے۔ فرعونیت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اسلامی شرافت، مروت، رواداری اور اداب وروایات سے وہ مکمل طور پر نا آشنا تھے۔ وہ ضرورت ہوتی تو اندرا گاندھی کے ٹینک پر بیٹھ کر بھی پاکستان کو فتح کرنے کے لیے آسکتے تھے۔ وہ حکومت کے حصول کے لیے کسی در پر بھی رکنے کے قائل نہ تھے۔ وہ کرسی کی خاطر اخلاق کی سرحد عبور کر سکتے تھے۔ جب کہ اخلاق کے بارے میں ان کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ اسلام، حب الوطنی، نظریہ پاکستان، دوستی، دیانت، صداقت، انسانیت شرافت، وعدہ وفائی یہ ساری باتیں ان کے لیے اجنانی اور بے معنی تھیں۔ ان الفاظ میں وہ اپنی اغراض کا رنگ بھر کر ہی انہیں استعمال کرتے تھے۔ بے وجہ محاذ آرائی، فتنہ وفساد جھگڑالو پن، ضمیروں کی سودے بازی۔ بار بار قومی بحران پیدا کر کے قوم اور معاشرے کی جڑیں ہلانا۔ اخلاقی قدریں پامال کرنا اور ہر معاملے کو سیاسی نظرت کے ساتھ دیکھنا۔ یہ باتیں ان کی بابی اور تفریح کا حصہ تھیں۔ وہ شدید درجہ متکبر، مغرور۔ خودسر، سرکش۔ بے لگام، ہٹ دھرم اور مطلق العنان آدمی تھے۔ ان کا عہد اقتدار لیٹرے اور ڈاکو کا عہد اقتدار تھا۔ انسانی زندگیوں سے کھیلنے والے اور انسانی عزتوں کو آلودہ کرنے والے ستم گر کا عہد تھا۔ ان کا عہد بچہ سقہ کی حکومت کی مانند تھا۔ وہ آندھی کی طرح آئے۔ قہر بن کر برسے آہوں، آنسوؤں اور خون کی برسات میں حکومت کرتے رہے اور تباہی کے کھنڈرات چھوڑ کر اور ملک پھر جس طرح مارشل لاء کے ذریعے قبضہ کیا تھا اسی طرح مارشل لاء کے حوالے کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ جب حکومت سے ہٹے تو لوگ آنکھیں مل مل کر دیکھتے تھے کہ کیا واقعی وہ ستم گر چلا گیا ہے یا وہ کسی نئے فریب کے پردے میں دوبارہ نمودار ہو جائے گا۔ کسی خونخوار جن کا نکل جانا شاید اتنا حیرت انگیز اور مسرت خیز نہ ہو گا

جتنا مسٹر بھٹو کا کرسیٔ اقتدار سے ہٹا دیا جانا حیرت انگیز اور مسرت خیز تھا۔ جب لوگوں کو چوبیس گھنٹے بعد یقین آ گیا کہ مسٹر بھٹو واقعی ہٹا دیے گئے ہیں تو لوگوں نے مٹھائیاں تقسیم کیں۔ دیگیں پکا پکا کر ہفتوں تک غرباء اور مساکین میں بانٹتے رہے۔ شرفاء شکرانے کے نوافل ادا کرتے۔ صدقات دیتے اور خیراتیں تقسیم کرتے رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر بھٹو کا عہد ایک خوفناک خواب کی مانند تھا۔ جس خواب کی ہیبت ناکی سے پوری قوم دوچار تھی۔ ان کے عہد کے مختلف پہلوؤں پر اس عہد کے بہترین صحیفہ نگار اہل قلم نے جو روشنی ڈالی ہے ان کے اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

پاکستان قومی اتحاد اور پاکستان پیپلز پارٹی

پاکستان کے مشہور مورخ اور دانشور ڈاکٹر صفدر محمود نے اپنی کتاب "پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں" میں تحریکِ نفاذ نظامِ مصطفےٰ کے فریقین پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

" حزبِ اختلاف کو کچل دینے، پریس کی زبان بند کرنے اور مخالفوں کو پارٹی سے نکالنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں بھٹو اپنا سیاسی امرانہ نظامِ حکومت قائم کرنے میں مکمل کامیاب ہو چکا تھا اسے معاشرے کے تمام حلقوں سے عوام کی بھرپور تائید کا پورا یقین تھا کیونکہ اس نے قلیل عرصے میں ایسی اصلاحات نافذ کی تھیں جن سے پاکستانی معاشرے میں تبدیلی کا احساس پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنی خارجہ پالیسی اور اندرونی محاذ پر سیاسی کامیابیوں پر نازاں تھا۔ چنانچہ اندرا گاندھی کے عام انتخابات کے اعلان سے سبقت لے جانے کے خیال سے بھٹو نے ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو عام انتخابات کا اعلان کر دیا جب کہ اندرا گاندھی نے عام انتخابات کا اعلان ۱۸ جنوری کو کیا۔ بھٹو کی حکومت کی آئینی مدت ابھی باقی تھی کیونکہ قومی اسمبلی کی

لہ "پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں" مصنف ڈاکٹر صفدر محمود ص ۲۵۴۔

پانچ سالہ میعاد آئین کی منظوری کے بعد ۱۹۷۳ء سے شروع ہوئی تھی لیکن وہ عوام سے ایک اور مینڈیٹ لینا چاہتا تھا تاکہ اپنی نافذ کردہ اصلاحات اور اپنے اقتدار کو مضبوط کر سکے۔ اسے بے پناہ کامیابی کی پوری امید تھی۔ چنانچہ مزدوروں کی اصلاحات کے ۴ جنوری کے اعلان، لگان کو ختم کرنے اور دوسری زرعی اصلاحات کے ۵ جنوری کے اعلان کے بعد اس نے عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ امریکی مصنف لارنس زائرنگ کے بقول "بھٹو کے تمام اقدامات کو حزب اختلاف نے اپنے وجود کے لیے ایک عظیم خطرہ خیال کیا۔ چنانچہ انہوں نے متفقہ طور پر محسوس کیا کہ یہ انتخابات محض انتخابات ہی نہیں بلکہ یہ ان کی یا بھٹو کی تباہ کا مسئلہ ہے۔ اگر بھٹو کامیاب ہو جاتا ہے تو بغیر کسی تردد کے پاکستان پیپلز پارٹی ایک جماعتی سیاست یا بغیر پارٹی ریاست (NON-PARTY STATE) میں تبدیل ہو جائے گی، ان احساسات نے ایک خوف کو جنم دیا جسے پیپلز پارٹی کے چیئرمین کی غیر جمہوری سیاست نے مزید تقویت دی بلکہ اسے حقیقت میں بدل دیا۔ چنانچہ تمام مخالف پارٹیوں کو پاکستان قومی اتحاد کی شکل میں متحد ہونا پڑا کہ یہ ان کی بقاء کی جنگ تھی۔ یہ اتحاد نو جماعتوں یعنی تحریک استقلال مسلم لیگ، جماعت اسلامی، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، آل جموں اینڈ کشمیر کانفرنس اور خاکسار تحریک پر مشتمل تھا۔ پاکستان قومی اتحاد کا وجود میں آنا پیپلز پارٹی کے لیے قطعاً غیر متوقع تھا کیونکہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو یقین تھا کہ ان جماعتوں کے اندر بذات خود اتنے تضادات اور اختلافات ہیں کہ یہ کبھی بھی ایک نقطے پر جمع نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے اس لحاظ سے مختلف تھے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں یہ پارٹیاں متحد نہیں تھیں جب کہ ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کا براہ راست ایک متحدہ محاذ سے مقابلہ تھا۔

باہمی رقابت اور گہرے سیاسی، نظریاتی اور مذہبی اختلافات کی وجہ سے ان پارٹیوں کو متحد کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ بلاشبہ ان سب کے نظریات آپس میں متصادم تھے اور مفادات الگ الگ تھے حتیٰ کہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھتے تھے۔ لیکن بھٹو کے خوف کی وجہ سے یہ سب ایک ہی جھنڈے تلے اکٹھے ہو گئے

جمیت علمائے اسلام کے مفتی محمود اس کے صدر اور جمیعت علمائے پاکستان کے رفیق باجواہ اتحاد کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔

انتخابی مہم کا آغاز فروری میں ہوا، پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور ۱۹۷۷ء میں جاری ہوا۔ جس میں وعدہ کیا گیا کہ قرآن اور سیرت کی تعلیم لازمی قرار دی جائے گی۔ اور اس بات کا اہتمام کیا جائے گا کہ دوسرے ممالک میں اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ منشور کا آغاز ان اسلامی سفارشات سے کیا گیا تاکہ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے غبارے سے ہوا خارج کی جاسکے۔ یوں بھی اسلام پر زور دینے کا اصل مقصد یہ تھا کہ عوام کو متوجہ کیا جائے اور پارٹی کا سوشلسٹ امیج اور غیر اسلامی تاثر ختم کیا جائے۔

پیپلز پارٹی کے منشور میں محنت کشوں کی اجرتیں بڑھانے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا لیکن اس اضافے کا انحصار پیداوار اور صنعتی شعبے کی کارکردگی پر تھا۔ صنعتی کارکنوں کو ہر سال بیس ہزار بغیر قیمت رہائشی پلاٹ دینے کا اعلان کیا گیا اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنائی گئی کہ آئندہ پانچ برس کے اندر اندر پاکستان خوراک اور تیل میں خود کفیل ہو جائے گا۔ بے گھر لوگوں کو دیہاتی علاقوں میں دس لاکھ اور شہری آبادیوں میں ساڑھے سات لاکھ پلاٹ دیے جانے تھے۔

معاشی پالیسی اسلام کے فریم ورک میں سوشلزم کی بنیاد پر بنائی گئی تھی۔ اس کا مقصد معاشرتی ناہمواریوں کو ختم کرنا اور پرائیویٹ سیکٹر کو اہمیت دینا تھا۔ سیم تھور کے علاج کیلئے بھی اقدامات کیے جانے تھے۔

منشور میں یہ امید بھی دلائی گئی تھی کہ ذرائع نقل و حمل کو بہتر بنایا جائے گا اور کشمیری عوام کو ان کے حقوق دلانے کی بھرپور کوشش کی جائیگی۔ دفاع کو مضبوط بنایا جائے گا اور اس ضمن میں اسلحہ ساز فیکٹریوں میں وسعت پیدا کی جائے گی، انہیں ماڈرن بنایا جائے گا تاکہ پاکستان کا اسلحے کے لیے غیر ممالک پر انحصار کم ہو۔

خارجہ حکمت عملی میں تیسری دنیا کے ممالک اور مسلمان ممالک سے قریبی تعلقات قائم کرنا بھی پیپلز پارٹی کا مقصد گردانا گیا۔ پاکستان کو مزید خوشحال بنانے کے کام کو آگے بڑھانے کے

دعوے کی بنا و پر بھٹو نے عوام سے تائید طلب کی تاکہ مستقبل کے خطرات کا سامنا کیا جا سکے۔ مختصر یہ کہ منشور بڑے غور و فکر کے بعد احتیاط سے مرتب کیا گیا تھا۔ معاشرے کے ہر طبقے کے لیے اس میں روشن مستقبل کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور سہانے خواب دکھائے گئے تھے۔

آغاز میں پاکستان قومی اتحاد نے کوئی منشور شائع نہ کیا اور کہا کہ قرآن ہمارا منشور ہے جوں جوں انتخابی مہم تیز ہوتی گئی۔ پیپلز پارٹی نے پاکستان قومی اتحاد پر طرح کے تیرو نشتر چلانے شروع کر دیے۔ چنانچہ اتحاد نے اپنا منشور ۸، فروری ۱۹۷۷ء کو شائع کیا۔ جس پر بھٹو نے تنقید کی اور کہا " اس میں نہ کوئی فلسفہ ہے نہ کوئی نظریہ اور نہ کوئی علت غائی ہے "

پاکستان قومی اتحاد کا منشور کئی ذیلی عنوانات پر مشتمل تھا جیسے اقتصادی نظام عمومی اقتصادی اصلاحات، صحت عامہ، زراعت، کم آمدنی والے طبقے کے حقوق، ملکی قوانین، پریس، ریڈیو اور ٹیلی وژن، تعلیم عامہ، انتظامیہ، آئین، دفاع اور امور خارجہ اس کا آغاز پیپلز پارٹی کے عوام سے کیے گئے غیر حقیقی وعدوں کے پول کھولنے سے ہوا۔ جنہیں عوامی حکومت عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہی تھی لیکن ساتھ ہی یہ نوید بھی سنائی گئی کہ قومی اتحاد عوام کے ان کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرے گا۔ منشور میں یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اتحاد غیر قانونی پابندیوں کو ختم کر کے، اقتصادی بدحالی اور معاشرتی ناہمواریوں کو دور کر کے لوگوں کو معاشرے میں ان کا باعزت مقام دلائے گا۔ قرآن و سنت کا نفاذ، انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا، استحصال کا خاتمہ اور قیمتوں کو کم کر کے ہر شخص کے لیے قابل قبول سطح پر لانا، روٹی، کپڑا اور مکان، ہر شخص کے لیے علاج اور تعلیم کا انتظام کرنا، عورتوں کو ان کے حقوق دلانا، مسلمان ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا تاکہ ایک اسلامی اتحاد عمل میں آ سکے، کشمیر کے مسلمانوں کو حق خود ارادیت دلانا اور آزاد کشمیر، گلگت اور بلتستان کے حالات کو بہتر بنانا قبائلی علاقوں میں اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق اور پاکستان میں صحیح جمہوریت کا قیام بھی قومی اتحاد کے پروگرام میں شامل تھا۔

پاکستان قومی اتحاد کے منشور میں عوام کے بنیادی حقوق کو تحفظ دے کر اور آئین میں

ایسی تمام ترامیم جنہوں نے ان بنیادی حقوق کو متاثر کیا ہے منسوخ کر کے ایک آزاد معاشرہ قائم کرنے پر اصرار کیا گیا تھا۔ وزیراعظم اور وزرائے اعلیٰ کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنا بھی اتحاد کا ایک مقصد قرار پایا۔ منشور میں ہنگامی حالات کے خاتمے، ڈی۔ پی۔ آر کی منسوخی، شراب نوشی، زناکاری، گھڑدوڑ، فحاشی وغیرہ کو بھی ختم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ سود خوری کا خاتمہ نیشنل پریس ٹرسٹ کی چھٹی، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آزادی کی بھی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ سرکاری ملازمین کو آئینی تحفظ فراہم کرنے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا اور رشوت ستانی، بدعنوانی اور سست رفتار سرکاری ضابطے کو ختم کرنے کے بعد ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔

منشور نے ایک واضح صنعتی حکمت عملی کا اعلان کیا جس میں محنت کش اور صنعت کار دونوں کا تحفظ کیا گیا تھا۔ زرعی اور صنعتی حکمت عملی کے تحت خوراک میں خود کفالت کارکنوں کی صنعتی انتظامیہ میں اور منافع میں شمولیت، نیا نظام ٹیکس، قابل زراعت زمینوں کی کاشتکاروں میں تقسیم، گھریلو صنعتوں کی ترقی، فوج کی تجدید اور لازمی فوجی تربیت وغیرہ شامل تھے اس طرح کوشش کی گئی تھی کہ منشور میں معاشرے کے ہر طبقے کے مسائل کا حل موجود ہو۔

پیپلز پارٹی کے منشور کے مقابلے میں پاکستان قومی اتحاد کا منشور مبہم تھا اس میں مصلحت کوشی صاف نظر آرہی تھی جو مختلف متضاد نظریات کی حامل جماعتوں کو اکٹھا کرنے سے در آئی تھی۔ علاوہ ازیں یہ منشور بہت جلدی میں تیار کیا گیا تھا جس کا اندازہ اسے پڑھنے سے بھی ہوتا تھا۔ اگرچہ دونوں منشوروں میں بڑے بلند بانگ وعدے اور اقتصادی حکمتِ عملی کے خاکے موجود تھے اور اپنے اپنے پروگرام نہایت مہذب انداز میں پیش کیے گئے تھے لیکن جب صحیح معنوں میں انتخابی مہم شروع ہوئی تو تہذیب جلسے جلوسوں کی گرد میں گم ہو کر رہ گئی اور بہت جلد معاملہ ذاتیات کی سطح پر اتر آیا۔ چنانچہ عوامی پلیٹ فارم سے ایک دوسرے پر ذاتی حملے ہونے لگے۔ انتخابی مہم کی زبان، تیور اور لب ولہجے کا اندازہ اس مثال سے ہو گا۔

بھٹو نے کہا کہ "ایک وقت تو اصغر خان کے پاس پی۔ آئی۔ اے سے ہوائی سفر کرنے

کے لیے کلاہ بھی نہیں تھا اب وہ سرمایہ داروں کی خیرات پر زندہ ہے، اس کے جواب میں اصغر خاں نے کہا "کہ بھٹو لاڑکانے کا چوہا ہے"۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

پاکستان قومی اتحاد کی سٹریٹجی یہ تھی کہ بھٹو کے جمہوریت کش کارنامے، جبر و تشدد پیپلز پارٹی کا غیر اسلامی کردار و انداز جس میں مال اور اخلاقی بدعنوانی اور رشوت کی فراوانی شامل تھیں پر بھرپور تنقید کر کے پارٹی کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا جائے لیکن شدید ترین حملہ بھٹو کے اس سیاسی کردار پر کیا جائے جس کے سبب ۱۹۷۱ء میں پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ پاکستان قومی اتحاد نے اقتدار میں آنے کے بعد حمود الرحمٰن کمشن رپورٹ شائع کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ گورنمنٹ کی نمایاں ناکامیوں، جیسے قیمتوں کا بڑھنا، قومی دولت کا ضیاع اقتصادی حکمت عملیوں کی ناکامیوں، اپنی حکومت پر بے جا اصراف، اختیارات کا غلط استعمال حزب اختلاف کو دبانے کے لیے فیڈرل سیکورٹی فورس کا قیام و استعمال، ان تمام پہلوؤں کو بھی بھٹو کے خلاف تقریروں میں استعمال کیا گیا اور پاکستان قومی اتحاد کا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ بھٹو کو شروع دن سے ہی مدافعانہ پالیسی اختیار کرنا پڑی اور اسے جوابی حملے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔

بھٹو پر ان ذاتی حملوں کی مہم کی وجہ سے اس کا قلبی و ذہنی اطمینان رخصت ہو گیا اور اسے احساس ہونے لگا کہ انتخابات میں کامیابی جسے وہ آسان کام سمجھتا تھا در اصل ایک خطرناک مہم اور ناقابل اعتبار بات تھی۔ وہ اپنے فن خطابت کو بروئے کار لایا اور یہ الزام لگایا کہ پاکستان قومی اتحاد پاکستان کا دشمن ہے اور ان پارٹیوں نے قائداعظم اور پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ بھٹو نے اپنی انتخابی مہم کے دوران بلوچستان میں مصائب کی ذمہ داری مخالف پارٹیوں پر ڈالی اور کہا کہ ان میں کئی اب بھی پاکستان کی وحدت کو تباہ کرنے کے درپے ہیں اس نے قومی اتحاد میں شامل پارٹیوں کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی ان کو اپنی شمشیر سے ختم کر دے گی۔

دونوں طرف سے نفاذ اسلام پر بہت زور دیا گیا۔ پاکستان قومی اتحاد نے نظام مصطفےٰ کا نعرہ بلند کیا اور پیپلز پارٹی کے سماجی و اقتصادی پروگرام کے غبارے سے ہوا نکالنے

کی سعی کی۔ اس کے مقابلے میں پیپلز پارٹی اپنی نمایاں اسلامی خدمات کا اعلان کرتی تھی تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ پیپلز پارٹی نفاذ اسلام کے ضمن میں قومی اتحاد سے زیادہ مخلص ہے۔ پیپلز پارٹی نے سوشلزم کا براہ راست تذکرہ چھوڑ دیا اور مساوات محمدی کا نعرہ لگایا تاہم انتخابی مہم کی تقریروں کا نمایاں پہلو ذاتی حملے اور تنقید تھے۔ جن کا مقصد حاضرین کو محظوظ کرنا تھا ایک تجزیے کے مطابق پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی ۴۴ فیصد تقریریں حزب اختلاف کے رہنماؤں پر شدید تنقید پر مشتمل تھیں۔ جن میں ان کی ماضی کی وابستگیاں اور ان کی تخریبی کارروائیاں اور ان کے مستقبل کے خطرناک منصوبے وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ اس کے برعکس قومی اتحاد کے راہنماؤں کی ۷۵ فیصد انتخابی مہم کی تقریریں بھٹو پر تنقید پر مشتمل ہوتی تھیں۔

جیسے ہی انتخابی مہم اپنے آخری مراحل میں داخل ہوئی دونوں پارٹیوں نے اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بڑے بڑے جلسے کرنے اور جلوس نکالنے شروع کر دیئے بالآخر قومی اسمبلی کے انتخابات ۷ مارچ اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۰ مارچ کو منعقد ہوئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے ۲۰۰ میں سے ۱۵۵ نشستیں حاصل کیں جس میں سے ۱۹ وہ نشستیں بھی شامل تھیں جہاں پیپلز پارٹی کے امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوئے پاکستان قومی اتحاد کو صرف ۳۶ نشستیں حاصل ہو سکیں۔ ان نتائج نے ملک بھر میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑا دی اور پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف احتجاج کی ایک مہم شروع ہو گئی۔ اگرچہ پیپلز پارٹی کی کامیابی غیر متوقع نہیں تھی لیکن پھر بھی سیاسی افق سے حزب اختلاف کا یوں نیست و نابود ہو جانا ہر شخص کے لیے حیران کن تھا۔ پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات میں پیپلز پارٹی پر بے پناہ انتخابی دھاندلیوں کا الزام لگانے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی۔ اصغر خان نے آٹھ مارچ کو ایک پریس کانفرنس کی جس میں اس نے انتخابات کو عوام کے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکہ قرار دیا اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قطع تعلق (بائیکاٹ) کرنے کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

بھٹو نے انتخابات میں دھاندلیوں کے الزام کو رد کر دیا لیکن جو ثبوت اور شہادتیں

پاکستان قومی اتحاد نے اٹھائیں وہ ناقابل تردید تھیں۔ یہاں تک کہ چیف الیکشن کمشنر نے بھی برملا اس بات کا اعتراف کر کے لوگوں کے شکوک کو یقین میں بدل دیا کہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی بدعنوانیاں کی گئی ہیں۔ حقیقت میں لوگ اس وقت انتخابات کے نتائج کے بارے میں شک میں مبتلا ہو گئے تھے جب ٹی وی پر شہروں کی بجائے دور دراز کے علاقوں سے انتخابات کے نتائج موصول ہونے شروع ہو گئے تھے اور قریبی شہری حلقوں کے نتائج کا اعلان نہیں کیا جا رہا تھا۔ بلاشبہ انتخابات میں دھاندلیاں ہوئیں لیکن قومی اتحاد نے بھی انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ تحریک اتنی شدید تھی کہ پاکستان کی حالیہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مارچ سے لے کر جولائی تک پوری قوم ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھی۔ جس کا اظہار روزانہ کے مظاہروں، احتجاجی جلوسوں اور ہڑتال جلوسوں میں ہوتا تھا اپریل کے مہینے میں تحریک میں تیزی آ گئی۔ نقطۂ عروج ۹ اپریل کو آیا جب پولیس نے لاہور میں ان مظاہرین پر گولی چلا دی جو اسمبلی ہال کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں نئی منتخب شدہ اسمبلی کا اجلاس ہوتا تھا۔ ان مظاہرین میں کچھ شہری ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ جذبات میں آئے ہوئے ہجوم نے بینکوں اور سرکاری عمارتوں کو جلا دیا۔ ہر شہر میں روزانہ مظاہرے اور جلوس روز مرہ کا معمول بن گئے جس سے ملک کی اقتصادی صورت حال بہت متاثر ہوئی۔ اس اثناء میں قومی اسمبلی کے اراکین نے اپنے استعفیٰ داخل کرنا شروع کر دیئے جن میں پیپلز پارٹی کے اراکین بھی شامل تھے اس کے بعد پیپلز پارٹی کے کئی اور حامی حضرات نے تائب ہونا شروع کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ سیاسی اور انتظامی صورتحال اس قدر بگڑ گئی کہ قابو سے باہر ہو گئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ نظم و نسق کی صورتحال بگڑتی چلی گئی حتیٰ کہ پانچ شہروں میں نظم و نسق بحال کرنے کیلئے فوج کو بلانا پڑا۔

بالآخر حکومت اور قومی اتحاد میں مذاکرات کا انتظام ہوا۔ حکومت کی طرف سے بھٹو عبدالحفیظ پیرزادہ، مولانا کوثر نیازی اور اتحاد کی طرف سے مولانا مفتی محمود کی سربراہی میں نوابزادہ نصراللہ خاں اور پروفیسر غفور ان مذاکرات میں شامل ہوئے یہ مذاکرات جون میں شروع

ہوئے جن سے قوم کو وقتی طور پر کچھ اطمینان ہوا۔

جو اطلاعات میسر آئی ہیں ان کے مطابق ایک سمجھوتہ طے پایا تھا جس کے مطابق فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں انتخابات دوبارہ کرانے کا فیصلہ ہوا۔ اس معاہدے کے نفاذ کے لیے ایک مشترک کونسل جس میں دونوں طرف سے پانچ پانچ ممبران شامل تھے، کی تشکیل ہوئی تھی تاکہ معاہدہ نافذ کیا جا سکے۔ معاہدے پر دستخط کرنے سے پیشتر بھٹو غیر ملکی دورے پر روانہ ہو گیا۔ بھٹو پہلے ہی اپنا اعتماد کھو چکا تھا۔ یوں اچانک ملک سے باہر جانے سے اس کے خلاف اور اس کی نیت کے بارے میں شکوک و شبہات مزید تقویت پکڑ گئے۔ دوسری طرف پاکستان قومی اتحاد اس بات پر بضد تھا کہ مجوزہ کونسل اعلیٰ ترین ادارہ ہو گی لیکن بھٹو کوئی فوق الحکومت ادارہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بالآخر ۲۔ جولائی کو ایک معاہدے کا اعلان ہوا لیکن پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی کونسل نے اسے مسترد کر دیا اور اس طرح ایک سیاسی تعطل پیدا ہو گیا۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے ایسے امکان کے لیے فیئر پلے کے نام سے ایک ہنگامی منصوبہ تیار کیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے پانچ جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ نوے دنوں میں انتخابات کا وعدہ کیا گیا۔ اگرچہ بظاہر یہ تحریک انتخابات میں دھاندلی کے خلاف تھی لیکن اگر پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ دور حکومت کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہو گا کہ دراصل یہ تحریک احتجاج تھی حکومت کی مجموعی پالیسیوں اور انداز حکومت کے خلاف جس میں کوئی طبقہ بھی خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتا تھا۔

پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ دور میں حکومت کی پالیسیوں کا اجتماعی نتیجہ تحفظ کا فقدان نکلا تھا۔ دوسری طرف کارکنوں، کسانوں اور مزدوروں کی توقعات پوری نہ کی گئیں۔ اس پس منظر میں جب تحریک چلی تو اسے معاشرے کے تقریباً سبھی طبقوں کی ہمدردی حاصل تھی جس میں صنعتی کارکن بھی پیش پیش تھے۔ صنعت کار اور درمیانے درجے کے بزنس مین نیشنلائزیشن سے ناخوش تھے۔ شرفاء غنڈہ گردی اور مار دھاڑ کی وجہ سے حکومت کو ناپسند کرتے تھے اخبارات اور سیاسی کارکنوں سے آزادیٔ اظہار چھین گئی تھی۔ چنانچہ وہ بھی حکومت کے

خلاف ہو گئے تھے۔ اس صورتِ حال سے جنرل ضیاء الحق نے فائدہ اٹھایا اور سیاسی تعطل کے رفع ہونے کا انتظار کیے بغیر پاکستان کی تاریخ کا طویل ترین مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس طرح ملک ایک بار پھر جمہوریت کی پٹڑی سے اتر گیا پر امن انتقالِ اقتدار کی آرزو محض خواب بن کر رہ گئی۔

پاکستان کی تاریخ وسیاست کے طالب علموں نے اپنی تاریخ کے اس دور سے یہ نتائج اخذ کیے کہ انشاء اللہ پاکستان میں آئندہ کبھی کوئی حکومت انتخابات میں دھاندلی نہیں کرے گی، چادر چار دیواری کا تقدس برقرار رہے گا کہ اس تصور کے مجروح ہونے کے خطرناک نتائج نکلتے ہیں۔ بار بار کے مارشل لاؤں کے سبب فوج ہماری سیاست میں ہمیشہ اہم فیکٹر رہے گی نفاذِ اسلام لوگوں کا آئیڈیل ہے اور سیاسی پارٹیاں غیر حقیقت پسندانہ نعروں سے اجتناب کریں گی۔

... ...

اب ہم جناب محمد صلاح الدین مدیر ہفت روزہ تکبیر کراچی کا تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ وہ پیپلز پارٹی، مقاصد اور حکمت عملی میں تحریر فرماتے ہیں۔

مسٹر بھٹو سیاست میں آمد کا راستہ

پیپلز پارٹی[1] کے خالق ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں اتنی بات ضرور ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے ذریعہ یا جمہوری ذرائع سے ہماری قومی سیاست میں داخل نہیں ہوئے بلکہ ایک بین الاقوامی سازش کے تحت خاموشی سے پر اسرار طور پر ایوانِ صدر پہنچائے گئے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ بھارتی پاسپورٹ پر امریکہ سے پاکستان آئے۔

اسکندر مرزا کے سمدھی امریکی سفیر مسٹر ہلڈرتھ (HILDRETH) کے ذریعہ ایوانِ صدر

---

[1] اقتباس از "پیپلز پارٹی مقاصد اور حکمت عملی" از صلاح الدین مدیر تکبیر کراچی ص ۔ ۷ ۔ ۸ ۔ ۹۔

میں داخل ہوئے لیکن اسکندر مرزا نے انہیں قبول کرنے میں قدرے مزاحمت کی۔ ناہید اسکندر مرزا اور نصرت دونوں ایرانی نژاد اور آپس میں رشتہ دار ہیں۔ اس رشتے کو کام میں لاتے ہوئے اور شاہِ ایران کا اثر رسوخ استعمال کر کے وہ اسکندر مرزا کی کابینہ میں شمولیت کا راستہ ہموار کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں سکندر مرزا ایوب خان کے مارشل لاء سے رخصت ہوئے تو سابقہ کابینہ کا واحد وزیر جو نئی کابینہ کو بطور ورثہ منتقل ہوا، ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ انہیں امریکہ اور ایران ہی کے دباؤ پر نئی کابینہ میں جگہ دی گئی۔ یہاں جنرل یحییٰ خاں سے ان کا پہلا رابطہ قائم ہوا جو مارشل لاء کو عملاً نافذ کرنے کے لیے جی ایچ کیو راولپنڈی سے دارالحکومت کراچی بھیجے گئے تھے۔ ایوب کابینہ میں رہتے ہوئے بھی ۱۹۶۲ء تک ان کی بھارتی شہریت برقرار رہی اور ان کے وکلاء بمبئی ہائی کورٹ میں ان کی ان جائیدادوں کی بحالی کا مقدمہ لڑتے رہے جو اب اندرا گاندھی نے ان کے وارثوں مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کے حق میں واگزار کر دی ہیں۔ وزیر توانائی و قدرتی وسائل کی حیثیت سے انہوں نے پہلا کارنامہ یہ انجام دیا کہ روس کو بلوچستان میں معدنیات اور دیگر قدرتی وسائل کے سروے کے نام پر ملک کے اس حصہ کا چپہ چپہ دیکھ لینے اور مکمل نقشہ مرتب کر لینے کا موقع عنایت فرمایا اور سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی رپورٹ حکومتِ پاکستان کو آج تک موصول نہ ہوئی۔ بعد ازاں معاہدۂ طاس سندھ کے ذریعے پاکستان کے آبی وسائل پر بھارت کی گرفت مضبوط کی اور پھر ۱۹۶۵ء کے بعد سے دمِ آخر تک جو کردار وہ ادا کرتے رہے۔ اس میں صرف اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو وہ اپنی نشری تقریر کے فوراً بعد سب سے پہلے ملٹری انٹیلی جنس کے اس سیل میں پہنچے جہاں ان کے بین الاقوامی رابطوں، ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ان کی پارٹی کی کامیابی میں قادیانیوں اور اسرائیل کے کردار، فنڈ فراہم کرنے والے اداروں اور ملکوں کی کارفرمائی اور دوسری بہت سی تفصیلات پر مکمل تحقیق رپورٹیں موجود تھیں۔ جن میں تھریٹس پیپر (THREATS PAPER) نامی دستاویز بھی شامل تھی۔ بھٹو صاحب نے جنرل اکبر کی موجودگی میں یہ تمام دستاویزات نذرِ آتش کرائیں، اس کے بعد وہ دوسرے کاموں پر متوجہ ہوئے۔

پارٹی کا نام

اس پارٹی کی تشکیل اور اس کی قیادت کی تیاری میں بدنام زمانہ فری میسن لاج نے جو کردار ادا کیا تھا وہ اب ایک تاریخی حقیقت کے طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے۔ پیپلز پارٹی عالم اسلام میں مختلف ناموں سے سامنے آئی ہے مگر ہر جگہ اس کے نام کا ایک جزو "پیپلز" اپنے ہم معنی الفاظ کی صورت میں شامل رہا ہے اور ہر جگہ ہم معنی لفظ کی شمولیت نے پارٹی کو یکساں کردار بھی دیا ہے۔ اس لفظ کے اصل معنی ہیں "عوامی" اب بنگلہ دیش کی عوامی لیگ، افغانستان کی خلق (عوام) پارٹی، ایران کی تودہ (عوام) پارٹی، مجاہدین خلق پارٹی، عراق اور شام کی بعث (عوام، گروہ) پارٹی کے مزاج و کردار اور کارناموں کا تقابلی جائزہ لیجئے۔ آپ کو یہ اشتراکیت زدگی، علاقائی قوم پرستی، مذہب بیزاری اور آمریت پسندی میں سگی بہنوں کی طرح نظر آئیں گی۔ یہ اسی فکر و فلسفہ سے غذا پاتی ہیں جو پیپلز گارڈز، پیپلز آرمی، پیپلز لبریشن آرمی، پیپلز ہال، پیپلز اسٹور، پیپلز ری پبلک اور پیپلز سوسائٹی وغیرہ کی اصطلاحات کثرت سے استعمال کرکے اور عوام، عوام کی رٹ لگا کر عوام کا گلا دباتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے جہاں جہاں اپنے ملی تشخص کے حوالے سے آزادی کی تحریکیں چلائی ہیں یا سیاسی تنظیمیں قائم کی ہیں وہاں اسلام اور مسلم وغیرہ کے الفاظ جزو لاینفک کے طور پر ان جماعتوں کے نام میں شامل رہے ہیں۔[1]

بھٹو جمہوریت کا منظر

۱۹۷۳ء کے جس دستور کے حوالے سے بحالی جمہوریت کی دہائی دی گئی اس کے تحت تو پاکستان کے عوام نے بدترین آمریت کا ایسا مزہ چکھا ہے جس کی لذت بھلائے نہیں بھولتی۔

---

[1] اقتباس از "پیپلز پارٹی مقاصد اور حکمت عملی" ص ۲۲، ۲۳۔ از محمد صلاح الدین مدیر تکبیر کراچی۔

یہ "جمہوریت" کی ایسی خوفناک اور بھیانک شکل تھی کہ اس کا مشاہدہ کرنے والی بد قسمت قوم اب مارشل لاء اور فوجی حکومت کے تسلط کو اس سے بہتر سمجھنے لگی ہے۔ بیشک رشوت چوریوں، ڈکیتیوں، پولیس کے مظالم اور دوسرے مظالم میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے لیکن قوم خود کو تذلیل و تحقیر کی اس اذیت سے محفوظ سمجھتی ہے جو اس کی عزتِ نفس اور غیرت و حمیت کے احساسات کو مسلسل کچوکے دیا کرتی تھی۔ آج کسی خاتون کی شلوار میں چوہے نہیں چھوڑے جاتے۔ کسی بیوہ کی یتیم بچیاں گورنر ہاؤس میں بیٹھے ہوئے "منتخب عوامی اور جمہوری" رہنماؤں کی آغوش سے برآمد نہیں ہوتیں کسی عالم دین کے ساتھ فاحشہ عورتوں کو لٹا کر ان کی تصویریں نہیں کھینچی جاتیں۔ نوجوانوں کی سرِ راہ پتلونیں نہیں اتاری جاتیں۔ انہیں برف کی سلوں پر لٹایا اور انڈے، ڈنڈے یا گنڈے چڑھانے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ مسلم مسجد کے علماء اور طلباء کو برہنہ حالت میں گلی کوچوں میں نظریں جھکائے اور آگے پیچھے ہتھیلیاں جمائے دیکھ کر کوئی خون کے آنسو نہیں روتا، کوئی خواجہ رفیق بیچ چوراہے پر گولیوں کا نشانہ نہیں بنتا، کسی ڈاکٹر نذیر کا خون اس کے اپنے کلینک میں نہیں بہتا کوئی مولوی شمس الدین اغواء کر کے قتل نہیں کیا جاتا، کسی عبدالصمد اچکزئی کے پرخچے بم سے نہیں اڑائے جاتے کسی شوہر کے سامنے اس کی بیوی کو، کسی بیٹے کے سامنے اس کی ماں اور بہن کو اور کسی باپ کے سامنے اس کے بیٹے کو بے آبرو نہیں کیا جاتا، کسی کے منہ میں پانی کی جگہ پیشاب نہیں انڈیلا جاتا، کہیں حروں کو پولیس مقابلے میں جان نہیں دینی پڑتی، کہیں کوئی دلائی کیمپ موجود نہیں، کہیں ایف ایس ایف کی گولیاں اور لاٹھیاں نہیں، کہیں ٹاسک فورس کے ڈنڈے نہیں اور کہیں سیاستدانوں کو اٹھوا کر سڑکوں پر نہیں پھکوایا جا رہا........"

پیپلز پارٹی کے بارے میں ہم کسی تعصب کی بناء پر نہیں خالص اخلاقی اور قانونی بنیادوں پر اور جمہوریت کے وسیع تر مفاد میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسے نہ جمہوری عمل میں شرکت کا حق ہے اور نہ جمہوری سیاسی جماعت کہلانے کا استحقاق۔ اس نے اپنی تاسیس کے اول روز سے آج تک جمہوریت کو پارٹی کی صفوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی اس کی قیادت خود ساختہ ایک خاندان کی میراث، اس کی تنظیم میں گاؤں کی سطح سے لیکر ملک

کی سطح تک ہر عہدیدار نامزد، اس کے کارکنوں کی غالب اکثریت غنڈوں، بدمعاشوں اور بدکرداروں پر مشتمل، اس کا نامۂ اعمال بدترین آمریت فسطائیت، ظلم وستم، جمہوریت کشی اور وطن کی شکستگی کے کارناموں سے پر۔ اس کی گردن پر مغربی پاکستان میں سینکڑوں بے گناہوں اور مشرقی پاکستان میں لاکھوں ہم وطنوں کا خون اس کی سرشت تخریب کاری اسکی سرپرست بھارت اور روس کی وطن دشمن قوتیں، اس کے کارکنوں کے ہاتھوں میں روس کی تھمائی ہوئی بندوقیں اور مشین گنیں اس کی جیبوں میں ان کا بھرا ہوا سرمایہ، اس کے جلو میں تخریب کاری کی تربیت پائے ہوئے دستے اور اس کے سینے میں انتقام کی دہکتی ہوئی آگ، کیا اس مزاج و کردار کی پارٹی اس ملک میں "بحالئ جمہوریت" کا کوئی کارنامہ سرانجام دے سکتی ہے ۔۔۔۔"

محمد صلاح الدین مدیر تکبیر کی اور بھی بے شمار نگارشات اس عہد کے بارے میں ہیں لیکن ہم عوف طوالت سے انہیں حذف کرتے ہوئے خود مسٹر بھٹو کے اپنے کارکن طارق وحید بٹ کا وہ اعتراف پیش کرتے ہیں جو انہوں نے تحریک نظام مصطفےٰ کے عوامی جوش و جذبہ کے بارے میں لکھا ہے:

مخالف تحریک کا انحراف

مسٹر طارق وحید بٹ تحریک نظام مصطفےٰ کے عوامی کردار کا انحراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"۔۔۔۔ پاکستان قومی اتحاد کی تحریک ملک کے ہر بڑے چھوٹے شہروں میں شروع ہو چکی تھی، قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ پیپلز پارٹی کے کچھ کارکنوں نے میاں احسان الحق کی قیادت میں انارکلی بازار میں جلوس نکالا جس میں غالباً تصادم ہو گیا اور وہ فیل ہو گیا کیونکہ ملک کے تقریباً تمام تاجر قومی اتحاد کے ساتھ تھے اور تجارتی منڈیاں قومی اتحاد کی ایک ہی آواز پر فوری بند ہو جاتی تھیں۔ میں نے اپنے اثر و رسوخ اور تعلقات کی بنا پر وفاقی حکومت کے کہنے

لے اقتباس از "میری آواز" مصنف طارق وحید بٹ ص ۱۰۰-۱۰۱، لاہور پنجاب

پر قائد عوام کے احکامات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کئی بار تاجروں کی ہڑتال ختم کرائی جو بے سود ثابت ہوئی۔ انہی دنوں بھٹو کے کسی مشیر نے انہیں مشورہ دیا کہ تاجروں کو تنگ کیا جائے محمد انور شوکت نامی ریجنل کمشنر انکم ٹیکس کو قائد عوام کا آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی بنوا دیا اور ملک کے مختلف بڑے چھوٹے تاجروں کی جھوٹی فائلیں کھلوا کر ان پر بھاری انکم ٹیکس نافذ کرا دیا تاکہ شاید تاجر حضرات ان فائلوں سے ڈر کے قومی اتحاد کا ساتھ چھوڑ دیں اور ہڑتال نہ کریں مگر ان کا یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ لاہور میں پیپلز پارٹی کی ہر کارروائی، جلسے اور جلوس کی قیادت مجھے ہی کرنا ہوتی تھی کیونکہ اس دوران تمام چوری کھانے والے مجنوں رفو چکر ہو چکے تھے۔

لہٰذا قائد عوام نے اپنے دور میں جو مارشل لاء لگائی اسے "چھوٹی مارشل لاء" کا نام دیا گیا تو مجھے انجینئرنگ یونیورسٹی باغبانپورہ میں کرنل منیر نے بلا کر بٹھا دیا۔ میں صبح کا گیا ہوا تھا اور رات کو انہوں نے مجھے گھر جانے کی اجازت دی کیونکہ انہیں سب کچھ علم تھا اور وہ مجھ سے پوچھتے رہتے کہ وزیر اعظم نے ٹیلی فون پر دو تین مرتبہ مجھ سے کیا باتیں کی ہیں میں نے کہا: "آپ بخوبی جانتے ہیں آپ ٹیلی فون ٹیپ کرتے ہیں آپ کے علم میں ہے کہ میں نے کیا منصوبہ بنایا ہے یہ تو قائد عوام کی شفقت تھی کہ انہوں نے مجھے سمجھایا آپ گھر بار چھوڑ کر میرے پاس راولپنڈی آجائیں" اس طرح جب قومی اتحاد کے جلوس نیلا گنبد یا مسجد شہداء سے نکلتے تو وہ ایک ہی نعرہ لگاتے کہ سر چاہیئے سر، طارق وحید بٹ کا سر چاہیئے[1]۔ یہ تو خداوند قدوس کی مہربانی اور عنایت تھی کہ اس نے اپنے کرم سے میری زندگی کو محفوظ رکھا۔ ان جلوسوں کی قیادت اکثر علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا عبدالقادر روپڑی، ملک غلام جیلانی، خان محمد اشرف خان قائد خاکسار تحریک، بارک اللہ خاں، نصر اللہ خاں، جاوید ہاشمی اور جماعت اسلامی کے رہنما کیا کرتے تھے۔

---

[1] یہ بات درست نہیں ہے جلوسوں میں نعرے "بھٹو کا سر چاہیئے" کے لیے ہوئے تھے۔ طارق وحید کو تو بھٹو کا ایک لاہوری کارکن سمجھا جاتا تھا۔ تحریک بھٹو کے خلاف تھی۔ (ا۔ف)

اس وقت حالات انتہائی ابتر ہو چکے تھے۔ پاکستان ریلوے کے وفاقی وزیر ڈاکٹر غلام حسین نے مجھے ریلوے ریسٹ ہاؤس میں بلایا اور کہا: "قومی اتحاد والے کھلم کھلا ملک کے بڑے چھوٹے شہروں میں جلوس نکال رہے ہیں اور ان کے راستے میں پیپلز پارٹی کا جو بھی کارکن ان کے ہتھے چڑھتا ہے وہ ان کو مار پیٹ کر کے چھوڑ دیتے یا پھر قتل کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے پیپلز پارٹی کے کارکن ان کے لیے سیاسی میدان کھلا چھوڑ کر دم دبا کر بھاگ چکے ہیں اور اتحاد والوں کے پاس موٹر سائیکلیں اور جدید اسلحہ ہے وہ ریلوے اسٹیشن لاہور پر بھی مسلح گھومتے پھرتے ہیں جبکہ بازاروں میں ہڑتال ہے لیکن پیپلز پارٹی کا کوئی وزیر اور ممبر قومی وصوبائی اسمبلی ڈر کے مارے سڑکوں اور گلیوں میں گھوم پھر نہیں سکتا۔ اتحاد والوں نے آج جلوسوں کی دھمکی دی ہے اور ان کے بڑے بڑے اجتماع منعقد ہوتے ہیں تو آپ بھی پیپلز پارٹی کی جانب سے ان کا مقابلہ کریں۔"

میں نے ڈاکٹر غلام حسین جو اس وقت پیپلز پارٹی کے مرکزی سیکرٹری جنرل بھی تھے کو جواب دیتے ہوئے کہا: "میرے ساتھ پیپلز پارٹی کے جو جیالے کارکن ہیں میں انہیں کس حساب سے قتل کرا دوں۔ پیپلز پارٹی اتنا عرصہ برسر اقتدار رہی ہے لیکن انہیں کسی نے پوچھا تک نہیں نہ ہی ان بے چاروں کو کسی نے روزگار فراہم کیا وہ ویسے ہی مصائب اور مسائل کا شکار رہے جیسے اقتدار سے قبل تھے اب پتہ چلا نا کہ بھٹو نے جن ابن الوقت جاگیرداروں کو ٹکٹ دیئے تھے وہ نہ صرف اپنے قائد بھٹو کا ساتھ بلکہ میدان ہی کھلا چھوڑ کر بھاگ چلے ہیں اور ان لوگوں نے اپنے گھروں پر سفید جھنڈے لہرا دیئے ہیں اسی لیے کہ جس گھر سے پیپلز پارٹی کا جھنڈا اتار کر سفید جھنڈا لگا دیا جاتا ہے اسے کچھ نہیں کہا جاتا لہٰذا میں اپنے کارکنوں کا ناحق خون نہیں بہانا چاہتا میری طرف سے صاف جواب ہے۔"

ڈاکٹر غلام حسین نے کہا: "بہرحال آج کے معرکے کے لیے سروسز اور میو ہسپتال میں ۵۰۰ بیڈ لگوا دیئے ہیں۔" تو میں نے اس وقت دعا کی: "اے مولا! تو ہی اس مسئلہ کا کوئی حل نکال کیونکہ میں اس طرح انسانیت کے قتل عام اور معصوم جانوں کو تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔" چنانچہ میں خاموشی سے واپس چلا آیا لیکن سوچنے لگا کہ بڑے بڑے دعوے کرنے والے پیپلز پارٹی

کے مرکزی اور صوبائی رہنما آخر کہاں چلے گئے ہیں قوم کے نمائندے تو ایسے نہیں ہوتے کہ گھروں میں چھپ جائیں وہ تو قوم کے لیے جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ بہرحال قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہزاروں کارکن جاں بحق ہوئے ہزاروں شدید زخمی اور معذور ہوگئے، کروڑوں روپے کی املاک جلا دی گئیں، بینک لوٹ لیے گئے، بے گناہ افراد کے کاروبار تباہ کر دیئے گئے، سینکڑوں بسیں و گاڑیاں جلا دی گئیں اور ملک میں ہر جانب خانہ جنگی کا سا منظر نظر آتا تھا کیونکہ قومی اتحاد کے جلوسوں میں جو عناصر شامل ہوتے تھے وہ پیپلز پارٹی کے حامیوں کے مکانوں کو جلا دیتے اور جائیدادوں کو لوٹ لیتے تھے اس وقت وزیر اعظم بھٹو کے تمام ساتھی اور حکومتی مشینری سب بے بس ہو چکے تھے اور پیپلز پارٹی کے ان کارکنوں کو جو اہم تھے لاہور، کراچی، حیدر آباد، ملتان، سرگودھا، فیصل آباد، سیالکوٹ، ڈسکہ اور راولپنڈی میں قتل کر دیا گیا تھا۔[1]

عہدِ ستم گر

اس تحریک کے پس منظر میں بھٹو کا وہ عہد کیسا تھا جس نے اس تحریک کو اس درجہ اجالا اس کا پس منظر پوری تفصیل سے جناب الطاف حسن قریشی ملک کے مشہور دانشور صحافی اور صاحبِ قلم نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کے دورِ حکومت کا تجزیہ اپنے خاص دل نشین انداز میں کیا ہے جو ذیل کی سطور میں درج ہے۔

"ایک دنیا حیرت میں ڈوبی ہوئی ہے کہ مسٹر بھٹو جو اپنے آپ کو پاکستانی عوام

---

[1] فی الحقیقت پی۔ این۔ اے کی تحریک میں پیپلز پارٹی کے غنڈہ عناصر اس طرح روپوش ہوگئے تھے کہ جو لوگ دوسری پارٹیوں کا جلسہ نہ ہونے دیتے تھے اور اپنے نام نہاد جمہوری طریقے سے خراب کر دیتے ہیں وہ بلوں میں گھس کر غائب ہو چکے تھے۔

(ا۔ گ)

[2] اگست ۱۹۷۷ء، اردو ڈائجسٹ لاہور۔

کی آنکھوں کا تارا اور امورِ خارجہ کا داناے یکتا تصور کرتے تھے، اس قدر جلد زوال پذیر کیوں ہو گئے؟ ۸، جنوری کو مرورِ شب نے اپنی زلفیں بکھیری تھیں اور پورے پاکستان پر ایک ہو کا عالم طاری تھا، اس وقت اچانک جناب بھٹو نے عام انتخابات کا مژدہ سنایا —— وہ اعلان ایک سمبل تھا بادشاہی اور کبریائی کا۔ پوری قوم کو مسخر اور ساری متقابل قوتوں کو زیر کر لینے کے بعد سیاسی مقابلے کا اذن عطا ہوا تھا۔ اذن دیتے وقت مسٹر بھٹو خود کو سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم محسوس کر رہے تھے۔

اور یہ غیر معمولی استحکام صرف چھ ماہ میں ریزہ ریزہ ہو گیا۔ عوام نے ٹھکرا دیا اور خارجی امور کا پھندا تدریجاً سخت ہوتا گیا اور اب اخلاق اور روحانی زندگی سے محروم ایک لاش پڑی ہے۔

کچھ اسی نوعیت کا حادثہ جناب ایوب خان کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ بھی دس برس تک سیاہ و سپید کے مالک رہے اور عوام کی جان ان کی مٹھی میں تھی، مگر جب طوفان اٹھا، تو ساڑھے چار مہینے میں سارے حفاظتی انتظامات ڈھیر ہو گئے۔ ایوب خاں کا زوال حیرت انگیز ہونے کے باوجود قابلِ فہم تھا۔ وہ بنیادی طور پر سیاستدان اور عظیم دانشور نہ تھے، اس لیے دُور تک نہ دیکھ سکے۔ تاریخ کا مطالعہ بھی قدرے سطحی تھا اور وہ اس لچک سے بھی محروم رہے جو صورتِ حال کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔ اس اعتبار سے ان کا المیہ بڑی حد تک ان کی اپنی ذات کا المیہ تھا۔

ان کے برعکس مسٹر بھٹو سیاسی علوم سے بہرہ ور اور سیاسی عمل کے شہسوار سمجھے جاتے تھے۔ ان کا اپنے متعلق دعویٰ بھی یہی تھا کہ برصغیر نے ان جیسا ذہین اور فطین مدبر پیدا نہیں کیا۔ عوام کی تخلیق اور بحرانوں کی پیداوار۔ وہ اس انداز میں بات کرنے کا ڈرامہ رچاتے کہ گویا تاریخ بول رہی ہے۔ پھر انہیں اپنی انتظامی صلاحیتوں پر بڑا ہی ناز تھا۔ مردم شناسی میں کسی اور کو اپنا ہمسر نہ سمجھتے۔ بیسویں صدی کے تمام بڑے بڑے آمروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسی مطالعے کی روشنی میں اپنے لیے طویل المیعاد منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ عمر بھر اقتدار میں رہنے کا اور ہر اس غلطی سے بچنے کا جو ماضی میں ڈکٹیٹر کرتے آئے اور اقتدار سے محروم ہوتے گئے۔ اس بے پناہ سازو سامان اور

حفاظتی تدابیر کے باوجود مسٹر بھٹو، حضرت بھٹو کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

انسانی تاریخ کا یہ دلچسپ و عجیب قتل ایک گہرے اور تفصیل جائزے کا متقاضی ہے۔

... ...

بھٹو صاحب جس حادثاتی پس منظر کے ساتھ برسر اقتدار آئے، وہ سائے کی طرح ان کے ساتھ لگا رہا۔ کروڑوں اہلِ وطن نے اپنی آنکھوں سے ان کا انداز سیاست دیکھا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنی ہوسِ اقتدار پر مشرقی پاکستان کو بھینٹ چڑھا دینا چاہتے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے اپنی تاریخ شکن تقریروں اور اقدامات کی ہزار تاویلیں پیش کیں، مگر دل اور ذہن مطمئن اور مسرور نہ ہو سکے۔ مشرقی پاکستان کی ہوک جب کبھی سینے میں اٹھتی ہے، مسٹر بھٹو کا طوفان آشام چہرہ دھوئیں کی مانند پھیلنے لگتا ہے۔ پاکستانی قوم اپنے جاہ پرست لیڈر کی چرب زبانیوں کے سامنے خاموش تو رہی مگر اسے ایک محب وطن قائد کا مقام نہ دے سکی۔

مشرقی پاکستان کے بعد "قائدِ عوام" نے بلوچستان اور سرحد کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی اور اس میں اس قدر شدت پیدا ہوئی کہ وطن کی سالمیت کو حقیقی خطرہ لاحق ہو گیا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں جو صوبائی خود مختاری اتفاق رائے سے طے پائی تھی، اس کے تمام تقاضے پامال ہوئے، چنانچہ اس سوچے سمجھے طرزِ عمل کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ اب صوبائی خود مختاری پر اتفاقِ رائے انتہائی دشوار ہو جائے۔ یہی وہ نازک مسئلہ تھا جس نے مشرقی پاکستان کو ہم سے بالآخر علیحدہ کر دیا تھا۔

پاکستان کی نظریاتی وحدت کے خلاف مسٹر بھٹو مختلف انداز سے سیاسی اور تہذیبی آپریشن کرتے رہے۔ مسلم قومیت کے بجائے علاقائی قومیتوں اور ثقافتوں پر ایمان رکھنے والے، ان کی آغوش میں جا بیٹھے اور نیشنل سنٹر، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلمی اداروں پر قابض ہو گئے اور بڑی فن کاری کے ساتھ پاکستان اور بھارت کی مشترکہ تہذیب و ثقافت، تاریخ اور جغرافیے کا نقش ذہنوں پر بٹھانے لگے۔ بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی باتیں خود مسٹر بھٹو نے بھی کیں اور ان کے چیلے چانٹوں نے اخبارات میں مضامین بھی لکھے۔ بھارت سے ایک ہزار سال تک جنگ کرنے والا مردِ مجاہد یہ بھی کہتا سنا گیا کہ اگر اہلِ پنجاب نے میرے خلاف سر اٹھایا تو میں اندرا کے ٹینک پر

سوار لاہور میں داخل ہوں گا اور باغیوں کا سر کچل دوں گا۔ ڈاکٹر طالبوت سے گفتگو کرتے ہوئے صدر بھٹو نے کہا تھا:

"اس برصغیر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس کے شمال میں بلند و بالا پہاڑ اور باقی تین سمتوں میں سمندر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ہمیں انحصار کرنے پر اور ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے طریقے تلاش کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

یہ تھے وہ معاملات جنہوں نے پاکستان کے وجود اور اس کے مستقبل کو مسٹر بھٹو کے عہدِ اقتدار میں غیر یقینی بنائے رکھا۔ عوام کے ذہنوں میں یہ کسک مسلسل اٹھتی رہی کہ ہمارے وطن کی قسمت جس شخص کے ہاتھ میں ہے، وہ کسی وقت بھی کوئی گل کھلا سکتا ہے۔ مسٹر بھٹو اور ان کے قریبی ساتھیوں نے یہ بات مختلف پیرائے میں ادا کی کہ ہمارے ہاتھ میں جو کھلونا ہے اگر اسے چھین لینے کی کوشش کی گئی تو ہم کھلونا ہی توڑ ڈالیں گے۔ ظالموں نے اس عظیم وطن کو ایک کھلونے سے تشبیہ دے کر یہ واضح کر دیا تھا کہ انہیں پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مسٹر بھٹو کا یہ امیج پہلے ایک داغ تھا جو چلتے چلتے ایک ناسور بن گیا۔

... ...

وہ شخص جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں فیصلہ کن حد تک معاون ثابت ہوا اسے نظریۂ پاکستان اور تحریکِ پاکستان سے کیا لگاؤ ہو سکتا تھا، چنانچہ انہوں نے اگست ۱۹۷۲ء کے وسط میں قومی اسمبلی کے پلیٹ فارم پر یہ اعلان فرمایا کہ قرار داد لاہور میں ایک پاکستان کے بجائے دو پاکستان کا نظریہ کارفرما تھا اور مشرقی بنگال کو پاکستان کا ایک حصہ بنا لینا تاریخ اور جغرافیائی عمل سے ہم آہنگ نہ تھا۔ ان ارشادات کے پہلو بہ پہلو اسلامی تشخص کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ ہر شریف آدمی ملا اور ہر ملا قابلِ گردن زدنی۔ اسلام کی تعلیمات فرسودہ اور رجعت پسندانہ۔ مذہبی شعائر، استعمار اور استحصال کی علامت۔ اصولِ دین کے مقابلے میں سائنٹیفک سوشلزم کا جارحانہ پروپیگنڈہ۔

اللہ کی حاکمیت کا تصور تخلیقِ پاکستان میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ ۷۳ء کے دستور میں بھی اسی تصور کو آراستہ کیا گیا تھا، مگر حضرت بھٹو چونکہ ایک لادینی ذہن اور مزاج کے مالک تھے

اس لیے انہوں نے اپنی گرفت پوری طرح مضبوط کر لینے کے بعد خدا کو پاکستان سے جلاوطن کر دینے کا منصوبہ تیار کیا۔ دسمبر ۱۹۷۶ء کے آخری عشرے میں پارلیمنٹ کی طرف سے قائدِ اعظمؒ کا صد سالہ جشنِ ولادت منایا گیا۔ بھٹو صاحب نے اس موقع پر ایک طویل تقریر کا شوق پورا کیا اور اپنے آپ کو قائدِ اعظمؒ کے ہم پلہ اور ان سے بھی بلند ثابت کرنے کے بعد ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ خدا کی حاکمیت کی جگہ عوام کی حاکمیت قائم کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنی حاکمیت مسلط کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہ ہمیشہ عوام سے مراد اپنی ذات کو لیتے رہے ہیں۔

مسجد اور دینی مدرسوں کا نظام اصلاح طلب ہونے کے باوجود معاشرے میں حریتِ فکر اور استحکامِ عمل کی پرورش کرتا رہا ہے۔ ان اداروں سے اعلیٰ روایات کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی املاک بھی وابستہ ہیں۔ حکومت نے اپنی مرضی کا مذہب رائج کرنے کے لیے مسجدوں اور دینی مدرسوں پر قبضہ جمالیا اور پورے ملک میں اوقاف کی آمدنیاں مرکزی وزارتِ اوقاف کی مدوں، جیبوں اور پیٹوں میں چلی گئیں۔ وزارتِ اوقاف نے کیا کیا رنگ جمائے، کیسے کیسے اللے تللے ہوئے، انتخابات کے زمانے میں اوقاف کی پاک آمدنی سے کس کس نے جام کے جام لنڈھائے اور ترنگ کے اڈے قائم کیے، یہ تفصیلات ہم اپنے قلم سے تحریر نہیں کر سکتے (لوگ بے خبر بھی نہیں)

زبردست عوامی دباؤ کے تحت دستور میں یہ شق شامل کی گئی کہ سات برس کے اندر تمام مروجہ قوانین اسلام کے سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ یہ مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دینے کی واردات تھی، کیونکہ چار برس کے اندر ایک قانون میں بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اصلاح نہ ہوئی۔ جسٹس حمود الرحمٰن اسلامی نظریاتی کونسل کے سربراہ تھے۔ انہوں نے عظیم جذبے سے سرشار ہو کر شب و روز کام کیا اور نہایت قلیل مدت میں سفارشات کی پہلی رپورٹ تیار کی اور آخری غور و خوض کے لیے قومی اسمبلی کے حوالے کر دی۔ بھٹو صاحب اسلام کو فقط نعرے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جسٹس حمود الرحمٰن اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی شکل لے آئے ہیں تو سخت جھنجلائے اور حکم صادر فرمایا کہ آئندہ سفارشات براہِ راست قومی اسمبلی کے بجائے وزارتِ قانون کو ارسال کی جائیں۔ نظریاتی کونسل نے تین رپورٹیں مرتب کیں مگر ان میں سے ایک بھی

قومی اسمبلی میں پیش کر دی گئی ـــ اور یوں ویرانی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔

مسٹر بھٹو نے بعض اقدامات ایسے ضرور کیے ہیں جن سے عام آدمی کو ان کی اسلام دوستی کا ہلکا سا تاثر ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی صدارت میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ قادیانی مسئلے کا آئینی حل تلاش کیا گیا جمعے کا دن ہفتہ وار تعطیل قرار پایا اور جب بھٹو شاہی آخری سانس لے رہی تھی تو شراب اور جوئے پر پابندی عائد کر دی گئی باد نسیم کے یہ جھونکے بھی بادِ سموم میں بدل گئے، کیونکہ ان کے پیچھے نیت کا خلوص نہ تھا۔ دراصل مسٹر بھٹو یہ ساری چالیں خالص ذاتی اور سیاسی خاطریوں سے چل رہے تھے۔ اسلامی سربراہ کانفرنس کے نتیجے میں بعض اچھے نتائج بھی مرتب ہوئے مگر اس کانفرنس کا بنیادی مقصد اپنے حقیقی آقا ـــ امریکہ اور اس کے حواریوں کو خوش رکھنا تھا۔ اس فقرے کا پس منظر یہ ہے کہ جنگِ رمضان کے بعد عرب سربراہوں نے امریکہ کے خلاف شدید اور سخت رویہ اختیار کیا۔ الجزائر میں ایک اہم کانفرنس منعقد ہوئی۔ جذبات بڑے تند و تیز اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ امریکی مفادات پر کاری ضرب لگ جائے۔ اس پُرجوش اور پُرعزم فضا کو تحلیل کرنے کے لیے مسٹر بھٹو نے اسلامی سربراہ کانفرنس بلائی اور پھر اپنے خصوصی ایلچی کے ذریعے ڈاکٹر کسنجر کو پیغام بھجوایا کہ میں اس کانفرنس کے ذریعے آپ کے مفادات کی حفاظت کروں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور عربوں کے انتہائی سخت طرزِ عمل میں خاصی لچک پیدا ہو گئی۔

اس کانفرنس کے پردے میں حکومت پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا اور وہ سیاسی جنگ جس میں مسٹر بھٹو کا پورا وجود ہل گیا تھا، ایک ایسے وقت ختم ہوئی جب اہلِ پاکستان بعد از اقرار خاموش رہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اسلامی کانفرنس ختم ہوتے ہی سوشلزم کی آواز اور بلند ہو گئی۔ تیسری دنیا کے چرچے ہونے لگے اور اسلام کے بچے کھچے آثار حیرت انگیز سرعت سے غائب ہوتے گئے۔

قادیانی مسئلہ قوم کے عظیم الشان اتحاد اور بے مثل تنظیم و ضبط کے باوجود اس بے دلی سے حل کیا گیا کہ پاکستان کے اندر کوئی بڑی تبدیلی رونما نہ ہو سکی۔ قادیانی حضرات، کلیدی مناصب پر پہلے بھی فائز تھے اور آج بھی فائز ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اقلیتی فرقہ، مسٹر بھٹو کو اپنا محسن

اور مربی تصور کرتا ہے، اس لیے اس نے حالیہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا تھا۔ قادیانی مسئلے کا صحیح اور موثر حل جداگانہ انتخابات کا تقاضا کرتا تھا اور جناب بھٹو اس کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ تھے۔ ایک ملاقات میں جناب ظفر احمد انصاری نے جداگانہ انتخابات کی تجویز پیش کی، تو ہمہ مقتدر وزیر اعظم آتش زیر پا ہو گئے اور فضا ان کا تکدر برداشت نہ کر سکی۔

مسلمانوں کو اب قادیانیوں سے کوئی پرخاش نہیں، بلکہ وہ اقلیتوں کے حقوق پوری دیانت داری اور اعلیٰ ظرفی سے ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی متفقہ رائے ہے کہ اقلیتوں کو اپنے نمائندے جداگانہ طور پر منتخب کرنے چاہئیں تاکہ ان کی اپنی آواز قانون ساز اداروں میں سنائی دے۔ جب تک یہ بنیادی اصول نافذ نہیں ہوتا، اس وقت تک فساد و عناد کے دروازے بند نہ ہو سکیں گے اور مسٹر بھٹو دیدہ دانستہ یہ دروازہ کھلا چھوڑ گئے۔

جمعے کی چھٹی کا سب سے پہلے مطالبہ جناب صاحبزادہ صفی اللہ نے قومی اسمبلی میں کیا تھا۔ یہ ۱۹۷۲ء کے وسط کی بات ہے۔ پیپلز پارٹی نے اس قرارداد کو پہلے سرد خانے میں ڈال دیا اور اور بعد میں پوری ڈھٹائی سے مسترد کر ڈالا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسٹر بھٹو تعطیل جمعہ کے حق میں نہ تھے، مگر جب سیاست کا رنگ بدلا اور انہیں احساس ہوا کہ اس مطالبے کے اندر بے پناہ جذباتی کشش ہے تو انہوں نے عام انتخابات کے اعلان کے ساتھ ہی یکم جولائی ۱۹۷۷ء سے جمعے کی چھٹی کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اخلاص سے خالی اور منافقت سے معمور تھا۔ سیاسی اغراض کے لیے وہ مسلمانوں کے مذہبی جوش و خروش سے کھیل جانا چاہتے تھے۔

یہی انداز شراب اور جوئے کی بندش کا ہے۔ شراب کے بارے میں بھی ایک قرارداد قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ اس وقت کی حکمران جماعت نے اس قرارداد کا نہایت بھونڈے انداز میں مذاق اڑایا تھا۔ ایک صاحب نے بڑے دلنواز لہجے میں پوچھا تھا کہ ہم اگر شراب نہ پئیں تو اور کیا پئیں۔ خود مسٹر بھٹو نے ایک تقریر میں ارشاد فرمایا تھا کہ میں شراب پیتا ہوں غریبوں کا خون نہیں پیتا۔ لاہور کے ایک انتخابی جلسے میں موصوف نے اعتراف کیا کہ میں تھوڑی سی پی لیتا ہوں۔ پیپلز پارٹی کے بیشتر ارباب بست و کشاد، شراب

کے رسیا تھے اور ان کے عہد اقتدار میں دیہات کے اندر دیسی شراب کی بھٹیاں بہت بڑی تعداد میں کام کرتی رہیں۔ مگر جب عوام کا دباؤ بڑھنے لگا اور سیاسی نیا ڈولتی نظر آئی تو مسٹر بھٹو نے شراب سے غسل فرما کر شراب کی بندش کا اعلان کر دیا۔ مذہب سے بیزاری کی رہی سہی کسر جابر حکمرانوں کی جابر پولیس نے پوری کر دی جس نے بوٹوں سمیت مسجدوں میں داخل ہو کر نمازیوں کو شہید کیا۔ بوڑھوں کی ڈاڑھیاں اس بے دردی سے نوچیں کہ جلد ہی اترتی چلی گئی۔ نو عمر بچے بھی ظلم و ستم کی چکی میں پس گئے۔ قرآنِ حکیم کے اجزا تار تار کر دیے گئے۔ لاہور کی مسلم مسجد اور راولپنڈی میں مولانا غلام اللہ کے دینی مدرسے سے ملحق مسجد اور احمد پور شرقیہ کی جامع مسجد میں جو کچھ ہوا اس کی مکمل روداد شاید ہی احاطہ تحریر میں آسکے۔

مذہب اور اخلاق سے سخت دشمنی اور بیزاری کا جو ایج بھٹو صاحب کا آغاز میں ابھرا تھا اسے ان کے ساڑھے پانچ سالہ شاہانہ عہد اقتدار نے اور زیادہ بھونڈا اور گھناؤنا بنا دیا۔ اسی ایج نے تمام مذہبی فرقوں اور دینی حس رکھنے والے نوجوانوں اور اخلاقی اقدار کے پاسداروں کو ان کے مد مقابل لا کھڑا کیا۔

... ...

اسلام کے ساتھ سوشلزم کی پیوند کاری مسٹر بھٹو نے کسانوں، مزدوروں اور معاشی اعتبار سے پس ماندہ طبقوں میں بے پایاں جوش و خروش ابھارنے کے لیے کی تھی۔ شروع شروع میں یہ حربہ خاصا کارگر ثابت ہوا، مگر واقعات کے ہاتھوں نے حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا۔ بلاشبہ حضرتِ بھٹو نے اپنی ہر تقریر میں غریبوں اور ناداروں کا بالاہتمام ذکر کیا اور یہ اعلان بھی ان کی طرف سے مسلسل ہوتا رہا کہ میں عوام کے لیے اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں۔ بعض اصلاحات بھی ہوئیں اور پسے ہوئے طبقے نے اپنے اندر ایک نیا دم خم سرایت کرتا ہوا محسوس کیا، مگر وسیع تر تناظر میں یہ اقدامات کٹے پھٹے نقلوں اور بلبلوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزدوروں کی تحریک برسوں کی جاں گسل کشمکش کے بعد جس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، اس میں کسی حکومت کے لیے بھی مزدوروں کے معیارِ زندگی، ان کے معاشرتی مقام اور ان کے تعلیمی تقاضوں سے آنکھیں بند کر لینا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے مزدوروں

کو جس قدر دیا، اس سے کہیں زیادہ واپس لے لیا۔ اور جو کچھ دیا، وہ آخری تجزیے میں ان کے حق میں مضر ثابت ہوا۔ سارے پہلو ہم ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ زیادہ دھر ادھر ہی کھلا ہے۔

پاکستان میں صنعتی مزدوروں کی تعداد ۷۰ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں مجتمع ہونے کی وجہ سے یہ طبقہ سیاسی اور اقتصادی زندگی پر گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔ جناب بھٹو نے اس قوت کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ صنعت کاروں اور سرمایہ داروں نے مزدوروں کے حقوق بڑی بے نیازی سے پامال کر رکھے تھے، نتیجے کے طور پر وہ تقریباً جانوروں کی سی زندگی گزارتے تھے، چنانچہ مسٹر بھٹو نے جونہی مزدوروں کے حقوق کی جدوجہد میں اپنی جان کھپا دینے کا غلغلہ بلند کیا، امیدوں اور توقعات کا ایک طوفان سا اُمڈ آیا۔ اس طوفان میں نظم و ضبط کے سارے ہی بند ٹوٹ گئے۔

مزدوروں کی بے پناہ حمایت سے اقتدار پر قابض ہو جانے کے بعد، جناب ذوالفقار علی بھٹو نے مزدوروں ہی کی قوت توڑ دینے کی ٹھان لی اور ۱۹۷۲ء کے آخری نصف حصے میں آپریشن شروع کر دیا۔ سحری کے وقت، نور کے تڑکے مزدوروں کے گھروں میں پولیس گھس گئی۔ پھر جان محفوظ رہی نہ عزت۔ صرف کراچی شہر میں اس قدر مزدور ہلاک ہوئے کہ گزشتہ ستائیس برس کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ تھے خون میں لت پت لاشیں پولیس اٹھا لے گئی اور انہیں شاید کفن بھی میسر نہ آیا۔ اس خوں آشام کارروائی سے مزدوروں کے اندر خوف اور دہشت کچھ عرصے سمائی رہی۔

دوسرا قدم مزدوروں کی آزمودہ اور سنجیدہ قیادت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا تھا، چنانچہ سہ فریقی کانفرنسیں وقفے وقفے کے بعد منعقد ہوتی رہیں جن کا ایک خفیہ مقصد بعض مزدور لیڈروں کو آرام و آسائش کا خوگر بنانا تھا۔ انٹر کانٹی نینٹل میں قیام کے بعد آسائشوں کی طرف ذہن پلٹتا ہے، چنانچہ کچھ خرید لیے گئے، کچھ پس منظر میں دھکیل دیے گئے اور کچھ بڑی حد تک بے اثر ہو گئے۔ گزشتہ پانچ چھ برس میں بڑے بڑے پہاڑ لڑھک گئے اور نئے لوگ سامنے آئے جن میں صلاحیت

سے ٹکر لینے کی ہمت ہی نہ تھی۔

بیشتر صنعتیں اور کاروباری ادارے قومی تحویل میں لے لیے گئے تھے، اس بناء پر مزدوروں کی بڑی تعداد حکومت کی ملازم قرار پائی۔ اسے قدم قدم پر نوکر شاہی سے سابقہ پڑا۔ کیونکہ قومیائے ہوئے کارخانوں میں سرکاری افسر تعینات تھے جنہیں اس خاص صنعت کو چلانے کا نہ کوئی تجربہ تھا اور نہ ولولہ۔ ان کارخانوں کے مزدور عملی طور پر ہڑتال کے حق سے محروم کر دیے گئے۔ سرکاری انتظامیہ بات بات پر پولیس لے آتی تھی۔

حکومت کی غیر متوازن، غیر مربوط اور غیر حکیمانہ اقتصادی حکمت عملی کے سبب کارخانے بند ہونا شروع ہوئے۔ بھٹو شاہی نے ہیجانی اور منفی پروپیگنڈے کے ذریعے صنعتی ماحول درہم برہم کر دیا۔ صنعت کاروں اور مزدوروں کو آپس میں لڑا دیا جس کے نتیجے میں سرمایہ فرار ہو گیا اور کارخانے منتقل ہوتے گئے۔ سوتی دھاگے اور کپڑے کی صنعت جس میں تقریباً پانچ لاکھ مزدور کام کرتے تھے، کئی برس سے شدید بحران میں مبتلا ہے آدھے سے زیادہ بڑے کارخانے بند ہو گئے اور باقی نیم دائیں، چنانچہ اسی تناسب سے مزدور بے روزگاری کا شکار ہیں اور ہر روز دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے۔

مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ تو ہوا مگر انہیں حقیقی سکون اور سچی خوشی میسر نہ آ سکی۔ ان کی طبی امداد کے لیے سوشل سیکورٹی اسکیم رائج ہوئی، تاہم اس میں لوٹ کھسوٹ اقربا پروری اور سیاسی تقرریوں کا جو بازار گرم ہوا اس کی بدولت مزدور بروقت اور مناسب طبی امداد سے محروم رہے۔

بھٹو صاحب ٹریڈ یونین سرگرمیوں کا قطعاً احترام نہ کرتے تھے پی آئی اے میں ایک منتخب ٹریڈ یونین — پیاسی — انتظامیہ کے ساتھ معاملات طے کرنے کی مجاز تھی۔ دوسری یونین — ایوپیا بھی موجود تھی۔ حکومت نے دونوں کی رجسٹریشن منسوخ کر دی۔ اکتالیس ملازم بیک قلم ملازمت سے نکال دیے اور بڑی تعداد میں سرگرم کارکن اور لیڈر ڈی پی آر کے تحت گرفتار کر لیے۔ عجب اتفاق ہے کہ اس آپریشن کے لیے ائر مارشل (ریٹائرڈ) نور خاں مقرر کیے گئے جو ٹریڈ یونین کی حمایت میں سرگرم بھی تھے اور مزدوروں کے حقوق پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔

اس نوع کے واقعات ہر صنعت اور ہر کارخانے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مزدوروں کی تعلیم اور فنی استعداد بڑھانے کا باقاعدہ اہتمام نہ ہونے سے، ان کی کارکردگی بڑی تیزی سے روبہ زوال ہوئی۔ صرف ٹیکسٹائل کی صنعت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صورتِ حال کس قدر سنگین ہے۔

ایک مزدور ایک گھنٹے میں کس قدر کام کرتا ہے:

جاپان	۲۱،۲
امریکہ	۱۹،۷
جرمنی	۱۱،۷
بھارت	۶،۵
انڈونیشیا	۲،۲
پاکستان	۰،۹

صنعتوں کے سمٹنے اور پیداوار کے مسلسل گر جانے سے مزدور اپنے آپکو ایک بھیانک اقتصادی بھنور میں چکر کاٹتا ہوا پاتے ہیں۔

مزدوروں کی اجتماعی قیادت نے بھٹو شاہی کے طور طریق جب بہت قریب سے دیکھے تو اس نے آخرِ کار محسوس کر لیا کہ مزدور ابتری کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ وعدوں کا پُر فریب پردہ چاک ہو چکا اور دستِ مسیحا خون آلود نکلا، چنانچہ اس نے شدید بحران کے زمانے میں بھٹو شاہی کا ساتھ نہ دیا۔ اس کے برعکس ۲۱ اپریل کی شام ان گنت مزدور تنظیموں نے اپنا وزن قومی جدوجہد میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مسٹر بھٹو نے مزدور دوستی کا جو امیج ریڈیو اور ٹیلی وژن سے تعمیر کیا تھا وہ حالات کی کسوٹی پر کھوٹا ثابت ہوا۔

... ...

پاکستان میں کاشت کار انتہائی ذلت آمیز زندگی گزارتے آئے ہیں۔ ان کی حیثیت وڈیروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کے ذاتی غلاموں کی سی رہی۔ صاف ستھری

اور خوشحال زندگی اور ذہنی ارتقا کے تمام راستے بند گھوڑوں اور کتوں سے بھی کم حیثیت اس غیر انسانی معاشرتی اور اقتصادی نظام کے خلاف ایک مدت سے جدوجہد جاری تھی جس نے کسانوں کو اپنی محرومیوں کا شدید احساس دلایا تھا۔ مسٹر بھٹو نے اسی احساس کو دیا سلائی دکھائی اور ہر بے زمین کاشت کار کو ساڑھے بارہ ایکڑ زمین دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے سمجھا کہ ہمارا نجات دہندہ آگیا، چنانچہ پوری قوت سے ساتھ دیا۔ اقتدار میں آنے کے بعد حضرت بھٹو خواب آور تقریروں سے کسانوں پر غنودگی طاری کرتے رہے مگر دیہی آبادی نے جلد ہی جان لیا کہ ساڑھے بارہ ایکڑ نہیں مل سکیں گے۔ زرعی اصلاحات دوبار نافذ ہوئیں مگر وڈیرے اور جاگیردار بڑی حد تک صاف بچ نکلے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۷۲ء کی زرعی اصلاحات سے ذرا پہلے بے تکبیر بھٹو کے کاغذات جن کا تعلق اراضی سے تھا، لندن کے سفارتخانے میں تیار ہوئے اور خاص انتظامات کے تحت پاکستان لائے گئے۔ دوسری زرعی اصلاحات کا اعلان جنوری ۱۹۷۷ء کے پہلے ہفتے میں ہوا اور اس کے بعد ایسی تحریک اٹھی کہ اس پر شاید ہی عمل ہو سکا ہو۔

مسٹر بھٹو کو دوسری بار زرعی اصلاحات کا اچانک اعلان یقیناً اس وجہ سے کرنا پڑا کہ تحریک استقلال کی بیشتر سیاسی جماعتیں ملکیت زمین پر کڑی حد لگانے کے حق میں تھیں۔ جناب ائیر مارشل اصغر خاں نے تحریک استقلال کا بہت انقلابی منشور پیش کیا تھا۔ اس میں ۲۵ ایکڑ کی حد ملکیت مقرر ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی نے بھی جاگیرداری اور زمینداری کا فرسودہ اور ظالمانہ نظام ختم کرنے کے لیے ایک مربوط نقشہ پیش کیا تھا اور دوسری جماعتیں بھی کاشتکاروں اور مزارعوں کو مالکانہ حقوق دلانے میں پرجوش نظر آتی تھیں۔ ان حالات میں مسٹر بھٹو کیلئے وڈیروں اور جاگیرداروں کے لامحدود مفادات کا تحفظ ناممکن ہوگیا اور انہیں جلدی میں دوسری زرعی اصلاحات کا اعلان کرنا پڑا۔ (جن پر کبھی عمل نہ ہو سکا)

کسانوں کو خوش رکھنے کے لیے مسٹر بھٹو گاہے گاہے زمینداروں اور جاگیرداروں کے خلاف بیانات دیتے رہے حالانکہ جن کے خلاف دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں ان کا بڑا حصہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکا تھا اور وہ اندر بیٹھ کر اپنے مفادات کی حفاظت کرنے میں مصروف

تھا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مزارعین کو زمینداروں کے خلاف بھڑکایا گیا اور ۷۷ء کے انتخابات میں انہی زمینداروں کو ٹکٹ جاری ہوئے غالباً مقصد یہ تھا کہ اس بار ان کے ہاتھوں کاشتکاروں کی کانٹ چھانٹ کی جائے جو حد سے آگے بڑھ آئے تھے۔ یہ امر خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ مسٹر بھٹو نے اس دفعہ کسی غریب مزدور لیڈر اور کسی بے آسرا کاشتکار کو ٹکٹ نہیں دیا۔ انہیں کسانوں اور مزدوروں سے سچی محبت ہوتی تو وہ کم از کم ۵۰ فیصد نشستیں ان پسے ہوئے طبقوں میں تقسیم کرتے۔ (انہوں نے سارے ٹکٹ جاگیرداروں کو دیے)

پیپلز ورکس پروگرام کے ذریعے دیہات کے ایک مخصوص طبقے پر دھن کی بارش ہوتی رہی۔ بچے اور رسہ گیر چاندی بناتے رہے اور سرکاری اہل کاروں سے لے کر ایم پی اے ایم این اے اور وزیروں تک سبھی نے اپنا اپنا حصہ وصول کیا اور یہ سارا بوجھ کسانوں کاشتکاروں اور دیہی آبادی کو برداشت کرنا پڑا۔ ٹریکٹروں کی قیمتیں ۱۶ ہزار سے ۸۶ ہزار روپے تک جا پہنچیں۔ جب وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ اور مرکزی اور صوبائی وزیروں کی زمینوں کے پیٹ بھر گئے، تب دوسروں کی باری آئی ٹیوب ویل زیادہ تر انہی کے حصے میں آئے جو رشوت دے سکتے تھے یا حکمران جماعت کی چاکری کے لیے پوری طرح آمادہ۔ مستحق افراد بالعموم ٹیوب ویل سے محروم رہے۔ تھریشر بھی گراں قیمت پر مہیا کیے گئے۔ اگر کفایت شعار اور دیانتدار حکومت ہوتی تو یہ تمام زرعی سہولتیں ایک تہائی قیمت پر آسانی سے فراہم کی جا سکتی تھیں مگر بھٹو شاہی تو عوام کو بے دم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

گندم کا ناقص بیج باہر سے درآمد کیا گیا۔ بڑے بڑے پارساؤں نے ہاتھ رنگے، مگر سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ گندم کی فصل معیار سے گرتی چلی گئی۔ کپاس کی تجارت پہلے ڈاکٹر مبشر حسن نے جان بوجھ کر تباہ کی اور اس کے بعد فصل بھی جواب دے گئی۔ حکومت نے اسپرے کے جو انتظامات کیے وہ کیڑوں کو مارنے کے بجائے فصلیں اجاڑتے رہے۔ کھاد کی قیمتوں میں دو سے تین گنا تک اضافہ ہوا اور زیادہ تر ریوڑیاں اپنوں ہی میں تقسیم ہوتی رہیں۔

گاؤں کے لوگ پہلے سے زیادہ بیدار ہونے کے باوجود ظلم کے کولہو میں بیلوں کی طرح

مٹتے ہوئے ہیں پٹواری، نمبردار، تحصیلدار، اوورسیئر، ضلعدار اور تھانیدار اژدہوں کی طرح ہر چیز اندر کی طرف کھینچتے جاتے ہیں۔ گندم کی قیمتیں زیادہ ہوئیں تو کاشت کار کے دن کچھ پھرے مگر رشوتوں کے نرخ اسی قدر بالا ہو گئے۔ چوری، اغوا اور قتل کے مقدمات میں اب تھانیدار، ہزاروں روپے وصول کرتا ہے اور پٹواری زمین کے جعلی انتقال کر کے خوب پیسے بٹورتا ہے اور ان پڑھ دیہاتیوں کو سرکاری اہل کار جھوٹے مقدمات میں الجھائے رکھتے ہیں کہ ان کا سکہ چلتا رہے اور کوئی سر نہ اٹھا سکے۔

دیہی زندگی میں آج بھی وہی گندگی اور غلاظت ہے جو پچاس برس پہلے تھی۔ وہی بدبودار جوہڑ وہی بیماریاں، وہی جہالت اور وہی بے ترتیبی۔ حکومت نے تعلیم پر اربوں روپے خرچ کیے مگر خواندگی کی اوسط پہلے سے بھی کم ہو گئی یعنی کوئی ۱۲ فیصد تعلیم بالغاں کے سلسلے میں گزشتہ پانچ چھ برس بالکل بے تگ و گیاہ نظر آتے ہیں۔ مساجد کو تعلیمی مرکز بنا کر ایک عظیم الشان انقلاب برپا کیا جا سکتا تھا مگر ان امور کی طرف توجہ دینے کی کسے فرصت تھی! تعلیم نہ ہو تو سیاسی بیداری بالعموم منفی لہر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور غالباً مسٹر بھٹو اسی منفی لہر کے سہارے حکومت پر قابض رہنا چاہتے تھے۔

بھٹو نے بلند بانگ دعووں کے علی الرغم صحتِ عامہ کی حکمتِ عملی کچھ اس طور پر وضع کی کہ ڈاکٹر حضرات دیہات کی طرف رخ کرنے سے گھبراتے رہے۔ نہ کہیں قابلِ ذکر ڈسپنسری، نہ دواؤں کا معقول انتظام، نہ قیام کی صاف ستھری جگہ۔ اور اس پر ستم یہ کہ پیپلز پارٹی کے چھٹ بھیے خنجر تانے کھڑے ہیں کہ قتل کی وارداتیں ہماری مرضی کے مطابق رپورٹ کیجیے۔ پھر ان ڈاکٹروں کے ساتھ محکمۂ صحت کا سوتیلی ماں جیسا رویہ۔ ان حالات میں کون ادھر کا رخ کرے؟ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ان گنت بندشوں کے باوجود ڈاکٹر صاحبان اپنی کھال بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمارے دیہاتی سسک سسک اور تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر بڑی تعداد میں لوگ، دیہات چھوڑ کر شہروں کی طرف لپک رہے ہیں۔ کاٹیج انڈسٹری کے ذریعے گاؤں اور قصبوں میں اقتصادی عمل مستحکم کیا جا سکتا تھا مگر بھٹو شاہی تو منصوبہ بندی کے سخت خلاف تھی اور اسے وڈیرانہ حکم چلانے کے لیے پسماندہ غلام درکار تھے۔

مقدمات کا سلسلہ وہی عمرو عیار کی زنبیل کی طرح دراز ہے۔ وہی تھانے، وہی کچہریاں اور وہی ہتھکڑیاں، وہی رشوتیں، وہی سفارشیں اور وہی بے چارگیاں۔ بیلف کی وہی کرخت آواز، کانسٹیبل کا وہی بدبودار لہجہ شب و روز انہی اندھے رسم و رواج اور انہی گونگے بہرے تعصبات میں جکڑے ہوئے۔ برادریوں کی للکار صاف سنائی دیتی ہے اور مسٹر بھٹو کے انتخابی معرکے میں وہی للکار کارفرما تھی۔

مسٹر بھٹو نے دنیا کو یقین دلانا چاہا تھا کہ وہ ایک کسان دوست وڈیرے ہیں مگر وہ بے زمین ہاریوں کو بارہ ایکڑ زمین دینے اس کی جمالیاتی، ذہنی اور معاشرتی نشوونما کا اہتمام کرنے اور اسے مستحکم زندگی کی بنیادیں فراہم کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔ وہ اپنی اس ناکامی کو چھپانے کے لیے دیہات کو شہروں سے لڑا دینا چاہتے تھے، مگر اب ان کا سحر ٹوٹ چکا۔

...   .

کچی آبادیوں کے تذکرے ایک مدت سے سننے میں آ رہے ہیں۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے نام نہاد انتخابات کے بعد ہمدردیوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا۔ ذرا ناقدانہ نظر سے دیکھیے تو یہ فقط ایک تماشا نظر آتا ہے۔ بھٹو صاحب ساڑھے پانچ سال برسرِ اقتدار رہے۔ سیاہ سپید کے مالک اور ایک ہٹ دھرم مطلق العنان حکمران ـــ اگر چاہتے تو کچی آبادیوں کا مسئلہ بڑی عمدگی اور اعلیٰ منصوبہ بندی سے حل کر دیتے مگر وہ تو کچی آبادیوں کو ایک انتخابی اور سیاسی نعرے کی حیثیت سے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل جناب ڈاکٹر مبشر حسن نے اس طرف خاص توجہ دی تھی لیکن ان کی نیت میں ہمیشہ ایک فتور سا رہا، چنانچہ اگر وہ سونے میں بھی ہاتھ ڈالیں تو اسے مٹی میں تبدیل کر دیں۔ لاہور میں ریلوے لائن کے قریبی حصے میں کچی بستی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اخبارات میں زبردست پروپیگنڈا کیا اور یہ تاثر دیا کہ غریبوں کے دلدّر دور ہونے والے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ قدم بھی اٹھائے گئے، مگر معاملہ اور زیادہ بگڑ گیا اور بے جائے باسیوں کو ناقابلِ برداشت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کے بعد گلبرگ کے پہلو میں غریبوں کی ایک نئی بستی آباد کرنے کی تجویز ہوئی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ کھاتے پیتے لوگ رشوتیں دے کر زمین اپنے نام الاٹ کرا رہے ہیں اور ڈاکٹر جسٹر صاحب کی چٹ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ سابق مرکزی وزیر جناب رشید نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر ہم اقتدار میں آ گئے تو کچی آبادیوں کو مالکانہ حقوق پندرہ روز میں عطا کر دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ساڑھے پانچ سال میں یہ کام کیوں نہ ہوا! اور پانچ مرلہ اسکیم آج کیوں یاد آئی! یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر قومی اتحاد انتخابی میدان میں نہ اترتا اور اس کے منشور میں انقلابی اصلاحات شامل نہ ہوتیں تو مسٹر بھٹو کچی آبادیوں سے اسی طرح غافل رہتے جس طرح لامحدود اقتدار نے انہیں ساڑھے پانچ برس مدہوش رکھا تھا۔

مسٹر بھٹو غریبوں کے کیسے ہی خواہ کس قدر تھے اس کا مشاہدہ ان کے اندازِ حکومت اور ان کے معیارِ زندگی سے ہو سکتا ہے قوم کی دولت غریبوں اور ناداروں کی ناگفتہ بہ حالت سدھارنے کے بجائے، ایوانِ وزیر اعظم کے باورچی خانے اور غسل خانے حسین تر بنانے پر ضائع ہوتی رہی۔ اٹلی سے ماہرین منگائے گئے اور فرانس سے جام و سبو۔ اپنے دوروں کے لیے تین کروڑ کا طیارہ خریدا اور ۳۶ لاکھ کی بیش قیمت کار۔ ایوب خاں مرحوم نے اسلام آباد میں ایوانِ صدر تعمیر کرانا شروع کیا اور انہیں اس میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ بھٹو صاحب کے عہدِ اقتدار میں یہ سفید محل اور پھیل گیا اور تعمیری اخراجات بائیس کروڑ تک جا پہنچے۔ وہ ابھی یہ فیصلہ کرنے ہی والے تھے کہ اس عظیم الشان عمارت کا نام ایوانِ وزیر اعظم رکھا جائے یا وہ پارلیمانی نظامِ حکومت کے بجائے صدارتی طرزِ حکومت اختیار کر لیں کہ اتنے میں اقتدار کی مضبوط کرسی ان کے نیچے سے نکل گئی اور وائٹ ہاؤس میں رہنے کی حسرتیں دل ہی دل میں رہ گئیں۔ شاہانہ مزاج کے اعتبار سے جناب ایوب خاں اور حضرت بھٹو میں کیا فرق رہا؟ اگر بھٹو صاحب واقعی غریبوں کے دمساز تھے تو انہیں کفایت شعاری سے سادہ زندگی بسر کرنی چاہیے تھی۔ وہ تو اپنی چاہتوں اور آرزوؤں پر پیسہ پانی کی طرح بہاتے رہے اور عوام کے نام پر جتنے بھی ادارے قائم ہوئے۔ ان پر صرف غنڈے اوباش اور طالع آزما مسلط رہے اور استحصال کی بدترین

مثالیں قائم ہوئیں۔

ساڑھے پانچ سال کی پرچھائیوں نے جناب بھٹو کا یہ ایمج بہت واضح کر دیا کہ وہ الف لیلوی عہد کے ایک بگڑے ہوئے شہزادے ہیں۔

... ...

علی بابا اور چالیس چور کے قصے کتابوں میں پڑھے تھے مگر جیتے جاگتے کردار بھٹو شاہی کے عہد میں نظر آنے اور ان سے بھی زیادہ حسن بن صباح کا پُراسرار قلعہ اور اس کے خونخوار اور پُراسرار کارندے مصروفِ عمل پائے گئے ___ اور دلائی کیمپ جس میں ارشاد، تارڑ اور ان کے ساتھی رکھے گئے۔ موت کا جزیرہ جہاں خواجہ خیرالدین سسکنے کے لیے پھینکے گئے۔ شاہی قلعہ جس نے نوجوان طلبہ کو برہنہ بھی دیکھا اور بجلی کے تاروں میں جکڑا ہوا بھی اور چونا منڈی جو دہشت اور بہیمیت سے آباد ہے یہ سارے کے سارے مقامات عبدالحلیم شرر کے ناول "فردوسِ بریں" میں ہو بہو دکھائی دیتے ہیں۔ جناب بھٹو نے جسے اپنا حریف سمجھا، اس کا سر قلم کرا دیا۔ ڈاکٹر نذیر پنجاب میں ان کی قیادت کے لیے زبردست چیلنج بن گئے تھے، چنانچہ کھلے بازار میں شہید کر دیے گئے۔ خواجہ رفیق کی جرأت اور شجاعت شکستہ اور شکست خوردہ قوم کے اندر انقلاب کی روح پھونک رہی تھی، انہیں دن دیہاڑے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس جناب شفیع الرحمٰن نے اس قتل کی عدالتی تحقیقات کی اور پولیس اور انتظامیہ کے عجیب عجیب رویے سامنے آئے۔ حکومت نے تحقیقاتی رپورٹ صیغۂ راز میں رکھی اور عوام کے مسلسل مطالبے کے باوجود منظرِ عام پر نہ لائی۔ اس طرزِ عمل سے ایک ہی تاثر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قتل کی اس واردات میں خود حکومت ملوث تھی۔ جناب احمد رضا قصوری کے والد جس انداز میں قتل کیے گئے اور جن افراد نے اس گھناؤنے فعل میں حصہ لیا عدالت میں ان پر سے نقاب اٹھ رہا ہے۔ ایف ایس ایف کے تین اعلیٰ افسر گرفتار کیے جا چکے ہیں اور اصل مجرم عوامی عدالت سے ضرور سزا پائیں گے۔

لاہور کی سرزمین میں ایک نوجوان لڑکا نذیر بڑی قوت سے ابھرا تھا۔ اسے بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا ___ اور اس عہدِ پاکباز میں بہادر حروں کے ساتھ کیا بیتی؟ اوپر سے احکام صادر ہوئے کہ حریت و شجاعت کی شمع گل کر دی جائے۔ ایس پی سانگھڑ نے احکام کی بجا آوری سے

انکار کر دیا۔ ڈی ایس پی نے معقول سا عذر تلاش کر لیا۔ اور پھر ایک پنجابی پولیس انسپکٹر نے بلبلی دیا دی اور چھ آدمی خون میں نہا گئے۔ تاریخ کی یہ شرمناک ترین واردات مسٹر بھٹو ہی کے نامۂ اعمال میں سما سکتی ہے۔ اگر کوئی انسان ہوتا تو پھٹ جاتا اور زمین میں سما جاتا۔

جمہوریت کی روح آج چیخ چیخ کر پوچھتی ہے کہ ۲۳ مارچ ۷۳ء کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں کیا ہوا تھا اور ۱۶ ستمبر کو تاج پورہ لاہور نے کیسا حشر ساماں منظر دیکھا تھا۔ دونوں مقامات پر سیاسی جلسوں پر حکومت کے اہتمام و انصرام میں مسلح حملے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین منڈی بہاؤالدین سے مسلح آدمیوں کو بسوں میں ٹھونس کر لائے اور ادھر کیمل پور سے قاتلوں کے قافلے ــــــ وزیروں کی حمایت کا پھریرا اٹھاتے ہوئے حقائق شہادت دیتے ہیں کہ لیاقت باغ کا آپریشن جناب بھٹو کی نگرانی میں پروان چڑھا اور تکمیل کو پہنچا تھا۔

تاج پورہ کے خونی واقعات انہی کے اشارے سے ظہور میں آئے بچوں اور بوڑھوں کو پولیس نے جس بے دردی اور سفاکی سے روندا اور سارے علاقے کا محاصرہ کر کے جس بہیمانہ انداز میں بے دریغ گولی چلائی اس کے سامنے جلیانوالہ باغ کے مظالم بے معنی ہو کر رہ گئے اور جنرل ڈائر بننے کا شرف مسٹر بھٹو کو حاصل ہوا جو مغرب کی یونیورسٹیوں میں احترام انسانیت شائستگی اور رواداری کے جام پیتے رہے تھے۔

حضرت بھٹو بذاتِ خود پیپلز پارٹی سے ٹوٹ جانے والے افراد کو ٹیلی فون پر ان کی عورتیں اور بچے اغوا کر دینے کی دھمکیاں دیتے رہے۔ سابق صوبائی وزیر محمد ارشاد جن کو دلائی کیمپ کی گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ ان کے والد فوت ہو گئے۔ مصطفےٰ کھر نے ٹیلی فون پر مسٹر بھٹو سے رحم کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ ارشاد کو صرف ایک روز کے لیے رہا کر دیجئے مگر پتھر دل بے حس و حرکت رہا اور بڑی رعونت کے ساتھ ٹیلی فون بند کر دیا۔

کتنے ہی بے گناہ پولیس مقابلے میں ختم کرا دیے گئے۔ انسانی جان سب سے ارزاں ٹھہری خون پینا قائد عوام کا شعار بن گیا۔ جعلی انتخابات کے بعد جو ملک گیر تحریک اٹھی، اسے کچل دینے کے لیے پولیس اور ایف ایس ایف نے وہ وہ مظالم ڈھائے کہ دوسری جنگِ عظیم کی انسان دشمنی ماند پڑ گئی۔ لاہور میں ۹ اپریل بڑی سج دھج سے طلوع ہوا تھا اور خون کے سمندر میں غروب

ہوا۔ اس روز وردی میں ملبوس درندوں نے سوفٹ بلٹ سے جوانوں کے سینے زخمی کیے۔ وہ سوفٹ بلٹ جن کو حالت جنگ میں بھی استعمال کرنے پر جنیوا کنونشن نے پابندی عائد کر رکھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر ایک حکومت اپنے شہریوں پر یہ ہلاکت خیز گولیاں برساتی ہے تو اس کا جرم کسی طور پر بھی معاف نہیں ہو سکتا۔ سوفٹ بلٹ انسانی جسم کے اندر داخل ہونے کے بعد پھٹ جاتا ہے اور موت کو یقینی بنا دیتی ہے۔ چنانچہ ۹ اپریل کے زخمی دم توڑتے چلے گئے اور مسٹر بھٹو اپنی فتح پر مسکراتے اور رقص کرتے رہے۔

حکومت کی سرپرستی میں سیاسی لیڈروں کے قتل کے منصوبے اب کھلنے لگے ہیں۔ سب سے پہلے جناب نبی بخش ڈہری نے جو مسٹر بھٹو کے نہایت قریبی ہم راز، خلوتوں اور جلوتوں کے دم ساز تھے۔ ایک اخباری بیان کے ذریعے انکشاف کیا کہ پانچ لاکھ افراد کو تہ تیغ کر دینے کا منصوبہ تیار ہوا تھا مگر پیپلز پارٹی کے اندر بعض عناصر کی مخالفت نے اسے معطل کر دیا۔ گزشتہ دنوں جناب خالد رشید حیات آنریری ڈی ایس پی سی آئی اے ریلویز نے ایک درخواست آئی جی پولیس پنجاب کو دی کہ میری اور میرے بچوں کی جان کو تحفظ دیا جائے۔ انہوں نے اس درخواست کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ سابق وزیراعظم مسٹر بھٹو کے ایما پر پیر پگارا شریف کو پنجاب میں قتل کر دینے کا منصوبہ تیار ہوا اور یہ طے پایا کہ عبدالحفیظ پیرزادہ اسلحہ اور ٹرانسپورٹ اور طارق وحید بٹ قاتل فراہم کریں گے۔ آئی جی پولیس ریلویز جناب صفدر حسین خان نے مجھے اس منصوبے پر مامور کیا تھا اور یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں نے یہ راز فاش کر دیا تو مجھے اور میرے بچوں کو سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔

اس نوع کی درخواستیں اور بھی گزاری جائیں گی اور رازہائے سربستہ اور بھی عیاں ہوں گے۔ ہر شہر اور ہر گھر نے زخم کھائے ہیں اور روداد غم عاول کی زبانی سنی جا سکتی ہے، پردے جس قدر اٹھیں گے اس قدر ہلاکو اور چنگیز خاں پیچھے جائیں گے۔

خون کی تازہ تازہ بوندوں میں مسٹر بھٹو کا ایک ایک قصاب کا ہے۔ ایک قاتل کا ہے۔ ایک بین الاقوامی مجرم کا ہے۔

... ...

قومی زندگی کے ہر شعبے میں ابتری اور افراتفری پیدا کی گئی جو آخری مرحلے میں تباہی کی حد چھونے لگی۔ ترقی اور انقلاب کے نام پر ہر ادارہ ادھیڑ دیا گیا، کوئی بنیاد اور اساس باقی نہ رہی۔ توڑ پھوڑ کا عمل انتہائی تیز رفتار اور وسعت پذیر تھا۔ ایڈمنسٹریشن، اقتصادیات، تعلیم، نظام عدل وانصاف، جمہوری ادارے، معاشرتی رابطے اور بین الاقوامی ضابطے سبھی کے بھی ٹوٹ پھوٹ گئے اور ان پر ہر لحظہ آپریشن ہوتا رہا۔

سیاسی میدان میں مسلسل محاذ آرائی ہوتی رہی۔ ایک طرف اپوزیشن کے ساتھ اور دوسری طرف مرکز اور دو صوبوں کے مابین اس کے علاوہ قوم کو علاقائی اور طبقاتی سطحوں پر تقسیم کر دینے کا عمل ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بہت آگے بڑھا ایک شدید بحران کی سی کیفیت ہر آن محسوس ہوتی رہی۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی کوئی حادثہ ظہور میں آنے والا ہے۔

ایڈمنسٹریشن کے تمام اصول اور ضابطے بالائے طاق رکھ دیے گئے۔ آغاز ہی میں تیرہ سو افسر نکال دیے گئے" تاکہ دہشت پھیلے اور کسی کو صحیح بات کہنے اور کرنے کا حوصلہ نہ رہے۔ پھر سرکاری ملازموں سے آئینی تحفظ چھین لیا گیا، اعلیٰ مناصب پر فائز افراد کسی وقت بھی کوئی وجہ بتائے بغیر نکالے جا سکتے تھے، چنانچہ کئی بار نکالے گئے۔ اس کے پہلو بہ پہلو سیاسی بنیادوں پر نا اہل، بدکردار اور تعصبات میں دھنسے ہوئے افراد بڑے پیمانے پر نظم ونسق کا حصہ بنے۔ پورا ایڈمنسٹریشن سیاسی اغراض کے گرد گھومتا رہا۔ مرکزی سیکرٹریٹ میں بھٹو کے مخالف عناصر کے قلع قمع کے منصوبے تیار ہوتے رہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے ایف ایس ایف وجود میں آئی اے اور اسی قسم کے بیورو قائم ہوئے۔ انٹیلی جنس کا نظام ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا گیا، صوبائی حکومتیں عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے عوام کے نمائندوں کو شکنجے میں کستی رہیں یا پھر مسٹر بھٹو کے جلسے اور جلوسوں کے لیے فول تیار کیے جاتے رہے، بلند و بالا گیٹ تعمیر ہوئے اور لوکل باڈیز کی معتدبہ رقوم پیپلز پارٹی کے کنونشنوں پر اٹھ گئیں، چنانچہ شہر غلاظت اور گندگی کے اعتبار سے گاؤں نظر آنے لگے اور مکھیوں، مچھروں اور متعدی جراثیم کی یلغار ہوتی رہی۔ انسداد ملیریا کی بڑی بڑی رقمیں بھٹو صاحب کے یاران طریقت ہڑپ کر گئے اور یہ فلسفہ ایجاد ہوا کہ ملیریا پھیلانے والے مچھر باقی ہی نہیں رہے۔

ایڈمنسٹریشن کی بے خبری اور ڈھیلے پن کا یہ عالم دیکھنے میں آیا کہ چند افراد نے بہاول پور میں مرکزی حکومت کی ایک ایجنسی کا بورڈ لگایا، صدرِ پاکستان کا ایک جعلی آرڈیننس جاری کیا اور اس کے حوالے سے سرکاری محکموں اور بینکوں میں سرکاری سطح پر کروڑوں روپے کے حساب چلتے رہے اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ پیر ہمایوں گندم اسکینڈل کسے یاد نہیں؟ اس فراڈ میں مرکزی وزیروں کے علاوہ، ریلوے کے اعلیٰ افسر اور کئی سیاہ ہاتھ ملوث تھے۔ لطف یہ کہ پیپلز پارٹی نے جناب ہمایوں کو بڑی دھوم دھام سے اپنے اندر شامل کیا تھا۔ سیٹھ عابد کے حوالے سے حکومت نے کس قدر لرزہ خیز انکشافات کیے تھے مگر بات زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ باخبر حلقے کہتے ہیں کہ اس واردات کے نشانات جنابِ حفیظ پیرزادہ تک پہنچتے تھے۔

مسٹر بھٹو نے انتظامیہ کے اندر سیاسی اور مالی کرپشن کا جو زہر گھولا تھا، اس کے سنگین نتائج عام آدمی کو بھگتنے پڑے۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ میں زیادہ تر ڈرائیور سفارش یا رشوت پہ رکھے گئے یا انہیں سیاسی پشت پناہی حاصل تھی، چنانچہ جعلی ڈرائیونگ لائسنس تیار ہوتے رہے یا ٹریفک پولیس سے زبردستی حاصل کر لیے گئے اور ناتجربہ کار افراد کے ہاتھوں میں تیز بسیں دے دی گئیں۔ پھر کیا تھا! دیکھتے ہی دیکھتے گاڑیوں کے پنجر نکل آئے۔ کروڑوں روپے غبن ہو گئے اور آخری زمانے میں حادثات کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ پورا پاکستان کانپ اٹھا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ بو سب سے زیادہ محفوظ سواری سمجھی جاتی تھی موت کا نشان بن گئی۔ ایک ایک روز میں تین تین چار چار بڑے بڑے حادثے بلا مبالغہ ہزاروں کے لگ بھگ مسافر جاں بحق ہوئے اور زخمیوں کی تعداد تو کہیں زیادہ تھی۔ ستم کی بات یہ کہ وزراء، ڈرائیوروں کے خلاف سخت قدم اٹھانے کی جس قدر دھمکیاں دیتے رہے حادثات میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ لوگ سفر کے تصور سے خوف کھانے لگے۔ ایک عام آدمی کی آنکھوں میں ان دنوں جو دہشت اور بیچارگی سمٹ آتی تھی وہ دیکھی نہ جاتی تھی۔

... ...

ایڈمنسٹریشن کھوکھلا تھا، بے بس تھا اور عوام سے بے نیاز۔

معاشی تباہی کا آغاز اس روز سے ہو گیا تھا جب پاکستانی سکے کی قیمت غیر متوازن طور پر کم کر دی گئی۔ مسٹر ایم ایم احمد جاتے جاتے پاکستان سے انتقام لے گئے اور مسٹر بھٹو جو اقتصادیات کی ابجد سے واقف نہ تھے، اس جال میں پھنس گئے۔ دوسرا وار بنیادی صنعتوں کو اچانک قومی تحویل میں لینے سے ہوا۔ اس آپریشن کی پشت پر بھی بنیادی طور پر انتقامی جذبہ کار فرما تھا۔ پاکستان کی بدقسمتی دیکھیے کہ عوامی حکومت کے پہلے وزیر خزانہ جناب ڈاکٹر مبشر حسن بنے جن کے اندر مالیاتی نظام کو سمجھنے کی ذرا صلاحیت نہ تھی، چنانچہ وہ اشتراکی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی خاطر بحران پر بحران اٹھاتے چلے گئے۔ صنعت میں بحران، زراعت میں بحران اور سارے مالیاتی امور میں بحران۔ انہوں نے کاشتکاروں اور زمینداروں میں بے چینی پیدا کرنے کے لیے کپاس کی ایسی پالیسی مرتب کی جس نے پنجاب اور سندھ کی زرعی معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ ٹیکسٹائل کی صنعت تباہ ہو جانے سے بھارت نے پاکستان سے عالمی مارکیٹ چھین لی۔ صنعتکاروں کو ایسے تند و تیز لہجے میں لتاڑا اور بے عزت کیا کہ وہ اقتصادی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ تربیلا ڈیم کے اندر جب پہلا شگاف پڑا، اس وقت ڈاکٹر مبشر حسن تربیلا کے آپریشن روم میں براجمان تھے اور ان کی ہدایات کے مطابق پانی چھوڑا جا رہا تھا۔

جناب فیروز قیصر جو معمولی درجے کی صلاحیت کے مالک ہیں انہیں اقتصادی امور کا مشیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے وہ وہ نئے تجربے کیے کہ معاشیات کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ رہی سہی کسر آٹا پیسنے اور چاول چھڑنے کے عمل کو قومی تحویل میں لینے سے پوری ہو گئی۔ اضطراب منجمد اور معیشت تحلیل ہو گئی۔

عدالتی نظام ضرب پر ضرب کھاتا رہا، تعلیمی ادارے علم و اخلاق کی قتل گاہیں بنیں، احتساب آبلہ پا، پریس سنگسار زیرِ لب پارلیمنٹ کی چیخ چیخ اور کھوکھلی آواز۔ دل بھی تباہ اور نظر بھی تباہ۔

مسٹر بھٹو قوم کے لیے تباہی کا چارٹر لے کر آئے تھے، آج بھی اس پر عمل جاری ہے۔ بیس سالہ سیاسی زندگی ان کا یہی ایچ پیش کرتی ہے۔

... ...

گزشتہ پانچ چھ برسوں میں شاہ خرچیوں کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا، ایک ایسا ریکارڈ جسے شاید ہی کوئی توڑ سکے. مسٹر بھٹو یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود جبلی طور پر ایک ہمہ جہتی وڈیرے ہی ہیں. انہوں نے پاکستان کو اپنی جاگیر بنا لیا تھا. جو چاہتے بخش دیتے جس کو چاہتے نواز دیتے. قومی خزانہ ان کی ذاتی ملکیت بن چکا تھا کوئی ضابطہ کوئی قانون. اقتدار سے ہم آغوش ہونے والی پہلی رات کو یہ مژدہ سنایا کہ وہ پانچ اور دس سالہ منصوبوں پر یقین نہیں رکھتے. اسلام آباد کی سرسبز و شاداب فضا میں منصوبہ بندی کمیشن کی ایک رفیع الشان عمارت ایستادہ ہے، ایک زمانے میں وہاں چوٹی کے اقتصادی ماہرین کا اجتماع رہتا تھا اور طویل المیعاد منصوبے تیار کیے جاتے. حضرت بھٹو اپنے آپ کو مافوق الفطرت قائد تصور کرتے تھے، چنانچہ ان کے لیے اقتصادی ماہرین کی پابندیاں ناقابلِ برداشت تھیں. حالات کے دباؤ نے انہیں کئی بار منصوبہ بندی پر مجبور کیا اور خاص خاص صنعتوں کے لیے ورکنگ گروپس مقرر ہوئے. انہوں نے لاکھوں روپے صرف کرکے ایک رپورٹ مرتب کی اور جب وہ وزیر اعظم کو پیش کی گئی تو انہوں نے کڑے احکام جاری کیے کہ اس کو ہوا تک نہ لگنے پائے، ساری محنت اور سارا پیسہ اکارت گیا. ایک ڈیڑھ برس بعد بھٹو صاحب کے ذہن میں ایک لہر اور اٹھی اور از سرِ نو منصوبہ بندی کا کام شروع ہوا. اس بار بھی وہ کسی بات پر ناراض ہو گئے اور بیش قیمت رپورٹ سرد خانے میں پھینک دی.

منصوبہ بندی سے یہ پیکرِ خودی اس لیے الرجک تھے کہ وہ ہاتھ پاؤں باندھ دیتی ہے. اور سرمائے کے اخراج کا ایک راستہ متعین کرتی ہے. وڈیرے راستوں کے کب پابند ہوتے ہیں؟ جناب بھٹو نے ترنگ میں آکر کہیں کارخانہ لگوا دیا اور کہیں میڈیکل کالج کھلوا دیا. اس بات کا جائزہ لیے بغیر کہ علاقے کی حقیقی ضروریات کیا ہیں. سیاسی بنیادوں پر زرعی بینک سے کروڑوں روپے کے قرضے جاری ہوئے جن کی وصولی تقریباً ناممکن ہے. بتایا جاتا ہے کہ نواب صادق حسین قریشی کو خوش کرنے کے لیے سیکشن کے کارخانے منظور ہوئے اور مسٹر بھٹو نے اپنی انتخابی نشست کو مضبوط بنانے کے لیے چیکوں کے ذریعے تین کروڑ کی امداد تقسیم کی، حالانکہ اس بار لاڑکانہ میں سیلاب کا پانی داخل ہی نہ ہوا تھا.

منصوبہ بندی کے بعد دوسرا کاری وار آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس پر ہوا۔ یہ محکمہ تمام سرکاری محکموں کا حساب کتاب رکھتا ہے اور اس بات کا جائزہ لیتا رہتا ہے کہ اخراجات قانون اور ضابطے کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اس رقیب روسیاہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے عجب عجب تدبیریں ہوئیں۔ ۱۹۷۲ء کے بجٹ میں ۲۰ ارب روپے کی رقم سرے سے غائب تھی۔ یہ رقم بجٹ سے باہر خفیہ مقاصد کے لیے رکھی گئی تھی۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا سنگین ترین قومی جرم تھا۔

یہ کثیر رقم ضمیروں کی خرید و فروخت، مد مقابل کی توڑ پھوڑ اور انسانی حقوق کی پامالی کے لیے استعمال ہوئی۔ اس کے علاوہ پنجاب کے سسپنس اکاؤنٹس سے فقط دو برس میں پچاس کروڑ وزیراعظم کی خفیہ چٹوں سے تقسیم ہوئے۔ ہم مسٹر بھٹو کے عہد کو بجا طور پر چٹ بازیوں کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ ۷۳ء میں سیلاب آیا تو گورنر ریلیف فنڈ قائم ہوا۔ مسٹر کھر دستور بن جانے کے بعد وزیراعلیٰ کی حیثیت سے مسلط کیے گئے تھے اور انہیں گورنر ریلیف فنڈ کو تقسیم کرنیکا اختیار نہ رہا تھا، مگر انہوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے قانون اور کمیٹی کی تشکیل میں ردوبدل کیا اور وہ چٹ ایشو کر دیتے کہ فلاں صاحب کو پانچ ہزار روپے دے دیے جائیں۔ چٹوں کا ہجوم بڑھتا گیا اور ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور فنڈ کے سارے پیسے پیپلز پارٹی کے حلقۂ یاراں میں بٹ گئے۔

زلزلے اور سیلاب کے سلسلے میں جس قدر بیرونی امداد آئی وہ چٹوں ہی کے ذریعے اپنوں میں تقسیم ہوئی۔ کوئی حساب نہ کتاب۔

سیکرٹ فنڈ کا دائرہ جناب بھٹو کے عہد اقتدار میں بہت وسیع ہو گیا تھا۔ بجٹ کا تو فقط ایک نام تھا اور اس میں حکومت جب چاہتی کتر بیونت کر لیتی۔ قومی اسمبلی کی منظوری کے بغیر ہی نئے نئے ٹیکس نافذ ہو جاتے اور پھر شاہ خرچیاں پوری نہ ہوتیں تو دوسرے طریقوں سے شہریوں کو نچوڑ لینے کے بہانے تلاش کیے جاتے۔ اس کے علاوہ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ کر بیچ لی جاتیں، ریل کے انجن اور بحری جہاز ہضم کر لیے جاتے۔

آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کو بے اثر بنانے کے لیے حکومت نے بڑی تعداد میں کارپوریشن قائم کیے۔

ان کے معاملات اس محکمے کے دائرۂ اختیار سے باہر تھے۔ مسٹر بھٹو نے جس کو سیاسی رشوت دینا چاہی اسے بھاری تنخواہ پر کارپوریشن میں ایک اچھی سی ملازمت دے دی۔ قوم کی دولت یہی جونکیں چوس گئیں۔

اخراجات پر موثر قدغن نہ ہو تو اچھے اچھے بہک جاتے ہیں۔ واضح قرائن یہی کہتے ہیں کہ بہتی گنگا میں مسٹر بھٹو نے بھی اشنان کیا اور ان کے چیلے چانٹوں نے بھی۔ پلاٹ، پرمٹ لائسنس نے نو دولتیوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جسے نہ وطن سے محبت تھی اور نہ رائے عامہ کا پاس۔ ہر بڑے اور بڑے سودے میں پیپلز پارٹی کے حسن صاحبوں کا ایک حصہ مخصوص تھا۔

مسٹر بھٹو نے قومی خزانے کی حفاظت کے جملہ انتظامات ختم کر دیے اور یوں چور دروازے کھلتے چلے گئے۔ اس پس منظر میں یہ بات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ انہوں نے کتنا زرِ مبادلہ کس کس ملک کے بنکوں میں خفیہ طور پر جمع کر رکھا ہے۔ واقفانِ حال اٹلی اور ناروے کا ذکر کرتے ہیں اور بالکل آخری دنوں میں جناب یوسف بچ کا سفیر کی حیثیت سے سوئٹزرلینڈ میں تقرر اذہان میں ان گنت سوالات اٹھاتا ہے۔

مسٹر بھٹو کا عہدِ اقتدار ایک لٹیرے اور ایک وڈیرے کا عہدِ اقتدار نظر آتا ہے۔

... ...

انسان قادرِ مطلق بن جائے تو پھر عوام کا وہی حال ہوتا ہے جو پچھلے پانچ چھ برسوں میں اہلِ پاکستان کا ہوا۔ ہر شے پر ذاتی تسلط جمانے کی خواہش نے حضرت بھٹو کو پاگل سا بنا دیا تھا۔ قرض میرے انگوٹھے کے نیچے رہے اور میں جب چاہوں کمانڈر انچیف کو نکال باہر کروں۔ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان اس مچلتی خواہش کا شکار ہوئے۔ جرنیلوں کی ایک بڑی کھیپ چشم زدن میں صاف کر دی گئی۔ دفاعی سازوسامان کی خریداری پر پروڈکشن ڈویژن نے قبضہ کر لیا جس کے سربراہ مسٹر بھٹو کے قریب ترین دوست تھے۔

پورے ملک کا ایڈمنسٹریشن ان کے اشارۂ ابرو کا منتظر رہتا تھا۔ نہایت معمولی باتیں پرائم منسٹر ہاؤس میں طے پاتی تھیں۔ صوبائی حکومتیں ہر سال اربوں روپے خرچ کرنے کے باوجود ایک

بے جان مشین کی مانند تھیں جسے مسٹر بھٹو خود چابی دیا کرتے تھے۔ آن کی آن میں صوبے کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا، کسی وزیر اعلیٰ کو کان سے پکڑ کے باہر کیا، گورنر جوتیوں کی طرح بدلتے رہے۔ مختلف صوبوں میں صدارتی راج نافذ ہوتا رہا اور وزیر مشیر بن گئے۔ انٹیلی جنس کے اہم لوگوں سے ذاتی رابطہ قائم رکھتے اور گورنروں، وزیروں اور چیف سیکرٹریوں کو نظر انداز کر کے بلاواسطہ احکام دیتے۔ سندھ میں ان کے سب سے زیادہ قابل اعتماد آدمی مسٹر جنیجو تصور کیے جاتے تھے۔ وہ تھے تو ہوم سیکرٹری، مگر غلام مصطفیٰ جتوئی بھی سانس لینے کی اجازت ان سے حاصل کرتے۔ پنجاب میں بریگیڈیئر منظور ملک سیاہ و سپید کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ وہ اپنے آقا کے اس قدر وفادار اور ہمہ وقت اطاعت گزار تھے کہ جب ان کی اہلیہ انتہائی کرب کے عالم میں زندگی کے آخری سانس لے رہی تھیں تو وہ انہیں اسی حالت میں چھوڑ آئے کہ بڑے صاحب کا بلاوا آیا ہے۔

تمام سیاسی اختیارات مسٹر بھٹو نے اپنی جیب میں ڈال رکھے تھے اپوزیشن کی بات تک سننے کو تیار نہ تھے۔ ایک مخالف آواز ان کے تن بدن میں آگ لگا دینے کے لیے کافی تھی چنانچہ یہ منظر بھی چشم فلک نے دیکھا کہ حزبِ اختلاف کے قائدین قومی اسمبلی سے باہر پھینکے جا رہے ہیں اور پولیس زدوکوب کر رہی ہے۔

زندگی کا ہر شعبہ حضرت بھٹو نے اپنی مضبوط گرفت میں لے رکھا تھا۔ عوام کے اندر کہاں کہاں بغاوت کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں، اس امر کا جائزہ لینے کے لیے صحافیوں اور وکیلوں اور خواتین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بعض اولوالعزم صحافی جیبوں میں ٹیپ ریکارڈ لیے پھرتے تھے اور مختلف آوازیں محفوظ کر کے مسٹر بھٹو تک پہنچا دیتے۔ کسی کی ڈاک محفوظ تھی نہ گھر ایسے آلات درآمد کیے گئے تھے جو ایک خاص فاصلے تک کی گفتگو ریکارڈ کر سکتے تھے۔ پھر خطوط بلیک میل کیے جاتے اور انہیں سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا۔

ایک عام شہری ہر کام ہر مقام پر حکومت کا دست نگر تھا۔ ملازمتوں کے سارے دائروں پر مسٹر بھٹو قابض تھے۔ تجارت و صنعت کے تمام سرچشمے ان کی مٹھی میں۔ ابلاغ عامہ کے جملہ ذرائع ان کے اختیار میں۔ ملک سے باہر جانے کے لیے ان کا پروانہ لازمی ضروری، جھوٹے مقدمات

سے گھو غلاص ان کی اجازت کے بغیر نامکمن تعلیمی ادارے ان کی نگاہ و فیض کے محتاج۔

جناب بھٹو ایک ہی بڑی تمنا رکھتے تھے کہ لوگ ان کے پاس بھکاری بن کے آئیں اور وہ ان کی جھولی میں کچھ ڈال دیں کسی کی عزت نفس پر چوٹ لگا کر انہیں بے حساب خوشی ملتی تھی۔ ان کے مقربین نے پوری طرح یقین دلا دیا تھا کہ حضور! اب آپ کی اجازت کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا اور آپ جسے چاہیں عزت بخش دیں اور جسے چاہیں ذلیل کر ڈالیں۔ زندگی بخش دینے اور زندگی چھین لینے کے بھی بعض مقامات پر تجربے ہوئے تھے۔

تاریخ کی گہری سیاہ لکیر پر جناب بھٹو ایک فرعون، ایک نمرود اور ایک شداد کا ہیولا بن کے ابھرے تھے۔

... ...

معاشرے میں اخلاقی اور جنسی بگاڑ پیدا کرنا بھی غالباً بھٹو صاحب کے مشن میں شامل تھا۔ جس روز غلام مصطفیٰ کھر گورنر بنے بیان کیا جاتا ہے کہ شاہی محلے کی طوائفوں نے گھی کے چراغ جلائے تھے کہ اب ہمارا ماما حاکم بن گیا ہے.... ہو سکتا ہے اس روایت میں قدرے مبالغہ ہو، مگر اصل واقعات روایت کو بہت پیچھے چھوڑ گئے۔ امریکہ میں ایک وائٹ ہاؤس ہے جس میں صدر رہتا ہے مگر پاکستان میں قدم قدم پر وائٹ ہاؤس نظر آئیں گے۔ سابق وزیراعظم نے اپنی شان و شوکت بڑھانے اور اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے گیسٹ ہاؤسوں سرکاری ریسٹ ہاؤسوں اور گورنر ہاؤسوں کا ایک وسیع نظام قائم کیا۔ پنجاب ہاؤس اور سندھ ہاؤس مختلف شہروں میں تعمیر ہوئے۔ ان میں مے خواری اور شب باشی ہوتی رہی۔ کراچی میں خطیر رقم سے اسپورٹ کمپلکس سجایا گیا۔ یہاں اہل ہوس کی آگ بجھانے کے لیے ملک بھر سے لڑکیاں لائی جاتی تھیں۔ نابکاروں نے لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں میں نقب لگائی تھی اور وہ خواتین اساتذہ کے ذریعے خاندانوں کے خاندان تباہ کرتے رہے۔ اس حیا سوز کاروبار میں حکمران ٹولے کے سبھی کرتا دھرتا شامل تھے۔ عورت کی عزت لوٹنا بھٹو شاہی کا سب سے دل پسند مشغلہ قرار پایا تھا تقریباً ہر اہم وزیر اور مشیر نے تین تین چار چار شادیاں رچائیں۔ ان سب ورق زدہ سوشلسٹ وزیروں نے بھی جو ایک سے زیادہ شادی کو رجعت پسندی کی علامت کہتے تھے بھٹو اور حسنی کے

شاخسانے زبان زدِ عام ہیں۔

عوامی حکومت کے عہد پاکباز میں کی کلب (KEY CULB) زوروں پر فروغ پائے۔ اور یہی وہ عہد سعید تھا جس میں کراچی کو بیروت کی طرح جدید ترین عشرت کدہ بنانے کا پروگرام وضع ہوا اور وزیر اعظم اور وفاقی اور صوبائی وزیروں نے آوارگی کے رجحان کو عملی طور پر تقویت پہنچائی۔ جناب بھٹو نجی محفلوں میں اپنے وزیروں کی بیویوں کے متعلق عجب عجب فقرے چست کرتے انہیں زبان درازی سے روکنے والا کون تھا؟ بھٹو کلچر نے ایسی مائیں اور ایسے باپ پیدا کرد یے جو اپنی بیٹیوں کو خود پیش کرنے آتے اور ملازمتوں، ترقیوں اور لائسنس سے لدے پھندے لوٹتے۔ یہ قبیح کام ہر سطح پر بڑے نظم کے ساتھ ہوتا رہا۔

غنڈے اور اوباش اثر و نفوذ کی کرسی پہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے قانون کا شرف و مجد جس درندگی سے تار تار کیا، اس کی مثال شرفاء کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جوانوں کے شہوانی جذبات بھڑکانے کے لیے ٹیلی وژن پر نیم عریاں رقص دکھائے گئے۔ ریڈیو سے ہیجان انگیز گانے نشر ہوئے۔ حکومت نے خود مار دھاڑ اور جنسی انارکی پھیلانے والی فلمیں درآمد کیں۔ فحش پنجابی فلموں کی سرپرستی ہوئی۔ فحاشی اور اخلاقی ابتری کو ہوا دینے والے رسائل جناب نصرت بھٹو کی آنکھ کا کاجل بنے۔

سرکاری اور نیم سرکاری دفتروں میں خواتین کی زیادہ تر بھرتی خوبصورتی اور دوستی کی بنیادوں پر ہوئی۔ انہی عنایات سے جناب حفیظ پیرزادہ کا رومان شروع ہوا اور تنگ و تاریک راستوں سے گزرتا ہوا شادی پر منتج ہوا۔ وزارت اوقاف کے مرکزی دفتر اسلام آباد میں ایسی خواتین بھی پے رول پر تھیں جو مختلف شہروں میں رہتی تھیں اور انہوں نے دفتر کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ ہر بڑے دفتر کے ساتھ اسی نوع کے حرم وابستہ تھے۔ سر ممتاز بھٹو پنجابی عورتوں کے بارے میں جو غلیظ باتیں کہتے رہے اور جناب کھر ان باتوں میں جو رنگ بھرتے رہے اس سے ان کی آلودگیوں کا صحیح صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ عرب شیوخ کو پاکستانی لڑکیاں فراہم کی گئیں۔ خواتین کو کنیزوں اور خادماؤں کی حیثیت میں ملک سے باہر بھیجنے کا شرف جناب بھٹو ہی کے

حصے میں آیا۔

آنکھیں ان مناظر پر اشکبار ہوئیں اور دل لہو بن کر بہتے رہے۔

جناب بھٹو نے قوم کو غنڈوں کی حکومت کا ایج دیا اور جب رشتۂ اقتدار ٹوٹا تو شریف زادوں نے سکھ کا گہرا سانس لیا۔

...   .

مکاری اور عیاری میں جناب بھٹو ہو بہو میکیاولی کے شاہزادے لگتے تھے۔ ہر بات میں فریب اور ہر قول میں جھوٹ کی آمیزش اقتدار چالبازی سے حاصل کیا اور پھر پورے زمانۂ اقتدار میں وہ بڑے بڑے جھوٹ کمال ڈھٹائی سے بولتے رہے اور ریڈیو اور ٹی وی نے وہ سارے جھوٹ، سچ کی صورت میں ان پڑھ لوگوں کے ذہن میں اتار دیئے۔

غریبوں کو فریب دیا گیا کہ فقط آپ کے لیے زندہ ہوں مگر مہنگائی کے ذریعے زندگی ایک عذاب بنا دی گئی۔ افواج پاکستان کو جدید ترین اسلحے سے لیس کر دینے کے لمبے چوڑے وعدے ہوتے رہے مگر خریدے گئے وہ شکستہ جنگی جہاز جن کی مرمت کے لیے قیمت خرید سے دگنا زرِ مبادلہ درکار تھا۔ ادھر جدید ساز و سامان ایف ایس ایف کے حوالے کر دیا گیا۔ صنعتکاروں کو یقین دلایا گیا کہ اب کوئی صنعت قومی تحویل میں نہ لی جائے گی مگر بعد میں تمام زرعی صنعت پر قبضہ کر لیا گیا۔ شہریوں کو مژدہ ملا کہ اشیائے صرف ارزاں ہو جائیں گی مگر اقدامات سارے ایسے کیے جن سے مہنگائی میں اضافہ ہی ممکن تھا۔

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عوامی حکومت کی طرف سے یوم آزادیٔ صحافت منایا گیا اور زیادہ سے زیادہ اخبارات و جرائد کے گلے اس نے گھونٹے۔ طلبہ کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار کی کرسی تک پہنچنے والے مسٹر بھٹو طالب علموں کو گولیوں کا نشانہ بناتے رہے، ڈی پی آر کے تحت اذیت دیتے اور شاہی قلعے میں لوٹ مار کرتے رہے۔ ایک طرف خواتین کی عظمت اور آزادی کی باتیں اور دوسری طرف پولیس نے طالبات کے دوپٹے پھاڑ ڈالے اور بے دردی سے لاٹھیاں برسائیں اور جدید ترین رائفلیں تان لیں۔

مسٹر بھٹو نے اپوزیشن کے ساتھ کئی بار مذاکرات کیے۔ اندر کچھ طے کرتے اور باہر آ کر کچھ اور

بیان داغ دیتے۔ معاہدہ کرتے وقت پاکستان کی سالمیت اور وحدت کے نام پر اپوزیشن سے مراعات حاصل کر لیتے اور بعد میں زہر آلود پروپیگنڈہ کرنے لگتے فوج کے شدید اور مسلسل دباؤ کے نتیجے میں جب مسٹر بھٹو نے اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات شروع کیے تو وہ اپنے وزیروں اور مشیروں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ میں ان بے وقوفوں کو ایک ایسا پلٹا دوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ حفیظ پیرزادہ صاحب بھی چپکے ہی کی نوید سناتے رہے اور سناتے سناتے خود سو گئے۔

عام انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلیوں کا ارتکاب مکر و فریب کا شاہکار تھا۔ اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی حاجت نہ رہی۔ بھٹو جی عذرِ گناہ بد تراز گناہ ثابت ہوئے اور پوری دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ یہ شخص حقیقت میں کیا ہے اور اس کے انگ انگ میں جھوٹ کتنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان کے بارے میں آج کل ایک دلچسپ حکایت نگری نگری اور بستی بستی سفر کر رہی ہے وہ یہ کہ جب کوئی شخص حضرت بھٹو سے معانقہ کرتا ہے تو بعد میں اپنا ہاتھ غور سے دیکھتا ہے کہ میری کوئی انگلی غائب تو نہیں ہو گئی؟

... ...

سیاست میں تعلقات کے دائرے بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ مگر جناب بھٹو نے مطلب براری اور بے وفائی کے زہریلے تیر تاریخ کے سینے میں گھونپ دیے۔ انسانی رشتوں کی انہیں ذرا قدر نہیں۔ دوستی کے پیمانے اقتدار کی شرح سے تیار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی ذات اور ان کی سیاسی قوت کو استحکام بخشتا ہے تو وہ ان کا عزیز ترین دوست ہے اور اگر عزیز ترین دوست میں خود اعتمادی یا خود آگاہی کی ذرا سی لہر بھی نظر آئی تو اس کی چیر پھاڑ میں انہیں ذرا تامل نہ ہو گا۔ وہ کامل بے ہر دگی اور سو فیصد غلامی کا تقاضا کرتے ہیں۔

جنرل گل حسن اور ائیر مارشل رحیم ان چند افراد میں سے ہیں جنہوں نے یحییٰ خاں کو اقتدار سے ہٹ جانے اور بھٹو صاحب کو حکومت سونپنے پر مجبور کیا تھا۔ جناب بھٹو نے پہلی فرصت میں اپنے محسنوں پر کاری وار کیا اور پستول کی نال پر استعفے طلب کیے۔ معراج محمد خاں اور مختار رانا نے مزدوروں میں جناب بھٹو کے لیے بڑی گرم جوشی سے کام کیا تھا اور بعض مواقع پر حدود بھی

پھلانگ گئے تھے۔ ان کے سیاسی آقا نے انہیں جیل میں ڈال دیا اور اس قدر اذیت دی کہ معراج محمد خاں پارٹی سے محروم ہو گئے۔ جے اے رحیم نے پارٹی کے لیے خون جلایا اور ذہنی اور تنظیمی فضا فراہم کی۔ اس وفاداری کی پاداش میں انہیں مسٹر بھٹو کے ایما پر سید احمد خاں نے گھر جاکر بری طرح زدوکوب کیا اور ان کے بیٹے کو بھی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ تالپور برادران نے سندھ میں مسٹر بھٹو کے لیے شب و روز کام کیا تھا، وہ بھی گردن زدنی ٹھہرے۔ پنجاب میں مصطفےٰ کھر نے حق نمک ادا کرنے کے لیے اپنا سب کچھ رہن رکھ دیا مگر ایک مرحلے پر ٹکراؤ ہوا اور سیاسی مصلحتوں کے تحت پھر یارانہ قائم ہوا۔ جناب محمد حنیف رامے نے ہفت روزہ نصرت اور بعد ازاں روزنامہ مساوات کے ذریعے مسٹر بھٹو کو قائدِ عوام بنایا اور اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتیں ان کے قدموں میں بچھا دیں، مگر صنم تم گر اور بے وفا نکلا اور حنیف رامے کو اپنی ہی پلکوں سے خود شناسی کی سوئیاں نکالنا پڑیں۔

عطاء اللہ مینگل سے مسٹر بھٹو کی نیم شبانہ کی دوستی تھی اور بزنجو خلوتوں کے راز دار تھے، مگر جب انہوں نے اقتدار میں شریک ہونا چاہا تو آنکھیں بدل لینے میں ایک لمحہ بھی حائل نہ ہوا پھر دشمنی یہاں تک بڑھی کہ عطاء اللہ مینگل کے لڑکے اسد کو جبری طور پر اغوا کر لیا گیا اور ایک لمبے عرصے تک اس کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا۔

سردار شیر باز خاں مزاری جناب بھٹو کے لندن میں ہم مکتب تھے۔ گہری دوستی اور محبت کی فراوانی ـــ لیکن جب سردار صاحب نے اپوزیشن کی راہ منتخب کر لی تو ان پر مصطفےٰ کھر نے مسلح حملے کرائے، فصلیں جلوا دیں اور مسلسل طاقت کا استعمال ہوتا رہا۔ جناب مزاری یہ سارے مظالم بڑی جی داری سے سہہ گئے اور بھٹو صاحب کی سیاسی طاقت کو بار بار چیلنج کیا وہ طیش میں آ گئے اور مزاری کے بڑے لڑکے پر قاتلانہ حملہ کرا دیا۔ قدرت نے حفاظت کی اور بد باطن کا وار خالی گیا۔

ان حالات کے پس منظر میں جناب مفتی محمود کا یہ الزام بڑی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی مقاصد کی خاطر جناب بھٹو نے اپنے عزیز ترین دوست شیر پاؤ کو موت کی نیند سلا دیا۔ اس المیے کے بغیر نیپ اور ولی خان پر بھرپور وار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

... ...

جیکل اینڈ ہائیڈ کی یہی کہانی جناب بھٹو کے ساڑھے پانچ سالہ عہد اقتدار نے مرتب کی ہے۔ جناب بھٹو دو چہروں اور دو شخصیتوں کے مالک تھے۔ عوام کے لیے ایک چہرہ، خواص کے لیے دوسرا۔ اندر کی شخصیت اور باہر کی شخصیت کچھ اور۔ یہی وجہ ہے کہ سادہ لوح عوام کو انہیں صحیح طور پر پہچاننے میں بہت دیر لگی اور پڑھے لکھے افراد بھی طویل عرصے تک مغالطے میں پڑے رہے۔

بھٹو صاحب محفل کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ فوجی افسروں سے باتیں کرتے ہوئے آداب کا لحاظ کرتے، اچھی انگریزی بولتے اور مہذب اطوار سے مخاطب کا دل موہ لیتے۔ سرکاری افسروں کے ساتھ ان کا رویہ تحکمانہ ہوتا۔ ان کے سامنے تاریخ کی باتیں بار بار دہراتے۔ کسی خاص سبجیکٹ پر اچھی طرح تیار ہو کر آتے اور اپنی علمی وجاہت سے برتری کا سکہ جما لیتے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ ان کا لب ولہجہ نہایت شیریں ہوتا۔ بین الاقوامی معاملات پر بحث چھیڑ دیتے اور اپنی زندگی کے تجربات سنانے لگتے اور یوں اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیتے۔

بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنی ذات کا امیج ابھارتے، پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل شاندار بتاتے، اپنے کارنامے گنواتے اور انسانی قدروں، بین الاقوامی اصولوں اور اخلاقی ضابطوں کا حوالہ دیتے اور امن اور انصاف کے راگ الاپتے اور یہ تاثر دیتے کہ وہ تاریخ کے نشیب و فراز پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

غیر ملکی نامہ نگاروں سے ان کی گفتگو بڑے لب ولہجے میں ہوتی بڑے فخر سے کہتے میں نے ایک متفقہ دستور نافذ کیا ہے، ملک میں جمہوری ادارے بڑی کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔ پریس کو اتنی آزادی حاصل ہے جس قدر ایک ترقی پذیر معاشرے کے لیے ضروری ہے فرد کو بنیادی حقوق حاصل ہیں، عدالتیں آزادی سے کام کر رہی ہیں اور ہم اپنے پڑوسی ملکوں سے برابری اور دو طرفہ تعلقات کی بنیاد پر دوستی استوار کر رہے ہیں۔ بھٹو صاحب کا یہ ایک چہرہ تھا۔ اسی چہرے کے ایک اور شیڈ کا مشاہدہ کیجیے:

عوام کے سامنے آتے تو ان کے مزاج میں ڈھل جاتے۔ کرتا شلوار، بازو اوپر کو اٹھے ہوئے اور منہ سے جھاگ کے فوارے چھوٹتے ہوئے۔ دو دو، تین تین گھنٹے اسٹیج پر اچھلتے کودتے اور وہ باتیں کرتے جن سے غریب عوام کے اندر خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ جاتی بے سروپا اور منفرد سے عاری باتیں، مگر پسے ہوئے طبقوں کے دل کی آواز۔ وہ تقریر کرتے ہوئے جوشِ خطابت میں کوٹ اتار کر پھینک دیتے، آستینیں چڑھا لیتے اور مختلف لیڈروں کی نقلیں اتارتے، کبھی بلیوں کی آوازیں نکالتے اور کبھی چوہوں کی سی۔ پھر خود ہی تالیاں بجاتے۔ ان کا مقصد حاضرین کو مسحور کرنا اور اپنے مطلب کی بات منوا لینا تھا۔ یہ اندازِ خطابت ان کی شخصیت پہ اس قدر حاوی ہوا کہ قومی اسمبلی کے اندر بھی یہی رنگ جما اور ریڈیو اور ٹیلی وژن سے خطاب کرتے ہوئے بھی یہی انداز اختیار کیا۔ وہ اس انداز کو کلیدِ کامیابی تصور کرتے تھے۔

... ...

— اور جناب بھٹو کا دوسرا چہرہ جو ان کا اصل اور حقیقی چہرہ تھا، اسے دیکھنے کی ہمت کم ہی لوگوں میں ہو گی۔

وہ اپنی ذات کے زبردست پرستار تھے۔ اپنے سوا کوئی اور نہ بھاتا۔ دکھاوے کے لیے کہتے رہتے کہ مجھے زیادہ اہمیت نہ دی جائے، مجھے پبلسٹی سے نفرت ہے، میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ ہوائی اڈے پر میرا پرشکوہ استقبال کیا جائے، مگر حقیقت بالکل برعکس تھی۔ وہ اپنی پبلسٹی کے بارے میں جس قدر حساس تھے، شاید کوئی اور صدر اور وزیرِ اعظم اتنا حساس نہ ہو گا۔ ایک آدھ اخبار کے سوا تمام کے تمام کالم نگار عوام کے لیے رطب اللسان۔ ریڈیو پر قائدِ عوام کے ارشادات یوں نشر کیے جاتے رہے جیسے وہ قائدِ اعظمؒ کے ارشادات ہوں۔ ٹیلی وژن پر صرف انہی کے تذکرے ہوتے اور قصیدے پڑھے جاتے۔ مارفیا کے انجکشن کی مانند پروپیگنڈے کی طلب اور بڑھتی جاتی۔ آخری زمانے میں یہ حال ہو گیا تھا کہ ۱۹۷۷ء کی پہلی سہ ماہی میں ٹیلی کاسٹ کا دائرہ ۴۸۱ گھنٹوں تک پہنچ گیا جبکہ ۱۹۷۶ء کی اسی سہ ماہی میں یہ دائرہ صرف ۹۲ گھنٹوں تک محدود تھا۔ گھنٹوں میں بے پناہ اضافے کے باعث حکومت نے ٹی وی کو ۶ء۵ کروڑ روپے ادا کیے۔ یہ سارا وقت بلاواسطہ یا بالواسطہ جناب بھٹو کے لیے وقف تھا۔ اس پبلسٹی سے بھی جی نہ بھرا تو

رنگین ٹیلی وژن کا "ہوکا" اٹھا۔ دوسرے ملکوں میں رنگین ٹیلی وژن نے عام آدمی کی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے اور خاندانوں میں کیا کیا بحران پیدا ہو رہے ہیں، اس کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ بادشاہ سلامت اپنی رنگین تصویریں دیکھنا چاہتے تھے اور عوام کو دکھانے کے درپے تھے۔

اس محاذ کے علاوہ جناب بھٹو کی قدِ آدم تصویریں مختلف آرٹسٹوں سے تیار کرائی گئیں اور وزارتِ اطلاعات نے کراچی کے ایک آرٹسٹ گل جی سے بھٹو صاحب کے رنگین پورٹریٹ ساڑھے تین لاکھ میں خریدے اور ان کی شخصیت کے بارے میں متعدد کتابیں شائع ہوئیں ایک کتاب کی قیمت دو سو روپے تھی۔

جناب بھٹو اپنا ایمج ملک سے بھی زیادہ، ملک سے باہر بلند کرنا چاہتے تھے چنانچہ بڑے اہتمام سے غیر ملکی نامہ نگار اور بعض اوقات نامور ایڈیٹر بلائے جاتے۔ خوب خوب مہمان نوازی ہوتی اور لمبے چوڑے انٹرویو دیے جاتے۔ وہ حکومت میں ۱۹۷۱ء سے پہلے آ رہے تھے اس لیے غیر ملکی صحافیوں سے یارانے خاصے پرانے تھے۔ مسٹر بھٹو نے اس امر کی سرتوڑ کوشش کی کہ ٹائم یا نیوز ویک کے سرورق پر ان کی تصویر شائع ہو، بڑے بڑے جتن ہوتے، مگر شکاری دام میں نہ آیا۔ سنا ہے جس روز انہوں نے نیوز ویک کے سرورق پر جنرل ضیاء الحق کی تصویر دیکھی تو وہ آتشِ رقابت سے جل اٹھے۔

جناب بھٹو کو یہ زعم تھا کہ قائداعظمؒ اور شہیدِ ملتؒ ان کی ذہنی سطح اور سیاسی قدو قامت سے کہیں چھوٹے تھے۔ پہلے دبی دبی آواز میں اپنے آپ کو قائدِ اعظم کا ہمسر قرار دیا اور جب مری سے حماست کا چلہ کاٹ کر آئے تو انتہائی جوش میں اگل دیا کہ قائدِ اعظم اور لیاقت علی خاں کو تو عوام نے منتخب ہی نہیں کیا تھا اور مجھے دوبارہ وزیرِ اعظم چنا ہے۔ وہ یہی تاثر دینا چاہتے تھے کہ میری سیاسی عظمت ان سے کہیں زیادہ ہے۔

مسٹر بھٹو نے غیر ملکی اخبار نویسوں کو انٹرویو دیتے ہوئے اس خواہش کا لطیف پیرائے میں اظہار کیا تھا کہ میں اندرا گاندھی کی جگہ لے سکتا ہوں۔ ایک بار بظاہر مزاحیہ انداز میں ارشاد فرمایا تھا کہ پاکستان کا میدان میرے لیے تنگ ہے۔ آخر میں بھارت کا صدر کیوں

نہیں بن سکتا۔[1]

پھیلنے اور بڑھنے کی اس غیر فطری آرزو نے انہیں اسلامی سربراہ کانفرنس کی طرف مائل کیا تھا۔ وہ پوری دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ تمام کا تمام عالم اسلام میری عظیم قیادت کو تسلیم کرتا ہے اور میں مشرق اوسط میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہوں۔

اسلامی سربراہ کانفرنس کے فوراً بعد تیسری دنیا کا غلغلہ بلند ہوا۔ مسٹر بھٹو اپنے آپ کو صرف مسلم ممالک تک محدود رکھنے کے بجائے بہت اونچا اٹھنا چاہتے تھے۔ وزیر شوق میں انہوں نے اسلام آباد میں تیسری دنیا کی تعلیمی کانفرنس بھی بلا ڈالی۔ جبکہ صرف چند حکومتوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ اس کانفرنس کو انتخابات کا بہانہ کر ملتوی کیا گیا اور ڈبری جگ ہنسائی ہوئی۔

یہ تھا وہ امیج جس کے سائے نے مسٹر بھٹو کو دیوانہ بنا رکھا تھا اور اس دیوانگی میں ایک اطالوی صحافی خاتون کو شیشے میں اتارنے کی کوشش ہوئی تھی۔

یہ ۱۹۷۳ء کا ذکر ہے مسٹر بھٹو نے ترنگ میں آکر فیصلہ کیا کہ یورپ میں جس قدر پاکستانی سفیر ہیں، ان کی ایک کانفرنس روم میں کی جائے۔ افراتفری کے عالم میں اطالوی حکومت سے رابطہ قائم کیا گیا۔ ان دنوں وہاں ایک سیاسی بحران پرورش پا رہا تھا۔ اس لیے صورت حال خاصی غیر یقینی تھی، تاہم اطالوی حکومت نے جذبۂ خیر سگالی کے ساتھ ضروری انتظامات کر لینے کی حامی بھر لی۔ یہ بھی طے پایا کہ ایک کھانا اطالوی سربراہ دیں گے۔ اب چونکہ مسٹر بھٹو اپنی مرضی سے وہاں جا رہے تھے۔ اس لیے اطالوی حکومت پروٹوکول کی پابند نہ تھی، چنانچہ ایک سینیئر وزیر مسٹر بھٹو کے خیر مقدم پر تعینات کر دیے۔ یہ بات جب بھٹو صاحب تک پہنچی تو ان کے دونوں کان غصے سے سرخ ہو گئے اور انہوں نے روم کے بجائے پیرس میں کانفرنس منعقد کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ متعلقہ افراد نے سمجھایا کہ دو روز میں نئے انتظامات تقریباً ناممکن ہیں۔ مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ ان کی انا کو سخت چوٹ لگی تھی۔ ایک یہ

---

[1] ہندوستان پاکستان کی کنفیڈریشن بنانے سے ان کا مقصد یہی تھا۔

تجویز بھی سامنے آئی کہ اسلام آباد میں کانفرنس بلائی جائے، مگر اس سے زخم خوردہ اَنا کو تسکین نہ پہنچتی تھی۔ آخر کار اطالوی حکومت کی منت سماجت کی گئی اور وہ چند منٹ کے لیے اپنا وزیراعظم ہوائی اڈے پر بھیجنے کے لیے رضامند ہو گئی، تب کہیں ایک عظیم بحران فرو ہوا۔

اپنے ایچ کا انہیں اس قدر خیال تھا کہ ہلکی سی خراش بھی وہ برداشت نہ کر سکتے تھے ایسے عالم میں کیمبرج اور برکلے یونیورسٹیوں کا پروردہ بھٹو ایک بھیڑیے کا روپ دھار لیتا۔ انتقام کے شعلے لہو پی کر ہی بجھتے۔ پھر انہیں کچھ ہوش نہ رہتا کہ وہ جس کی کھال کھینچ رہے ہیں وہ ان کے ساتھ بچپن میں کھیلتا رہا ہے اور زندگی کا طویل سفر اکٹھے طے کیا ہے۔ طوطا چشمی اور منتقم المزاجی ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ ان کا پورا عہدِ حکومت انتقامی کارروائیوں سے عبارت ہے جن میں سانپ کی پھنکار بھی تھی اور زہر بھی۔

زندگی کے ہر شعبے میں ان کے دو چہرے اور دو شخصیتیں صاف نظر آتے ہیں۔ جیورسٹ کانفرنس میں یقین دلایا گیا کہ ڈی پی آر کا استعمال صرف ناگزیر صورتوں میں ہو گا، لیکن اس کانفرنس کے ختم ہوتے ہی اسپیشل ٹریبونل قائم ہوئے اور ہزاروں شہریوں کو اس اذیت ناک شکنجے میں کس دیا گیا۔

ایک چوٹی کے سیاسی قائد مسٹر بھٹو سے ملنے آئے۔ ملاقات کے دوران میں عجیب و غریب ڈراما کھیلا گیا۔ جناب بھٹو نے آواز میں رقت پیدا کی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکائے اور اس لیڈر کے گھٹنوں کو بار بار ہاتھ لگایا۔ بس ایک ہی فقرہ زبان پر تھا کہ آپ میرے بزرگ ہیں، مجھے حکم دیجیے۔ منت سماجت سے لبریز اس فضا میں وہ صاحب پہلو بدلنے لگے اور آخر کار مسٹر بھٹو کی بات سے متفق ہو گئے۔ جب وہ چلے گئے تو مسٹر بھٹو نے اپنے اے ڈی سی سے پوچھا کہ کیا تم اس قدر کامیاب ڈراما اسٹیج کر سکتے ہو؟

اسی انداز کی ایکٹنگ انہوں نے امریکی ڈالر اور صدر کارٹر کے خلاف کی تھی، مگر لومڑی کچھ زیادہ فاصلہ طے نہ کر سکی اور بے دم ہو کر گر گئی۔ مکاری کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔

اور وہ لمحہ بھٹو صاحب کے لیے تلوار کی دھار بن گیا جب انہوں نے خونِ شہیداں کی توہین

کی تھی اور کہا تھا کہ لوگ پسینے پر گولیاں ڈالر کی خاطر کھا رہے ہیں۔ اس وقت ان کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ ہم نے انسانوں کو بھیانک جرائم کی پاداش میں بندر بنا دیا تھا۔

... ...

اس عہد میں پیپلز پارٹی کے جیالے جمہوریت کا نام لے کر جس طرح فسطائیت نافذ کیا کرتے تھے اس کا تذکرہ خود ان کے ایک فدائی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

جلسے خراب کرنے کا انوکھا جمہوری طریقہ

پیپلز گارڈ پنجاب کے سربراہ طارق وحید بٹ اپنی کتاب "میری آواز" میں پیپلز پارٹی کے حکم پر دوسری جماعتوں کے جلسے خراب کرنے کی پہلی عظیم کارکردگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"پیپلز گارڈ پنجاب کا میں جب سالار تھا تو ایک دن پیپلز پارٹی کی ہائی کمان (جس میں اس وقت لاہور سے تعلق رکھنے والے صوبائی وزراء اور وزیر اعلیٰ پنجاب بھی شامل تھے) ضلع کچہری لاہور پہنچے جہاں آغا شورش کاشمیری نے بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرنا تھا۔ اس وقت خورشید عالم بار کے صدر تھے۔ جب آغا شورش کاشمیری بار سے خطاب کرنے لگے تو وہاں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ آغا شورش کاشمیری شوگر کے مریض ہیں چنانچہ جب انہیں اندرون بھاٹی گیٹ کے شاہنواز نے خنجر سے حملہ کر کے زخمی کرنا چاہا تو میں نے اس سے خنجر چھین لیا اور آغا شورش کاشمیری کو دھکیل کر بار کے پچھلے کمرے میں لے گیا، جہاں بے شمار کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ آغا شورش کاشمیری ایک زندہ دل، بہادر نڈر، بے باک قسم کی شخصیت تھے۔ اس خطرناک لڑائی جھگڑے میں جس میں اندرونِ شہر میں سے تعلق رکھنے والے لوگ جو میاں ستاری کی ٹیم سمجھی جاتی تھی کی نیت انہیں جسمانی تکلیف پہنچانے کی تھی۔

---

[1] "میری آواز" مصنف طارق وحید بٹ ص ۶۹۔

مگر اس میں بھی ان کے جاہ و جلال اور زبان کے جنگجو ہونے میں کوئی کمی نہ آئی اس طرح پیپلز پارٹی تحریک استقلال کو کوئی جلسہ نہ کرنے دیتی تھی اور ہم کوشش کرتے تھے کہ ان کے جلسوں کو جمہوری طریقے[1] سے ناکام بنا دیں تحریک کے صدر ریٹائرڈ ایئر مارشل محمد اصغر خاں مجھ سے اتنے خائف تھے کہ جب کبھی بھی ان کی جلسہ گاہ یا لاہور ائیرپورٹ پر ان کے خلاف جمہوری انداز سے احتجاج ہوتا جس میں، میں موجود نہ بھی ہوتا تھا تب بھی وہ کہا کرتے تھے کہ یہ سب کچھ طارق وحید بٹ کرا رہا ہے اور وہی مجھے بے عزت کرنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہ تھا اور ہم سب کچھ جمہوری انداز میں یہ سارے کام کرتے تھے۔

آغا شورش کاشمیری ایک بہت بڑے اپوزیشن رہنما بھی تھے ان کا شہر میں کہیں بھی جلسہ جلوس، پریس کانفرنس یا کسی بار میں ان کا خطاب ہو، اس طرح تحریک استقلال کے صدر ریٹائرڈ ایئر مارشل محمد اصغر خاں اور نوابزادہ نصر اللہ خاں یا پیر صاحب پگارا اور ولی خاں کا جلسہ یا جلوس ہو یا کوئی میٹنگ یا اجتماع ہو میں اور میرے ساتھی پارٹی ہدایات کے مطابق انہیں ناکام بنا دیتے تھے اور ان کے جلسہ گاہ میں کھڑے ہو کر کھلے عام ان پر تنقید کیا کرتے تھے کہ آپ لوگ یہ بات غلط کہہ رہے ہیں وہ پیپلز پارٹی کے خلاف کوئی بھی بات کرتے ہم فوراً اس بات کو غلط قرار دے دیتے جس سے عوام میں ان کے خلاف اچھا تاثر پیدا نہ ہو سکا تھا اور لوگوں کو ہم نے پیپلز پارٹی کی جانب زیادہ مائل کر رکھا تھا کہ پیپلز پارٹی کے سوا ملک میں کوئی اور سیاسی جماعت ہی نہیں ہے۔ تحریک استقلال کے صدر ریٹائرڈ ایئر مارشل محمد اصغر خاں نے شاہراہ قائداعظمؒ لاہور میں ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے کہا تھا: "ذوالفقار علی بھٹو دنوں کی بات ہے کہ تم دیکھو گے کہ آسمان پر بجلیاں چمکیں گی اور بادل بھی گرجیں گے۔"

---

[1] جلسے خراب کرنے کا جمہوری طریقہ صرف پیپلز پارٹی کی ایجاد ہے۔ معاشرتی زبان میں اسے غنڈہ گردی اور سیاسی زبان میں اسے فسطائیت کہتے ہیں۔

پاکستان کے مشہور صحافی اور تحریک پاکستان کے کارکن جناب زیڈ۔ اے سلہری نے اپنے مضمون بھٹو کا عروج و زوال میں اس عہد کا منظر جو ذیل تحریر کیا ہے۔

بھٹو کا عروج و زوال

صدر ایوب کے زمانے میں بھٹو صاحب نے مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے صدر لیگ کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ پارٹی کے متعلق عہدوں پر ڈپٹی کمشنر اور ایس پی صاحبان متعین ہونے چاہئیں اپنے آخری دور میں بھٹو نجومیوں اور دست شناسوں پر بھی انحصار کرنے لگے تھے چنانچہ انہوں نے سری لنکا کے مشہور نجومی سے پوچھا تھا کہ ۷ مارچ ۷۷ء کی تاریخ انتخابات کیسی رہے گی نیز مشہور دست شناس ایم اے ملک کو اپنے ہاتھ کا نقشہ بھیجا تھا۔ بھٹو صاحب جرنیلوں سے مشورہ کرنے کے بھی دلدادہ تھے۔ یہ ان کی شروع ہی سے کمزوری تھی کہ وہ جرنیلوں سے میل جول رکھیں جب میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کا ڈائریکٹر تھا تو وہ اکثر مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ جرنیل ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور آخر کار وہ جرنیلوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ہی تخت حکومت پر بیٹھے۔ دراصل بھٹو جرنیلوں سے مرعوب تھے۔ انہوں نے فیلڈ مارشل ایوب کی سالوں نوکری کی تھی انہی کو فیصلہ کن طاقت کا منبع سمجھتے تھے اور اسی لیے انہیں اپنانے کے متمنی تھے چونکہ وہ سیاست میں حادثاتا ہی نمودار ہوئے تھے۔ ان کا جبلی میلان بیوروکریسی پر انحصار تھا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

قومی اتحاد (پی این اے) کی تحریک ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد شروع ہوئی۔ تحریک کی طوفانی گیرائی اور گہرائی کا یہ عالم تھا کہ دو ماہ تک تو وہ بلا روک ٹوک چلتی رہی پولیس تو کیا فوج بھی اس کی مزاحمت نہ کر سکی لیکن جب مسلم ممالک کے نمائندوں، خاص طور پر سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب کی مداخلت پر دونوں پارٹیوں میں مذاکرات کی شروعات ہوئیں تو بھٹو تین محاذوں پر مصروف پیکار تھے۔ اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورے پی این اے کے لیڈروں سے بات چیت اور جرنیلوں سے باقاعدہ میٹنگیں۔

پی این اے کی تحریک نے ملک و قوم کو اسی طرح اپنے گھیرے میں لے لیا جیسے اچانک

سیلاب زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ایسی مقبولِ عام پیپلز پارٹی کی حکومت جس نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں قطعی غیر معروف اور بے اثر اشخاص کو بڑی اکثریت سے جتوایا تھا وہ اب اصغر خاں کی صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کی ایک للکار سے لرز گئی اور پی این اے کے اجتماعی طوفان کے سامنے پرکاہ کی طرح کانپنے لگی۔ اس کیفیت کی توجیہہ نہ دھاندلیوں کے وقوع میں ہے اور نہ پی این اے کی طاقت میں۔ اس کیفیت کی توجیہہ اس دراز سلسلۂ مظالم میں ہے جو ملک و قوم پر بھٹو حکومت نے ڈھائے تھے اور جنہوں نے لوگوں کے دلوں میں ناسور کر دیا تھا۔ عوام کسی نہ کسی بہانے ان جاہ و موقع پرستوں کے سامنے اٹھنا چاہتے تھے جنہوں نے ان کی روزمرہ کی زندگی حرام کر دی تھی۔ وطن کی عزت کو خاک میں ملا دیا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس لیے بے تحاشہ، لاکھوں کی تعداد میں لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ سینکڑوں مارے گئے اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ جس سرعت سے حکومت کے خلاف عوامی مزاحمت کا ریلا اٹھا اس سرعت سے بھٹو صاحب اور ان کے رفقائے کار کے حوصلے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ پہلے تو انہوں نے اپنی تسلیم کردہ تیس چالیس دھاندلیوں کی چار نشستوں کو بلا ہچکچاہٹ قومی اتحاد کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دیا لیکن جب اس پیشکش کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا گیا تو از سرِ نو انتخابات کرانے پر تیار ہو گئے۔ جمہوری ملکوں میں عام طور پر ایسی وسعتِ قلب کا مظاہرہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ انتخابات جیتنے کا دعویٰ کرنے والی حکومتی پارٹی یکا یک اس طرح میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ پی پی پی کے طرزِ عمل کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں اول یہ کہ حکمرانوں کو ان کے احساسِ جرم نے بری طرح اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا کہ دھاندلیاں تیس چالیس نہیں بلکہ کہیں زیادہ وسیع (۸۰ یا ۹۰ فیصد) پیمانے پر ہوئی ہیں اور وہ اپنی ستی بھول گئے۔ دوم یہ کہ وہ عوام کے اس بے پناہ غیظ و غضب کے اظہار کی تاب نہ لا سکے جو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

بھٹو صاحب ہر قیمت پر برسرِ اقتدار رہنا چاہتے تھے لیکن اب انہیں خارجی کمک کی احتیاج محسوس ہو رہی تھی۔ غیر مقبولیت کی فضا میں انہوں نے فوج سے بڑی مدد لی لیکن ماتحت حیثیت میں فوج بھی ایک حد تک ہی جا سکتی ہے۔ اب غالباً بھٹو صاحب کا یہ منصوبہ تھا

کہ فوج کی شراکت سے حکومت کی جائے لیکن فوج کی شراکت سے توازن ان کے حق میں نہ رہتا۔ فوج بھٹو کی ان پالیسیوں کی روادار نہ ہوتی جنہیں عوامی تائید حاصل نہ ہوتی تو پھر بہتر یہی تھا کہ فوج بلا شرکت غیرے کلی ذمہ داری سنبھالے تاکہ وہ اپنی حکمت عملیوں کی پوری طرح جوابدہ ہو سکے۔ بھٹو کے کردار نے فوجی بالادستی کو ملک کا مقدر بنا دیا تھا۔

بھٹو کی فوری مقبولیت کا راز پاکستان کے معروضی حالات میں مضمر ہے۔ مدتوں سے سیاست کا میدان ویران پڑا تھا اور یہ ویرانی صدر ایوب کی طویل حکمرانی سے ہی نہ پیدا ہوئی تھی یہ دیرینہ مرض تھا۔ مشرقی پاکستان میں تو ۱۹۵۴ء کے انتخابات سے سیاست میں کچھ جولانی پیدا ہو گئی تھی اور مسلم لیگ کے سمندر پر نئی قیادت اور پارٹیوں کی عمارتیں بھی اٹھی تھیں لیکن مغربی پاکستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے مکمل جمود چلا آ رہا تھا۔ یہاں حکومت کے جوڑ توڑ کا دارومدار ۴۷۔ ۴۵ء کے انتخابات پر ہی تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد کے ہاتھوں ۱۹۵۵ء میں دستور ساز اسمبلی کے ٹوٹنے کے بعد جب اس کی جگہ نئی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو مغربی پاکستان کے صوبوں کے معزول شدہ اسمبلیوں کے سابق ارکان نے ہی حلقہ ہائے انتخابات کا کام دیا گویا کہ وہ ایسا علم رشیدہ ادارہ تھا جس سے عوامی نمائندگی کی مہک جا تی رہی ہو۔ اس لمبی مدت میں ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر حد درجہ بوسیدہ ہو چکے تھے اور کسی کشش کے مالک نہ تھے۔ ایوبی دور کے دس سال نے رہی سہی سیاست پر جھاڑو پھیر دی تھی۔ یوں ایک سیاسی بیابان کا سماں تھا۔ بے شک کچھ فعال سیاستدان موجود تھے اور وہ صدر ایوب کے خلاف ایجی ٹیشن بھی چلا رہے تھے لیکن عوام کے دلوں پر ان کی کوئی گہری چھاپ نہ لگی تھی۔ ایک تو وہ مختلف الخیال مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے دوسرے ان میں کوئی ایسی قد آور شخصیت نہ تھی جس کی قیادت پر سب متفق ہو سکتے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ ضرور تھی اور اس کا قائد مجیب الرحمٰن بااثر تھا لیکن وہ علیحدگی پسندی کی سیاست میں غرق اور مغربی پاکستان کی سیاست سے بالکل غیر متعلق تھا۔ جب اس پس منظر میں بھٹو نے ایوب خان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اسے دوسرے مغربی پاکستانی سیاستدانوں پر کئی جہتوں میں برتری حاصل تھی وہ جوان اور وجیہہ تھا۔ وہ ایک امیر سیاسی خاندان کا چشم و چراغ تھا، اعلیٰ

تعلیم یافتہ اور لسان تھا۔ آٹھ سال وزیر رہا تھا۔ آداب شہنشاہی کا شناسا تھا اور عوام اس سے مرعوب تھے۔ اس لیے زمانہ وزارت ہی میں بھٹو نے بیوروکریسی میں ایک وسیع حلقہ احباب بنا لیا تھا۔ اگر افسر اس کے گرویدہ تھے تو جرنیلوں سے بھی اس کی راہ و رسم تھی۔ اس کے جنرل یحییٰ خان سے گہرے تعلقات ہو گئے تھے جو بعد میں دھماکہ خیز ثابت ہوئے۔ مزید براں بھٹو پچھلے سالوں میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر متعارف ہو چکا تھا لیکن جس چیز نے اس کے لیے قوم میں بڑی شہرت اور مقبولیت پیدا کی وہ اس کا سلامتی کونسل کا کردار تھا۔ مسئلہ ہو کشمیر کا، موضوع ہو پاک بھارت جنگ کا اور انداز بیاں ہو کرشمہ ساز بھٹو کا تو بجلی تڑکنے لگی۔ یکا یک وہ قومی قیادت کے لیے روشنی کا ایک مینار بن گیا۔ انہی عوامل کا اثر تھا کہ جب بھٹو حکومت سے الگ ہوئے تو لوگوں نے ان کا ایک ہیرو کی طرح استقبال کیا۔ وہ ایک محبوب لیڈر بن گئے اور مغربی پاکستان کے تمام سیاستدانوں پر چھا گئے۔ مقبولیت کے اس اونچے اور مضبوط تھڑے سے انہوں نے گھسے پٹے نعروں کی جگہ ایسے انقلاب آفرین نعرے لگائے جنہوں نے قوم کی رگوں میں خون کی روانی تیز کر دی جہاں ایک طرف انہوں نے کشمیر کے حصول کو اپنا مقصد روشن ٹھہرایا اور ہندوستان کے خلاف ایک ہزار سال جنگ جاری رکھنے کے عزم کا اعلان کیا۔ وہاں دوسری طرف صدر ایوب پر الزام لگایا کہ اپنا اقتدار بچانے کیلئے انہوں نے بزدلی سے ۱۷ دن کے بعد ہی جنگ بند کر دی اور جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار دی۔ انہوں نے اپنی آستین میں معاہدۂ تاشقند کے رازوں کا ایک خنجر چھپائے رکھا جسے وہ استعمال کرنے کی دھمکی دیتے رہے۔ ساتھ ہی بھٹو نے عوام کو "روٹی کپڑا اور مکان" مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ بارودی سیاست تھی اس نے ہر جہت میں آگ لگا دی۔

لوگ کشمیر حاصل کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کے خلاف بآسانی بھڑک سکتے تھے پھر وہ اپنی بنیادی ضروریات کا مداوا بھی چاہتے تھے ان مقاصد کو دلانے والا کائد ہی حقدار قیادت ہو سکتا تھا۔ بھٹو کی سیاست نے تحریک پاکستان کی سی کیفیت پیدا کر دی اور ہر نوع کے سیاسی گروہ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ لیکن سب سے آگے لیفٹسٹ (بائیں بازو والے) تھے جو اب تک اسلامی پاکستان میں تنہائیوں کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ اب ان کی بن آئی۔ نہ صرف

ان موقع پرستوں نے بھٹو کی پُرزور حمایت کا اعلان کیا بلکہ پارٹی کا رُخ متعین کرنے کے لیے اس کی باگ ڈور بھی سنبھال لی۔ پیپلز پارٹی پر سُرخ رنگ چڑھ گیا۔ اس کے جلسے جلوسوں میں پارٹی کے جھنڈوں نے افق کو سُرخ کر دیا اور ایشیا سُرخ ہے کے نعرے لگنے لگے۔

۱۹۶۸ء کے اواخر میں گو اکثر جماعتیں ایوبی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم سے ۱۹۵۶ء کے دستور کے نفاذ کا مطالبہ کر رہی تھیں لیکن بھٹو نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی اور صدر ایوب کی گول میز کانفرنس میں حصہ نہ لیا۔ بھٹو کو مذاکرات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ در اصل ان کے ارادے ہی کچھ اور تھے وہ نہ جمہوریت کے احیاء کے لیے متفکر تھے اور نہ ہی صدر ایوب کو کسی سیاسی مصالحت کے کریڈٹ سے تازہ دم ہو کر اس بحال کرنے کی مہلت دینا چاہتے تھے۔ بھٹو کا مقصد وحید بدامنی جاری رکھنا اور ایوب خان کو ناکام کر کے بے کردار جنرل یحییٰ کو جس سے اس کی ساز باز ہو چکی تھی منظرعام پر لانا تھا جنرل یحییٰ صدر ایوب کی بیماری سے ہی برسر اقتدار آنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور انہوں نے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے ایوب کے خلاف تحریک کے دوران جزوی طور پر شہروں میں مارشل لاء لگانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ مارشل لاء لگے گا تو پورے ملک میں لگے گا۔ مطلب صاف تھا آپ جائیے میں آتا ہوں۔ چنانچہ جونہی گول میز کانفرنس ناکام ہو گئی اور مشرقی و مغربی پاکستان میں تحریکوں نے ازسرِنو سر اٹھایا جنرل یحییٰ کو کھلے طور پر سامنے آنے کا موقع مل گیا اور انہوں نے بھٹو کی آشیرباد کے ساتھ مارشل لاء لگا دیا اور اپنے محسن صدر ایوب کو جنہوں نے یحییٰ کو بہت سے جرنیلوں پر ترجیح دے کر کمانڈر انچیف بنایا تھا ۲۴ گھنٹوں میں ایوان صدر خالی کرنے کا حکم دے دیا۔

جنرل یحییٰ کے انتخابات کے وعدے سے ملک میں ایجی ٹیشن تو ختم ہو گئی لیکن حالات کی بہتری کی صورت پیدا نہ ہوئی کیونکہ پورے ایک سال کی انتخابی تیاری کا موقع ملنے سے سیاست کی ہیئت ہی بدل گئی جہاں پہلے زیادہ تر اس کا نشانہ ایوبی حکومت ہوتی تھی، اب وہ تنگ علاقائی ڈگر پہ چلنے لگی۔ مجیب تو شروع سے ہی چھ نکاتی پروگرام کا علمبردار تھا لیکن اب بھٹو بھی مختلف و کثیر التعداد قومیتوں کے نظریے کا پرچارک بن بیٹھا۔ وہ پہلے ہی ون یونٹ کا

سخت مخالف تھا لیکن اب وہ روسی سوشلزم کے علاقائی قومیتوں کے اثر کے تحت پاکستان کی اساس مسلم قومیت کا بھی انکاری ہو گیا۔ یہیں سے میرے اور بھٹو کے درمیان نقطۂ انحراف کا آغاز ہوا۔ ایک رئیس وڈیرہ سوشلسٹ کیسے ہو سکتا تھا۔ مساوات کے دعوؤں کے باوجود وہ کسی غریب کی صحبت کے روادار نہ تھے۔ اپنے معمر ملازموں کو جنہوں نے تمام عمر اُن کی خدمت کی اور اپنے ہاتھوں میں پالا "چھوکرا" کہہ کر بلاتے جو میرے کانوں کو ناگوار گزرتا۔ ان کی ابن الوقتی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ (جو مجھے بعد میں معلوم ہوا) ہندوستان میں جائیداد حاصل کرنے کے لیے وزیر بننے تک وہ ہندوستانی شہریت کے حامل تھے پاکستانی وہ وزیر بننے کے بعد بنے۔

دنیا میں کہیں بھی ایک سال کی انتخابی مہم کی روایت نہیں، پھر یحییٰ نے اسے پاکستان میں کیوں روا رکھا! کیا اس لیے کہ وہ اپنی مدت حکومت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر سکیں یا اس کا مطلب تھا کہ مجیب کو چھ نکاتی پروگرام کی کھلی چھٹی مل جائے اور بنگالیوں کے دلوں میں علیحدگی پسندی اس طرح راسخ ہو جائے کہ پھر مشرقی و مغربی پاکستان میں میل جول کی کوئی گنجائش نہ رہے اس کا اثر یہاں تک تو ضرور ہو گیا تھا کہ جو بنگالی کراچی، لاہور یا راولپنڈی آتے وہ اردو کی بجائے انگریزی بولنے پر اصرار کرتے رہے جیسے فی زمانہ اکبر بگٹی کر رہے ہیں یا اس کا مقصد بھٹو کو مغربی پاکستان کے لوگوں کو مشرقی پاکستان کے خلاف جذبات بھڑکانے کے لیے درکار وقت دینا تھا۔ بے شک پاکستان کا جغرافیائی نقشہ انوکھا تھا اور دو حصوں میں ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا لیکن ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے کہ پاکستان کا وجود ایک مشترکہ قومیت یعنی مسلم قومیت کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ عوامی سطح پر مشرقی و مغربی پاکستان کے لوگ آپس میں دلی تعلق محسوس کرتے تھے پاکستان کی بظاہر بے ڈھنگی جسمانی تصویر جدوجہد آزادی کے ایک ہی برش سے ایک ہی رنگ میں بنائی گئی تھی اس لیے پاکستان ایک ناقابلِ تقسیم وحدت تھی۔ جغرافیے کی بنا پر اس کے حصے بخرے کرنے کا مطلب تھا کہ اس کی قومیت صحیح و سالم نہ رہی تھی اور برصغیر میں دو قومیتوں کے جس نظریہ پر قائداعظمؒ نے مسلمانوں کی انگریز اور ہندو کی غلامی سے حریت کی تحریک شروع کی تھی وہ بے بنیاد تھی۔ پاکستان کے دولخت ہونے سے اس کی پوری عمارت کے ڈھے جانے کا خطرہ تھا چنانچہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر اندرا گاندھی نے فوراً دو قومی نظریے کے بطلان کا فتویٰ دیا تھا اور اسکے بعد

مغربی پاکستان کے صوبوں میں بھی علیحدگی پسندی کی تحریکیں جڑ پکڑنے لگیں۔ مسلم قومیت کی حقیقت کی جگہ کثیر التعداد قومیتوں کے دعاوی کا جھوٹ بولا جانے لگا جس میں بھٹو پیش پیش تھے۔ ان کے اعلیٰ قریبی ساتھی بااثر حلقوں خاص طور پر دانشوروں اور صحافیوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کرتے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے مغربی پاکستان کی اقتصادی حالت میں زمین آسمان کا فرق پڑ جائے گا۔ بہر حال ایک سال کی انتخابی تیاری نے ملک میں مسلسل ہلچل کا سماں رکھا اور جب بالآخر دسمبر ۷۰ء میں انتخابات ہوئے تو اگر ایک طرف مجیب کو چھ نکاتی پروگرام کی بنا پر مشرقی پاکستان کی نمائندگی کی اجارہ داری مل گئی، تو دوسری طرف بھٹو نے "روٹی کپڑا مکان" اور مسلم قومیت کے خلاف کثیر التعداد قومیتوں کے نعروں سے اکثریتی ووٹ حاصل کیے۔ اس طرح ملک خود بخود کسی بھونچال سے نہ ٹوٹا وہ ایک منصوبے کے تحت چاک کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ بھٹو کسی طرح مجیب سے تعاون کے لیے تیار نہ ہوا پہلے اس نے "ادھر ہم، ادھر تم" کا نعرہ لگایا پھر اس نے نو منتخب قومی اسمبلی کے ڈھاکہ اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ یہ پارلیمانی بائیکاٹ پاکستان کی سالمیت کے تابوت میں آخری کیل کی حیثیت رکھتا تھا ۱۹۴۶ء میں قائد اعظمؒ نے دہلی کی دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کر کے الگ مسلم قومیت کا دستوری ڈنکا بجایا تھا تو اس سے پاکستان تخلیق ہوا لیکن جب بھٹو نے بائیکاٹ کیا تو اس سے پاکستان مسمار ہو گیا۔

اگر بھٹو پاکستان کی سالمیت کے بارے میں مخلص ہوتا تو ہرگز ڈھاکہ اجلاس کا بائیکاٹ نہ کرتا۔ بھٹو کے معذرت خواہوں کی طرف سے ایک توضیح تو یہ دی جاتی ہے کہ یحییٰ اور مجیب کے درمیان مشرقی و مغربی پاکستان کے لیے دو دستوروں کی تدوین پر مفاہمت ہو چکی تھی جس سے ملک دو حصوں میں بٹ سکتا تھا اور بھٹو اس منصوبے کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے "ہم اور تم" کا نعرہ لگایا، اجلاس کا بائیکاٹ کیا اور مطالبہ کیا کہ اقتدار مشرقی اور مغربی پاکستان کی الگ الگ اکثریتی پارٹیوں کو منتقل ہونا چاہیے اور پھر دستور کے بارے میں دونوں علاقوں کی اکثریتی پارٹیوں میں برابری کی سطح پر مذاکرات ہونے چاہئیں۔ اب یحییٰ مجیب کی مفاہمت کی صداقت کا تو کوئی ثبوت نہیں لیکن بھٹو کی تجویز کا مفہوم صاف ہے کہ دو دستوروں کے تصور کا قلع قمع کرنا تو کیا انہوں نے ملک کو ایک وحدت کے درجے سے گرا کر جسمانی تقسیم سے پیشتر ہی واقعی طور پہلے

دو الگ وحدتوں میں تفریق کر دیا، ایک قوم کا تصور ہی غائب ہو گیا حالانکہ دو دستوروں کی پیش بندی کرنے کا یہ ہی ایک مؤثر طریقہ تھا کہ قومی اسمبلی میں شرکت کر کے یک قومیت کا مظاہرہ کر کے اکثریت کی بالادستی قبول کرتے، افہام و تفہیم کے ذریعے درمیانی راستہ نکالتے اور ملک کو کسی نہ کسی قیمت پر ایک رکھنے کی کوشش کرتے دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ مجیب نے پہلے ہی یک طرفہ دستور تیار کروا لیا تھا جس پر وہ صرف دستور ساز قومی اسمبلی کی تصدیق کا منتظر تھا۔ اب فرض کیجئے کہ دستور چھ نکات کی بنیاد پر مرتب کر لیا گیا تو بھی اس میں ایک پاکستانی مرکز کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ بھٹو تو چھ نکات میں سے ساڑھے پانچ نکات پہلے ہی تسلیم کر چکا تھا۔ اگر مشرق و مغرب کے نمائندے آپس میں مل کر بیٹھتے تو توقع امید تھی کہ مرکزی اختیارات کا دائرہ وسیع کر دیا جاتا۔

بنگالیوں کو مغربی پاکستانیوں سے زیادتی کی شکایت ضرور تھی لیکن صوبے کی بھاری اکثریتی آبادی انقطاع تعلق حامی نہ تھی کہ مغربی پاکستان سے الگ ہو جانے کے بعد نہ صرف مشرقی پاکستان چاروں طرف سے ہندوستان کے گھیرے میں آجاتا بلکہ ہندوستان کے مقابلے میں اس کی عددی اور مالی اہمیت اتنی کمزور ہو جاتی کہ اسے اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا۔ بے شک جنوری ۷۱ء میں بھٹو مجیب سے ملنے کے لیے ایک لمبے چوڑے وفد کی معیت میں ڈھاکہ گیا۔ میں بھی اسی جہاز پر ڈھاکہ گیا اور اسی ہوٹل میں ٹھہرا جہاں بھٹو مقیم تھے، ہر روز میری ان سے ملاقات ہوتی اور تبادلۂ خیال ہوتا، لیکن مجھے چند ہی ملاقاتوں کے بعد محسوس ہوا کہ بھٹو مذاکرات کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ساڑھے پانچ نکات ماننے کے بعد سمجھوتے میں قباحت کیا ہو سکتی تھی درحقیقت بھٹو کسی سمجھوتے پر پہنچنا ہی نہ چاہتے تھے اور اسی لیے چند روز بعد لاہور واپس آگئے۔ واپسی پر میں اسی جہاز میں بھٹو کے ساتھ آیا بلکہ ان کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا۔ دوران سفر کچھ باتیں ہوئیں لیکن سب سے اچنبھے والی بات تب ہوئی جب ہمارا جہاز لاہور کی حدود میں داخل ہوا تو بھٹو نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا وہ کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھے تھے ا" دیکھو، ہمارا ملک کتنا خوبصورت ہے" اس لمحے مجھے لاہور کی خوبصورتی نظر نہیں آئی بلکہ یہ شدید احساس ہوا کہ یہ جناب مشرقی پاکستان کو غیر ملک قرار دے رہے ہیں

میں بھٹو کے خیالات کے تجزیے کی ادھیڑبن میں کھو گیا کہ اتنے میں جہاز کا دروازہ کھلا اور بھٹو صاحب ہندوستانی جہاز گنگا کی طرف، جو اغوا کر کے لاہور لایا گیا، دوڑنے لگے۔ بھٹو صاحب جہاز کے اغوا کنندگان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور میرا دل ڈوبا جا رہا تھا کہ یہ وقوعہ کسی سانحہ کی تمہید نہ بن جائے۔ یہی ہوا۔ جب جہاز کو جلا دیا گیا تو ہندوستان نے ڈھاکہ تک ہمارا ہوائی روٹ بند کر دیا اور اسطرح مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان سے ہزار ہا میل فاصلہ بڑھ گیا۔ یہ پہلا علیحدگی کی طرف پہلا اقدام تھا۔

مجیب اور بھٹو دونوں علاقائی بنیادوں پر انتخابات لڑے تھے اور انہوں نے ایکدوسرے کے حلقہ اثر میں کوئی دخل نہ دیا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ جہاں مجیب اکثریتی پارٹی کا لیڈر تھا وہاں بھٹو اقلیتی پارٹی کا لیڈر تھا۔ اگر بھٹو پاکستان کی سالمیت کا قائل ہوتا تو اسے مجیب کیساتھ مل کر مخلوط حکومت بنانے یا اپوزیشن میں جا بیٹھنے میں کوئی عار نہ ہوتی۔ پاکستان کی پارلیمانی سیاست بتاتی ہے کہ کوئی اکثریتی پارٹی ہمیشہ ٹھوس اکثریتی پارٹی نہیں رہی اس میں گروپوں نے ضرور سر نکالا۔ یہ حادثہ مسلم لیگ کے ساتھ ہو چکا تھا اور جب بعد میں عوامی لیگ جیسی واحد رہی تو اس میں بھی اشخاص اور گروہ ٹوٹے۔ تو اگر قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو جاتا اور مغربی اور مشرقی پاکستان کے مختلف اقلیتی نمائندوں میں گفت وشنید ہوتی تو مجیب کا ایک طرفہ زور ٹوٹ جاتا اور ملک کو بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی مفاہمت کی سبیل نکل آتی۔ خصوصاً جب یہ بات صاف ہو گئی ہوتی کہ فوجی راج ختم ہو گیا ہے اور حکومت اکثریتی پارٹی کی تحویل میں ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اجلاس کے انعقاد کی صورت میں بھٹو کو اسی قسم کی مفاہمت کا خدشہ تھا اور وہ اس مفاہمت کے پروان چڑھنے کی ناکہ بندی میں لگے ہوئے تھے کیونکہ ایسی مفاہمت کی رو سے یا اسے مجیب کے تحت کام کرنا پڑتا یا اپوزیشن کے اجاڑ میں وقت گزارنا پڑتا۔ ان تمام خدشات کا ایک ہی مؤثر توڑ تھا کہ ڈھاکہ اجلاس ہونے ہی نہ دیا جائے نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس طرح اس نے نہ صرف مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی راہ ہموار کی بلکہ مغربی پاکستان میں اپنی مطلق العنانی کی بنیاد بھی ڈالی۔ یعنی مجیب۔ بھٹو کے سہ طرفہ ملاقات کی ناکامی کے بعد ملٹری ایکشن شروع ہوا تو بھٹو نے کراچی پہنچ کر کہا " اللہ نے پاکستان کو بچا لیا ہے"۔ کون سے پاکستان کو

بچالیا؟ اگر کوئی چیز بچی اور یقینی ہوئی تو اقلیتی پارٹی کے لیڈر بھٹو کے مغربی پاکستان کا وجود جسے انہوں نے نیا پاکستان کہنا شروع کیا اور قائد اعظمؒ اور مسلم قوم کے بنائے ہوئے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نئے پاکستان کے بانی بنے۔ مشرقی پاکستان سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے بعد وہ باسانی یحییٰ سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیتا، جیسا کہ ہوا۔

سلامتی کونسل میں بھٹو نے پاکستان کو بچانے کے لیے جو شورے بہائے وہ مگر مچھ کے آنسو تھے۔ اگر ان میں اپنے ادعا کے لیے ذرہ بھر اخلاص ہوتا تو وہ کم از کم پولینڈ کی قرارداد نہ پھاڑتے۔ اس قرارداد پر عمل درآمد کرنے میں پاکستان کے ایک رہنے کے امکانات تھے اس کے خلاف جب وہ دو جرنیلوں کے کندھوں پر چڑھ کر کٹے پھٹے پاکستان میں برسر اقتدار آئے تو مارشل لاء کی جگہ جمہوریت قائم کرنے کے لیے مدعی نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا منصب سنبھالنے کو ترجیح دی یکے بعد دیگرے ایسے اقدامات کیے جن کا مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اب تا قیامت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے نہ ملنے پائے۔ اس سمت میں پہلے تو انہوں نے غیر مشروط طور پر مجیب کو رہا کیا کہ ان کے بغیر بنگلہ دیش کی چولیں صحیح نہ بیٹھ سکتی تھیں اور بہت ممکن تھا کہ غیر یقینی کی صورت میں وہاں ایسی تحریکیں جنم لیتیں جو مغربی پاکستان سے تعلق قائم رکھنے کی حامی ہوتیں۔ سب طاقتوں کو جو (مع بھٹو) پاکستان کو توڑنے میں شریک تھیں مجیب کی موجودگی کی اشد ضرورت تھی۔ پھر بھٹو صاحب نے یہی نہیں کیا کہ ہندوستان اور امریکہ کو پاکستان کی تقسیم مستقل کرنے کے لیے مجیب الرحمٰن کا نذرانہ پیش کیا، بلکہ اس احسان کے بدلے کوئی معاوضہ نہ مانگا حالانکہ ڈپلومیسی میں جس مہارت کا بھٹو صاحب کو بڑا زعم تھا۔ دو ملکوں میں کوئی سودا بطور تحفہ نہیں کیا جاتا۔ اس میں ہمیشہ لین دین ہوتی ہے تو کیا بھٹو صاحب مجیب کے بدلے میں پاکستانی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ نہ کر سکتے تھے۔ نہ صرف وہ یہ کر سکتے تھے۔ بلکہ ان کے مطالبے کی فوری پذیرائی ہوتی کہ ان کے پاس مجیب کا کوئی بدل نہ تھا مگر بھٹو صاحب نے اس مضبوط کارڈ کا کوئی استعمال نہ کیا۔ انہوں نے بلا تکلف ہمارے جوانوں کو ہندوؤں کی قید و بند کی ذلت میں دے دیا، کیا بھٹو صاحب کو ڈر تھا کہ یہ فوجی واپس آ کر اودھم مچائیں گے اور ان کی آمریت کی راہ میں روڑا اٹکائیں گے یا وہ افواج کی تذلیل میں ہی خوش تھے کہ ان کے سامنے کوئی سر اٹھا کے نہ

چلے۔ چنانچہ تھوڑے دنوں بعد ہی انہی جرنیلوں، رحیم اور گل حسن کو جو انہیں اپنے سروں پر بٹھا کر لائے تھے بوناپارٹ ازم کا الزام لگا کر اپنے عہدوں سے معزول کر دیا۔

اب بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش کو ثقہ بین الاقوامی حیثیت دلانے کے لیے اسے تسلیم کرانے کی مہم شروع کی۔ بے شک کئی ملکوں نے بنگلہ دیش کے الگ وجود کو تسلیم کر لیا تھا لیکن جب تک مادرِ ملک، پاکستان اسے تسلیم نہ کرتا آزاد ملک کی حیثیت سے اس کا مرتبہ مخدوش تھا آزادی کے بعد برطانیہ نے نہ صرف پاکستان کو تسلیم کیا اور کرایا بلکہ اسے اقوامِ متحدہ میں متعارف کرایا۔ پاکستان کی سفارتی شناخت کے بغیر بنگلہ دیش کی پوزیشن بھی غیر یقینی تھی اور اگر غیر ممالک اسے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تو خود اس کے اندر پاکستان سے اتحاد و الحاق کی تحریکیں اٹھ سکتی تھیں۔ ان ممکنات کا سدباب کرنا بھٹو صاحب نے اپنا فرضِ منصبی سمجھا اور اسے سرانجام دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا یہ امر عجیب غدارانہ ذہنیت کا عکاس تھا کہ جہاں محض چین کی خوشنودی کے لیے پاکستان تائیوان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اور اسرائیل کو عربوں کی خاطر ماننے پر راضی نہ تھا وہاں وہ اپنے جگر گوشے کو اپنے جسدِ سیاست سے کاٹ پھینکنے پر تلا ہوا تھا۔

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

ملک میں بھٹو کی مہم کی شدید مخالفت ہوئی اس مخالفت پر قابو پانے کے لیے بھٹو نے ایک چال چلی۔ انہوں نے اسلامی کانفرنس بلانے کا اہتمام کیا۔ اس کانفرنس کا مقصد بنگلہ دیش کو تسلیم کروانے کے لیے ایک جذباتی فضا پیدا کرنا تھا اور اس کے انعقاد کے لیے لاہور منتخب کیا حالانکہ مہمانوں کی رہائشی سہولتوں کے مدنظر یہ موزوں مقام نہ تھا اور لوگوں کو ٹھہرانے کے لیے پرائیویٹ کوٹھیاں حاصل کرنا پڑیں۔ ایسی بین الاقوامی کانفرنسوں کے لیے اس وقت کراچی زیادہ ٹھیک تھا جہاں بڑے ہوٹلوں کی کمی نہ تھی۔ بھٹو صاحب بغیر کسی علت کے کوئی فیصلہ نہ کرتے تھے اور لاہور کے انتخاب کا مقصد جوشیلے پنجابیوں کو ٹھنڈا کرنا تھا کیونکہ وہی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اسلامی سربراہوں کے اکٹھ سے فضا واقعی جذباتی ہو گئی اور وہ لمحہ تو نہایت رقت آمیز تھا جب بادشاہی مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد شاہ فیصل کی

متاثر کن شخصیت نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اور گڑگڑا کر لمبی دعا کی۔ اس منظر کو لکھوکھا افراد نے ٹیلی وژن پر دیکھا اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ قوم ابھی اسی روحانی کیفیت سے وجد میں تھی کہ شام کو اعلان ہوا کہ مجیب الرحمٰن آ گئے ہیں اور بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ خبر بجلی کی طرح گری اور لوگ دھاڑیں مار کر رونے لگے اسلامی اخوت کے جذبے کا جس طرح عیارانہ استعمال کیا گیا وہ کبھی معاف نہ کیا جائے گا اس سے پاکستان کے دوبارہ متحد ہو جانے کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بھٹو کی ڈھاکہ کو تسلیم کروانے کی مہم کے پس منظر میں میرا ماتھا اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے اعلان پر ہی ٹھنکا تھا جبکہ یہ امر پہلے ہی کیبنٹ میں طے پا چکا تھا کہ اس موقع پر بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا جائے گا بلکہ دوسرے سربراہوں کے ساتھ مجیب الرحمٰن کی تصویر بھی بنوالی گئی تھی لیکن اسے سڑکوں پر اس وقت آویزاں کیا گیا جب مجیب لاہور وارد ہو گئے۔

بھٹو صاحب ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مارشل لاء کے جلو میں تختِ حکومت پر بیٹھے۔ اسی شام سب سے پہلے انہوں نے ایک کام یہ کیا کہ مجھے پاکستان ٹائمز کی چیف ایڈیٹری سے سبکدوش کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۶۷ء سے جب ان کی پارٹی کی ان کے تثلیثی نعروں (سوشلزم ہماری اقتصادیات، اسلام ہمارا دین، جمہوریت ہماری سیاست) کی اپنی تحریروں میں لگی لپٹی رکھے بغیر شدید مخالفت کی تھی اور باوجود ان کی طرف سے گاہ بگاہ میل میلاپ کی دعوت کے میں واحد صحافی تھا جو ان کی پارٹی کی کراچی کانفرنس میں موجود تھا) کسی نکتے پر ان سے مفاہمت نہ ہو سکی۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کی انتخابی کامیابی کے بعد میں نے لکھا کہ ان کے سامنے تین راستے ہیں، حکومت بنانے کو مدعو ہوں جس کی عوامی لیگ کی اکثریت کے پیشِ نظر کوئی توقع نہیں یا مجیب کے ساتھ مخلوط حکومت میں جونیئر پارٹنر کی پوزیشن میں شامل ہوں اور یا پھر حزبِ اختلاف کا رول ادا کریں تو لاہور میں صوبائی اسمبلی ہال کے سامنے ایک استقبالیہ جلسے میں انہوں نے مجھے مخاطب ہو کر کہا "کیا میں کوئی مسز بندرا نائیکے (سری لنکا کی سابقہ وزیرِ اعظم) ہوں کہ اپوزیشن میں بیٹھوں؟" ایسی مسلسل مخالفت کی روشنی میں مجھے اپنے خلاف ان کے عمل سے کوئی شکایت نہ ہو سکتی تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی قربت سے زیادہ بُعد میں عافیت تھی کہ گو ان کا مزاج

ہمیشہ سے ہی وڈیرانہ و متکبرانہ تھا لیکن اب اس میں شاہانہ طمطراق حلول کر گیا تھا جب ایک خاندانی بزرگ جے اے رحیم جو پی پی پی کے سرکردہ دانشور اور لیڈر تھے اور جنہوں نے پارٹی کا منشور تصنیف کیا تھا، وزیراعظم کے ایک ڈنر پر تاب انتظار نہ لا سکے اور پی ایم ہاؤس چھوڑ کر چلے گئے تو جو گت ان کی بنی وہ عبرت کے لیے کافی ہے۔

ایک بار میری بھی ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ شامت اعمال وہ لاہور آئے تو گورنر ہاؤس میں بلا بھیجا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا کہ پاکستان میں کثیر القومیتی معاشرے کی اصطلاح کا، جس کی انہوں نے رٹ لگائی ہوئی تھی، کیا مطلب ہے! اور کیا آپ تحریک پاکستان کی تاریخ سے واقف نہیں کہ ملک کی بنا مسلم قومیت ہے۔ جواب تو انہوں نے کیا دینا تھا غصے سے لال پیلے ہو گئے اور انٹرویو ختم ہو گیا۔ وہ اب کسی کا اختلاف رائے برداشت نہ کر سکتے تھے۔ حالانکہ ماضی میں ہمارے درمیان بحث مباحثہ معمول تھا۔ البتہ اس ملاقات کا ایک یادگاری تحفہ انہوں نے مجھے ضرور بھیجا۔ ایک نامہ محبت۔ رمضان کا آخری عشرہ تھا اور عید سر پر کھڑی تھی کہ مجھے کراچی سے کے ڈی اے کا خط ملا جس میں یہ فیصلہ درج تھا کہ مجھے میرے پلاٹ کی فروخت منسوخ کر دی گئی ہے۔ سالہا سال پہلے جب میرا اخبار ایوننگ ٹائمز کراچی سے نکلتا تھا اور میں وہاں رہتا تھا تو ایک دوست نے زبردستی پہلی قسط دے کر میرے لیے ایک پلاٹ بک کرا لیا تھا۔ کراچی چھوڑے عرصہ گزر گیا تھا اور اب مجھے یاد بھی نہ رہا تھا کہ میری کوئی قیمتی پراپرٹی وہاں موجود ہے۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ ہنسی تو اس لیے کہ مجھے اس پراپرٹی میں کوئی دلچسپی نہ تھی مکان بنانے کا نہ شوق تھا نہ سرمایہ اور نہ ہی وہ ابھی میری تحویل میں آئی تھی کہ مجھے اس کے گم ہو جانے کا غم ہو اور رونا اس بات کا تھا کہ حاکم وقت نے محض اپنے اندر غصے کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے میری جائیداد کا کتنا کھوج لگوایا ہوگا اور کتنے محکموں کا قیمتی وقت ضائع کرایا ہوگا اور انہیں کتنا طیش آیا ہوگا کہ کیسے قلاش شخص سے پالا پڑا ہے لیکن مجھے آنکھیں دکھانے سے باز نہیں آتا۔ ایک بار راولپنڈی میں بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ صدر ایوب کے سابقہ دفتر میں انہی کی میز پر براجمان تھے لیکن میز کی جائے نشست رخ بدلا کسی نجومی یا دست شناس کے مشورے پر۔ اپنے پیشروؤں کی نحوست سے بچنے

کے لیے بدل دی گئی تھی، بڑے فخریہ انداز میں فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے " وہ (یعنی فیلڈ مارشل ایوب) آیا تھا ٹیکس معاف کرانے "۔ میں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا ، اللہ اللہ کل تک یہ صاحب اپنے آپ کو ان کا "بیٹا" کہلاتے اور انہیں اپنا "باپ" کہنے میں کتنی سربلندی محسوس کرتے تھے۔

جب اس مزاج سے حکومت کی جائے گی تو اس میں جتنے بھی ولاڈ کیمپ بنیں کم ہیں۔ بھٹو نے اپنے مخالفوں کو ہی سزائیں نہیں دیں، انہوں نے ملک و قوم کو نقصانِ عظیم پہنچایا۔ اقتصادی میدان میں تو ہیانے کی جلد بازی، کوتاہ بینی اور طفلانہ پالیسی نے سالوں کے لیے صنعتی ترقی کو روک دیا۔ خارجہ میدان اپنا نام اچھالنے اور مقام بنانے کو حکمت عمل کا درجہ دیا۔ ذاتی انا کی تسکین کے لیے کامن ویلتھ سے نکل آئے اور سربراہان ممالک کی سربراہی کے جنون میں مبتلا ہو گئے۔ قومی نقطہ نگاہ سے اسلامی کانفرنس کے انعقاد سے ہمیں سخت ضرب لگی کہ اس کے ذریعے پاکستان کی تقسیم پر مہر توثیق لگا دی گئی۔ جب ۷۶ء میں ترقی پذیر ملکوں کے وزرائے خارجہ کی میکسیکو میں میٹنگ ہو رہی تھی تو اپنے وزیر خارجہ عزیز احمد کو وہاں یہ ہدایت دے کر بھیجا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو پاکستان میں ان ملکوں کی سربراہی کانفرنس کے انعقاد پر آمادہ کریں تاکہ تیسری دنیا کا تصور اور تشخص ابھرے۔ چونکہ ایسی سربراہی کانفرنس کا غیر جانبدار ملکوں کی تنظیم (جس کے ان میں اکثر ملک رکن تھے) سے ٹکراؤ ناگزیر تھا۔ کسی وزیر خارجہ نے عزیز احمد کی تجویز پر کان نہ دھرا اس اس طرح بھٹو کی شخصیت مرکز نگاہِ عالم نہ بن سکی جو اس کا اصل مقصد تھا۔ معاہدہ شملہ ایک ایسا بھید ہے جس کی حقیقت ابھی تک نہیں کھلی۔ یہ مذاکرات ۲۸ جون ۷۲ء کو شروع ہوئے اور دو جولائی تک چلے لیکن کسی سمجھوتے کی صورت نظر نہ آئی۔ پاکستانی وفد نے واپسی کے لیے اپنا سامان باندھ لیا کہ اچانک مسز اندرا گاندھی اور مسٹر بھٹو کے درمیان ۲ اور ۳ جولائی کی نیم شب تنہائی میں ایک رازدارانہ میٹنگ ہوئی جو تین گھنٹے جاری رہی اور اس کے بعد یہ تعجب انگیز اعلامیہ جاری ہوا کہ پاکستان اور ہندوستان میں معاہدہ ہو گیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ دو شخصیتیں اپنے ملک کی گتھی کو چٹکیوں میں سلجھانے میں کس طرح کامیاب ہوئیں۔ یہ بہرحال ظاہر ہے کہ اس معاہدے کے ایک کلیدی نکتے سے کشمیر پر پاکستان کی پوزیشن ہندوستان کے مقابلے میں کمزور

ہوئی۔ معاہدہ شملہ سے پہلے پاکستان پر اس مسئلے کو سلامتی کونسل یا کسی ثالث کے سامنے اٹھانے کے لیے کوئی پابندی نہ تھی لیکن اب کسی ایسے اقدام سے پہلے ہندوستان کی مرضی کو پیش نظر رکھنا لازمی ہو گیا۔ اس طرح کم از کم اس بنیادی جھگڑے میں ہندوستان کو پاکستان پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ اب امریکہ کی طرف آیئے۔ بھٹو نے امریکہ سے ہمارے تعلقات کی مدتوں محنت سے اٹھائی عمارت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا جس کا پاکستان کو اقتصادی، خارجہ اور عسکری میدان میں بڑا نقصان پہنچا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ایک سپر پاور سے تعلقات کی خرابی کی تلافی دوسری سپر پاور سے دوستی نے کر دی ہو۔ جہاں ہندوستان، روس اور امریکہ دونوں سے فائدہ اٹھا رہا تھا، پاکستان دونوں کی ناراضگیوں اور ناخوشی کا ہدف بنا۔

بھٹو کا دور حکومت اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا تو صورتحال یہ تھی کہ اس کی پوزیشن ڈانواں ڈول تھی۔ بھٹو کی مطلق العنانی کی دہشت پھیل چکی تھی۔ ملک کی اقتصادی حالت دگرگوں تھی تو خارجی دنیا میں ہم اکیلے رہ گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ بھٹو سے بہت مایوس ہو گئے تھے۔ ان کے متعلق یہی نہیں کہا جا رہا تھا کہ انہوں نے ملک توڑا، جمہوریت بحال کرنے کی بجائے عوامی مارشل لاء لگایا، سوشلزم اور سیکولرازم کے خیالات پھیلائے بلکہ معاشرتی اور معاشی طور پر زندگی اجیرن کر دی۔ پھر بھی وہ انتخابات میں دو تہائی اکثریت کے تعاقب میں سرگرداں تھے جو ۷۷ء میں انہوں نے اپنے مخصوص طریقوں سے حاصل کی۔ ان انتخابات میں پی پی پی کو ۱۵۸ نشستیں ملیں۔ اس تعداد میں سے اگر چالیس دھاندلی زدہ نشستوں کی بخشش پی این اے کو دے بھی دی جاتی تو باقی ۱۱۸ نشستوں میں قبائلی اور خواتین کی نشستیں ملا کر دو تہائی اکثریت یعنی ۱۴۲ بآسانی بن جاتی۔ سوال یہ ہے کہ آخر بھٹو دو تہائی نشستوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے تھے؟ کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے خود ساختہ دستور کو یکسر بدلنا چاہتے تھے، لیکن کیوں؟ یہی چیز لوگوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کرتی تھی اور یہ بات پھیل گئی تھی کہ وہ یک جماعتی حکومت کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے اور یہ افواہ بھی گشت لگا رہی تھی کہ یوں آمرانہ اختیارات حاصل کر کے وہ پاکستان اور ہندوستان کو کنفیڈریشن کے رشتے میں پرونا اور خود اس کا صدر بننا چاہتے تھے۔ یہ تھے عوامی تاثرات جو سالہا سال سے ملک کی فضا میں نفوذ

کیے ہوئے تھے۔ بھٹو کی ناکامی کا سبب دھاندلیاں ہی نہ تھیں۔ انتخابات میں دھاندلیاں کب نہیں ہوئیں۔ خود وزیر اعظم لیاقت علی خان کے زمانے میں پنجاب کے انتخابات میں اس قسم کے کارناموں کے لیے پہلی بار "جھرلو" کی اصطلاح رائج ہوئی تھی۔ دراصل ان کی المناک ناکامی کی اولین وجہ ملک وقوم کے مفادات کے حق میں وہ سوچ تھی جو منظر عام پر منکشف ہوئی اور زبان زد عام ہوگئی ورنہ پی این اے جو چند غیر منظم جماعتوں اور مختلف النوع لیڈروں پر مشتمل تھی کی تحریک اس قدر زور نہ پکڑتی کہ نہ پولیس اور نہ فوج کے قابو میں آسکی، حتیٰ کہ مارشل لاء لگ گیا اس سے پہلے جب کبھی ایجی ٹیشن ہوئی اس پر تھوڑی سی طاقت کے استعمال سے قابو پا لیا گیا لیکن بھٹو کے خلاف تحریک نہ رکی۔ اس کے محرکات گہرے اور دو گونہ تھے۔ ایک تو وہ پاکستان کی حفاظت کے جذبے سے سرشار اس کی بقا کے عزم کی حامل تھی۔ بھٹو کے ہاتھوں میں وہ غیر محفوظ نظر آتا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح اس نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا رستہ صاف کیا اسی طرح وہ بقیہ پاکستان کو ہندوستان کا حاشیہ نشین بنانا چاہتا ہے۔ اسی احساس و ادراک کے زیر اثر عوام نے سومنانہ فراست سے کام لیا اور اسی سوراخ سے دوبارہ ڈسے جانے سے انکار کر دیا۔

... ...

مسٹر بھٹو کے جرائم

مسٹر بھٹو کے جرائم کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور کالم نگار صحافی عبدالستار احسن نے اپنے جریدے افریشیا میں لکھا۔

"_____ تحریک نظام مصطفےٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان کے عوام نے مسٹر بھٹو کو آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے رد کر دیا ہے۔ مسٹر بھٹو ان کے لیے نفرت کا نشان بن چکے ہیں وہ شخص جو پاکستان کے غریب اور مظلوم عوام کے نام پر ابھرا تھا وہ یہاں کے عوام کو غریب تر اور مظلوم تر بنا کر ڈوب گیا اس نے معاشی جمہوریت کا نام لے کر ان سے سیاسی جمہوریت بھی چھین لی۔ یہی نہیں اس نے شریفوں کی شرافت چھیننے کی کوشش کی اور ہر شخص کو اس

خوف میں مبتلا کر دیا کہ اس کی جان، مال، عزت، آبرو محفوظ نہیں اور آخر میں جب ظلم و ستم کی پانچ سالہ تاریک رات ختم ہونے کی امید ہوئی اور عوام کو حق ملا کہ وہ اپنی رائے کے استعمال سے اپنی مرضی کی حکومت چُن لیں تو وہ ننگی دھاندلی مچائی گئی کہ الامان والحفیظ اور پھر مکافاتِ عمل کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو ہر فرعون، ہر شداد، ہر نمرود اور ہر یزید کو بہا کرلے جاتا رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر اس اہل کیلئے کوئی مہلت نہیں ہوا کرتی۔

کیا حالیہ تحریک میں پاکستانی عوام نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ وہ اگرچہ کچھ عرصہ چُپ ضرور رہے لیکن منکر نکیر کی طرح مسٹر بھٹو کا ایک ایک کارنامہ ان کے نامۂ اعمال میں درج کرتے رہے جو انتخابی مہم کے دوران جلسوں اور جلوسوں میں اُلم نشرح ہو گیا۔

پاکستان کی تاریخ میں مسٹر بھٹو کو ایک مخصوص مقام حاصل ہے اکتوبر ۵۸ء سے لیکر جون ۷۷ء تک تقریباً انیس سال کے طویل عرصے کے دوران وہ پاکستان کی سیاست میں ایسے مقام پر فائز رہے ہیں کہ آپریشن جبرالٹر سے لے کر معاہدۂ تاشقند، سقوط ڈھاکہ اور شملہ معاہدہ تک اس دور کے تمام اہم فیصلوں میں ان کا ہاتھ رہا ہے۔ لازم ہے کہ ان کے ۱۹ سالہ کردار کے بارے میں اہلِ پاکستان کو آگاہ کیا جائے۔

مسٹر بھٹو نے سب سے بڑا جرم یہ کیا ہے کہ انہوں نے غریبوں کے نام پر لٹیرے نوابوں کی حکومتیں قائم کیں اور پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں بڑے سے بڑا جاگیردار اور سرمایہ دار غریبوں کے سروں پر مسلط کر دیے ۔۔۔ مسٹر بھٹو نے ملک و قوم کی جاں نثار پاکستانی فوج کے چہرے کو مسخ کرنے کی مسلسل اور متواتر کوشش کی۔ فوج کی شکست کی تصویریں ٹیلی وژن پر دکھانے والے مسٹر بھٹو ہی تھے۔ اس فوج کے بارے میں پاکستان ٹائمز میں یہ مضامین لکھوانے والے بھی مسٹر بھٹو ہی تھے۔ کہ یہ کرائے کی فوج ہے اس فوج کو ہمیشہ کے لیے بددل کرنے کی خاطر بیرون ملک سے ماہرین کو منگوا کر فیچر فلمیں تیار کروانے والے بھی مسٹر بھٹو تھے جنہوں نے بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی حمایت میں مضامین لکھوائے۔ اسی طرح یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے ۱۹۶۹ء میں مجیب الرحمٰن کی وکالت کی پیشکش کی تھی

اور یہ بھی مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے ۱۹۷۲ء میں اسے رہا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ مسٹر بھٹو ہی نے اسلامی سربراہی کانفرنس کے پردے میں بنگلہ دیش کو منظور کیا تھا اور مجیب الرحمٰن کو اس سرزمین میں توپوں کی سلامی دی تھی جس سے اس نے غداری کی تھی۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے ۶۵ء میں رن کچھ کے سلسلے میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ثالثی کے اصول کو تسلیم کیا تھا اور اس فیصلے کی راہ کھولی تھی جو پاکستانی قوم کے سراسر خلاف تھا۔ اسی طرح کابینہ کے اجلاسوں کی روداد گواہ ہے کہ مسٹر بھٹو کا ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کیا کردار رہا اور یہ تاریخی حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اسی جنگ کے نتیجے میں جنوری ۱۹۶۶ء میں معاہدہ تاشقند ہوا۔ اور فروری ۱۹۶۶ء میں اپوزیشن کے اس اجتماع میں جو لاہور میں چودھری محمد علی کے مکان پر منعقد ہوا تھا، مجیب الرحمٰن کو چھ نکات پیش کرنے کی جرأت ہوئی۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے جمہوری عمل سے معرض وجود میں آئی ہوئی مملکت پاکستان پر سیاسی عمل کے نام پر قبضہ کیا۔ لیکن اس مملکت میں تمام تر سیاسی اور جمہوری عمل کا گلا گھونٹا اور تمام سیاسی، معاشی، قانونی اور معاشرتی اداروں کو ملیامیٹ کر دیا۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے عوامی تحریک کے دباؤ سے مجبور ہو کر شراب اور جوئے پر پابندی کا اعلان کیا لیکن شرابیوں اور جواریوں کو کھلی چھٹی دے کر اسلام کا مذاق اڑانے کی جسارت کی۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے یحییٰ خاں کو مجبور کیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں فوجی اقدام کرے اور یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے صرف فوج کی ناکامی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے حمود الرحمٰن کمیشن کو تشکیل دیا اگرچہ اس کی رپورٹ آج تک شائع نہیں کی۔ لیکن مسٹر بھٹو نے اس حقیقت کو کبھی سامنے نہیں آنے دیا کہ فوجی شکست کے پیچھے کون سی سیاسی قوتیں کارفرما تھیں۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں مداخلت کی بدترین مثالیں

قائم کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الیکشن کمیشن نے تقریباً سو سیٹوں کا ریکارڈ محفوظ کر کے اس میں جھانکنے کی تکلیف اٹھائی ہے اور صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ دھاندلی کا پیمانہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ نئے انتخابات کے سوا اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ میں پاکستان میں ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میری پالیسیوں سے لوگوں کو اختلاف ہو تو عام سے عام آدمی بھی میرا گریبان پکڑ کر مجھے یہ کہہ سکے کہ مسٹر بھٹو جہنم میں جاؤ، اور یہ بھی مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے اپنے عہد اقتدار کے پانچ سالوں میں لوگوں کے لبوں کو سی دیا اور ان کی زبانوں پر پہرے لگا دیے اور سیاسی افق پر دفعہ ۱۴۴ اور ڈی پی آر کے اندھیرے مسلط کر کے جہنم کا سماں پیدا کر دیا۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے پہلے تو ایک متفقہ آئین بنانے کی داد وصول کی اور پھر اپنے ہی ہاتھوں سے چار سال تک اس کی دھجیاں بکھیرتے رہے اس آئین میں من مانی ترمیمیں کی گئیں اور وفاقیت اور صوبائی خود مختاری کے اصولوں سے یکسر انحراف کرتے ہوئے صوبائی حکومتوں کو بے دست و پا کر دیا۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے قومیانے کے بجائے ملک میں سرمایہ کاری کو سرے سے ختم کر دیا۔ مسٹر بھٹو نے بے روزگاری اور نتیجتہً بے چینی پیدا کی اور لوگوں کو رزق تلاش میں ملک چھوڑنے کی راہ پر ڈالا۔ یہاں تک کہ پاکستان پچھلے تین سال سے برادر ملکوں کی بخشیش پر چل رہا ہے۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے کبھی تو یہ دعویٰ کیا کہ قومی اسمبلی ملک کا سب سے معزز ادارہ ہے اور اسے توڑا نہیں جا سکتا لیکن یہی مسٹر بھٹو تھے جن کے دور میں قومی اسمبلی کے اراکین کو تابعداری کے آداب سکھانے کے لیے پرمٹوں اور لائسنسوں کا عادی بنایا گیا اور جس کسی کو اس تعلیم و تربیت سے انکار ہوا اسے حسب ضرورت ایف ایس ایف کے جوانوں سے اٹھوا کر اسمبلی سے باہر پھینک دیا۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جنہوں نے سرکاری افسروں کو اپنا ذاتی ملازم بنانے کے لیے

ان سے آئینی تحفظات چھین لیے اور "لیٹرل انٹری" کے منصوبے کے تحت ان کی صفوں میں اپنے کارندے چھوڑ دئے تاکہ پاکستان کی سروسوں میں کسی طرح کا نظم و ضبط باقی نہ رہے۔

یہ مسٹر بھٹو ہی تھے جن کے دور میں لاہور میں حلقہ نمبر ۶ کے اندر جلیانوالہ باغ کا نقشہ پیدا ہوا اور بیسیوں بے گناہوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، اور پھر یہی خونی ڈرامہ کراچی حیدرآباد، ملتان اور پاکستان کے تمام شہروں اور قصبوں میں دہرایا گیا۔ باغ میں گولی کا نشانہ بننے والے ایک جوان کے بھائی نے لندن میں کیا کہا تھا۔ کیا مسٹر بھٹو بھول گئے کہ پاکستانی ماؤں کے وہ ہزاروں بچے جنہیں ان کے حکم سے شہید کر دیا گیا۔ ان کے خون کا حساب لینے والا کوئی باقی نہ بچا؟ اگر مسٹر بھٹو کو یہ زعم ہے کہ پاکستان کے غریب عوام ان کا ساتھ اس لیے دیں گے کہ انہوں نے پاکستان بھر کے لٹیرے نوابوں کو اپنی گود میں بٹھانے کے باوجود یہ نعرہ لگایا ہے کہ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی چمڑی ادھیڑ دیں گے، تو یہ بھی ان کی بھول ہے دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خلاف عوامی تحریک میں شہید ہونے والے ایک ہزار نوجوانوں میں سے ایک بھی کسی جاگیردار یا سرمایہ دار کا بیٹا نہیں تھا، بلکہ یہ سب متوسط درجہ کے سفید پوشوں اور غریبوں کے چشم و چراغ تھے۔ اگر پاکستان کے امیر بھی مسٹر بھٹو کو معاف بھی کر دیں تو پاکستان کے غریب انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے [1]"۔

آگے چل کر انہوں نے لکھا:

"مسٹر بھٹو کے خلاف تحریک اس منفی نکتہ سے شروع ہوئی کہ وزیراعظم مستعفی ہو جائیں اور نئے الیکشن کرائے جائیں بعد میں اس تحریک نے نظام مصطفےٰ کے قیام کا مثبت رُخ اختیار کیا اور یہ مثبت رُخ بھی دراصل پہلے منفی نکتہ کا منطقی نتیجہ تھا کہ بھٹو حکومت کے

---

[1] اقتباس از مضمون "بھٹو کے جرائم" از عبدالقادر حسن شائع کردہ "افریشیا" ۱۱ اگست ۱۹۷۷ء

[2] اقتباس از مقالہ خصوصی ہفت روزہ افریشیا لاہور مورخہ ۱۲ گست تا ۱۸ اگست ۱۹۷۷ء۔ جلد ۳۔ شمارہ ۷۔

خلاف نفرت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس میں عوام کو وہ انصاف میسر نہ تھا جو اس ملک کے عوام کے تمام یعنی مطالبہ یعنی اسلامی نظام میں موجود ہے۔ بھٹو کی حکومت کا عمومی ناک نقشہ غیر اسلامی تھا اور وہ اگر لوگوں کو خوش کرنے کیلئے کوئی اسلامی اقدام کرتے بھی تھے تو غیر اسلامی انداز میں جس سے کوئی وقتی سیاسی مقصد مطلوب ہوتا تھا نہ کہ دیانت کے ساتھ کوئی اسلامی مقصد۔ ان کے ساتھ عوام نے بڑی شدید والہانہ محبت کی۔ اس شخص سے مایوسی کے بعد قدرتی طور پر اتنی ہی شدید نفرت بھی کی اور اسی نفرت کی بے پناہ قوت کا نتیجہ تھی اس بے مثال عوامی تحریک کی جس نے بھٹو کے اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بھٹو اور اس کے ساتھی وہ لوگ ہیں جن سے نجات پانے کے لیے ایک لاکھ سے زائد افراد قید ہوئے۔ کم از کم تین سو کے قریب لوگوں نے جام شہادت نوش کیا اور مالی نقصان اور مالی ایثار کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔

یہ قوم آج ایک نئی با اعتماد قوم ہے جسے اپنے زور بازو پر بڑا گھمنڈ ہو گیا ہے۔ ایک آمر نے اس سے ووٹ کا حق چھیننے کی جرأت کی تو اس نے برملا اور للکار کر اپنا حق چھین لیا۔ ایسی قوم کو دھوکہ دینے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

عوامی تحریک کے حوالے سے اس قوم کی اُمنگوں کا جائزہ لیا جائے تو چند باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ قوم نے اس طبقے کو مسترد کر دیا جو قیام پاکستان کے بعد سے اس پر حکومت کرتا چلا آ رہا ہے۔ کبھی وہ کسی جماعت میں شامل ہوتا ہے اور کبھی کسی دوسری جماعت میں لیکن کسی بھی خوشنما لبادے کے اندر وہی رہتا ہے۔ اس طبقے کو قوم نے ایک بار تو بھٹو کی قیادت میں مسترد کر دیا اور دوسری بار اس وقت جب بھٹو انہیں شکست خوردہ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر عوام کے پاس آیا، دونوں موقعوں پر یہ طبقہ عوام کا مردود ٹھہرا۔

۲۔ قوم نے اس کے ساتھ اس طبقہ کو بھی مسترد کر دیا جو متذکرہ طبقہ کی جگہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھٹو کی قیادت میں سامنے آیا تھا اور جس نے ظلم و ستم اور بد دیانتی اور بدعنوانی میں متذکرہ طبقے کو بھی مات کر دیا۔

۳۔ وہ تمام پالیسیاں اور افعال بھی مردود ٹھہرے ہیں جو بھٹو دور کی پیداوار ہیں۔

۴۔ عوامی تحریک نے قوم میں یہ جذبہ پیدا کیا ہے کہ اس پر حکومت کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو جمہوریت کے عملاً قائل ہوں۔ اسلامی نظام زندگی پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کے نفاذ کے خواہاں ہوں۔ پاکستان میں اسلامی نظام کا مطالبہ اتنا پرانا ہے کہ حکمرانوں کی طرف سے اس کے عملاً استرداد کا زخم اب ناسور بنتا جا رہا ہے اور عوام اس ناسور کے حتمی علاج پر کمربستہ ہیں۔

۵۔ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا لیڈر کیوں نہ ہو عوام اسے عوامی تحریک کے بنیادی تقاضوں اور مطالبات سے صرفِ نظر کی اجازت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ اور یہ تو سارے لیڈر جان ہی گئے ہیں کہ پاکستان کے عوام جس کی اجازت نہ دیں وہ بات نہیں ہو سکتی۔"

تحریک کی رُوداد

مسٹر بھٹو کے خوفناک عہد کے بارے میں مستند اہلِ قلم حضرات کی شہادت سامنے آگئی ہے۔ ان کے طرزِ حکمرانی کا یہی پس منظر تھا جس کی روشنی میں انتخابات میں بہت بڑی کامیابی حاصل کر کے آنے والے مسٹر بھٹو صرف ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک پہنچتے پہنچتے ملت کی نفرت کا بدترین ہدف اور مرکز بن چکے تھے اور ان کے خلاف احتجاج و فریاد کا لاوا ہر شریف انسان کے سینے میں ابل رہا تھا۔ اس آتش فشاں کو آخری طور پہ مسٹر بھٹو کی غیر معمولی انتخابی دھاندلیوں نے پھٹنے پر مجبور کر دیا۔ ملت نے محسوس کیا کہ یہ شامتِ اعمال تو اب انتخابات کے ذریعے بھی رخصت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس نے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا راستہ چھوڑ کر اپنے تمام وزراء اعلیٰ اور درجنوں کے حساب سے دوسرے عہدہ داران بلا مقابلہ کامیاب کرا لیے تھے اور اب اس حضرت کے خلاف کھلا کھلا احتجاج کیے بغیر ملت کو کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ جان دینے، شہادت حاصل کرنے اور جان فروشی کے عزائم کے ساتھ میدان میں آگئے۔

قومی نشستوں پر ملت کے معتوب ترین لوگوں کا بلا مقابلہ کامیاب ہو جانا اس بات کی علامت تھی کہ ملت اسلامیہ یا تو اپنے آزاد ملک میں ایک بے دین گمراہ کی غلامی کو قبول کر کے ہمیشہ کے لیے اپنی آزادی سے دستبردار ہو جائے یا پھر اپنی آزادی کی بحالی اور تحفظ کے لیے ہمت کر کے اٹھے۔ قومی اتحاد میں کوئی بہت زیادہ مضبوط اور مشہور جماعتیں شریک نہ تھیں۔ صرف وہ اس تمام پر اکٹھی ہوئی تھیں جو تمام ملت کی آرزوؤں کا مظہر تھا۔ اسی لیے جب قومی اسمبلی کے انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف قومی اتحاد نے صوبائی نشستوں کے بائیکاٹ کا اعلان کیا تو وہ بائیکاٹ ایسا شاندار تھا کہ پولنگ اسٹیشنوں پر مکھیوں اور گرد کے سوا کوئی نہ پہنچا اور ایسے مکمل بائیکاٹ نے حکومت کے اوسان خطا کر دیے۔ پھر وہ بائیکاٹ مایوس کن خاموشی، بے جان علیحدگی اور دلبرداشتہ بے تعلقی پر ختم نہیں ہوا بلکہ عوام نے شہر بہ شہر جلوس نکالنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چند ابتدائی احتجاجی جلوسوں کے بعد ہی قومی اتحاد کے نمایاں قائدین تو مسٹر بھٹو نے گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیے لیکن احتجاجی تحریک جو لیڈروں اور جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر ملت کے اپنے ہاتھ میں چلی گئی تھی اب تدریج اپنے آپ آگے بڑھتی چلی گئی۔

لاہور میں روزانہ جلوس نکلتے، لاٹھی چارج ہوتا، گولی چلتی، کچھ لوگ شہید ہو جاتے اور پھر دوسرے روز اس سے بھی بڑا جلوس نکلتا۔ پھر دو دو جلوس۔ تین تین جلوس۔ پھر تو سارا شہر سڑکوں پر دکھائی دیتا۔ یہی حال پشاور، کراچی، حیدر آباد، فیصل آباد، ملتان اور سرگودھا کا تھا۔ یہ سلسلہ چل پڑا تو پھر انتظامیہ اور عوام کا تصادم ہی باقی رہ گیا۔ پیپلز پارٹی کے جیالے تو منظر سیاست سے ایسے غائب ہوئے کہ کہیں نظر نہ آتے تھے۔ جو جیالے کسی جماعت کو جلسہ نہ کرنے دیتے تھے اور بقول ان کے جمہوری طریقے پر شور و غل مچا کر، پتھر مار کر اور ہڑبونگ کر کے جلسے خراب کر دیتے تھے۔ وہ جیالے زیر زمین چلے گئے اور اپنی مقبولیت کے دعوؤں کے باوجود اس طرح غائب ہو گئے جیسے چور اور ڈاکو گھر والوں کے جاگ جانے پر غائب ہو جاتے ہیں یا لٹیرے چوکیدار آنے پر دبک جاتے ہیں۔

ملک کا کوئی شہر، کوئی حصہ باقی نہ رہا، جس میں احتجاجی جلوس نہ نکلتے ہوں۔ بعض

شہر تو مسٹر بھٹو نے فوج کے حوالے کر دیے اور فوج نے پولیس سے بڑھ کر مسٹر بھٹو کو بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ کمانڈر انچیف نے سیاسی حکومت کی حمایت کا کھلا اعلان کیا اور سرکلر جاری کیا۔ فوجی ہر جگہ جلوس کے آگے مورچہ بنا کر بیٹھ گئے اور ایک حد مقرر کر دی کہ یہاں سے آگے جلوس نہ جانے گا لیکن پر جوش نوجوان سینہ تان کر آگے بڑھے۔ گولی نے ماں کے لال کو شہید کر دیا تو دوسرا مجاہد سینہ تان کر آگے بڑھا۔ اس طرح نوجوانوں نے پولیس اور فوج کے ہاتھوں مسٹر بھٹو کی ہدایات پر جگہ جگہ جانیں قربان کیں اور تحریک نظام مصطفےٰ کو خونِ شہیداں سے لالہ زار کیا۔

اندھا دھند لاٹھی چارج سے ہزاروں، لاکھوں لوگ زخمی ہوئے، اپاہج ہوئے۔ قومی اتحاد نے ریلیف فنڈ قائم کیا تو ملت نے اس میں لاکھوں روپے جمع کر دیے۔ قومی اتحاد نے جسٹس بدیع الزماں کیکاؤس کو اس فنڈ کا خزانچی مقرر کیا۔ چودہ لاکھ سے زائد فنڈ زلوگوں کے علاج معالجے اور امداد پر خرچ ہوئے۔ یہ ساری رقوم عوام نے ہی جمع کی تھیں۔ لوگ جہاد تحریک کی طرح قومی اتحاد کی کامیابی کے لیے روپیہ اور جانیں نچھاور کر رہے تھے۔ شہر، قصبے اور دیہات تحریک کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔ ایک ہزار سے زائد افراد شہید ہوئے۔ ایک لاکھ سے زائد افراد زخمی ہو گئے۔ کئی لاکھ لوگ جیلوں میں گئے، کروڑوں اور اربوں کی جائدادیں تباہ ہو گئیں۔ یہ تحریک ۱۱ مارچ سے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک مسلسل چلتی رہی۔ اس دوران مسٹر بھٹو مذاکرات کے ذریعے تحریک کو ٹھنڈا کرنے کے حربے آزماتے رہے، سفیروں کو درمیان میں ڈالتے رہے۔ اسلامی نظام جاری کرنے کے دعوے کرتے رہے بلکہ انہوں نے مجبور ہو کر شرابی ہونے کے باوجود ناراض قوم کو راضی کرنے کے لیے شراب کی بندش کا اعلان بھی کیا۔ جمعہ کی چھٹی کا اعلان بھی کیا۔ لیکن لوگوں کا ان کے خلاف اشتعال اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ ان دنوں عوام کے جلوس میں یہ نعرہ بہت پاپولر تھا کہ "ہمیں بھٹو کا سر چاہیے" اور بعد کے دور کی تاریخ میں قدرت نے ملت کا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا۔

اس ساڑھے تین ماہ کی تحریک کے دوران جب تمام لیڈر جیلوں میں تھے اور پیر پگاڑا تحریک کی سربراہی کر رہے تھے تو انہوں نے ۳۰ اپریل کو اسلام آباد تک لانگ مارچ کا

اعلان کر دیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلام آباد پہنچ کر وزیر اعظم ہاؤس کا گھیراؤ کر کے اپنے مطالبات پیش کیے جائیں۔ اس لانگ مارچ کے اعلان سے مسٹر بھٹو اتنے گھبرائے کہ انہوں نے اسے ناکام کرنے کے لیے پورے ملک کی پولیس کو اس کام پر لگا دیا اور اسلام آباد اور راولپنڈی کے دونوں شہروں کو پولیس کے گھیرے میں دے دیا۔

۳۰ اپریل اور واردات زنداں

اس طرح ۳۰ اپریل کا دن ہماری قومی زندگی میں ایک یادگار دن بن گیا ہے جس طرح ۶ ستمبر کا دن کبھی فراموش نہ ہو گا کہ اس روز پاکستان میں آباد پاکستانی قوم کی حفاظت اسلام نے کی تھی اور صدیوں کا خفتہ جذبہ ایمان جہاد کی للکار بن کر نمودار ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح صدیوں سے مسلمان قوم میں سویا ہوا شعور اسلام جمہوریت ۳۰ اپریل کو ایک زبردست احتجاجی انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا۔ مسلمانوں کے دل میں یوم کربلا میں جو حسرت اظہار رہ گئی تھی اب وہ حسرت نکلنے کا دن ۳۰ اپریل مقرر ہوا تھا۔ حسینؓ کی کربلا کا معرکہ ہماری تاریخ کو ہر بار زندہ کر دیتا ہے۔

... ...

یہ ۳۰ اپریل ہے اور قوم ۸ مارچ سے تاریخ کی شاہراہ پر احتجاجی مارچ کرتی ہوئی آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی۔ ملک طوفانی ہلچل سے دوچار تھا۔ پوری قوم اضطراب میں مبتلا تھی، قوم کے ساتھ دھوکا دہی کا عمل ہو گیا تھا۔ ایک فرد کے ساتھ بھی دھوکہ ہو جائے تو وہ اضطراب سے تڑپ اٹھتا ہے لیکن یہاں تو پوری قوم لٹ گئی تھی اور اس کی جیب کٹ گئی تھی، اس کی حقیقی رائے اس کی اجتماعی مرضی کے خلاف چلا کر چوروں نے اسے لاٹھیوں کے گز سے ناپ ڈالا تھا۔ ایسا دھوکا بھی تاریخ میں کسی نے کبھی کسی کو نہ دیا ہو گا۔ ایسی دیدہ دلیری بھی اپنی قوم ہی کے خلاف کسی نے نہ کی ہو گی۔ پوری قوم دھوکہ دہی کے اس ملک گیر عمل کے خلاف سراپا احتجاج بنی ہوئی تھی، سارے ملک میں ایک زبردست سیاسی زلزلے کی سی کیفیت طاری تھی، لوگ احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اب اگر رائے دہی کے بکسوں پر بھی

اعتماد نہ رہا۔ اب اگر انصاف کرنے والوں کی طرف سے بھی دھوکے تقسیم ہونے لگے تو پھر لوگ اس ملک میں کس طرح آباد رہ سکیں گے؟ لوگ اپنی مملکت کا انتظام کس طرح جاری رکھ سکیں گے! پھر تبدیلی کیسے ہو گی؟ عوام کی مرضی کیسے نافذ ہو گی! اگر شہد سے بھی مٹھاس زائل ہو گئی اور بادل نے بھی برسنا چھوڑ دیا تو لوگ کیا کریں گے۔ یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی اور لوگ اس ناقابلِ برداشت صورتِ حال کے خلاف احتجاج اور فریاد کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے تھے، اب گھروں میں غلام بن کر بیٹھنا بے کار تھا۔ ان سے جنگل، جیل خانے اور شاہی قلعے کے عذاب خانے بہتر تھے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے اپنی آزادی کی خاطر اور انسانیت کی خاطر گھروں سے نکل آئے تھے۔ لوگ اب اس سے زیادہ غلام بننے کے لیے تیار نہ تھے، وہ روس میں نہیں پاکستان میں آباد تھے۔

قوم ایک سیاسی زلزلے سے دوچار تھی۔ ۷، مارچ کے انتخابات میں مسٹر بھٹو نے دھوکا کیا تھا، لوگوں کی رائے چرالی گئی تھی اور اب ملک میں ایک سیاسی زلزلے کی سی ہلچل تھی۔ کراچی سے خیبر تک سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔ بیداری اور بیزاری کے اس مخلوط احتجاجی عمل نے تمام معاشرتی طبقات اور مکاتبِ فکر کو ایک مربوط اور متحد جماعت بنا دیا تھا۔ صدیوں کے بعد ایک جارحیت پسند بدی کے خلاف قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی تھی۔ قوم میدانِ عمل میں تھی۔ ۲۰، اپریل اس کا یومِ احتجاج تھا۔ دھوکا باز کے گھر کے سامنے بات یہ تھی کہ ۱۴، مارچ سے احتجاج و اضطراب کا سلسلہ ہر شہر میں جاری تھا۔ لاکھوں لوگ اپنی انسانی آزادی کی حفاظت کے لیے جیلوں میں جا چکے تھے، ہزاروں زخمی اور شہید ہو گئے تھے۔ دن رات جگہ جگہ شہر بہ شہر جلوس نکل رہے تھے۔ آزادی کا حصول سب سے بڑا قیمتی جذبہ ہوتا ہے، اور مسٹر بھٹو نے جبر کی تلوار اور دھوکے کے انتخابات سے قوم کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کی تھی۔

... ...

عوام کا مطالبہ یہ تھا کہ قومی زندگی میں ایسی جعل سازی نہ چلے گی، اس لیے دوبارہ قوم کی رائے بیلٹ بکس میں معلوم کی جائے۔ بات معقول تھی لیکن نامعقول لوگوں نے گولیاں

چلائیں، نوجوان جیلوں میں گئے، معصوم نوجوانوں کو شاہی قلعے اور حوالاتوں میں لے جاکر ان کو اذیتیں دی گئیں جیسے اذیتیں دینے والے سامراجی طاقت کے نمائندے تھے۔ انہیں اس قوم اور اس کی آرزوؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کو الٹا لٹکا کر مارا گیا۔ میرے عزیز اور محترم ساتھی اچھرہ والے میاں عثمان کا سوجا ہوا چہرہ کیمپ جیل میں میں نے دیکھا تھا، وہ اپنے محلے کا شریف ترین نوجوان تھا اس پر اس کے ہمسائے فخر کرتے تھے۔ اُسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا تھا کہ یزید کا دور پھر آ گیا تھا۔ شاید یہ ہمارے ملک میں لارڈ کلائیو یا رنجیت سنگھ یا جنرل ڈائر کی حکومت تھی، ناخن انگلیوں سے نوچ لیے گئے، ڈاڑھیاں ماچس کی جلتی تیلیوں سے جلائی گئیں۔ جسم کے نازک اعضاء پر بجلی کے جھٹکے دیئے گئے، یہ مسلمان پولیس اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ کارروائیاں کر رہی تھی، یہ سب شریف شہری تھے اور ساری قوم کے حق رائے دہی کے لیے لڑ رہے تھے۔ لوگوں کی زبان پر پنجاب پولیس مردہ باد کا نعرہ تھا۔ کاش یہ مُردہ ہی ہوتی لیکن اس کی قومی اور ملی غیرت مردہ تھی وہ کتوں کی طرح قوم کو بھنبھوڑ رہی تھی۔ فی الحقیقت پولیس کا محکمہ قومی اور ملی جذبات سے بالکل خالی ہے اور یہ کرائے کے غنڈوں پر مشتمل باوردی گروہ گمراہ بن گیا ہے۔

... ...

قوم کا بھرا ہوا گھر لٹ گیا تھا۔ بقول جسٹس سجاد احمد جان چیف الیکشن کمشنر انہوں نے دکان سجائی دکان خوب تھی گاہک بھی شریف تھے لیکن ڈاکو آئے اور ساری دکان لوٹ کر لے گئے ... اب وہاں جلی ہوئی راکھ ٹوٹی ہوئی اشیاء اور لٹے پٹے دوکاندار کے سوا کچھ بھی باقی نہ تھا۔ قوم بیزار ہو گئی تھی۔ ۶۔ ستمبر کو اس نے خارجی کافر کی جارحیت کے خلاف جذبۂ جہاد کیا تھا۔ اور اب وہ ۲۰۔ اپریل کو اپنی قوم کے ظالم و جابر حکمران کے خلاف جذبۂ جہاد کا اظہار کر رہی تھی۔

... ...

ذرا دیکھئے کہ چینی کے برتنوں کی دکان کیسی بھری پڑی ہے۔ خوبصورت پیالیاں قطار در قطار پڑی ہیں۔ گلدانوں کی قطار ہے، نظر نواز جگ رکھے ہیں، ٹی سیٹ پڑے ہیں،

پلیٹیں، ڈنر سیٹ، ڈونگے اور رکابیاں یہاں سے وہاں تک سجی ہوئی ہیں۔ یکایک ایک بھینسا پھنکارتا ہوا اس خوبصورت دکان میں گھس آتا ہے، خونخوار بھینسے کی ٹکروں سے ساری دکان میں زلزلہ آیا ہوا ہے۔ پیالیاں ادھر اور گلدان اُدھر لڑھکتے اور ٹوٹتے چلے جا رہے ہیں۔ چشم زدن میں ساری خوبصورت دکان ٹوٹے ہوئے ٹھیکروں کا ڈھیر دکھائی دینے لگتی ہے۔

انسانی معاشرہ بھی تو چینی کے برتنوں کی ایک دکان کی مانند ہی ہے۔ ہمارے معاشرے کی دکان میں جبر و تشدد کا عفریت گھس آیا تھا۔ مسٹر بھٹو ہی وہ عفریت ہیں جنہوں نے پاکستانی مسلمان معاشرے کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ یہ عفریت اس شریف قوم کا حقیقی نمائندہ نہیں ہے۔

... ...

اخلاقی قدروں کا اہتمام، محبت، رواداری، حق گوئی، حق پرستی، شرافت، دیانت، معقولیت، دلیل پسندی، صلہ رحمی، باہمی تعاون و معاونت، غریب پروری، مشاورت (جمہوریت) اور آزادانہ رائے دہی، حق پرستانہ اختلاف اور معاشرانہ تعاون غرض انسانی اور اخلاقی قدروں کا ایک گلزار، ایک شریف انسانی معاشرے میں سجا ہوا ہوتا ہے۔ ہمارا بھی ایک شریف مسلمان معاشرہ ہے۔ اگر یکایک دندناتا دھمکاتا اور پھنکارتا ہوا کوئی ظالم ڈکٹیٹر اس معاشرے میں گھس آئے تو معاشرے کی اصلاحی اور اخلاقی قدروں کی ساری بساط تباہی و بربادی کا ایک ڈھیر دکھائی دینے لگتی ہے۔ ظلم و تشدد کے بھیڑیے انسانی شرافت اور معقولیت کو پھاڑ کر کھا جاتے ہیں، اس ظالم بھیڑیے نے پوری قوم کو پھاڑ کھایا تھا، پھر ظالموں کو خدا ہی پکڑتا ہے اور خدا نے پکڑ لیا ہے۔

بھیڑیا بلاشبہ بڑا خطرناک درندہ ہوتا ہے جب وہ بھیڑوں کے گلے پر حملہ آور ہوتا ہے لیکن اس بھیڑیے کی تباہ کاریوں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا جب وہ بھیڑ کی کھال پہن کر آتا ہے اور بھیڑوں میں ہی گھل مل جاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ وہ بھی بھیڑوں میں سے ایک بھیڑ ہے چرواہا اس کی طرف سے مطمئن رہتا ہے اور بھیڑوں کا پورا گلہ اور اس کی ایک

ایک بیڑا اس کی زد میں ہوتی ہے۔

... ...

پاکستان میں آباد مسلم معاشرہ بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ وجود میں آیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس مملکت میں مثالی اسلامی ریاست کا خواب دیکھا تھا، قائداعظمؒ نے یہاں چودہ سو سال کے قدیم قرآنی قوانین کے اجراء کو اپنی جدوجہد کا مقصد قرار دیا تھا۔ مسلمانانِ ہند نے اس مملکت کی بنیاد کو کلمہ طیبہ پر استوار کیا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک یہ تاثر ساری دنیا میں پھیل گیا تھا کہ یہ مملکت خلافتِ راشدہ کا مظہر ثانی بن کر منصۂ شہود پر آ رہی تھی اور یہاں شورائیت عدل و انصاف تقویٰ و دیانت شرافت و امانت اور مساوات اور فضائل اخلاق کا دور دورہ ہوگا۔ یہ مثالی اسلامی ریاست ہوگی، پاکستان اسلام کا گھر ہوگا۔

... ...

لیکن مملکت کے وجود میں آتے ہی غیب سے وہ غولِ بیابانی نمودار ہو گیا جو مسلمانوں کی تاریخ کا بہت بڑا عفریت ہے۔ وہ عفریت اسلام کی راہِ مستقیم سے انحراف کرنے والا فسق و فجور کا بگاڑا ہوا باغی کردار ہے اور جب سے وہ کردار مغرور ہوا ہے جو ایک زمانے میں یزید بنتا ہے۔ دوسرے زمانے میں حجاج بن یوسف بن جاتا ہے۔ کبھی وہ اکبر بادشاہ کی صورت میں اٹھتا ہے اور کبھی میر جعفر و میر قاسم کے روپ میں آتا ہے تو وہی کردار اس نئی مملکت میں بھی نمودار ہو گیا۔ اس کردار کے نمودار ہوتے ہی ملت کا قافلہ زندگی کے دوراہے پر ٹھہر گیا۔ زمانہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ تاریخ حسبِ روایت اپنا سفر طے کرتی رہی لیکن اس مملکت میں ملتِ مسلمہ کا قافلہ حق و باطل کے دوراہے پر جو کھڑا ہوا تو آج تک تیس سال سے حیران کھڑا ہے۔ ماہ و سال ساون کے بادلوں کی طرح گزرتے چلے گئے ہیں۔ قومیں چاند پر پہنچ گئی ہیں۔ قومیں اپنے حکمرانوں کا احتساب کر کے انہیں حسبِ ضرورت بدل دیتی ہیں۔ قومیں اپنے غداروں کو سزائیں دیتی ہیں، قومیں عالم ایجاد میں نو بہ نو زندگی کا ثبوت پیش کرتی اور تاریخ کے دھارے میں آگے ہی آگے بڑھتی ہیں لیکن مملکتِ پاک میں قافلۂ ملت پہلے دن سے جہاں رکا تھا وہیں کا وہیں رکا کھڑا ہے۔ بڑے بڑے وہاں آتے ایسے ورغلاتے

پھسلاتے اور بھٹکاتے ہیں۔ تاریخ کے چوراہے پر یہ حیران و پریشان انسانی قافلہ بدکردار عفریتوں کی شکارگاہ بن گیا۔ اے میری قوم تیرا خدا حافظ ہے۔ تو عفریتوں کے غول میں گھر گئی ہے، خداوند ہی تیرا محافظ ہو تو اپنے شعور سے خود اُٹھے گی تو یہ عفریت تیری تیری جان چھوڑ دیں گے۔

... ...

ساری دنیا میں سورج کی گردش کے ساتھ ساتھ کیلنڈر بدلتے ہیں، شب و روز بدلتے ہیں، تاریخ بدلتی ہے مگر ہماری اس مملکت میں کیلنڈر نہیں بدلتا۔ ہماری تاریخ جہاں ٹھہر گئی تھی برس ہا برس سے وہیں ٹھہری ہوئی ہے اور اپنے آپ کو سنگ مشین کے پہیئے کی طرح مسلسل اور پیہم اسی مقام پر دھرا رہی ہے۔ کتنے ہی حوادث بیت گئے ہیں کتنے ہی حکمران آئے ہیں اور چلے گئے ہیں لیکن ہم آج بھی ۱۹۴۷ء میں ہی کھڑے ہیں۔ ہمارے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۷ء میں بس یہی فرق ہے کہ ہم زیادہ خستہ حال ہو گئے ہیں اور نصف رہ گئے ہیں۔

... ...

آج کے اس جمود ملت کا ذمہ دار تاریخی کردار مسٹر راون ہے جس کے دس سر اور ہر سر میں دس زبانیں ہیں۔ اس کی ہر زبان مختلف بات کہتی اور ہر بات مختلف مفہوم رکھتی ہے اس کا اعلان ہے کہ اس کا دین اسلام ہے ظاہر ہے کہ میکیاولی کے اصول کے مطابق مسلمانوں پر حکومت کے لیے حکمرانوں کی سیاسی ضرورت یہی ہے کہ وہ اپنے لیے دین اسلام کا ہی اعلان کرے۔ اس کا اعلان ہے کہ اس کی معیشت سوشلزم ہے اس لیے کہ جبر و تشدد کی حکومت قائم کرنے کے لیے سوشلزم سے بہتر اور کہیں کوئی پائیدار اور معیاری مثال موجود نہیں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی سیاست جمہوریت ہے اس لیے کہ بیلٹ بکسوں کو بدلنے اور جعلی ووٹوں کو بھگتا کر عوامی جمہوریت کا ڈھونگ رچانے کے فن میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اس لیے کہ ایف ایس ایف اور پولیس کی لاٹھیاں اور گولیاں عوام کے سینوں پر برسانے والے

گھناؤنے کردار پر پردہ ڈالنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی نعرہ نہیں ہے۔

... ...

مسٹر راون مسلمانوں کی تاریخ میں خدا کے باغی کردار کا جھنڈا ہے مسلمانوں نے صدیوں تک اس کے زخم برداشت کیے ہیں۔ مسلمانوں کے سینے اس کے مظالم سے چھلنی ہیں۔ بالآخر مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس ظالم راون کے خلاف جہاد کیا جائے اور جہاد جاری رہے گا تا آنکہ ہماری تاریخ کے راون کا کردار مکمل طور پر نابود ہو جائے۔ راون کی آخری جعل سازی کھل جانے کے بعد تو مسلمانوں میں اضطراب کا لاوا ہی ابل پڑا ہے اور خیبر سے کراچی تک مسلمان صدائے احتجاج بلند کرنے لگے۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ ایک قوم نے قومی حیثیت سے اٹھ کر ظالم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے اور اس بات سے کون بے خبر ہے کہ جب امام حسینؓ کربلا میں ذبح ہو رہے تھے تو کوفے میں جشنِ فتح منایا جا رہا تھا۔ پھر اس کارروائی کو بار بار دہرایا گیا۔ امام مالک کے پہنچے اکھاڑ کر اونٹ پر اٹھا پھرایا جا رہا تھا تو ملت خاموش تماشائی تھی۔ جب امام احمد بن حنبل پر کوڑے مینہ کی طرح برس رہے تھے تو ملت ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی حالت میں تھی۔ جب امام ابو حنیفہ اور امام ابن تیمیہ کے جنازے جیلوں سے نکل رہے تھے تو ملت دم بخود تھی۔ یوں اس بے چاری ملت پر سے ملوکیت کے جبر و تشدد کی صدیاں بادل کے سایوں کی طرح گزر گئی تھیں۔ اب ملت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ظلم کی تاریخ کو ختم ہونا چاہیے۔ ملت اٹھ کھڑی ہوئی تھی راون بھی اپنے لشکرے کر میدان میں آ گیا تھا معرکہ بڑا سخت تھا، اس معرکے کے لیے دونوں طرف خوب تیاریاں تھیں۔ اس معرکے کا ایک میدان پنڈی بھی تھا۔ ۳۰ اپریل شاہراہ مری پر لانگ مارچ۔ خلقِ خدا نے وقت کے راون کو سرنگوں کرنے کے لیے دار الحکومت کی شاہراہ پر مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک نبض شناس کارکن نے کہا تھا کہ ہر مسلمان اپنے ساتھ ۷، ۷ کنکریاں بھی لے جائیں اور لاحول پڑھ کر راون کے مکان پر مارے تاکہ خلافتِ ابلیس کا تخت الٹ دیا جائے اور شیطان لاحول کی ضرب سے بھاگ جائے۔ بالآخر وہ بھاگ ہی جایا کرتا ہے۔ شیطان کبھی میدان میں جم کر مقابلہ نہیں کرتا۔

... ...

۱۴، اپریل کو منصورہ میں نماز عشاء کے بعد جناب چوہدری رحمت الٰہی صاحب نے تذکرہ کیا کہ کل ہمارا راولپنڈی جانے کا ارادہ ہے۔

"میں بھی راولپنڈی جاؤں گا" میں نے کہا۔

"ہمارا ارادہ صبح ۴ بجے کرفیو ختم ہوتے ہی روانہ ہونے کا ہے" انہوں نے دہرایا۔

"آپ مجھے پونے چار بجے تیار پائیں گے" میں نے کہا۔ اس رات سفر کے لیے مختصر سا بیگ تیار کر کے میں سویا اور سفر کرنا میرا ۲۰ سالہ تجربہ ہے۔ زندگی خود سفر مسلسل ہے اور صبح ۴ بجے ہم راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔

۱۴، اپریل کو ہم راولپنڈی اس لیے جا رہے تھے کہ وہاں ۲۰، اپریل کی تاریخ کو قوم کی طرف سے احتجاجی لانگ مارچ کا اعلان تھا۔ پاکستان قومی اتحاد نے اعلان کیا تھا کہ مسٹر بھٹو کے مظالم کے خلاف اسلام آباد کی طرف قومی احتجاجی لانگ مارچ ہوگا۔ اسوقت قوم کی آواز پاکستان قومی اتحاد کے منہ سے نکلتی تھی۔

ہم اس لیے ۱۴، اپریل کو وقت سے پہلے راولپنڈی جا رہے تھے کہ ۲۰، اپریل کے جلوس کی انتظامی تیاریوں میں مدد دیں اور دوسری طرف گرفتاریوں سے بچی ہوئی قومی اتحاد کی باقی ماندہ جنرل کونسل کا اجلاس بھی تھا ہم تین افراد چوہدری رحمت الٰہی جناب انور یار اور راقم الحروف صبح ۴ بجے منصورہ سے راولپنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ بابا مہتاب خان گاڑی چلا رہا تھا۔

... ...

ہماری پہلی منزل گجرات شہر میں مرزا عنایت اللہ صاحب یونس فین فیکٹری والوں کا مکان تھا۔ مرزا صاحب ہمارے ایسے پیارے رفیق ہیں جن کا خلوص اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر دامن تھام لیتا ہے۔ چند بے تکلفی کی باتیں اور ناشتہ کر کے ہم آگے روانہ ہو گئے۔ جا بجا پولیس کا چوکی پہرہ پتہ دیتا تھا کہ ہم کسی جمہوری ملک میں سے نہیں بلکہ اشتراکی آمریت کے آہنی پردے میں سے گزر رہے تھے۔ سفید کپڑوں میں مشکوک افراد خاص

کے پہرے، ہر پُل پر، موڑ پر پولیس اور ایف ایس ایف کے پہرے فضا میں خاموش جبر و تشدد کے سائے جھلملا رہے تھے۔ جب ہم راولپنڈی میں داخل ہوئے تو ۱۱ بجے تھے اور جب ہم دفتر جماعت اسلامی کالج روڈ کے ملبے میں داخل ہوئے تو گیارہ سے پندرہ منٹ زائد تھے۔ دفتر کا یہ ملبہ حکمران جماعت کی امن پسندانہ کارروائی کا نتیجہ تھا۔

... ...

دفتر میں بہت سے پہرے موجود تھے اور دفتر کی تعمیر ہو رہی تھی، شہید اظہر مرزا کے لہو کے خون میں چھینٹے اوپر کے کمروں کی دیواروں پر جا بجا موجود تھے۔ دفتر کے سامنے کا حصہ حکمران جماعت کی تاخت و تاراجی کی خاموش کہانی بیان کر رہا تھا۔

ہمارے اس دفتر کو جو ایک بیوہ کا کرائے کا مکان ہے حکمران جماعت کے غنڈوں نے جلا دیا تھا۔

قاضی رحمت اللہ صاحب نے بتایا۔

"تو کیا اس وقت پولیس موجود نہ تھی؟" میں نے پوچھا۔ ظاہر ہے کہ میرا یہ پوچھنا تجاہل عارفانہ نہیں تھا۔ "جی ہاں" "نہ صرف پولیس بلکہ ایف ایس ایف بھی موجود تھی اور غنڈوں نے یہ کارِ خیر انہی دونوں امن قائم رکھنے والے اداروں کی موجودگی اور نگرانی میں سرانجام دیا تھا۔ انہوں نے پہلے ہی دفتر کے نوجوان کارکن اظہر مرزا کو شہید کر کے امن کی فضا قائم کر دی تھی تاکہ مقابلے کی صورت میں نقصِ امن کا خطرہ نہ رہے۔ قاضی صاحب نے اپنے مخصوص مسکرانے کے سے انداز سے کہا افسوس اس ملک میں کوئی کیونکر رہے جہاں چوکیداروں پر سے گھر والوں کا اعتماد اٹھ جائے۔ اعتماد، اے اعتماد اب تجھے کہاں سے لاؤں۔ ایک مذاکرات وہ بھی تھے جو سیوا جی نے بادشاہ عالمگیر کے جرنیل افضل خان سے کیے تھے بس وہی عدم اعتماد کی فضا تھی جو ہر طرف زہریلا دھواں بن کر پھیل گئی تھی۔ ایک طرف سیوا جی تھا اور دوسری طرف افضل خان کھڑا تھا، ایک کے ہاتھ کھلے تھے اور دوسرے کے ہاتھ چھپے ہوئے تھے، چھپے ہوئے ہاتھوں میں دوستی کا خنجر موجود تھا۔

... ...

سہمی سہمی فضا ہر طرف موجود تھی۔ راولپنڈی اشتراکی روس کا کوئی شہر معلوم ہوتا تھا بلکہ سائبیریا کا کوئی کنسنٹریشن کیمپ لبوں پر خاموشی کی مہریں تھیں، ہولناک طوفان کے سائے فضا میں منڈلا رہے تھے۔ قومی اتحاد کے تمام کارکن جرم اتحاد میں کئی دنوں سے جیل میں پہنچ چکے تھے، گویا ملک میں کوئی دستور نہ تھا، کوئی قانون نہ تھا۔ سب کچھ ایک شخص مسٹر راولن کی مرضی کا تابع تھا اور مسٹر رادن خود ہی قانون، خود ہی قانون ساز، خود ہی اسمبلی اور پارلیمنٹ اور خود ہی دستور تھا۔ اس کے اشارے کا نام تعزیر تھا۔ اس کا کوئی اشارہ کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند نہ تھا۔ اس کی مرضی یہ تھی کہ پاکستان کا کوئی باشندہ پاکستان کے دارالخلافے میں کسی طرف سے بھی داخل نہ ہو۔ سڑکیں، راستے، پل، موڑ، چوک سب بند تھے، راولپنڈی میں اجنبی پاکستانیوں کے لیے چلنا پھرنا ممنوع تھا۔ جو شخص دیندار سفید پوش، شریف اور کچھ اجنبی سا نظر آئے پولیس کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ اسے فوراً بلا وارنٹ پکڑ لے، اسے مارے پیٹے، اس کا لباس اتار لے، اسے ننگا کر دے، اس کے پیسے، کپڑے چھین لے، نقدی ہتھیا لے، گھڑیاں اتار لے، ٹوپیاں اور نئے جوتے اُتار لے اور پھر اسے مار مار کر ادھموا کر دے اور جس جیل خانے یا حوالات میں چاہے اسے بند کر دے یہی پورے اختیارات حکمران جماعت کے ہر فرد کو اور دوسرے غنڈوں کو حاصل تھے۔ شہر میں اجنبیوں کی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ ہر اجنبی مسلمان کی جان، مال، عزت آبرو غیر محفوظ تھی۔ یہ کارروائی ۱۷ اپریل سے شروع تھی اور ہم وہاں ۲۸ اپریل کو داخل ہوئے تھے۔ کئی چوراہوں اور پلوں پر ہماری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھا گیا لیکن ہم نکلتے چلے گئے تھے۔ حیرت ہے کہ ہم بہت سی متجسس آنکھوں سے بچتے ہوئے جائے قیام پر پہنچ گئے

... ...

مرزا اظہر رشید کا خون دیکھ کر دل بھر آیا۔ یہ ہمارے پیارے ملک کا حال ہو گیا تھا۔ حضورؐ نے تو فرمایا تھا کہ ایک مسلمان کی جان مال اور عزت و آبرو دوسرے مسلمان پر اس طرح حرام ہے جس طرح بیت اللہ شریف میں حرام ہے لیکن یہاں پاکستان کے

دارالخلافہ میں پاکستانی مسلمانوں کی عزت و آبرو جان و مال غیر محفوظ تھی اور ہر غنڈے کو حق حاصل تھا کہ اسے قومی اتحاد کا فرد قرار دے کر اسکی ہر شے چھین لے۔ کسی مسلمان کا کوئی اسلامی یا بنیادی یا شہری حق محفوظ نہ تھا۔

دفتر جماعت اسلامی کو حکمران جماعت کے غنڈوں نے جلا دیا تھا، ملک میں جلانے، تباہ و برباد کرنے گھروں پر حملے کرنے، دکانوں کو لوٹنے کا کام حکمران جماعت کے لوگوں نے خود ہی پولیس کی حفاظت میں کیا تھا۔ جو لوگ مظلوم تھے، فریادی تھے وہ اپنی ہی دکانوں اور اپنے ہی مکانوں کو کیسے آگ لگا سکتے تھے، وہ اپنے ہی بچوں کو کیسے ذبح کر سکتے تھے، یہ کام تو وہ لوگ کر رہے تھے جن کو لائسنس اور اسلحہ دونوں اپنی حکمران پارٹی کی طرف سے منہ مانگی تعداد میں ملے ہوئے تھے اور جن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم اور اقتدار اکٹھے رہیں گے اور اگر ہمیں چھیڑا گیا تو ملک ہاتھ سے جائے گا۔ اشتراکیت اور غنڈہ گردی کے سانپ نے غریب پاکستان کے بچے کے گلے میں کنڈل ڈال لی تھی اگر وہ سانپ کو مارتا تھا تو اس کا بچہ بھی ساتھ مرتا تھا اور اگر بچے کو بچاتا تھا تو سانپ بھی ساتھ بچتا تھا۔ یہ عبرت ناک پریشان کن صورتحال پیدا کر دی گئی تھی لوگوں کو حکمرانوں کی حب الوطنی کے بارے میں واضح شکوک و شبہات موجود تھے، لوگ بے بس ہو کر رہ گئے تھے، لوگ آسمان کیطرف دیکھتے اور دعائیں کرتے تھے، الہٰی ان ظالموں سے نجات دے۔

... ...

۲۸، اپریل کی رات ۲، بجے تک ہم مختلف رہنماؤں سے ملاقاتوں میں معروف رہے، خصوصاً دو بار تو پیر صاحب پگاڑا شریف سے صورت حالات معلوم کرنے کے لیے ملنے گئے۔ وہاں جناب حسن محمود سے بھی باتیں ہوئیں۔ وہ پیر صاحب کے نفس ناطقہ ہونے کے مدعی تھے لیکن حقیقت اس قدر نہ تھی۔ پیر صاحب زیادہ چکر تو سہالہ کے لگا رہے تھے جہاں تمام نمائندہ مرکزی رہنماؤں کو نظر بند کر کے جمع کر دیا گیا تھا۔ مسٹر بھٹو جبراً مذاکرات کرنا چاہتے تھے، یہ دنیا میں مذاکرات کی انوکھی قسم تھی کہ مد مقابل کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور اسے قیدی بنا کر اس کے ساتھ سودے بازی جاری تھی، افسوس کہ مسٹر بھٹو کے طریق ہائے واردات

بہت زیادہ شریفانہ اور معیاری نہ ہوا کرتے تھے، وہ شریف آدمی نہ تھے وہ مسلمانوں کے مجمع میں اپنی شراب نوشی کے تذکرے بڑے مزے لے لے کر کیا کرتے تھے۔

... ...

پیر صاحب نے بتایا کہ ظالم پھر رعایت چاہتا تھا۔ وہ وزارت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا اور اس سے جدائی جان نکل جانے اور گلا کٹ جانے کے برابر سمجھتا تھا۔ اس لیے اسے پہلی وزارت سے علیحدگی کسی صورت بھی گوارا نہ تھی۔ اس شوق میں وہ قوم کو قربان اور ملک کو دوبارہ ذبح کرنے کی کارروائی بھی کر سکتا تھا اس لیے معاملہ ایک ایسے شخص سے تھا جسے قوم اور ملک کے مقابلے میں اپنی کرسی بے حد عزیز تھی اور اس کی مضبوطی کے لیے وہ قوم کا خون بھی بہا سکتا تھا اور بہا رہا تھا۔ وہ مذاکرات اور نتائج اور مسٹر بھٹو کے بارے میں بہت زیادہ پر امید نہ تھے، انہیں ڈر تھا کہ یہ خونی آدمی دس لاکھ تک مسلمانوں کا خون بہا سکتا تھا۔

... ...

ہم نے ان سے ۲۹ اپریل کی صبح ۱۰ بجے منعقد ہونے والے قومی اتحاد کی جنرل کونسل کے اجلاس میں شرکت کی گزارش کی تو کہنے لگے کہ میرے لیے مشکل ہو گا اس لیے کہ مجھے سہالہ جانا ہوتا ہے۔ ۳۰ اپریل کی صبح کو جلوس میں شرکت اور قیادت کے بارے میں کہا گیا تو پیر صاحب نے پہلے تو کچھ معذرت سی کی پھر جلوس کی قیادت کے لیے تیار ہو گئے۔ جلوس میں شرکت سے روکنے کے لیے حکومت کی کارروائی کا ذکر آیا تو گمان غالب یہی سامنے آیا کہ حکومت ضرور روکے گی چنانچہ یہ طے پایا کہ ہوٹل کانٹی نینٹل میں پیر صاحب کیلئے ایک کمرہ ریزرو کرا لیا جائے تاکہ حکومت نے جو کچھ کرنا ہے اس کمرے کو گھیرنے کے بارے میں کر لے اور خود پیر صاحب اس کمرے میں ٹھہرنے کی بجائے راولپنڈی میں کسی دوسری جگہ جا کر ٹھہریں اور وہاں سے یکایک جلوس میں ۱۰ بجے بروقت پہنچ جائیں۔ یہ بات بہت پختگی سے طے ہو گئی تو ہم واپس آ گئے۔ ہم رات ۲ بجے ایک بند پڑی ہوئی آئل ملز کے ویران کمروں میں آ کر سو گئے۔ کسی آباد مکان میں ٹھہرنا ان دنوں بہت خطرناک تھا۔

... ...

دوسرا دن جمعے کا تھا اور دس بجے جنرل کونسل کا اجلاس اسی ہال کے احاطے میں طے پایا تھا۔ ناشتہ کر کے ہم سب تیار تھے کہ اجلاس میں جائیں۔ چودھری رحمت الٰہی صاحب نکل گئے تھے اور میں ابھی ایک کتاب کے آخری چند صفحات ختم کر کے اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا جب ہمارا دفتری ندیم صحن کی طرف سے اندر کمرے میں آیا اور اس نے بتایا کہ پولیس صحن میں آ گئی تھی۔ اس نے ہال کے پھاٹک کو گھیر لیا تھا اور وہ ہمیں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔

میں نے اطمینان سے کتاب بند کی، بیگ درست کیا، سامان تہہ کر کے بیگ میں رکھا اور تیار ہو کر باہر صحن میں آ گیا۔ باہر جو لوگ پولیس کے گھیرے میں تھے۔ ان میں جناب سلطان محمد یوسف خان صاحب رکن مجلس شوریٰ، ملک محمد اسلم صاحب، محمد سعید مغل، اور تین چار ہمارے ساتھی اور تھے۔ صرف چند منٹ پہلے بعض ملاقاتوں کے لیے گاڑی لے کر انور یار خاں کہیں تشریف لے گئے تھے جیسے انہیں آنے والے حادثے کا وجدانی علم ہو گیا تھا۔ بس صرف چند منٹوں کا ہی فرق رہ گیا تھا۔ ہم نے میٹنگ کی طرف جانے یا ادھر اشارہ کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا تاکہ میٹنگ میں جمع لوگ ۳۰ اپریل کے لیے بچ جائیں اور ہم ۲۹ اپریل بروز جمعہ صبح ساڑھے نو بجے پولیس کے نرغے میں آ گئے۔

اگرچہ پولیس نے سارا دن ہمیں تھانے زیرِ حراست کی حوالات میں رکھنے کے باوجود ہمارا چالان ۳۰ اپریل کو کیا اور ۲۹ اپریل کا سارا دن اور ساری رات ہمیں بلا چالان حبس بے جا میں رکھا۔ غالباً پولیس کی نظر میں ۳۰ اپریل کا دن پاکستان کے شہریوں کے لیے راولپنڈی میں موجود ہونا ناقابلِ معافی اور قابل دست اندازی پولیس جرم تھا اور تعزیرات جبر و تشدد کی رو سے ۳۰ اپریل کو راولپنڈی میں پائے جانے والے پاکستانی مسلمانوں کا وہاں موجود ہونا ہی ایسا جرم تھا کہ اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے، اس کے لیے کسی رپٹ، پرچہ وارد فریاد یا چارہ جوئی کی ضرورت نہ تھی۔ مسٹر راؤن کی نظر میں ۳۰ اپریل کا دن اسکے خلاف بغاوت کا دن تھا۔ یہ اس کی کم نظری تھی۔ فی الحقیقت وہ کوئی مدبر اور دُور اندیش

آدمی نہ تھا۔

... ...

۳۰ اپریل کو ہمارا چالان مکمل ہو گیا۔ اب راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل ہمارے سامنے تھی۔ پولیس کے بند جالی دار ٹرک سڑک پر کھڑے تھے سڑک کے پار جیل کا بند دروازہ ہمیں اپنی آغوش میں لینے کا منتظر تھا۔ جہاں بہت سے سپاہیوں اور شہریوں کی بھیڑ تھی۔ درمیان سے سڑک گزر رہی تھی۔ اب جیل اور ہمارے درمیان صرف وہ سڑک حائل تھی اور ہم جیل میں جلد جانے کے لیے اس لیے منتظر تھے کہ وہاں ہم کسی قاعدے قانون کے تحت آ جائیں گے جس روٹی کپڑے اور مکان کا وعدہ بھٹو صاحب کرتے تھے، وہ روٹی کپڑا اور مکان ایک ضابطے کے مطابق جیل میں ہر قیدی کو حاصل تھا۔ ایف ایس ایف اور پولیس کے جس بلیک میل اور فاقہ کشی کے عذاب سے ہم تین دن سے دوچار رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں اب ہمیں جیل غنیمت محسوس ہو رہی تھی۔

راولپنڈی کے ۲۷ اپریل سے ۳ مئی تک کے شب و روز پر ۳۰ اپریل بھاری رہی تھی اور قیدی کثرت سے تھانوں اور جیلوں میں جمع ہوئے تھے۔ سڑک پر کھڑے کھڑے جب ذرا تاخیر ہوئی تو سڑکوں پر نعروں کا کورس چل گیا۔ معلوم ہوا کہ وہیں قریب ہی کہیں وزیر اعظم کا ماتم کدہ تھا۔ یہ حضرات وزیر اعظم تک اپنی آواز پہنچانے کے شوق میں اپنے گلے خراب کر رہے تھے۔ حالانکہ جن کی آنکھوں پر رنگین شیشے دلوں پر پردے اور کانوں پر مہریں لگ جائیں وہ کب کسی کی فریاد سنتے ہیں۔ انہیں تو صرف ایک ہی آواز سنائی دیتی ہے جو ان کے اپنے نفس کی آواز ہوتی ہے۔ باقی سب آوازوں کی طرف سے ان کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ بسر اوقات روح کا راستہ بند تھا اور نفس کا راستہ کھلا تھا۔

... ...

جیل میں داخلہ کا باعث تاخیر بھی معلوم ہو گیا۔ پولیس کے جوان بہت بڑا کارِ خیر سرانجام دینے میں مشغول تھے۔ اب تک تو سب قیدی بلا چالان ہی بند تھے اور جب انہیں جیل میں بھجوانا تھا تو اس کارروائی کے لیے چالان ضروری تھا۔ چنانچہ اب سب لوگوں کے چالان

سڑک پر بیٹھ کر سادہ کاغذ کے پرزوں پر تیار کیے جا رہے تھے۔ جلدی جلدی ان سب انسانوں کی آزادی لینے کے لیے ان کے پاس کاغذ کا پورا فل اسکیپ ورق بھی موجود نہ تھا۔ کاغذ کے پرزے پھاڑ پھاڑ کر ہر شخص کی آزادی چھیننے کے لیے مجسٹریٹ کی مہر لگائی جا رہی تھی ان کی بلا سے کہ ملزم کون کہاں سے آیا اور کس قسم کا انسان تھا۔ سب کی گردن میں ایک ہی پھندا فٹ آ رہا تھا۔ دفاع پاکستان کا قانون گویا پاکستان کے شریف شہریوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈالنا پاکستان کے تحفظ اور دفاع کے لیے انتہائی ضروری کام تھا بھٹو کی حکومت میں پاکستان کے تحفظ کے لیے پاکستان کے عوام کا جیلوں میں رہنا بہت ضروری تھا۔

جس ملک میں یہ رسم چل نکلے اس ملک کا بس خدا ہی حافظ ہے۔

دوسرا کارِ خیر جو پولیس والوں کے لیے حقیقی حاصلِ محنت تھا وہ سب قیدی لوگوں سے ان کا قیمتی سامان چھیننا تھا۔ قیدیوں کا سامان پولیس جمع کر رہی تھی۔ واپس کرنے کے وعدے پر گھڑیاں، روپے، نقدی، قلم، ٹارچ، چاقو اور دوسری قیمتی چیزیں اس طرح بلکہ ایک سڑک پر برسرِ عام قیدیوں سے مالِ غنیمت سمیٹنے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ یہ بھی چونکہ بے حد اہم کام تھا اس لیے تقریباً ایک گھنٹہ اس کارروائی میں صرف ہو گیا۔ ملک محمد اسلم صاحب کی تجویز پر ہم سب نے اپنی گھڑیاں اور نقدی شیخ عقیل صاحب اور ندیم کے حوالے کر دیں۔ یہ دونوں حضرات سائے کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ رہے تھے اور انہوں نے گذشتہ تین دن ہمارا پورا پورا تعاقب کیا تھا اور رفاقت کا حق ادا کیا تھا۔

... ...

پھر ڈیوڑھی کا پھاٹک کھل گیا۔ ہم اپنے اپنے سامان کی تلاشی دے کر جیل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تھے۔ تھوڑی سی دیر میں ساری ڈیوڑھی قیدیوں سے بھر گئی۔ پولیس ہمیں جیل کے عملے کے حوالے کر کے واپس جا رہی تھی۔ ہم محسوس کر رہے تھے کہ جیسے ہم بہتر حفاظت میں آ گئے تھے۔ ایسی پولیس جس کے وجود سے ملک کے باشندے جیل کو ترجیح دیں آخر عوام کے کس مصرف میں آ سکتی ہے۔ راولپنڈی میں جیل کا عملہ زیادہ شائستگی اور تہذیب سے پیش آیا اس نے اپنے رویے سے لوگوں کا احترام ظاہر کیا۔ ان سے مجرموں کا سا سلوک نہیں کیا۔

البتہ تلاشی لینے والے عملے نے اپنی روایتی عادت کی بنا پر حدودِ اخلاق کو بار بار پھلانگنے کی کوشش کی۔ خان محمد یوسف خان نے ان کا مزاج درست کر دیا۔ ہم نے اپنا باقی ماندہ سامان معمول نقدی، پنسل، کاغذ اور قلم ڈیوڑھی میں جمع کرا دیے۔ جیل میں یہ رسم ہے کہ قیدی کو قلم اور کاغذ رکھنے سے منع کرتے ہیں حالانکہ قلم اور کاغذ اس کے سوا اور کسی خطرے کا مظہر نہیں ہوتے کہ وہ کسی انسان کے تعلیم یافتہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ میرے لیے تو قلم سے جدائی سخت شاق تھی۔ عمر کا بڑا حصہ قلم سے دوستی میں گزرا تھا۔ یوں جیل کے دروازے پر اس سے جدائی ایسی جدائی تھی جیسے بیوی بچوں سے جدائی ہو رہی ہو۔ میں نے بادلِ نخواستہ یہ قلم جیل کے حوالے کر دیا۔ یہ قلم ایوب خاں کے دورِ آمریت میں جب ہم جیل گئے تھے تو اس وقت بھی ہم سے جدا نہیں کیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب دراصل جہالت اور پسماندگی کے رہنما تھے اور انہیں اپنے کسی حریف کے ہاتھ میں قلم ناقابلِ برداشت تھا۔ درحقیقت وہ قلم اور ضمیر دونوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

... ...

ڈیوڑھی کے اندر کا پھاٹک بھی کھل گیا اور اب ہم قیدیوں کی حیثیت سے اصلی اور بڑی جیل میں داخل ہو گئے اندر جاتے ہی گنتی ہوئی نام پکارے گئے۔ احاطے الاٹ ہوئے اور ہمیں الاٹ ہوا: "پھانسی احاطہ چکیاں نمبر ۵" ہم ایک وارڈر کی سرکردگی میں چکیاں نمبر ۵ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ساری جیل بند ہو چکی تھی۔ سب قیدی اپنے اپنے پنجروں میں بند تھے بعض کھلے تھے بعض باتیں کر رہے تھے۔ جب ہم اپنے احاطے میں داخل ہوئے تو میں نے نظر اٹھا کر اس پر لکھا ہوا بورڈ پڑھا۔ لکھا تھا "کوٹھڑیاں پھانسی احاطہ" ہم اس احاطے میں اللہ کا نام لے کر داخل ہو گئے۔ پھر قیدیوں کو مختلف کوٹھڑیاں کھول کھول کر ان میں داخل کیا جانے لگا۔ جس جس کوٹھڑی میں جیل والوں کے نزدیک کہیں کوئی گنجائش موجود تھی اس میں ایک ایک دو دو نئے قیدی داخل کر دئے گئے۔ ہمارے حصے میں ایک بالکل خالی کوٹھڑی نظر آئی۔ اس میں انہوں نے چھ آدمیوں کو داخل کیا اور باہر سے تالا لگا کر چلے گئے جب ہم نے اپنا جائزہ لیا تو جو لوگ اس پھانسی کوٹھڑی میں قسمت نے جمع کر دیے تھے۔

وہ تھے مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی نائب صدر پی ڈی پی پاکستان خان محمد یوسف خان ناظم شعبہ خدمت خلق جماعت اسلامی لاہور۔ مولانا عبداللطیف خطیب جامع اشرفیہ لاہور قاری حافظ نصیرالدین، مولوی حسین احمد طارق طالب علم جامعہ اشرفیہ اور راقم الحروف۔ یہ کوٹھڑی بنیادی طور پر ایک ہی پھانسی پانے والے قاتل کے لیے بنائی گئی تھی۔ لیکن حکومت کی عوامی ضروریات نے ان کوٹھڑیوں تک میں ہجوم عاشقاں جمع کر دیا تھا۔ ان کوٹھڑیوں کی دہشت گردی اب ختم ہو گئی تھی۔ وہ دہشت حقیقتاً برائے نام تھی۔ پھانسی کی کوٹھڑی صرف مجرم کو دہشت زدہ کرتی ہے۔

اب رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم نے نماز عشاء ادا کی اور کوٹھڑی کے کچے فرش پر لیٹ گئے جیل کے چیتھڑے نما کمبل اس میں پہلے سے موجود تھے۔ جو پسینے کی بدبو غلاظت، سرسریوں، جوؤں اور چیونٹیوں سے بھرے ہوئے تھے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ نیند تو پھانسی پر بھی آجاتی ہے اور ہم تو پھانسی کی کوٹھڑیوں میں تھے۔ البتہ جگہ کی تنگی کے سبب ہم سب کی ٹانگیں ہم سب پر تھیں اور ہم ایک دوسرے سے یوں بے تکلف ہو کر سوئے کہ ایک دوسرے کی سانسوں اور ہاتھ پاؤں سے دوسرا ہر ایک مستفید ہو رہا تھا۔

... ...

مولانا روپڑی کے لیے پیشاب کو روک کر رکھنا سخت آزمائش تھا۔ وہ الصبح کوٹھڑی کھلنے سے بھی پہلے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نہ پانی تھا نہ استنجا گاہ، نہ آزادی اور نہ باہر نکلنے کی کوئی سبیل۔ وہ صرف کوٹھڑی کی سلاخوں سے لگ کر انتظار ہی کر سکتے تھے۔ سو وہ انتظار کرتے اور وارڈر کو کھولنے کے لیے آوازیں دیتے رہے لیکن صبح اٹھنے میں نمازی اور غیر نمازی کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ نمازی تو سورج نکلنے سے پہلے نماز کی خاطر اٹھتا ہے لیکن غیر نمازی کو تو سورج ہی آکر جگاتا ہے ظاہر ہے کہ جیل کے وارڈر مسلمانوں کی دوسری قسم میں سے تھے۔

ہمارے معاشرے میں بھی مسلمانوں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں عامل (PRACTIS INC MUSLIMS)

اور غیر عامل (NON PRACTIS — ING MUSLIM) چنانچہ عامل اور غیر عامل کی عادات میں
زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جاگنے، سونے، کھانے پینے، آرام کرتے، سیر کرتے، مطالعہ
کرنے بلکہ ہر معاملے میں دونوں قسم کے مسلمانوں کے دو مختلف طرز کے معمولات ہوتے ہیں
جس کے نتیجے میں اگر ان دونوں کو شب و روز کا واسطہ پڑ جائے تو دونوں کو ایک دوسرے
سے تکلیف پہنچتی ہے۔ یہ تکلیف معمولات کے اختلاف کی تکلیف ہوتی ہے۔ شاید اسی کے پیش نظر
قرآن نے مردوں اور عورتوں کے شادی بیاہ میں جس صالحین کے لیے صالحات طیبین کے
لیے طیبات اور خبیثین کے لیے خبیثات کی تقسیم کی ہے تاکہ جنس کو جنس ملے کر کے ہاتھ اور باہمی
ٹکراؤ کے امکانات کم سے کم ہو جائیں۔

مولانا روبڑی وارڈر کے پاؤں کی چاپ سن کر اسے آوازیں دے رہے تھے
جب سامنے میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی اور کوٹھڑی کی لوہے کی سلاخ
کھل گئی۔

... ...

جیل کی کوٹھڑیوں سے قیدی نکل نکل کر باہر کھلے احاطے کی طرف جا رہے تھے۔
بیت الخلاء کی طرف تنگ سے احاطے میں صبح کو سیر کے لیے۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں قید و بند
کے پنجروں سے نکل کر باہر آ گئی تھیں ان میں سے بیشتر مشترک بیت الخلا کی طرف جا
رہے تھے۔

پناہ بخدا انسانی ذلت و رسوائی اور انسانیت کی توہین کا سب سے بڑا مظہر اگر کوئی ہے
تو وہ سی کلاس میں جیل کا بیت الخلاء ہے یہ جیلیں ہمارے لیے انگریز نے بنوائی تھیں۔
اب تک ہم ساری ہی چیزیں انگریز کی بنائی ہوئی استعمال کر رہے ہیں۔ تعلیم، عدالت،
انتظامیہ، اسمبلی، قانون، ننگ انسانیت پولیس، حوالات اور جیل کے بیت الخلاء۔ کاش
اس بیت الخلاء پر کسی پرنس آف ویلز کو لا کر بٹھایا جاتا۔ کم از کم اس کے حقیقی جانشین
مسٹر بھٹو ہی آ کر اس بیت الخلا پر بیٹھتے شاید وہ اپنی شراب نوشی اور معاشرتی بے تکلفی کے
باوجود اس کھڈی پر نہ بیٹھ سکتے ان بیت الخلاؤں پر تو جانوروں، حیوانوں، کتوں اور خنزیروں

تک کو بھی بیٹھنے سے گھن آنے لگی دو طرفہ دس دس تنگ چوڑا نا کھڈیوں کی قطاریں جن پر ایک صحت مند آدمی سخت تنگی اور مشکل سے ہی بیٹھ سکے۔ ان کے درمیان ایک تین فٹ اونچی پتلی سی دیوار۔ ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنے والوں کے سر آپس میں۔ بہت قریب کہ وہ ایک دوسرے کی فطری فراغت کی بھانت بھانت کی آوازیں سن سکیں۔ پھر سامنے کا حصہ کھلا ہوا ہر نیا آنے والا آگے کی خالی کھڈی کی طرف جانے کے لیے بہت سے بیٹھے والوں کی عریانی کو پار کرتا ہوا جائے۔ انسانیت کا سر شرم سے جھکا ہوا۔ بدبو، سڑاند، تعفن، بے حیائی، عریانی اور بہتے ہوئے پیشاب کی دھاریں اور پاخانے کے ڈھیر جن پر استنجے کے پانی کے بہاؤ سے غلاظت کی دھاریں دور تک فرش پر بہتی ہوئی چلی جاتیں۔ ہر آنے جانے والے کو ان دھاروں پر سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ یہاں ایک بار بیٹھنے اور حاجت روائی کے بعد پھر انسان میں سے بدبو کا احساس، شرافت کی حس، شرم وحیا کا جذبہ، عریانی و بے حیائی سے نفرت ہر چیز بتدریج تحلیل ہونے لگتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ماحول انسان کو خود اس کی اپنی نظر میں انسانیت سے بہت دور۔ میرا خیال ہے کہ جیلوں کے یہ بیت الخلاء ہی جس انجینئر نے ہماری جیلوں کے لیے ڈیزائن کیے تھے اس نے ہماری انسانیت کو ذبح کر کے ہمیں انگریزوں کا ابد تک غلام رکھنے کا سامان صرف اس ایک ڈیزائن میں ہی مہیا کر دیا تھا۔

آج تیس سال سے پاکستان کے جیل انگریزوں کی اس وراثت کو اب تک پورا کر رہے ہیں۔ وائے آزادی۔ وائے تقلید انگریز، وائے بیوروکریسی، وائے ذہنی افلاس اور وائے ملی نفاق۔ کوئی اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ ہمارے ملک میں تو قدم قدم پر ماتم کرنے کے لیے ماتم کدے موجود ہیں۔ کیوں نہ ہم ایک ہی بار اپنی ساری انسانیت کا ماتم کر لیں تو قصہ پاک ہو جائے۔ بھٹو صاحب اب اس کوشش میں مصروف تھے کہ پاکستانیوں کی پوری آبادی کی انسانیت، اسلامیت، شعوریت، حمیت، غیرت، دیانت، امانت، شرافت، صداقت سب کا جنازہ نکال کر اسے قبرستان بنا دیں۔ یہ سارے جیل انسانیت کے قبرستان ہیں اور ان جیلوں کے داروغے درحقیقت ان قبرستانوں کے مجاور ہیں جہاں انسانیت اور شرافت دفن پڑی ہے۔

... ...

ہم نے جیل کے احاطے میں نماز با جماعت ادا کی۔ نماز مولانا قاری محمد امین نے پڑھائی ان کی قیادت میں نماز میں بھی لطف آیا اور نماز کے بعد ان کے درس سورہ یوسف میں بھی کیفیت محسوس ہوئی۔ یہ مولانا لوگ بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ان کو ملعون کرتے ہیں۔ وہ خود ان کے جوتوں کے برابر بھی علم و شرافت، دیانت و امانت اور تقویٰ اور پرہیزگاری نہیں رکھتے۔ بس ذرا فرقہ بندی کا متعدی مرض ان کو لگ جائے تو پھر امت مسلمہ کی تباہی ہے۔ لیکن ایسی بات قاری صاحب میں نہیں ہے۔ ان کے پاس عمدہ علم ہے اعلیٰ شرافت ہے اور وہ خوب آدمی ہیں۔ سورہ یوسف کی تشریح، جیل کا ماحول، حضرت یوسف کی اپنے قیدی ساتھیوں سے باتیں اور انہیں توحید کی دعوت۔ اس پس منظر میں ہماری قید و بند؛ غرض دونوں چیزوں کا باہم پر لطف اور پر مغز انطباق، کیف و سرشاری اگر وجدان کو مسحور کرتی ہے تو ہم نے وہی کیفیت محسوس کی۔ پھر اس کے بعد ہمارا نماز فجر کے بعد ہر صبح کا یہی معمول رہا۔

... ...

نماز فجر کے بعد پھر باہمی تعارف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے احاطے میں سب اتحاد کے قیدی ہی تھے کوئی اخلاقی قیدی نہ تھا۔ یہ سب مختلف مقامات کے لوگ تھے۔ بلوچستان سے لے کر سوات تک یہ سب ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ بے تکلف ہونے میں تو ایک لمحہ بھی زائد صرف نہ ہوا۔ بیشتر میں پہلے سے شناسائی موجود تھی بعض سے روشناسی بھی تھی۔ غرض خوب خوب معانقے ہوئے اور یوں محسوس ہوا کہ بہت سے بیٹھے بٹھائے چن چن کر بس اجتماعی ملاقات کی خاطر ہی ایک جگہ جمع ہو گئے تھے جن کا عام حالات میں جمع ہونا اور ملنا ممکن نہ تھا۔ جیل کا پہلا دن تو احباب کی طرف سے دعوتوں ہی میں گزر گیا۔ دعوتیں، چائے ملاقاتیں، سیاسی حالات کے تذکرے، جماعتی حالات، آئندہ کے احکامات، تحریک کے نتائج مذاکرات کی نوعیت، اندر اور باہر کی باتیں، راز ہائے درون سینہ، افواہوں کی فیکٹریاں، تخمینے اور اندازے۔ غرض سارا دن یوں گزرا جیسے ہم کوئی نہایت ہی اہم شخصیت تھے اور اس

احاطے کے مکین اجتماعی طور پر سب ہمارے میزبان تھے جو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہماری میزبانی کرنا چاہتے تھے انہوں نے جاتے ہی ہمیں اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ ہم یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ یہاں کھانے پینے کا معروف سسٹم کیا تھا۔ صبح کا ناشتہ، گیارہ بجے کی چائے، دوپہر کا کھانا، شام کی چائے، رات کا کھانا، اور رات کی چائے۔ نہ جانے کدھر کدھر سے اور کس کس کی طرف سے کتنی ہی دعوتیں ہو گئیں۔ یوں تو سسرال میں بھی اتنے ذوق و شوق اور محبت و ہمدردی اور چاؤ چونچلے سے سنبھالا نہ گیا ہوتا۔ جس طرح ہم سنبھالے گئے ہیں اور رو پڑی صاحب تو دعوتوں کی کثرت سے بوکھلا گئے اور یہ دعوت کرنے والے کون لوگ تھے۔ یہی ہمارے فراخدل قیدی ساتھی جو ہماری طرح ہی چند دن پہلے یہاں پہنچے تھے جہاں سب دوست ہی جمع ہوں وہاں دلوں کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں اور دل کا دروازہ تو وہ دروازہ ہے کہ جب وہ کھلتا ہے تو شہد اور دودھ کی نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ اتحاد کے قیدی، ضمیر کے قیدی ہیں۔ حریت و جرأت و جسارت کے قیدی ہیں۔ آزادی و حریت کی جدوجہد زندہ باد۔۔۔!

… … …

۲ مئی کو سارا دن تعارف باہمی کا دن تھا۔ کہاں کہاں سے آزادی کے پروانے آئے تھے۔ ایسے ایسے پیارے اور محبت بھرے لوگ ملے کہ انسانیت کی طرف سے ساری مایوسیاں دور ہو گئیں اس طرح احساس ہوا کہ

ع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

: مری کے حاجی شفار الحق جن کو ظالموں نے بچوں سے چالیس دن تک نہ ملنے دیا تھا جو ہر نئے آنے والے قیدی بھائی کے لیے بچھے جاتے تھے۔ مری کی اتحاد کونسل کے پُرجوش رہنما دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں آئے تھے اور جوش و جذبہ اور خدمت خلق کا پیکر تھے، وہ ہر نئے آنے والے قیدی کے حقیقی میزبان تھے۔

: راجہ ظفر الحق ایڈووکیٹ نہایت پڑھے لکھے، معقول، سنجیدہ، مہذب شائستہ اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان تھے جن سے مل کر انسان کی معلومات میں اضافہ

ہوتا تھا۔ انتہائی خادم قسم کے انسان تھے۔ راولپنڈی کی بار کے روشن چراغ بہت خوب آدمی۔

- راجہ محمد ظہیر خان گوجر خاں والے جو نہایت ہی پیارے، خادم، مخلص اور سوجھ بوجھ والے رفیق تھے جن سے مل کر دل کو سکون ہوتا تھا اور جن کا محبت بھرا مسکراتا ہوا چہرہ جیل میں بھی چمن کی فضا پیدا کرتا تھا۔
- حافظ قاری محمد امین خطیب جامع مسجد درکشالی محلہ راولپنڈی جن کی تلاوت میں سوز تھا جن کے درس میں فہم و جذبہ تھا اور جن کی باتوں میں گہرے علم اور محبت کا پُر خلوص انداز تھا۔ جن سے مل کر آدمی دل میں روشنی محسوس کرتا تھا ان کی باتوں اور درس میں کتنی توانائی اور جوانوں کا سا حوصلہ تھا۔
- مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی جن سے زندگی میں پہلی بار پولیس تھانہ الف کی بلیک ہول میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کتنے مخلص بے لوث اور منکسر المزاج بزرگ تھے جن سے مل کر دل کو راحت ہوتی تھی۔ ان کا علم بہت رواں اور مستحضر تھا۔
- خان محمد یوسف خاں میرے عزیز رفیق اور مدت دراز سے دوست اور ہمدرد مصنفہ امریکن نومسلم خاتون مریم جمیلہ کے شوہر اور نڈر ساتھی جن کے دل میں غیر اللہ کا رتی بھر خوف بھی سما نہ سکتا تھا اور جو راہِ حق پر شتر بے مہار چلنے کے عادی تھے۔
- خان عبدالمجید خان بلوچستان میں تحریک اسلامی کے رہنما اور جسم ناتواں کے اندر روح بیدار رکھنے والے جرأت مند ساتھی۔ نہایت ہی پیارے انسان۔
- جناب فضل الٰہی قریشی جو رونق محفل اور بلبل ہزار داستان تھے۔ جن کی باتوں میں خلوص اور مٹھاس اور جن کی رفتار میں خدمت خلق کا جذبہ موجود تھا۔
- سینیٹر خان محمد زمان خان اچکزئی جیل کے میرے مرحوم دوست خان عبدالصمد خان اچکزئی کے قبیلے کے انتہائی مخلص دیندار، جرأت مند اور نظام اسلامی کے جانباز سپاہی۔
- راجہ امتیاز احمد خاں مری میں تحریک اسلامی کے پُر جوش حوصلہ مند اور جاندار ساتھی جن کے دم قدم سے مری کے سرد علاقوں میں بھی تحریک اسلامی کی گرمی پائی جاتی تھی۔

پھر کوئٹہ کے محترم خدانے خود مولانا عبدالواحد، حاجی ملک غلام سرور تھے۔ ملتان، پشاور، سانگھڑ، نواب شاہ، رحیم یار خاں، کراچی، لاہور، آزاد کشمیر، ہری پور، گوجرانوالہ اور کہاں کہاں سے یہ عشاق قافلہ اسلام پہنچے ہوئے تھے اور اسلامی نظام کے استقبال کے لیے انھوں نے جیل کی چار دیواری میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ باطل نظام میں مسافران حق کا پڑاؤ جیل میں ہوتا ہے اور نظام حق میں ایک کتا بھی اگر فرات کے کنارے بھوکا مر جائے اور ایک لاوارث بکری کو بھی بھیڑیا پھاڑ کھائے تو خلیفۂ وقت خدا کے سامنے جواب دہی کے خیال سے تھر تھر کانپتا ہے۔ چنانچہ باطل نے ان سب معزز شہریوں کو اپنی کمینہ فطرت کے اطمینان کے لیے جیل میں سی کلاس دے رکھی تھی۔ یہ سب لوگ صبر و شکر سے اپنی حالت پر مطمئن تھے کہ جب ان میں سے بعض قیدیوں کو بی کلاس کی پیش کش کی گئی تو انھوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اور اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

... ...

ہم جو قزاق سیاست دانوں نے اول روز سے پارلیمانی نظام کی مذمت کی اور صدارتی نظام کا علم بلند کیا۔ اس لیے کہ اصل مسئلہ اقتدار میں غیر معمولی اختیار کا ہے جو مسٹر بھٹو ہر قیمت چاہتے ہیں۔

ہم سب نے آپس میں اپنی اپنی رودادیں بیان کیں اور گرفتاریوں کے حالات کا تذکرہ کیا۔ باہمی تعارف کے بعد اپنی گرفتاری کی روداد بیان کرتے ہوئے سینیٹر محمد زمان خان اچکزئی نے بتایا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم بھی راولپنڈی کے جلوس میں بلوچستان کا حصہ ڈالیں گے۔ جاسے اس فیصلے کی اطلاع مقامی انتظامیہ کو ملی تو اس نے مرکزی ہدایات کی روشنی میں ہماری ناکہ بندی کا کام شروع کر دیا جب انھیں معلوم ہوا کہ ایک جیش کوئٹہ سے ۱۴، اپریل کو غزالہ ایکسپریس سے روانہ ہو رہا تھا تو انھوں نے وہ گاڑی وقتِ مقررہ سے پانچ گھنٹے پہلے ہی بغیر مسافروں کے چلا دی۔ یہ ریلوے کی تاریخ میں ایک عجوبہ واقعہ تھا۔ البتہ یہ اعلان کیا گیا کہ گاڑی کی روانگی منسوخ کر دی گئی تھی چنانچہ اکثر لوگ کوئٹہ ایکسپریس سے روانہ ہوگئے پھر اس

گاڑی کو سبی سے اگلے اسٹیشن پر رات ساڑھے نو بجے روک لیا گیا اور حکام نے کوشش شروع کر دی کہ قومی اتحاد کے لوگ اتر کر واپس چلے جائیں۔ سات گھنٹے تک گاڑی کو جنگل میں روک رکھا گیا۔ عورتیں، بچے بوڑھے بیمار سخت مصیبت کا شکار ہو گئے۔ بچے پانی کے لیے بلکتے رہے جب اتحاد کا کوئی شخص بھی واپس جانے پر تیار نہ ہوا تو پھر گاڑی کو انجن بدل کر واپس پیچھے کوئٹہ کی طرف چلا دیا گیا اس طرح سارے مسافروں کو واپس کوئٹہ لا کر ڈال دیا گیا۔ یہ کارروائی ۲۸ اور ۲۹ اپریل کو کی گئی۔ اس طریقے سے بلوچستان کے لوگوں کو راولپنڈی کی لانگ مارچ میں شرکت سے روکنے کی ناکام کوشش کی گئی چنانچہ بیشتر لوگ دوسرے ذرائع سے آئے انہیں بھی جا بجا سڑکوں پر شہریوں میں، چوکوں اور موڑوں پر مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غرض بلوچستان سے جتنے راستے ریل یا سڑک کے راولپنڈی کی طرف آتے تھے سب پر آنے جانے والوں کو سختی سے روکا گیا۔ اس طریقے سے ۱۶ یا ۲۰ ہزار افراد روکے گئے بس چند سو افراد ہی راولپنڈی پہنچ سکے۔ ہمارا گروپ خفیہ طور پر بذریعہ ہوائی جہاز پہنچا لیکن ہمیں اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر بلا وارنٹ رکھانے گرفتار کر لیا گیا۔ بلوچستان کے سب قیدیوں کی یہی داستان تھی۔

... ...

پھانسی کی چکیاں تو بہت سی تھیں البتہ پانچ نمبر چکی جس میں ہم بند تھے جیل کے اندر ایک چھوٹی سی جیل تھی ہر قیدی جو پانچ نمبر چکی میں بند تھا گنتی کے لحاظ سے سات تالوں میں بند تھا یعنی اس کوٹھڑی کے تالے سے لے کر باہر ڈیوڑھی کے تالے تک اس کی بندش کے لیے سات تالے تھے جیل میں ہر قیدی کے لیے ایک پھٹا پرانا کمبل تھا چاہے وہ اسے اوڑھے یا بچھائے تلاشیاں کثرت سے ہوتی تھیں آتے جاتے ہر جگہ تلاشی کا انداز انتہائی غیر شریفانہ بلکہ غیر مہذبانہ تھا لوگوں کی حاجتیں بڑھ گئی تھیں، حماموں کا انتظام ناکافی تھا، کپڑوں کی دھلائی ایک مسئلہ تھا۔ اس کے لیے کرنسی کا ہونا ضروری تھا اور جیل کی کرنسی کے نوٹ سگریٹ کی ڈبیاں تھیں سگریٹ کے نوٹ دو ڈبیاں دینے سے ایک جوڑا شلوار قمیص کی دھلائی ہوتی تھی۔ لال ٹوپی والے ہمارے نمبردار جیل انتظامیہ کے سی آئی ڈی کا کام کرتے تھے اور شکایات اور چغلیاں کر کے قیدیوں کے مصائب میں اضافہ کرتے تھے جیل میں نعرے لگانے پر پابندی تھی۔

ہمارے دوست حاجی شفاء الحق کو نعرہ لگانے کے جرم میں ڈیڑھ ماہ تک ملاقاتوں سے محروم کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے بعض لوگ بھی اپنے آپ کو اتحاد کے کارکن ظاہر کر کے سی آئی ڈی کے لیے جیلوں میں بھیجے گئے تھے تاکہ وہ مسٹر بھٹو کو صورتِ حال سے باخبر رکھیں۔ وہ لوگوں میں بددلی پھیلاتے تھے۔ کمزور کارکنوں کو ورغلاتے تھے غرض پیپلز پارٹی کی سیاسی لائن کمیونسٹ لائن تھی۔ حد یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے راولپنڈی کے ممبر قومی اسمبلی پروفیسر نذیر نے قومی اتحاد کے ایک سرگرم کارکن چوہدری خورشید احمد کی ڈاڑھی اپنے ہاتھ سے جلائی اور اسلام کو گالیاں دیں اور اس کے سامنے خدا اور رسولؐ کے حق میں سخت گستاخیاں کیں۔ یہ وہ سوشلزم تھا جسے وہ غنڈوں کے جبر و تشدد جیل کی کوٹھڑیوں اور قتل و غارت کے زور سے پاکستان کے مسلمان عوام پر مسلط کرنا چاہتے تھے ایک روز حساب ضرور ہو گا۔ جب انہیں اس ملک کے مالکوں کے ساتھ غیر انسانی، بہیمانہ سلوک کا بدلہ دینا ہو گا روسی سامراج کے ان ایجنٹوں کو پاکستان میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ مسلمان عوام جان دے سکتے ہیں جیسے انہوں نے یہ حقیقت "تحریکِ احتجاج" کے دوران ثابت کر دی ہے لیکن وہ کسی اشتراکی ایجنٹ کے غلام بن کر زندہ رہنا گوارا نہیں کر سکتے۔ آج پاکستان میں شرافت کی غنڈہ گردی سے اسلام کی الحاد اور دہریت سے۔ انسانیت کی حیوانیت سے مکمل جنگ ہے اور اس جنگ میں شرافت اسلام اور انسانیت ہی فتحیاب ہونگے

المدد المدد، یا خدا یا خدا !

... ...

جیل کا سی کلاس کا کھانا اگر مسٹر بھٹو اور ان کے حواریوں کو کھلایا جائے تو وہ بے موت مر جائیں۔ سیاہ دال جسے دیکھ کر انسان کی آنکھ ہرگز قبول نہ کرے روٹی جس میں پھان بورے کے ساتھ ریت اور مٹی کی ملاوٹ ہو دانتوں کو واضح طور پر محسوس ہو۔ البتہ جیل کا گوشت سب سے نرالی چیز ہے اگر بارش کے ذرا میلے پانی کے ڈرم میں بڑے گوشت کی چند ہڈیاں اور چھیچھڑے ڈال دیے جائیں تو وہ جیل کے قیدیوں کے لیے عمدہ گوشت کا سالن تیار ہو جاتا ہے۔ سالن کی بالٹی کو اوپر سے دیکھیں تو نیچے ہڈیاں پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں غالباً اسی سالن کے بارے میں مدرسے کے کسی طالب علم نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اس سے وضو کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جس روز جیل میں گوشت پکا ہو اس روز قیدی روکھی روٹی گڑ، پیاز یا مرچ سے کھا لیتے ہیں۔

... ...

جیل میں بحثیں جاری تھیں کہ ۲۰ اپریل کا پروگرام ناکام رہا یا کامیاب مختلف آراء تھیں کہ حکومت کے انتہائی جبر اور مقامی لیڈر شپ کی کمزوری اور عدم موجودگی کے سبب بہت کامیاب نہ رہا۔ مسٹر بھٹو کو جیپ میں فوٹو کھنچوانے اور پیر پگارا شریف سے مصافحہ کرکے یہ بات کہنے کا موقعہ مل گیا۔ لیکن بعض کی رائے یہ تھی کہ یہ پروگرام غلط تھا۔ راولپنڈی فوجی بھرتی کا ضلع تھا جہاں سیاسی شعور مفقود تھا۔ یہاں بہت زیادہ خوف و وحشت کی فضا بنائی گئی تھی یہاں کی مقامی قیادت اتنا بڑا پروگرام سنبھالنے سے عاری تھی۔ یہاں پیپلز پارٹی نے جماعت اسلامی کا دفتر دن دہاڑے جلا دیا تھا اور ایک نوجوان اظہر مرزا کو بر سر عام شہید کر دیا تھا لیکن نہ کوئی گرفتاری ہوئی تھی اور نہ بدلہ لیا گیا تھا۔ یہاں ملازمانہ ذہنیت تھی۔ یہاں سیاسی تحریکیں کبھی نہ پہنچی تھیں اس لیے یہاں یہ پروگرام رکھنا ہی غلط تھا۔ یہ مرکزی کونسل کے فیصلے کی غلطی تھی لیکن ہمارے عزیز رفیق راجہ بشارت احمد نے راولپنڈی کا دفاع کیا سب سے پہلے تو انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہنے لگے:

"ایک شخص ۲۰ سال تک فوجی ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہو کر گھر واپس آیا تو اس کے باپ نے سب عزیزوں کو بلا کر ان سے اس کا تعارف کرایا۔ یہ تمہارا چچا ہے، یہ بھائی ہے، یہ ماموں ہے اور یہ خالو ہے" اور پھر کہا کہ دیکھو عزیزم تم نے ساری عمر ہر شخص کو دشمن ہی کہا ہے اور تمہاری بندوق کی نالی ہمیشہ دشمن کی طرف رہی ہے اور اب یہ تمہاری عادتِ ثانیہ بن گئی ہے اس لیے میں تمہارے عزیزوں سے تمہارا تعارف کرا رہا ہوں تاکہ تم کو یہ معلوم ہو کہ تم اپنوں کے درمیان آ گئے ہو یہ سب تمہارے اپنے عزیز ہیں تم اپنی بندوق کی نالی ان سے دور ہی رکھنا۔ انہوں نے یہ لطیفہ سنا کر کہا کہ راولپنڈی کی ان معاشرتی روایات کے ساتھ تو یہاں جتنا کچھ بھی پروگرام ہو گیا ہے بس اسے کامیاب ہی قرار دینا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ راولپنڈی کے عوام نے پہلی بار اس تحریک کے ذریعے سیاسی شعور حاصل کیا اور اس

کا مظاہرہ کیا ہے، لوگوں نے دیہاتوں سے آ کر شہروں میں گرفتاریاں پیش کی ہیں۔ انہوں نے اس سے پہلے نہ خلافت تحریک میں حصہ لیا تھا نہ تحریکِ پاکستان میں کوئی حصہ لیا تھا یہ تو ہمیشہ اپنے معاشی چکر میں مبتلا رہے ہیں یہ پہلا موقعہ ہے کہ راولپنڈی کا علاقہ اٹھ کر تحریک نظام مصطفےٰ کے ساتھ شامل ہوا ہے۔ مجھے راجہ بشارت احمد کی بات سے اتفاق تھا۔ اس لیے بھی کہ اگر ۳۰ اپریل کو کوئی کسر رہ گئی تھی تو راولپنڈی کے احباب نے جیلوں کے اندر قیدیوں کی خدمت کر کے وہ کسر پوری کر دی تھی۔

راولپنڈی کے وہ لوگ جو خود جیلوں میں محبوس تھے ان کا کردار بھی نہایت خادمانہ اور مبنی بر ایثار تھا اور جو باہر تھے انہوں نے تو حافظ محمد ایوب کی سرکردگی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی: "اچھا بھئی! ہم آپ کی سیاسی بیداری اور خدمتِ اسیران کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں" میں نے راجہ بشارت احمد سے کہا تو ان کے چہرے پر مسرت اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی انہوں نے اپنے علاقے کا دفاع نہایت کامیابی سے کیا تھا۔

... ...

ہمارے جیل کے احباب میں حاجی شفاء الحق، محمد ظہیر خاں اور راجہ امتیاز احمد نے بھی خدمت کا بے مثال ریکارڈ قائم کیا خود ہماری کوٹھڑی کے نوجوان طالب علم حسین اور طارق نے بھی بے مثال صبر و سکون کے ساتھ سارے ساتھیوں کی خدمت کی۔ اس جیل میں بہت سے لوگوں کی تربیت ہو گئی ان میں خدمت کا جذبہ ابھرا، صبر و توکل کی عادت پڑی، شکر کا احساس نمودار ہوا خدا خوفی اور خدا ترسی کے جذبات پیدا ہوئے۔ راضی برضا ہونے کا ڈھنگ سیکھا نمازوں میں خشیت کا رنگ ابھرا، تلاوت میں فہم و شعور کی جھلک آئی دوستوں سے رواداری محبت اور مروت کا فن سیکھا اور بحیثیت مجموعی کارکنوں نے تحریکی شعور اور انسانوں سے بہتر انسانیت کا سبق سیکھا۔

... ...

جیل میں ہر روز نئی سے نئی خبر آتی تھی۔ خصوصاً سہالہ میں مذاکرات کی خبریں، جن میں بی بی سی، اخبارات اور سینہ گزٹ بہت چلتے تھے۔ ہمیں تو لئے وقت مل جاتا تھا، تھوڑے

تھوڑے وقفے کے بعد کوئی نہ کوئی سنسنی خیز بات جیل کے اندر دوڑ جاتی تھی۔ بیرکوں میں باہمی پیغامات کے تبادلے بھی ہوتے تھے۔ کبھی ملک محمد اسلم کی احاطہ نمبر ۲ سے سلپ آ جاتی۔ کبھی سعید سنبل کی طرف سے پیغام ملتا تھا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بہت دراز ہو گیا جمعہ کے دن ہسپتال کے احاطے میں نماز جمعہ پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ اجازت کیا ملی، سینہ چاکان چمن کو بے شمار سینہ چاک مل گئے۔ پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی ہمارے احباب عزیز کا ایک خاصا گروہ ہسپتال کے متصل ہی نوا بیرک کے بنگلے میں مقیم تھا، پھر تو معانقوں کا وہ سلسلہ چلا کہ ساری فرقتیں اور مجبوریاں دُور ہو گئیں۔ چودھری رحمت الٰہی بھی اسی احاطے میں مل گئے۔ مولانا فتح محمد سے سب سے پہلے ملاقات ہوئی اور ان کے مخصوص معانقے نے دل کو ٹھنڈا کیا۔ اس کے بعد پھر تو ہمارے میجر مصطفیٰ شاہین، چودھری عبدالرحمٰن، جناب فخرالدین بٹ، الطاف پرویز اور کتنے ہی دوسرے عزیز اور بزرگ ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ اس روز ہم نے اپنی بیرک میں واپس آنے کے بار بار احکام کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کی اور اسی دلچسپ مجلس میں جہاں احباب نے نماز جمعہ کے بعد چائے بسکٹ اور ملاقاتی اشیاء کا بندوبست کر رکھا تھا۔ خوب لطف اندوز ہوئے یوں محسوس ہوا کہ عید گاہ سے واپس آتے ہوئے ایک محلہ کے نمازی دوسرے محلہ کے نمازیوں سے گلے مل رہے ہیں۔ محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم جیل میں مقیم اور نظربند ہیں۔ ملاقاتوں کے نتیجے میں آنے ہوئے مال غنیمت سے خوب خوب استفادہ کیا گیا۔

... ...

سہالہ کے مذاکرات میں ذرا تشویش کا رنگ ابھرتا تو جیل بھر میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی جس شخص سے سب کو واسطہ تھا۔ وہ ہر لمحہ نئی سے نئی سنسنی پیدا کرتا۔ وہ کسی صورت میں اقتدار سے علیحدگی کے لیے تیار نہ تھا۔ بلکہ وہ معقول انصاف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ کبھی پتہ چلتا کہ اب مذاکرات کامیاب ہونے والے ہیں اور کبھی معلوم ہوتا کہ وہ استعفیٰ دینے کو تیار نہیں ہے اور اتحاد والے اس سے کم پر کسی صورت راضی نہیں ہیں بالآخر یہ بات کافی نمایاں ہو گئی کہ اتحاد والے تو بہت سے مطالبات چھوڑ کر بھی سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے تاکہ

بحران ختم ہو اور ملک میں افراتفری، احتجاج اور بدامنی کا خاتمہ ہو اور لوگ سکون کیساتھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوسکیں لیکن مسٹر بھٹو اپنی بدنیتی اور چالبازی کے رویے کو آخری دم تک جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس جادوگری سے انہوں نے سات مارچ کو ووٹ حاصل کیے تھے وہی جادوگری کرنے کے راستے ان کے لیے اب بھی کھلے رکھے جائیں۔ اتحاد والوں کو وزیراعظم کی حیثیت سے مسٹر بھٹو کی ذات پر مکمل عدم اعتماد تھا وہ جانتے تھے کہ ان کی موجودگی میں آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات نہیں ہوسکتے لیکن مسٹر بھٹو از سر نو انتخابات کرانے کا مطالبہ تسلیم کرنے اور گذشتہ دھاندلیوں کا اعتراف کرلینے کے باوجود انتخابات کے دوران وزارت عظمیٰ پر فائز رہنے پر مسلسل بضد رہے اور کوئی غیر جانبدار، عارضی حکومت قائم کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ ہوس اقتدار کے بے شمار نمونے تاریخ میں موجود ہیں لیکن بے حیائی کی آخری سرحد تک ہوس اقتدار میں مبتلا کردار ایک ہی ہے جو تاریخ میں منفرد ہے بھارت کے ایک وزیر نے ریلوے کے ایک حادثے پر اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا تھا لیکن ہزاروں قتل، تباہی و بربادی اور پوری قوم کے احتجاج کے باوجود یہ صاحب پورے ملک کو تباہ کرنے اور پوری قوم کو مرتے دیکھ سکتے تھے لیکن اپنی وزارت عظمیٰ کا تمغہ چھوڑنے پر ہرگز راضی نہیں تھے۔

... ...

ہم نے جیل کے دنوں کو بلند تر بنانے کے لیے انہیں تعلیمی اور تربیتی رنگ دینے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ ہر روز کا ایک پروگرام بنایا گیا۔ ہمارے پاس علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ایک پوری ٹیم موجود تھی۔ صبح کی نماز کے بعد درس قرآن ہوتا اور عصر کی نماز کے بعد درس حدیث ہوتا۔ یہ دونوں درس نہایت مؤثر ہوتے جن میں حالات حاضرہ پر تبصرہ اور انطباق بھی آجاتا۔ بالعموم بدل بدل کر یہ درس دیے جاتے تاکہ تنوع قائم رہے۔ مولانا قاری محمد امین، مولانا عبدالواحد (بلوچستان والے) حافظ عبدالقادر روپڑی بالعموم یہ فرض انجام دیتے تھے۔ ہمارے احاطے کے امیر قاری اسعد اللہ عباسی تھے وہ خوب ہمدرد اور منتظم ساتھی تھے۔ مجالس اتحاد میں مولانا مودودی کی تجاویز میں زیر بحث آئیں تو اندازہ ہوا کہ

کارکنان کی سطح پر ان تجاویز کے بارے میں کتنے گرم جوش اور تحسین کے جذبات پائے جاتے تھے سب کی یہ رائے تھی کہ ۱۹، اپریل سے ۲۲، اپریل تک اجتماعی تحریک کا حکومت کے اعصاب پر شدید دباؤ تھا اور وہ اس کا نقطۂ عروج تھا۔ اس کے نقطۂ عروج کو سمجھنا اور اس کے مطابق حکومت کو اپنے مطالبات کے سامنے جھکنے پر مجبور کرنا بس یہی سیاسی بصیرت کا کمال تھا۔ مولانا مودودی نے وہ تجاویز پیش کر کے ایک طرف سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا دوسری طرف معین طور پر چند مطالبات پیش کر کے حکومت کو نظم و ضبط کی اندھی لائن کی بجائے ایک سیاسی لائن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ان تجاویز کو قبول کرنے کی صورت میں مسٹر بھٹو غیر مسلح ہو جاتے تھے اور احتجاجی تحریک کو کام کا کھلا میدان مل جاتا اور تحریک کا کچھ دیکھ بھال عوام کی جھول میں آ جاتا تھا۔ تیسری طرف وہ فضا پیدا ہو سکتی تھی جس سے خون خرابے کی بجائے مصالحت اور عوام کی بہتری کا غیر جذباتی کا راستہ اختیار کیا جا سکتا۔ اور چوتھی طرف ان تجاویز کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے جبر سکال کے اقدامات کی کوئی ذمہ داری قومی اتحاد پر عائد نہ ہوتی تھی اور وہ حکومت کے بارے میں اپنی سیاسی پالیسی متعین کرنے میں کلیتہً آزاد رہتا تھا لیکن برا ہو اس سیاست بازی کا جو نظریات کی بجائے افراد کو تول کی بجائے قائل کو اور اجتماعی مفاد کی بجائے انفرادی جذبات کو دیکھتی ہے اور ملی تاریخ کے اہم موڑوں پر پہاڑیوں کو پھاندتی اور کنکریوں سے ٹھوکر کھاتی ہے۔

... ...

اب یہ حال ہو گیا تھا کہ آزاد ہونے سے گرفتار ہونا زیادہ آسان اور آرام کی بات تھی جو لوگ جیل کے اندر تھے وہ تو آرام سے بیٹھے صرف باہر کی خبروں پر کان لگائے ہوئے تھے ان کا بس ایک ہی کام تھا کہ وہ حالتِ بندش میں انتظار کرتے رہیں، انتظار کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا۔ ملاقات کا انتظار، ضمانت کا انتظار، رہائی کا انتظار، بھٹو کے زوال کا انتظار، مذاکرات کی کامیابی کا انتظار، ملک میں خوشگوار تبدیلی کا انتظار، ڈاکٹر کا انتظار، اخبار کا انتظار، ڈیوڑھی سے بلاوے کا انتظار، ان سب کا سب سے بڑا پہلا اور آخری کام انتظار

تھا۔ اس کے مقابلے میں جو جیل سے باہر تھے ان میں سے ہر ایک کے ذمے پانچ پانچ کام از خود لگ گئے تھے جیل والوں کی ضروریات کی فراہمی، ان کے بال بچوں کی نگرانی، ان کی ضمانتوں کی کوشش، جلوسوں میں لاٹھیاں کھانے کے لیے جانا اور اپنے گھریلو کاموں کی معمولی نگرانی۔ اندر والوں کا کام اتنا کٹھن نہ تھا جس قدر باہر والوں کا تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دونوں کے لیے آسانی مہیا کر دی تھی۔ باہر والوں کو کاموں کے ساتھ آزادی دے کر اور اندر والوں کو قید کے ساتھ آرام دے کر لیکن اس آرام کو حقیقی عذاب میں بدلنے کیلئے مسٹر بھٹو اور ان کے کارندوں نے کوئی کمی نہ اٹھا رکھی تھی۔

... ...

بھوک، پیاس، تنگی، ترشی، جبر و تشدد، جیل کے اندر تکالیف دینے کی کوشش، طویل وقفوں تک سلاخوں کے اندر بند رکھنے کا رجحان۔ بدترین کھانا جو مسٹر بھٹو کے کتے بھی سونگھنا پسند نہ کرتے اور گرمیوں میں کوٹھڑیوں کے سخت اور پکے فرش پر حبس اور پسینے میں سونے کی کوشش، کنکروں والی سیاہ دال، ریت والی چھان بورے کی روٹی لیکن ان سب باتوں کے ساتھ مسٹر بھٹو کے کارندوں نے جیلوں میں سے ریمانڈ کے نام پر قیدیوں کو لے جا کر تھانوں کی حوالاتوں، تہ خانوں اور قلعوں میں مار پیٹ کا عمل شروع کر دیا۔ کسی نوجوان پر بم کا کیس بنایا گیا۔ کسی پر قتل کا مقدمہ۔ غرض تعزیرات پاکستان کو سامنے رکھ کر وہ سب جرائم جو میں جیلوں کے عادی مجرم اور حکمران پارٹی کے غنڈے ملوث تھے۔ وہ جرائم اتحاد کے شریف شہریوں پر عائد کر کے انہیں جیل میں سے نکال نکال کر پولیس کے حوالے کرنا شروع کر دیا گیا۔ جیل کے مختلف احاطوں اور بیرکوں سے مختلف سرگرم کارکن چن چن کر پولیس کے حوالے ریمانڈ کے طور پر لیے جانے لگے۔ ان میں سے جو واپس آئے انکی دردناک داستانیں دل ہلا دینے والی داستانیں تھیں۔ ان کو بجلی کے جھٹکے دیے گئے، ناخن اکھاڑ دیے گئے، نازک اعضاء پر بجلی کے ننگے تار رکھ کر جھٹکے دیے گئے۔ الٹے لٹکا لٹکا کر مارا گیا۔ نفسیاتی حربے استعمال کیے گئے ان پر خوف و دہشت طاری کرنے کی کوشش کی گئی۔ یوں ایک ایک دو دو سرگرم کارکن روز جانے لگے یہ تجربے بڑی وحشت اثر خبریں تھیں۔

... ...

میری بھی ایک ذاتی ملاقات ہوئی۔ میرا لڑکا لاہور سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اسے مسٹر بھٹو نے میرا لڑکا ہونے کے جرم میں ایک مرزائی سیکرٹری کی وساطت سے معطل کر دیا تھا۔ وہ تقریباً تین ماہ سے معطل تھا۔ وہ ملنے کے لیے آیا تو مجھے ڈیوڑھی میں بلایا گیا وہ میرے لیے سارا سامان لایا تھا جس کی مجھے ضرورت ہو سکتی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ زائد اس نے اپنے گھر اور عزیزوں کے حالات بتائے اور یہ کہ اللہ کے راستے میں اس موقع پر یکایک میرا جیل چلا آنا غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لیے وہ مطمئن تھے محترم والد صاحب کو تشفی کا خط جیل سے ہی لکھ دیا تھا۔ ننھی مریم بھی میری واپسی کی منتظر تھی۔ فرزانہ اور اس کی امی کو بھی میرا انتظار تھا اور حالات بدلنے کا انتظار تو سارا ملک ہی کر رہا تھا۔ ساری قوم منتظر تھی کہ اللہ تعالیٰ ظالم کی تبدیلی کا کوئی سامان کرے لیکن ظالم اس طرح چمٹا ہوا تھا کہ گویا کرسی اس سے چپٹ کر رہ گئی تھی اور یہ کسی بڑے اپریشن کے بغیر اس کے جسم سے علیحدہ کرنا مشکل تھی۔ لوگوں کو توقع تھی کہ سمجھوتہ ہونے کے بعد جب جعلی اسمبلی ٹوٹے گی تو پھر اسکا جبر واستبداد اور لالچ و مفاد پرستی کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

... ...

اچانک ایک روز خان یوسف خان کا نام پکارا گیا اور انہیں ڈیوڑھی میں بلایا گیا۔ یہ ان قیدیوں کو ریمانڈ کے بہانے حوالاتوں میں لے جا کر زدوکوب کرنے کے دن تھے۔ ہم سب پریشان ہوئے اور پھر معلوم ہوا کہ خاں صاحب کو اسلام آباد کے تھانے میں لے گئے تھے اسلام آباد جو اسلام کے نام سے آباد ہوا ہے جو جمہوری حکومت کا دارالخلافہ ہے۔ اس کے تھانے میں ایک تہ خانہ ہے جس میں لوگوں کو نام نہاد جرائم کا اعتراف کرانے کے لیے عذاب دیا جاتا ہے عذاب دے کر کس سے اعتراف نہیں کرایا جا سکتا۔ کیا مسٹر بھٹو کو عذاب دیا جائے تو وہ پاکستان کو توڑنے کا اعتراف نہیں کر لیں گے۔ کیا مسعود محمود ڈائرکٹر جنرل فیڈرل سیکورٹی فورس کو عذاب دیا جائے تو وہ بے شمار سیاسی قتلوں اور بہت سے سیاسی قیدیوں کو دلائی کیمپ میں رکھنے کا اعتراف نہیں کر لیں گے کیا مصطفےٰ کھر کو عذاب

دیا جائے تو وہ ڈاکٹر نذیر شہید اور خواجہ رفیق کے قتل کا اعتراف نہیں کرے گا۔ ان حقیقی مثالوں سے قطع نظر اگر عبدالحفیظ پیرزادہ کو عذاب دیا جائے تو وہ اپنے امریکی ایجنٹ ہونے کا اعتراف نہیں کرے گا؟ لیکن مسٹر بھٹو اور ان کی پولیس کا منشاء صرف یہ تھا کہ جھوٹے جرائم عائد کر کے لمبی لمبی سزائیں دی جائیں تاکہ قومی اتحاد کے کارکن انتخابات اکتوبر میں نہ آسکیں اور ان کو اتنا عذاب دیا جائے کہ وہ خوفزدہ ہو کر سیاسی میدان سے نکل جائیں یا معذور ہو جائیں افسوس کہ قاتلوں اور ڈاکوؤں کے گروہ بھی بعض اوقات منظم ہو کر ملکوں کی سیاست پر قابض ہو جاتے ہیں۔ غالباً یہی حال تھا جب سکندر اعظم کو ایک بحری قزاق نے جواب دیا تھا کہ میرے اور تمہارے درمیان کچھ بڑا فرق تو نہیں ہے میں بحری قزاق ہوں اور تم بری قزاق ہو۔

تیرا پیشہ ہے سفاکی، میرا پیشہ ہے سفاکی
کہ ہم قزاق ہیں دونوں تو میدانی میں دریائی

غرض یوسف خان ہماری کوٹھڑی میں سے چلے گئے اور اس کوٹھڑی میں ہم پانچ افراد ہی رہ گئے دوسرے دن ندیم نے ان کے بارے میں بتایا کہ وہ بخیریت تھے اور اسلام آباد میں تھانے میں موجود تھے ان سے ان کی نومسلم بیوی مریم جمیلہ کے حوالے سے امریکی امداد کے بارے میں اعتراف کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی، جیسے وہ کئی نوجوانوں کے سامنے زدوکوب کے بعد امریکی ڈالر اور پستول رکھ کر یہ کہتے تھے کہ یہ لکھ دو کہ یہ ڈالر اور پستول مجھے مولانا مودودی نے دیے ہیں تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے بم کی باتیں جب انہوں نے ہمارے بہادر ساتھی محمد رفیق اشرفی سے کیں تو انہوں نے زور دے کر کہا اگر میرے پاس بم ہوتا تو اسے ضرور بھٹو کے خلاف استعمال کرتا۔ لیکن افسوس کہ میرے پاس بم نہیں ہے۔

... ...

بھٹو حکومت نے مولانا مودودی پر جبر و تشدد سے حکومت کا تختہ الٹنے کا الزام لگایا تو مولانا مودودی نے خوب کہا کہ میں ان کے خیال میں اتنا دیوانہ ہوں کہ چند گولیوں، پستولوں اور چند دستی بموں سے یہ سمجھتا ہوں کہ پوری حکومت کا تختہ الٹایا جا سکتا ہے۔

... ...

ہم نماز عصر سے فارغ ہوئے تھے کہ اچانک احاطے میں نمبردار نے ناموں کی ایک طویل فہرست پڑھ کر سنانی شروع کر دی۔ تقریباً راولپنڈی سے باہر سے آئے ہوئے لانگ مارچ کے بیشتر قیدیوں کے نام پکارے جانے لگے۔ حکم ہوا کہ یہ سب لوگ اپنا اپنا سامان لے کر ڈیوڑھی میں پہنچ جائیں۔ ہماری کوٹھڑیوں میں سے قاری نصیر الدین کو چھوڑ کر باقی ہم سب کے نام پکارے گئے تھے معلوم ہوا کہ راولپنڈی جیل میں رش کو گھٹانے کے لیے سب لوگوں کو ان کے اپنے اضلاع کی جیلوں میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ جیل والوں کی خوشیاں جیل والوں کی سی ہوتی ہیں۔ ہم اسی پر خوش تھے کہ کم از کم لاہور تو جا رہے ہیں چاہے جیل ہی میں جا رہے ہیں۔ ڈیوڑھی کے سامنے تین سو ساٹھ قیدیوں کی قطاریں کھڑی تھیں جن میں سب پنجاب، سندھ اور سرحد کے لوگ تھے۔ سب کو ہتھکڑیوں کا زیور پہنایا جا رہا تھا۔ میں اور چوہدری رحمت الٰہی ایک ساتھ کھڑے تھے۔ ہم تو تیار تھے لیکن ہمارے ساتھیوں کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی کہ یہ ہمارے بزرگ ہیں ہم ان کو ہتھکڑی نہ لگنے دیں گے۔ پولیس اور جیل انتظامیہ ٹھٹھک کر رہ گئی تھی لیکن پولیس ہتھکڑی لگانے پر بضد تھی اس دوران نماز مغرب کا وقت ہو گیا اس لیے ہم سب نے نماز مغرب کی اور عشاء کی نمازیں جمع کر لیں۔ کیونکہ یہ بات کھل گئی تھی کہ ساری رات سفر کیا جائے گا اور ہماری اگلی منزل میانوالی جیل تھی جو پنجاب کی بدترین جیل شمار ہوتی تھی۔

... ...

یوں مسٹر بھٹو کی حکومت نے میرے جیسے ایک لاکھ سے زائد افراد کو جیلوں میں بھیجا تاکہ وہ ان کی انتخابی دھاندلیوں اور حکومتی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرنے سے باز آجائیں۔ اپریل، مئی، جون کے مہینے مذاکرات میں گزر گئے۔

تحریک اور مذاکرات

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر بھٹو کی حکمتِ عمل مذاکرات کے ذریعے تحریک نظام مصطفیٰ کے

عوامی جوش کو ٹھنڈا کرنا۔ اپنے اقتدار کے حالات کو برقرار رکھنا اور تدریجاً حالات پر قابو پالینے کے بعد قومی اتحاد پر شدید جوابی حملہ کرنا تھا۔ وہ سیاسی مخالفین کو مروا ڈالنے کے بھی قائل تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر نذیر شہید اور خواجہ رفیق جیسے سینکڑوں افراد قتل کروا دیے اس لیے کہ وہ ان پر تنقید کرتے تھے۔ میں ان کے پانچ سالہ دور میں دو بار قید و بند کا شکار رہا اور میری طرح بے شمار لوگ ان کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے اور اپنے سارے دورِ ستمگری میں وہ جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگاتے رہے حالانکہ انہوں نے بدترین آمریت کے ذریعے حکومت کی۔ وہ دھوکا دینے اور وعدہ خلافی کرنے کے عادی مجرم تھے۔ وہ عوامی تحریک کے اشتعال کے دن گزار کر پھر اپنے مخالفین سے ہٹلر اور مسولینی کی طرح نپٹنا چاہتے تھے۔ یہی ان کی حکمتِ عملی تھی۔ پنجاب میں ان کے پاس سٹرکھر موجود تھے جو اپنے غنڈوں کی فوج کو لے کر امارکلی کے میدان میں توڑ پھوڑ کی جنگ برپا کرنے کی تیاریوں میں معروف تھے اور ہر صوبے میں ان کے پاس غنڈہ فورس موجود تھی۔ انہوں نے اپنی ذاتی ایف ایس ایف بھی بنا رکھی تھی جو صرف ان کی ذاتی وفاداری کا حلف لیتی تھی۔ غرض مسٹر بھٹو کا ارادہ مسائل کو حل کرنے، انتخابات نئے کروانے اور اصلاحِ احوال کا نہ تھا اور نہ ہی فاشی ذہن رکھنے والا کوئی ڈکٹیٹر کبھی اختیارات سے دستبرداری اور صلح جوئی کی بات کرتا ہے۔ وہ صرف تحریک نظامِ مصطفےٰ کو ٹھنڈا کرنے کی مہلت چاہتے تھے۔ اس مہلت کے لیے انہوں نے نئے انتخابات کے دو حرفی مطالبے پر سورن سنگھ کی طرح تین مہینے مذاکرات کیے تاکہ جلوسوں کی شدت کم ہو اور انہیں جوابی حملے کا موقع مل سکے۔ اس مہلت کو حاصل کرنے کے بعد پھر ان کا ارادہ پولیس انتظامیہ اور غنڈوں کے ذریعے پورے ملک میں قومی اتحاد کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کا تھا جس میں وہ کئی لاکھ افراد مروا دینے کا ارادہ رکھتے تھے اس نوعیت کے اعلان اور قرائن برابر ان ایام میں سامنے آ رہے تھے ظاہر ہے کہ غلط انتخابات کو منسوخ کرا کے نئے انتخابات کرانے کا مطالبہ اتنے خون خرابے کے مقابلے میں کوئی بعید از قیاس اور ناممکن العمل مطالبہ نہ تھا فرانس میں سال میں دو بار انتخاب بھی کئی بار ہو چکے تھے لیکن مسٹر بھٹو یہ معمولی قومی مطالبہ بھی ماننے پر بالکل تیار نہ تھے وہ انتخابی جمہوریت کی بجائے فاشزم کے قائل تھے اسی

لیے وہ نئے انتخابات پر مذاکرات اور معاہدات پر آخر دم تک دستخط کرنے سے گریز کرتے تھے۔ جو طریقہ ان کے ساتھ مذاکرات کشمیر میں سردار سورن سنگھ نے اختیار کیا تھا تقریباً وہی طریقہ وہ اب قومی اتحاد کے ساتھ اختیار کر رہے تھے جبکہ ان کے اس رویے سے عوامی مایوسی میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا اور جوں جوں ان کے اس عظیم احتجاجی تحریک کے باوجود اقتدار میں رہ جانے کے امکانات مذاکرات کے نتیجے میں بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے ہی عوام کے اندر مایوسی بھی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مارشل لاء جیسی ناپسندیدہ چیز کا اعلان ہوا تو ملک بھر میں ملت اسلامیہ نے پورے اکیس دن تک دیگیں پکا پکا کر خیراتیں کیں اور انہیں محسوس ہوا کہ بھٹو سے نجات کا جو مقصد انہیں تین ماہ کی تحریک کے باوجود حاصل نہ ہوا تھا وہ مقصد مارشل لاء کے اعلان سے حاصل ہو گیا تھا اور ان کی جان ایک معتوب ترین آمر سے چھوٹ گئی تھی۔ اس وقت لوگ مارشل لاء کو نجات دہندہ کی حیثیت میں دیکھ رہے تھے۔ مسٹر بھٹو نے اپنے عہد کو مارشل لاء سے کہیں زیادہ بدتر بنا کر پیش کیا تھا۔ بھٹو کے اس عہد نے ضیاء الحق کے مارشل لاء کو اتنی طوالت کا موقع فراہم کیا۔

متحدہ قومی اتحاد کے قائدین نے مسٹر بھٹو سے مذاکرات کر کے غلطی کی جس کے نتیجے میں تحریک طویل ہو گئی۔ قومی نقصانات میں اضافہ ہوا۔ لوگوں میں مایوسی ہوئی اور اور فوج نے مارشل لاء کے سوا کسی بڑے فساد کو دبانے کا اور کوئی راستہ نہ پایا۔ فی الحقیقت فوج کی ملکی انتظامات سنبھالنے کے لیے آمد بالعموم سیاستدانوں کی ناکامی بلکہ نالائقی کے باعث ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں سیاستدانوں کی بڑی کھیپ ایسے افراد پر مشتمل چلی آتی ہے جو جاگیردار ہیں، نیم خواندہ ہیں، ضدی اور اڑیل ہیں، ریاکار ہیں، بے نظریہ اور بے تدبیر ہیں۔ غرض جاگیرداری کے سارے عیوب اپنے اندر رکھتے ہیں۔ وہ ملت کے ملی احساسات سے ہمیشہ بے خبر و بے نیاز رہتے ہیں۔ وہ اڑنگے باز ہیں نہ ماننے اور آخری حد تک تدبیر و بصیرت سے عاری، عدم رواداری کا شکار باہمی گالی گلوچ اور الزام بازی میں مبتلا، مسائل کو سلجھانے سے معذور، سیاسی امور الجھانے اور مشکل حالات میں سے تحمل

صبر اور تدبر سے گزر جانے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہیں۔ وہ دین کی بصیرت اور قرآن کی رہنمائی سے دور ہیں چنانچہ جب سے ملک بنا ہے یہ سادہ مسائل کو بگاڑ کر بار بار انہیں قومی بحران بنا دیتے ہیں اور بحران کو بھی اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں کہ یا ملک ٹوٹ جائے یا دشمن کے ہاتھ میں چلا جائے یا ساری دنیا کے سامنے مضحکہ خیز تماشا بن جائے۔ چنانچہ یہ صورتحال پیدا کر دینے کا نتیجہ مارشل لاء ہوتا ہے۔ فی الحقیقت مسلمانوں میں سیاست کے لیے اخلاص، خدمت، ذہانت، علم، تحمل، تدبیر، قرآن و سنت سے آگاہی اور حب الوطنی وہ شرائط ہیں جن کے بغیر کوئی شخص بھی سیاست میں داخل ہو کر مسلمانوں کو نقصان تو پہنچا سکتا ہے لیکن فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ تحریک نظام مصطفےٰ چلانے کے بعد مسٹر بھٹو سے مذاکرات ہی غلط تھے۔ صرف ایک ہی مطالبہ کافی تھا کہ مسٹر بھٹو مستعفی ہوں اور عدلیہ کی نگرانی اور فوج کے انتظام میں دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔ یہ ایک ایسا معقول مطالبہ تھا جس پر کسی نوعیت کے مذاکرات کی ضرورت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ مذاکرات نے اپوزیشن لیڈروں کی بصیرت کا بھانڈہ بھی پھوڑ دیا کہ وہ جس شخص کی انتخابی دھاندلی اور بدکرداری کے خلاف خونریز تحریک چلا رہے تھے اسی شخص کو دوسرے نئے انتخابات کی سپریم کونسل کا چیئرمین بھی تسلیم کر آئے تھے۔ یہ ایک ایسا تضاد تھا جو غلط مذاکرات نے پیدا کر دیا تھا۔ افسوس کہ ایسی قابل قدر پرجوش تحریک کو سیاستدانوں نے ضائع کر دیا جس تحریک کی قوت سے ساری حکومتی پارٹی تتر بتر حکومتی مشینری مفلوج اور نظام حکومت بے بسی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس تحریک میں سے قومی اتحاد کے لیڈر ملت کے لیے کوئی مفید نتیجہ نکالنے سے قاصر رہے۔ یہ ان کی ناکامی تھی۔ اپوزیشن کا یہ مطالبہ انتہائی معقول تھا کہ حکومت مستعفی ہو جس کی دھاندلی سے انتخابات خراب ہوئے اور نئے انتخابات منعقد ہوں تاکہ مشتعل عوام کو تازہ مینڈیٹ دینے اور اپنا اعتماد ظاہر کرنے کا موقع مل سکے۔ یہ ایک معقول ترین مطالبہ تھا جس کی پشت پر ساری جمہوری دنیا کی تائید اور ملت کی قربانی موجود تھی۔ ایسے معقول مطالبے کو منوانے کی بجائے مہینوں مذاکرات میں ضائع کرنا کسی صورت بھی عقلی دانشمندی کا مظاہرہ

نہ تھا۔ فی الحقیقت پاکستان کا المیہ اس کے قائدین کی سیاسی بصیرت کے فقدان کا المیہ ہے۔

بالآخر ان طویل مذاکرات نے تحریک کو تباہ کرکے مارشل لاء کی گود میں ڈال دیا۔ وہ مارشل لاء جس سے سو بگاڑ پیدا ہوتے ہیں اور چند روزہ جیل کے سے عارضی سکون کے سوا ملت کو کبھی کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ نئے مارشل لاء نے ملت کے مزید گیارہ سال برباد کیے اور تحریک نظام مصطفےٰ کی ساری قربانیاں اور پُر جوش جذبات نئے فسادات کی نذر ہو گئے۔ البتہ اس تحریک نے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ ملت کسی بے دین، فسادی اور مطلق العنان آمر کو زیادہ دن اپنے اندر برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس تحریک نے ملت کے حقیقی مزاج اور مطالبے کو نکھار کر دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ملت صرف نظام مصطفےٰ کا نفاذ چاہتی ہے جو اس کے دل کی تمنا ہے لیکن اس کے نفاذ کے لیے وہ کسی معجزے کا انتظار کر رہی ہے کوئی طویل جانگسل جدوجہد اور کردار سازی کرنے سے وہ ابھی گریز کر رہی ہے۔ اس نعرے پر فوری قربانیاں دینے کے لیے وہ تاریخ کے ہر دور میں تیار رہی ہے۔

استدراک

ہماری ملت میں بیداری کا مسئلہ انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ اجتماعی طور پر بیدار اور چوکس رہ کر ہی قومیں دنیا میں ترقی کرتی ہیں اس لیے حکیم الامت نے کہا تھا۔

پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

بیداری کے لیے علم و آگہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سے ملت میں احساس سود و زیاں کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ ہماری ملت جس کی اساس علم پر رکھی گئی تھی عالمی سطح پر دوسری قوموں کے مقابلے میں علم کی کمی اور ملی احساس و شعور کے فقدان کا شکار ہو گئی ہے۔ اسی لیے عام حالات میں وہ اپنے ملی مسائل سے غافل ہوتی ہے البتہ جب وہ اپنے ملی وجود کو ہی کسی خطرے میں محسوس کرتی ہے اور خطرہ بھی اتنا شدید، جو اپنی ساری ابتدائی حدیں پار کر کے نیستی کے بالکل آخری مقام پر جا پہنچتا ہے تب ہماری ملت ہڑبڑا کر اٹھتی اور جیسے تیسے کچھ اقدامات کر کے اس سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہے۔ اسی لیے تیاری کے بغیر مقابلہ کرنے کے نتیجے میں خطرے کے ابتدائی نقصانات بھی اسے پہنچ جاتے ہیں اور گھبراہٹ میں کیے گئے ادھورے اقدامات کے باعث کچھ مزید نقصانات سے بھی اسے بہر حال دوچار ہونا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ بالکل آخری مقام تک پہنچا ہوا خطرہ اپنا بدترین نقصان پہنچائے بغیر زائل نہیں ہوتا۔ اسی لیے اس کی زبردست قربانیوں سے عبارت جد و جہد بھی بالعموم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ایک زندہ اور با مقصد قوم کے لیے کسی طرح بھی یہ صورت حال خوش آئند نہیں ہے۔

... ...

یہ بات تو بہت اچھی طرح واضح ہے کہ ہماری ملت کی قوت اتحاد میں ہے اور یہ بھی کہ ہماری ملت کے پاس افتراق کے مقابلے میں اتحاد کے عناصر بہت زیادہ ہیں۔ عقائد اور اعمال میں دوسری تمام ملتوں کے مقابلے میں ہمارے پاس اتحاد کے عنوانات غیر معمولی طور پر زائد ہیں۔ تحقیق اور علمی بحثیں تو کسی قوم کی ترقی اور حالات کے ساتھ مطابقت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور فکری جمود کو توڑنے کا باعث ہوتی ہیں لیکن ہمارے دشمنوں نے ہماری غفلت اور علم کی کمی سے فائدہ اٹھا کر انتہائی چالاکی سے ہماری علمی بحثوں کو ہی مذہبی، سیاسی معاشرتی اور اقتصادی دائرے میں ہمارے درمیان بے شمار اختلافات پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے چنانچہ جو باتیں ہمارے لیے ترقی و اتحاد کا ذریعہ بننی چاہیے تھیں۔ انہیں کو ہمارے دشمنوں نے انتہائی ہوشیاری اور چابکدستی سے ہمارے درمیان اختلاف و افتراق کا باعث بنا دیا ہے۔

... ...

ہمارے ہاں قیادت کا مسئلہ بھی انتہائی پریشان کن ہے۔ دیانت، امانت، خدا ترسی خدمت، تقویٰ اور آگہی کو ہمارے ہاں اصولی طور پر قیادت کے لوازمات قرار دیا گیا تھا لیکن ہماری تاریخی بدقسمتی سے ہماری شورائی خلافت کو منہدم کر کے اس کی جگہ ملوکیت مسلط ہونے سے قیادت کے لیے مقرر کردہ یہ اعلیٰ عناصر بتدریج لوازم قیادت سے خارج ہو گئے جس کے نتیجے میں کفر و الحاد پر قائم قوموں کو تو بڑی آسانی سے اپنے لیے مطلوب مخلص قائدین مل جاتے ہیں لیکن ہمارے لیے اس میں بے شمار دشواریاں لاحق ہو گئی ہیں خدا و رسول کے احکام سے انحراف کے ساتھ ہی اخلاص مشتبہ ہو جاتا ہے جبکہ قیادت میں اخلاص کا پہلو بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

... ...

ہمیں یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ ہمارے اندر مستقل ایک گروہ موجود رہنا ضروری ہے جو ملت کو ان اقدار سے آگاہ رکھے جن پر اس ملت کی اساس ہے۔

فرمایا گیا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ ال عمران آیت ۱۰۴ ۔ رکوع ۱۱

ترجمہ: "تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔" آلِ عمران ۱۰۴

گویا ہر وقت ہر دور میں ایک اسلامی تحریک کی اس ملت کے اندر موجودگی قرآنی حکمتِ اصلاح کی رو سے لازم ہے تاکہ وہ گروہ ملت کو شعور و آگہی دیتا رہے۔ معروف کی طرف دعوت دے منکر سے باز رہنے کی تلقین کرے اور ملت کو دعوتِ اسلامی کی طرف بلائے لیکن ملت اس گروہ کی موجودگی کا مسلسل التزام کرنے سے غافل ہو گئی جس کے نتیجے میں اس کے اندر ملی فضا اور قومی ماحول اسلامی اقدار سے دور ہوتا چلا گیا تو کوئی قوت ایسی موجود نہ رہی جو معروفات کی فضا کو قائم کرے۔ منکرات کی فضا کا تدارک اور مزاحمت کرے۔ اس کے سبب ملت میں معروفات کے دبتے چلے جانے اور منکرات کے افزائش پانے سے ملت کے احساس کی تیز دھار کند ہو گئی اور احساس کا یہی فقدان اسے بے حس کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا۔

... ...

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس عمل میں ہمارے حکام کا ظالمانہ طرزِ عمل بھی شامل ہے۔ خلافت کے خاتمے اور ملوکیت کے رواج پانے کے بعد ہمارے حکام نے اصولوں پر قائم رہنے والوں کے ساتھ جس ظلم و ستم کا مظاہرہ کیا اس بے جواز اور غیر متوقع ظلم و ستم سے ملت اسلامیہ سہم سی گئی اور اس کے دل میں جرأت و بے باکی کا ایمانی عنصر کمزور پڑ گیا چنانچہ جو افراد حضرت عمرؓ سے کرتے کا حساب طلب کرتے تھے وہ پیدا ہونا بند ہو گئے۔ حضرت امام حسینؓ کے ساتھ یزید کا بے رحمانہ سلوک ملت کے اندر گویا حق گوئی اور راست روی کو مشکل ترین بلکہ جان لیوا بنا دینے والا عمل تھا۔

حضرت امام مالک کے ایک عام سے علمی فتوے کو بادشاہ کے مزاج سے مطابق نہ پاکر جوان پر ظلم و ستم ڈھائے گئے اور اتنے متقی، پرہیزگار عالم دین کے بازو اکھڑوا کر انہیں سارے شہر میں رسوا کیا گیا تو پھر اس کے بعد کوئی بہت ہی غیر معمولی شجاعت و جرأت کا مالک عالم دین ہی بادشاہ کی پسند کے خلاف کوئی علمی مسئلہ بیان کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ اسی لیے جب خلق قرآن جیسا انتہائی خلاف عقیدہ اسلام مسئلہ بادشاہِ وقت کی طرف سے اٹھایا گیا تو اوّل اوّل تو علماءِ اسلام نے اس مسئلے کی مذمت کی اور صحیح علمی مؤقف بیان کیا لیکن جب یہ بات سامنے آئی کہ جو کوئی بادشاہ کی رائے کے خلاف دلیل سے اپنی رائے دے گا اسے کوڑے پڑیں گے تو سارے اہلِ علم دم سادھ کر خاموش بیٹھ گئے اور تنہا ایک امام احمد بن حنبلؒ ہی بیس سال تک اپنے جرمِ صداقت کی مار کھاتے رہے اسی کے نتیجے میں جب امام ابو حنیفہ جیسی عظیم دینی شخصیت کا جنازہ بھی جیل خانے سے ہی برآمد ہوا اور بادشاہِ وقت نے انہیں کوڑے مار مار کر شہید کرا دیا تو سارا شہر انکے جنازے کے ساتھ قبرستان تک تو ضرور چلا گیا لیکن شاہی محل کے سامنے احتجاج کے لیے جانے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی۔ مسلمان حکام کے اس ظالمانہ طرزِ عمل کے سبب ملت میں علمائے دین کی کثرت ہو گئی اور علماء دین حق کم سے کم تر ہوتے چلے گئے۔

... ...

آج یہی وہ تاریخی پس منظر ہے جس کے سبب لوگ حق کو مظلوم بھی دیکھتے ہیں تو دل میں کڑھتے ہیں لیکن جرأت کر کے میدان میں نہیں آتے بلکہ حکومت کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکومت سے مختلف رائے رکھنے کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پوری ملت بالعموم حکومتِ وقت کے مسلک اور طریقے پر چلتی ہے اور عام آدمی نے حاکم وقت کو خدا کا سایہ شمار کر لیا ہے اور وہ اسی طرزِ عمل میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

یہ بدقسمتی ہے کہ جس ملت کے سفیر اور ایلچی بھی روم و ایران کے درباروں میں جا کر حق گوئی کر کے تہلکہ مچا دیا کرتے تھے اس ملت کے بدبخت ظالم حکام نے اپنے ظلم و ستم سے اس کے افراد کو اتنا زیادہ دہشت زدہ کر دیا ہے کہ اب وہ حکومت کے مقابلے میں

اپنی زبان کھولتے ہوئے بھی تھر تھر کانپتے اور خوف کھاتے ہیں اور ہمیشہ حکومتِ وقت کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے وہ حکومت کتنی ہی ظالم و فاسق و فاجر کیوں نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ اس ملت میں جہاں ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ و عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے سایۂ رحمت حکمران پیدا ہوئے وہاں حجاج بن یوسف نادر شاہ اور مسٹر بھٹو جیسے ظالم حکمرانوں کی گنجائش بھی موجود ہے اور محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ جیسے عیاش اور بدکردار حکمرانوں کو بھی مسلمان انہیں تامرگ برداشت کرتے رہتے ہیں۔

... ...

اس ملت میں روساء اور امراء نے بھی اپنی حرام خوری اور عیاشی کے سبب خود غرضی ملت فروشی، بے رحمی اور بے حسی کا بدترین کردار ادا کیا ہے ان کے ہاتھ سے کبھی کوئی خدمتِ خلق کا کام سرانجام نہیں پاتا۔ غیرمسلموں کے بے شمار رفاہی ادارے صرف ان کے غیرمسلم روساء اور افراد کے بل پر چلتے ہیں لیکن ہمارے روساء چونکہ بدکردار اور اصولِ اسلام سے منحرف، زکوٰۃ سے منکر اور سود خوار لوگ ہیں اس لیے ان کی بے حسی اور بے دردی مثالی حد تک پہنچی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ملت کی نوّے فیصدی دولت سمٹ کر امراء کے پاس چلی گئی ہے اور غربا بے سہارا ہونے کے سبب احساسِ کمتری اور طبقاتی غم و غصے کا شکار ہو گئے ہیں اور ان دونوں طبقات میں صرف نفرت اور بے اعتمادی کا واحد تعلق ہی باقی رہ گیا ہے۔

... ...

ان اسباب کے باعث ہماری ملت۔ جس کے پاس ورثے میں اتحاد اور قوت کے سرچشمے اور علم و آگہی کے سمندر ہیں۔ ان سرچشموں سے محرومی کے سبب، غفلت، مدہوشی بلکہ بے حسی اور مردنی کی گہری دبیز چادر اوڑھ کر سوتی رہتی ہے اور اسی غفلت میں وہ اپنا غم روزگار، غم محکومی اور غم زوال و انحطاط بھی محو کرتی رہتی ہے۔ وہ نہ اپنے حکام سے امید رحم و کرم رکھتی ہے، نہ علماء سے امیدِ صداقت و راستی رکھتی ہے اور نہ اپنے روساء سے امیدِ تعاون و اخوت رکھتی ہے۔

یہی مایوسی اس کی بے حسی اور اپنے ملی مسائل سے بے تعلقی کا سبب بن گئی ہے یہی وجہ ہے کہ جب تک کوئی خطرہ خود اس کے وجود کو ہی لاحق نہ ہو جائے وہ بالعموم اجتماعی بیداری کا ثبوت نہیں دیتی اور اسی وجہ سے اس کے اندر سے صداقت شعار افراد تنہا اٹھ کر ظلم و ستم کی للکیثر سہنے کی جرأت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس کیفیت کو دور رکھنے کا نسخہ وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے کہ ملت کے اندر ایک مسلسل اسلامی تحریک کا وجود ضروری ہے جو اسے اس کی اصل حقیقت سے آگاہ رکھے۔ اس کی حقیقی منزل کی نشاندہی کرتی رہے اور ملت کے جاندار سعید فطرت، باشعور افراد کو چھانٹ چھانٹ کر وہ قوت فراہم کرتی رہے جو ایک وقت ملت کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے۔

یہاں ہم ملت کی موجودہ کیفیت اور اس میں لگے ہے گے ہے بھڑکنے والے اسلامی جذبات کی ایک دلچسپ تمثیل پیش کرتے ہیں جس میں نہایت خوبصورتی سے اس صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے تمثیل ملاحظہ فرمائیے۔

اسلامیل کی تمثیل

مشرق کی سرزمین میں ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ لیکن اسلامیل بیدار نہ ہوا۔ لاتعداد زبردست دھماکے زمین کے پرخچے اڑاتے رہے۔ انسانیت کو بار بار ذبح کرتے رہے زلزلے اور طوفان آتے رہے۔ انسان انسان کو اپنے اغراض کی بھٹی میں جھونکتا رہا۔ انسان انسان کا گوشت کھاتا رہا۔ صدیاں بہاروں کے سوکھے بادلوں کی طرح فضا میں تیرتی ہوئی گزرتی چلی گئیں۔ وقت سرپا ئیں اس کی بیداری کا انتظار کر کے جاتا رہا۔ دکھی انسانیت زخمی ہو ہو کر گرتی رہی لیکن سونے والے نے کروٹ نہ لی۔ گہری خوفناک نیند اس پر مسلط رہی۔ زلزلوں نے اس کے جسم میں ذرا سی جنبش بیداری بھی پیدا نہ کی۔ زخمی انسانیت کی چیخیں اس کی سماعت کو واپس لوٹا نہ سکیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ایک زندہ لاش کی طرح آمد ھیاں آتی ہیں تو بعض درخت ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنا مقام چھوڑ جاتے ہیں۔ بعض پتھر

ایسے بھی ہوتے ہیں جو کانپ کر گر پڑتے ہیں۔ لیکن سونے والے کا جمود ان نباتات و جمادات سے بھی زیادہ گہرا اور دیرپا تھا۔ کائنات اس کے چاروں طرف پھولتی، مرجھاتی، پھیلتی، سکڑتی، آباد اور برباد ہوتی رہی لیکن وہ اپنی گہری نیند سے نہ چونکا۔ اس نے تو "اصحاب کہف" کو بھی مات کر دیا۔ اس نے تو کائنات کی ساری نیند کو سمیٹ کر اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا وہ کسی اندھیرے غار میں گھس کر یا کسی تاریک کونے میں جا کر بھی نہیں سویا۔ وہ تو کائنات کی وسیع گود میں ایک زخم خوردہ طفل معصوم کی طرح لیٹ گیا اور لیٹ کر سو گیا۔ وہ تو ایک روٹھے ہوئے بچے کی طرح وقت کے سینے اور حادثات کے چولہے پر سو گیا۔ اور پھر جگانے والوں نے اسے جگانے کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ لیکن وہ سویا رہا اور کروٹ تک نہ لی۔

اس کے سینے پر جو زخموں کے نشان ہیں یہ اس کے اپنے دوستوں اور وفادار ساتھیوں ہی کے لگائے ہوئے ہیں۔ اس کا عصائے اقتدار جو اس کے پاس شکستہ پڑا ہے اسے توڑنے کا فخر اس کے دشمنوں کو حاصل نہیں بلکہ اس بدبختی کو بھی اس کی دوستی کے دعوے داروں نے ہی اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ کائنات کی گود میں مالک الملک اور خالق الکل کا بھیجا ہوا سلطان سویا پڑا ہے۔ اس کی سپاہ اسے چھوڑ کر اس کے دشمنوں کے لشکروں میں بھرتی ہو چکی ہے اور بھرتی ہونے کے بعد بھی نہ صرف اسی نسبت "سلطان کی فوج" کہلانے پر مصر ہے۔ بلکہ اس پر "فخر" بھی کرتی ہے۔ جگہ جگہ اس کا نام لے کر اپنی غداری سے اسے بدنام کرتی ہے۔ اس سونے والے کے ساتھیوں نے اس کے دشمنوں کے درباروں میں اونچے اونچے مناصب حاصل کر لیے ہیں لیکن اپنی کھوکھلی وفاداری کے دعوے پھر بھی اس بے چارے سونے والے کے رجسٹر میں ہی درج کیے جاتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے گزرتے ہوئے اس کی طرف اشارے کر کے سرگوشیاں کرتے ہیں: "یہ ہے خالق کائنات کا بھیجا ہوا بادشاہ وقت جو خود فراموشی کے پردے تلے سویا پڑا ہے۔"

سفید سفید صدیاں اپنے ہلکے پھلکے لبادوں کے ساتھ اُڑتی جا رہی ہیں: "وہ دیکھو زمین کا بادشاہ، جس کے ساتھی اس کا عصائے اقتدار توڑ کر اس کے دشمنوں سے مل گئے ہیں جو دنیا و ما فیہا سے بے خبر پڑا سو رہا ہے۔ اس کے "اوامر و نواہی" کا فرمان ہواؤں کے دوش پر

کھوئے ہوئے اوراق کی طرح پریشان ہے اس کی نواہی کی پشت پر سیاست کی کوئی قوت نہیں۔ اس کے اوامر کے دامن میں اقتدار کا لہو نہیں ہے۔ وہ کونسی خوش بخت گھڑی ہو گی جب یہ کائنات کا شہزادہ اپنی گہری بھیانک نیند سے بیدار ہو گا۔ جب اسکے عصائے اقتدار میں قوت و شوکت اور حکم و دبدبہ لوٹ کر آئے گا۔ جب اس کے "اوامر و نواہی" کے اوراق یوں ہواؤں کے دوش پر پریشان نہ ہونگے بلکہ انسانی زندگی کے زندہ ضابطے ہونگے۔ وائے افسوس کہ وہ گھڑی ہمارا جگر گوشہ نہ ہوئی!"

لیکن شہزادہ اس انتظار کے کرب سے بے خبر سویا پڑا ہے۔ اس نے تو زندگی اور موت سے دوستی چھوڑ کر صرف نیند کو اپنا رفیق بنا رکھا ہے وہ کائنات کے اضطراب سے بے خبر ہے۔ اسے اپنے آپ کا ہوش نہیں ہے۔ وہ وقت کے سینے پر ایک سنگین مجسمے کی طرح بے حس و حرکت پڑا ہے۔

...   .

ہجرت کی پہلی ہی صدی میں وہ اونگھ سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی اونگھ کا سبب وہ دل شکستگی تھی جو اس کے بعض پیروؤں نے اپنے طرز عمل سے اس کے دامن میں ڈال دی۔ اپنے آقا کی اسی اونگھ کو اس نوجوان سپاہی نے شدت سے محسوس کیا جس نے اسے جگانے کے لیے اپنے سارے خاندان کو کربلا کے میدان میں لا کر ڈال دیا تھا۔

"اٹھ میرے آقا بیدار ہو کہ ملوکیت کا درندہ تیری بادشاہت میں گھس آیا ہے اس نے تیری رعایا کی ایک بڑی آبادی کو اپنی خونخواری سے نیم جان کر دیا ہے۔ اٹھ اپنے جاں نثاروں کو اذن جاں نثاری دے۔ اٹھ میں تیری خدمت میں معصوم اصغر کے حلق میں ترازو ہونے والا تیر لایا ہوں۔ میرے ساتھ جوان عباسؑ کی لاش بھی تیرے قدموں کو بوسہ دینے کی منتظر ہے۔ اٹھ، کہ تیری راہ میں چھڑکاؤ کے لیے میں نے اپنی رگوں کا خون بھی فراہم کر لیا ہے۔ اٹھ، میرے آقا، تیری مملکت پر غاصب ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے لیکن اس آواز کا جواب آقا کی طرف سے بے خبر خاموشی اور اتھاہ خراٹے تھے اور دشمنوں کی طرف سے

ننگی تلواریں اور ظلم و ستم کے خنجر۔

جاں نثار نے آقا کو جگانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے اپنی رگوں کا بہادر اور مخلص خون آقا کے قدموں پر چھڑکا۔ اپنے بچوں کو اس کے قدموں میں ڈالا۔ اپنی خواتین کا سہاگ اسے جگانے کے لیے لٹا دیا۔ اپنی ساری ہستی اسے جگانے کی جدوجہد میں جھونک دی۔ لیکن بادشاہِ وقت کے پہلے جاں نثار کو ملوکیت کا درندہ نگل گیا۔ اور اس کی سلطنت میں خونخواری کو پھیلاتا چلا گیا اور اونگھنے والا بیدار نہ ہوا۔ وہ گہری نیند سو گیا اس کو خبر نہ ہوئی کہ اس کے ایک جاںنثار نے اس کے چاروں طرف اپنے خون سے چھڑکاؤ کر دیا تھا۔ وہ بے خبر پڑا سوتا رہا اور درندے انسانی بستیوں میں گھس آئے۔ "اسلامیل" کا عصائے اقتدار شکستہ حالت میں اسکے پاس پڑا رہا، اور درندوں نے اپنی قوت و شوکت کے پھریرے بستیوں اور شہروں کی فصیلوں پر اڑا دیے۔

... ...

پھر اسی شہر سے جہاں اسلامیل کے پہلے جاں نثار کے ساتھ غداری ہوئی تھی ایک شخص اٹھا اور اس نے اونچے درباروں کو جھک کر سلام کرنے سے انکار کر دیا۔ اسوقت سونیوالا اتنی گہری نیند سو رہا تھا اور غاصب اتنے جری ہو گئے تھے کہ انہوں نے عصائے اقتدار کو اپنا لازمی حق تصور کر لیا تھا اور زندگی ان کے درباروں میں ڈری ڈری اور سہمی سہمی داخل ہوتی تھی۔ اس لیے کہ تلوار اور خون آشامی کا چرمی فرش ان کا امتیازی نشان بن گیا تھا۔

"میں صرف آدم کے بیٹے" اسلامیل کا وفادار ہوں۔" اس نے مختصر آواز میں کہا۔

"قدامت کے اس وفادار کا ذرا امتحان تو جلاد!" غاصب نے جلا کر طنز سے کہا۔

اور اسلامیل کے سفید بالوں والے بوڑھے وفادار پر کوڑوں کی بے پناہ بارش ہو گئی۔ لیکن وہ کوئی بودا وعدے دار نہ تھا۔ وہ اپنی شریانوں کو ضبط کی مٹھی میں رکھتا تھا۔ خون کی دھاریں اس کی ایڑیوں سے بہ گئیں لیکن وہ سختی اور لالچ دونوں کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا۔

"میرے آقا! اٹھ کہ تیرا غلام اپنی خون آلود ایڑیوں کے ساتھ تیری قدم بوسی کیلئے حاضر ہوا ہے"
اس نے ضعیف آواز میں کہا۔

لیکن سونے والا سویا رہا۔ اور جگانے والا اس کی نیند سے اپنی عمر کا مقابلہ نہ کر سکا۔

پھر ایک تیسرا آیا اور اس تیسرے کو غاصب اقتدار نے اٹھتے ہی جکڑ لیا۔
"سنتریو! پکڑ لو اسے جانے نہ پائے۔ یہ "اسلامیل" کا ایجنٹ ہے اور غدار ہے"
غاصب نے یہ بات زمانے کے سامنے پوری ڈھٹائی سے پھر ایک بار دھرا دی۔ اور وہ مسلسل بیس سال تک اسلامیل سے وفاداری کے جرم کی سزا سہتا رہا۔
"میرے ہادی! اٹھ، تیرا خادم اپنی پیٹھ پر بیس سال تک برسے ہوئے کوڑوں کے سراٹے کر تیری خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ زمانہ کہتا ہے اگر ہاتھی کو بھی اتنا مارا جاتا تو وہ اپنے قدموں پر جم نہ سکتا۔ میرے مالک! تیرے غلام کو اللہ نے اُحد کے پہاڑ جیسے استقلال کی توفیق بخش دی تھی۔ اٹھ اور اپنا عصائے اقتدار سنبھال، تاکہ تیری سپاہ تیرے جھنڈے تلے جمع ہو سکے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ عقابوں کے نشیمنوں پر چیلوں اور کوؤں نے قبضہ کر رکھا ہے"

لیکن سونے والا سوتا رہا اور پکارنے والا پکارتے پکارتے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا اور صدیاں پرندوں کی قطاروں کی طرح بے حس و حرکت پڑے ہوئے اسلامیل کو دیکھتی ہوئی گزرتی چلی گئیں۔

اس کا عصائے اقتدار شکستہ ہی رہا۔ اس کے "اوامر و نواہی" کا فرمان ہواؤں کے دوش پر پریشان ہی رہا۔ اور وہ زمانے کے چوراہے پر مدہوش پڑا سوتا رہا۔
"خدائی" کے بڑے بڑے مدعی آتے رہے اور گزر جاتے رہے لیکن وہ جو "لا الٰہ" کی ضرب سے "خدائی" کے ہر دعوے دار کو ختم کرنے آیا تھا ـــــ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کے جذبہ توحید میں کوئی اجتماعی حرکت پیدا نہ ہوئی۔

پھر راجاؤں کے دیس میں ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا:

"میں آدم کے بیٹے "اسلامیل" کا وفادار ہوں۔ وہی اس اقتدار کا تنہا مالک ہے۔ جو اس کی وفاداری سے بے نیاز اپنے اقتدار کا دعویٰ کرے، میں اس کا باغی ہوں!"

اس کی اس پکار پر وہ راجہ جو خود "اسلامیل" کی وفاداری کا ہوائی دعویٰ کرتا تھا اور اسی دعوے کی بنا پر اس نے اپنی سپاہ کے شیرازے کو سمیٹ رکھا تھا ___ بھڑک اٹھا اور اس کی جیلوں کی دیواریں اس پکارنے والے کے گرد سمٹ آئیں، اور اس کے وسیع پھاٹک نے اسے نگل لیا۔

پکارنے والے نے چیخ چیخ کر آدم کے بیٹے اسلامیل کو جگانے کی کوشش کی لیکن وہ بیدار نہ ہوا اور اس کا عصائے بے قوت اور اس کا فرمان بے شوکت زمانے کے ہاتھ میں محض ایک "تجویز" کی صورت میں پڑا رہا۔

اور پھر جب صدیاں انسانیت کو تڑپتے اور خون آلود لباس میں ماتم کرتے دیکھتے دیکھتے تھک گئیں تو ایک جگہ سے کچھ لوگ اٹھے۔ اسلامیل کے کچھ پروانے اٹھے۔ زندگی کے شکاری اور عزت کے کچھ دیوانے اٹھے اور سمٹ سمٹ کر انہوں نے لوہا سمیٹنا شروع کر دیا۔

"اسلامیل" کے عصائے اقتدار کو "حدید" کی ضرورت ہے" ایک پکار اٹھی۔ اور سرفروش شمال سے اور جنوب سے، مشرق سے اور مغرب سے سمٹ سمٹ کر آئے تاکہ اسلامیل کے عصائے اقتدار کو "حدید" کی قوت سے سجا دیں اور اپنی حدی سے اسے بیدار کر دیں اور اپنے خون سے اسکی راہوں کو صاف کر دیں۔

پتے چبا چبا کر اور کوڑے کھا کھا کر انہوں نے لوہا جمع کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کئی کئی روز تک فاقوں کے ساتھ غاصبوں کے لوہے سے اپنے لوہے کو ٹکرایا۔ انہوں نے کئی کئی ہزار کوس پیدل سفر کیا۔ انہوں نے دنیا کی سختیوں سے کہہ دیا کہ:

"آؤ ___ اگر تمہیں اسلامیل کے غلاموں کا صبر آزمانا مقصود ہے" اور زمانے کے وہ لمحات چشم دید گواہ ہیں کہ ان کا صبر سختیوں سے بازی جیت گیا۔

"اٹھ ہمارے قائد — ہمارے زخم تیری راہ میں آنکھیں کھولے ہوئے ہیں۔ اور تیری پرشوکت سواری کے لیے ہمارے سینوں کا فرش حاضر ہے۔ ہماری لاشیں تیرا شاہانہ جلوس اپنے اوپر سے گزارنے کے لیے مدت سے سانسیں سینوں میں روک کے پڑی ہیں اٹھ یہ اسمٰعیل کا سر تیرے قدموں میں کٹا پڑا ہے — یہ سید احمد کی لاش تیری سواری سے روندے جانے کی تمنا میں بازو پھیلائے پڑی ہے۔"

لیکن سونے والا پہلو بدل کر پھر سو گیا — اس کے لبوں پر ایک خفیف سی دلفریب مسکراہٹ آئی اور پھر غائب ہو گئی۔ اس کے فرمان "اوامر و نواہی" کے پریشان اوراق پھڑ پھڑائے اور پھر بکھر گئے — اس کے عصائے اقتدار میں ایک لرزش سی آ کر رہ گئی —!

بالاکوٹ کی سرزمین کے ہر ذرّے کا دل اپنے دامن میں شہیدوں کا خون سمیٹے دھڑک رہا ہے۔ اور اس دن کا منتظر ہے جب انقلاب فکر و عمل کا نیا سورج طلوع ہو جب کائنات کے شہزادے اسلامیل کی سواری پوری شوکت و جبروت سے نکلے۔ جب بھیڑیے بستیاں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ جب ملوکیت اور آمریت کو ماضی کے گہرے گڑھے میں دھکیل دیا جائے اور جب انسانیت مسکرا کر حاکمیت سے ہم آغوش ہو۔

اور دراز دامن سال و ماہ کائنات کو خون سے آلودہ اور زمین کو انسانی پنجروں سے معمور دیکھتے ہوئے مایوس و دل گرفتہ گزرتے چلے گئے۔

اسلامیل وقت کے بدلتے ہوئے دھاروں کے رُخ سے بے خبر پڑا سوتا رہا — اور زمانہ اپنی نسل میں اس مبارک ہستی کا — پیہم انتظار کرتا رہا جو اپنے ساتھ حق پرستوں کے لشکر لائے۔ جو اپنے ساتھ زندگی کے خشک پھریرے پر تازگی دوڑانے کے سامان لائے۔ جو صدیوں کی حکمران بہیمیت کو چیلنج کر کے بھانساتوں پر سے حیوانیت کی حاکمیت ختم کر کے توہین آدمیت کے اس تسلسل کو روک سکے۔

... ...

اور پھر وہ گھڑی آ کر رہی! — زمانے کے سینے سے وہ گوہر بے بہا برآمد ہو کر رہا۔

مشرق جو مدت سے اس خوش بختی کا منتظر تھا کہ اس کے سینے کی سرد آہوں کو سرورِ کائنات کے حضور میں باریابی کا اذن حاصل ہو۔ اپنی سرد آہوں کو سمیٹنے میں مصروف ہو گیا اور ایک آواز مشرق کے عین سینے سے اٹھی۔ اس نے پکار کر کہا:

"اے انسانوں کے غلام انسانو! تم نے کبھی کسی پرندے کو پرندے کا غلام دیکھا ہے! آقا تو صرف وہی ہے جو خالق ہے تم جو غاصبوں کے لشکروں میں بھرتی ہو کر اپنی انسانیت کی توہین کر رہے ہو یہ تمہیں زیب نہیں دیتا تم صرف عالم کائنات کے غلام ہو تم صرف اسماعیل کی فوج کے سپاہی ہو۔

تمہارا کام عالم کائنات کے سوا ہر حاکمیت سے انکار کرنا ہے۔ تم اس پر مامور ہو کہ نہ صرف خود انکار کرو بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو اس پر آمادہ کرو۔ تم نے جو قبیلہ اور نسل اور قوم کی بیساکھیوں میں اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔ یہ تمہاری تذلیل کے سامان ہیں۔ آؤ ـــ ہم سب مل کر اسماعیل کی سپاہ تیار کریں۔ آؤ ـــ ہم اس کے اعلائے اقتدار کے لیے لوہا جمع کریں۔ آؤ ـــ ہم اس کے پریشان فرمانِ "اوامر و نواہی" کو سمیٹ کر اسے دنیا کے چوراہے پر نصب کر دیں۔ تاکہ انسان اس سے اپنی کھوئی منزل کا نشان پا سکے" ـــ اور ایک پُرعزم سپاہ مشرق کے اس حصے میں پھیل گئی ہے۔ وہ انسانوں کی بستیوں میں یہ آواز پہنچا پہنچا کر انسانوں کے دلوں سے قوت و شوکت کا لوہا سمیٹ رہی ہے:

"ہمارا لوہا آدم کے بیٹے اسماعیل کی امانت ہے۔ ہمیں بساطِ زمانہ سے شیطانوں کے لشکروں کو بھگانا ہے جو خون اور آگ اور لوہے کے دوزخ لے کر انسانیت پر پل پڑے ہیں۔ ہمیں زمانے کی گود میں امن و سلامتی کا تحفہ لا کر ڈالنا ہے۔ ہمیں خونخوار سرمایہ دار اور جاگیردار کی عالمگیر قیادت ختم کر کے اپنا کیمپ دنیا کے تمام مظلوموں اور ظالموں، غلاموں اور آقاؤں گداگروں اور شاہوں کے لیے الگ قائم کرنا ہے۔ ہمیں اسماعیل کی قیادت میں انسان کو انسانیت سکھانا ہے۔ ہمیں ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم نہیں بنانا ہے۔ ہمیں آقا کو غلام اور غلام کو آقا نہیں بنانا ہے۔ ہمیں قصر نشینوں کو خاک نشین اور خاک نشینوں کو قصر نشین نہیں بنانا ہے ہمیں تو ظالم کو ظلم سے روکنا ہے اور مظلوم کو اس کا حق دلوانا ہے۔ ہمیں تو خدا کی اس زمین پر

انسانوں کو مساوی حقوقِ انسانیت دلواتا ہے۔ ہم اسماعیل کے سپاہی ہیں اور اس کے عصائے اقتدار کے لیے "عہد یہ" فراہم کر رہے ہیں۔ ہم اس کے پریشان فرمان" اوامر و نواہی" کو سمیٹنے اور نافذ کرنے اُٹھے ہیں:

یہ نعرہ مشرق کے اس خطے کے گھر گھر میں گونج رہا ہے۔ یہ پکار اب گلی گلی سنائی دے رہی ہے۔ یہ پرچاپ زبانوں پر عام ہوا جا رہا ہے اور یہ حیات بخش خبر ہوا کے پر لگا کر اطراف عالم میں اڑ جانے کے لیے تیار کھڑی ہے کہ آدم کا بیٹا اسماعیل بیدار ہو رہا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ سونے والے نے آنکھیں کھول دی ہیں اور اصحاب کہف سے بازی جیتنے والا انگڑائی لیکر اٹھ بیٹھا ہے اور اپنا عصائے اقتدار ٹٹول رہا ہے اور اپنے "اوامر و نواہی" کے فرمان کی ترتیب کی تیاری کر رہا ہے۔

... ...

اس خبر نے زمانے کو مسرت سے معمور کر دیا ہے اور اب وہ ان مظلوموں کو تسلی دینے میں معروف ہو گیا ہے جنہوں نے صدیوں سے ظلم وستم اور بے چارگی و بے نوائی کے دن گزارے ہیں۔ اسماعیل کے عالم بیداری کے وہ کارنامے ابھر ابھر کر انسانیت کے سامنے آنے لگے ہیں جب وہ اپنے غلام کے اونٹ کی نکیل تھام کر مفتوحہ شہر میں داخل ہوا تھا جب وہ بیت المال کے اونٹوں کو خود اپنے ہاتھ سے مالش کرتا تھا اور چلچلاتی دھوپ میں ننگے پاؤں ان کی تلاش میں نکلا کرتا تھا۔ جب ایک گورنر کے جانبدارانہ فیصلے کی سزا کوڑوں کی شکل میں خود مظلوم کے ہاتھوں دلائی جاتی تھی۔ جب شہروں اور بستیوں میں کوئی زکوٰۃ کا مستحق نہ ملا کرتا تھا۔ جب اسماعیل اپنے کندھوں پر آٹے کی بوری لاد کر ایک بڑھیا کے مکان تک خود دے جاتا تھا۔ جب وہ قحط کے زمانے میں اپنی رعایا کی تکلیف کے خوف سے نیند، سکون اور خوراک سے محروم ہو جاتا تھا۔ جب وہ محاذ پر جانے والے مجاہدوں کے گھروں پر جا جا کر ان کے لیے بازار سے سودے خرید کر لاتا تھا اور انہیں اپنے ہاتھ سے خطوط لکھ لکھ کر دیتا تھا۔ جب کھلے جلسوں میں اس پر نکتہ چینی کی جاتی تھی اور وہ اس پر خوش ہوتا تھا کہ ملت میں روحِ تنقید موجود ہے جو گمراہی سے روکنے کی علامت ہے جب ذمہ داری کے احساس سے اس کے دنوں کا سکون اور

اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ جب وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میں دن میں سوؤں تو رعایا کو اور اگر رات کو سوؤں تو مجھے تباہی سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ جو بیت المال سے شہد کا ایک قطرہ بھی بلا اجازت نہ لیتا تھا۔ جو اپنے کسی دوست کو ایک ذاتی خط بھی بیت المال کے لیمپ کی روشنی میں نہ لکھتا تھا ــــ یہ خبر عام ہو رہی ہے کہ وہی اسلامیل اب پھر بیدار ہو رہا ہے۔ اپنا عصائے اقتدار سنبھال رہا ہے اور اپنے "اوامر و نواہی" کی ترتیبِ نو میں مشغول ہے۔

... ...

اور روحِ کائنات کا چہرہ مسرت سے شگفتہ ہوا جا رہا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے:

"اے آدم کے بیٹے "اسلامیل"! ــــ اے میرے جاں بخش شہزادے۔ اے امن کے سچے علمبردار۔ اے انسانوں کو تاریکیوں سے اجالوں کی طرف لانے والے۔ اے زخموں کو مندمل اور آلام کو دُور کرنے والے۔ اے خونی دھاروں کے ظالم بہاؤ کو روک کر سلامتی و رحمت کی جان نواز نہریں چلانے والے۔ اے طوفانِ زندگی کے بہترین تیراک۔ اے کشتیٔ حیات کے کامیاب ملاح۔ اے راتوں کے چاند اور اجالوں کے سورج۔ اے خالقِ کل کے فرمان کے صادق مبشر۔ اے گرتوں کو تھامنے والے اور تباہ حالوں کو خوشحال کرنے والے۔ اے سب غلامیوں سے نجات دلانے والے۔ اے آزادیٔ فکر و عمل کے واحد علمبردار۔ اے دشمنوں کو معاف کر دینے والے اور قوت پا کر رحم کرنے والے ــــ اٹھ، کہ اس دنیا کو قساریوں نے روند دیا ہے۔ انسانوں کو ظالموں نے بار برداری کا جانور اور اپنی شکارگاہوں کا پالتو شکار بنا لیا ہے۔ ہر پانچویں یا دسویں سال انہوں نے دنیا پر آگ اور لوہا برساتے برساتے اسے لاشوں سے پاٹ دیا ہے۔ خون کے نالے بہا دیے ہیں۔ اُٹھ! ــــ یہ عرصۂ حیات ان کی جولانیوں سے تہ و بالا ہو گیا ہے۔ آدم کے بیٹوں "اشترکیل" اور "سرمائیل" نے ہواؤں میں طوفان بکھیر دیے ہیں، سمندروں میں لاشیں بچھا دی ہیں۔ زمیں پر انسانی ڈھانچوں کے ڈھیر لگا دیے ہیں، اور انسانیت کی کھوپڑیوں سے اپنی فتح کے مینار تعمیر کر لیے ہیں۔ اٹھ کہ انسانیت مدت سے تیری راہ تک رہی ہے۔ زمین کی چاروں سمتیں تیرے استقبال کے

نیمے پلٹنے پر آمادہ کھڑی ہیں۔ اُٹھ ــــ اے طویل نیند سے جاگنے والے! آج شیطان نے ہر حق گو کی رگوں پر اپنے قلم کا نشتر رکھ دیا ہے۔ اٹھ میرے محبوب کہ تیری آمد کی تمنا میں کتنوں کی زندگیاں بیت گئی ہیں۔ کتنی بیوائیں تیرے بغیر بے سہارا ٹھوکریں کھا رہی ہیں۔ کتنے یتیم تیرے دستِ شفقت کے منتظر ہیں۔ کتنے مظلوم فریاد کی قوت تک کھو چکے ہیں۔ کتنے بے سہارا گر کر پھر اٹھ نہیں سکے ہیں اور ظالموں کی فوجوں تلے روندے اور کچلے گئے ہیں۔ کتنے مسکین بے چارگی کی پکار اپنی آنکھوں سے باہر نہ نکال سکے اور کسی نے ان کی آنکھوں میں بیٹھی ہوئی مظلومیت کو پہچاننے کی کوشش نہ کی۔ آج "عدل" بے سہارا ہے اور انصاف کو نکال کر ظلم کے ہاتھ میں عنانِ اختیار دے دی گئی ہے تو کیا جانے کہ "سخت جان" انسانیت نے تیرے بغیر کس قیامت کے عذاب دیکھے ہیں۔ اٹھ اور اپنا ــــ عصائے اقتدار سنبھال کہ تیری سپاہ کے چند جاں نثاروں نے زندگی کی باگ تھام کر اسے تیری رکاب سے باندھ دیا ہے۔ اٹھ اور بیدار ہو زخمی اور دل گرفتہ انسانیت تیرے قدموں پر آ کر گر پڑی ہے اور تیرے سوا اس کائنات میں اب اس کے لیے کہیں جائے پناہ نہیں رہ گئی ہے۔ اٹھ اور اقتدار کی باگ ڈور ہاتھ میں لے اور فسادیوں کو آدم کی وراثت سے خارج کر دے۔ اٹھ ــــ تیری سواری کے استقبال کے لیے تیری کنیز دم بخود کھڑی ہے اور زمانہ کی آنکھیں تیرے لیے فرشِ راہ ہیں۔"

... ...

بیداری کے اس عمل میں عالمی اسلامی تحریک کے اس پس منظر کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو پوری دنیا میں رو بعمل ہے۔ ملتِ افغانیہ کی ضربات مومن نے ایک سپر پاور کا کچومر نکال دیا ہے اور اس پردہ پوش قوت کے جال میں جکڑے ہوئے سارے غلام ایک ایک کر کے رہا ہو گئے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدینِ حریت جہاد کا علم لے کر ہندو سامراج کے مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور توکل علی اللہ انہوں نے اس خوفناک عفریت کو چیلنج کر کے تمام مظلوموں اور کمزوروں کے اندر قوت و جراءت کی طاقتور رو دوڑا دی ہے۔ فلسطین میں نہتے مجاہدین نے امریکہ اور اسرائیل کے مشترکہ سامراج کو ابابیلوں کے لشکروں

کی زد پر رکھا ہوا ہے اور وسط ایشیا میں ماوراءالنہر کے مسلمان انگڑائی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی مسجدوں کے پٹ کھول رہے ہیں۔ غرض یہ ملت عالمی سطح پر مظلومی کے ہر مقام پر مزاحمت، مداومت اور استقلال کے مراحل طے کر رہی ہے اور قدرت کا منشاء اسے مظالم کے مقابلے میں استقامت، تشدد کے مقابلے میں شجاعت اور دھوکا دہی کے مقابلے میں صداقت کا سبق دے کر اسے دنیا کی امامت کے لیے از سرِ نو تیار کرنا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا شجاعت کا ؎
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس طرح قسمت نے عالمی سطح پر اس ملت کے لیے ایک مکتبِ آزمائش و ابتلاء و ترقی و ارتقاء کھول دیا ہے جس میں سے اسے گزارنے کے بعد اسے دنیا کی رہنمائی کے لیے تیار کرنا مقصود ہے اس لیے کہ دنیا کے لیے خدا کا آخری پیغام اسی ملت کے پاس ہے۔ دنیا کے آخری ہادیؐ کا اسوۂ مبارک اسی ملت کے پاس محفوظ ہے اور دنیا کی رہنمائی کے لیے متوازن و معتدل طرزِ حیات بھی اسی کے پاس ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت نے ان امانتوں کو سنبھالنے اور دنیا والوں تک پہنچانے کے لیے اس ملت کی شایانِ شان کردار سازی کا کام شروع کر دیا ہے یہ ایک فطری عملِ ارتقاء ہے۔ یہ عمل اپنے نتائج ظاہر کرنے کے لیے وقت ضرور لیتا ہے لیکن جس طرح ہر شجرِ طیب بالآخر اپنا سایہ اور پھل دیتا ہے اسی طرح اس ملت نے بھی اپنے منصبِ شہادتِ حق پر فائز ہو کر اپنا فرض وحدتِ اسلامی لازماً ادا کرنا ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ وہ وقت اب بہت زیادہ دور نہیں ہے۔

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

دستاویزی حوالہ جات کی کتب

۱۔ آزادی کے چراغ ——— مشکور حسین یاد
۲۔ آدم کے تین بیٹے ——— ڈاکٹر اسعد گیلانی
۳۔ جب ملت بیدار ہوئی ——— ،،
۴۔ بلیڈ تھگ پنجاب ——— بے بھارتی
۵۔ ہندوستان سے پاکستان تک ——— سردار احمد علی خان
۶۔ فریڈم ایٹ مڈنائٹ ——— لیری کولنز
۷۔ دی میکنگ آف پاکستان ——— رچرڈ سائمنڈس
۸۔ مطالعۂ پاکستان ——— پروفیسر فاروقی نجیب اختر وہاجہ
۹۔ لیٹرز ٹو جناح ——— علامہ اقبال
۱۰۔ قرارداد پاکستان ——— پروفیسر فاروق
۱۱۔ مولانا محمد علی کی تقریریں اور تحریریں ——— افضل اقبال
۱۲۔ قول حق (عدالتی بیان) ——— مولانا محمد علی جوہر
۱۳۔ مقدمہ کراچی ——— مرتبہ رئیس احمد جعفری
۱۴۔ ۱۸۵۷ء ——— غلام رسول مہر
۱۵۔ عروج سلطنت برطانیہ ——— منشی ذکاء اللہ
۱۶۔ قیصر التواریخ ——— سید کمال الدین حیدر
۱۷۔ ہندوستانی مسلمان اور ان کی جدوجہد ——— مولانا ابوالحسن علی ندوی
۱۸۔ تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو ——— ڈاکٹر سید اسعد گیلانی
۱۹۔ سید احمد شہید ——— مولانا ابوالحسن ندوی
۲۰۔ سیرت سید احمد شہید جلد اول دوم ——— مولانا غلام رسول مہر
۲۱۔ علماء ہند کا شاندار ماضی ——— مولانا سید محمد میاں
۲۲۔ ایک سو ایک برگزیدہ مسلمان ——— خواجہ جمیل احمد
۲۳۔ تاریخ دعوت و جہاد ——— مولانا عبد اللہ بند فلاحی
۲۴۔ بھٹو کے جرائم ——— عبد القادر حسن
۲۵۔ میری آواز ——— طارق وحید بٹ
۲۶۔ پیپلز پارٹی مقاصد اور حکمت عملی ——— محمد صلاح الدین
۲۷۔ پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں ——— ڈاکٹر صفدر محمود
۲۸۔ مرزائیت اور اسلام ——— شورش کاشمیری
۲۹۔ مقدمہ بہاولپور ——— مفتی محمد شفیع
۳۰۔ قادیانی مسئلہ ——— مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
۳۱۔ قادیانی اور جمہور مسلمان ——— علامہ اقبال
۳۲۔ قادیانیت ——— مولانا ابوالحسن علی ندوی
۳۳۔ اسلام اور احمدی ازم ——— علامہ اقبال
۳۴۔ قادیانیت ——— علامہ احسان الٰہی ظہیر
۳۵۔ قادیانی مذہب ——— پروفیسر محمد الیاس برنی
۳۶۔ پیغام صلح ——— مرزا غلام احمد قادیانی
۳۷۔ ہمارا اسماعیلی مذہب اور اس کا نظام ——— ڈاکٹر زاہد علی
۳۸۔ عجمی اسرائیل ——— شورش کاشمیری
۳۹۔ تحریک جمہوریت ——— مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
۴۰۔ اندھیروں کے رنگ ——— منظور الدین ظہیر
۴۱۔ خون کی ہولی ——— اے حمید
۴۲۔ مشرق کا منظر ——— عبد القادر
۴۳۔ چمن تا چمن زار ——— سید اسعد گیلانی
۴۴۔ میں نے پاکستان بنتے دیکھا ——— پروفیسر متین الرحمن مرتضیٰ
۴۵۔ روشنی کا مینار ——— مولانا شبیر احمد عثمانی
۴۶۔ پاکستان ناگزیر تھا ——— سید حسن ریاض
۴۷۔ مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں ——— جمیل الدین احمد
۴۸۔ ہندوستانی مسلمان ——— مولانا ابوالحسن علی ندوی
۴۹۔ تاریخ ہندوستان ——— مولانا ذکاء اللہ دہلوی
۵۰۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ——— مفتی انتظام اللہ شہابی
۵۱۔ غدر کی صبح و شام روزنامچہ ——— منشی جیون لال
۵۲۔ باغی ہندوستان میں ——— مولانا فضل حق خیرآبادی

نوٹ: ان کتب کے علاوہ بے شمار رسائل کے آزادی نمبر اخبارات کے فائل دیکھنے کے بعد یہ مضامین مرتب کئے ہیں۔

اسعد گیلانی

"اسلام کی سب سے بڑی تبلیغ یہی ہے کہ اس کا عملی مظاہرہ دُنیا کے سامنے کیا جائے لیکن دنیا کی بدقسمتی اور مسلمانوں کی شومئی قسمت سے اسلام دنیا کے سامنے اپنی عظیم الشان داخلی قوت اور برکات کا مظاہرہ کر چکنے کے باوجود اب دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے اور مسلمانوں کا عمل دنیا کو اسلام کی طرف کھینچنے کی بجائے دنیا کو اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے —

جب کسی قوم کی شامت آتی ہے تو وہ سب سے پہلے بے عملی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے شاندار اصول اس کے سامنے موجود رہتے ہیں اور وہ ان اصولوں کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان بھی رہتی ہے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کی سکت اس کے اجتماعی عمل میں سے خارج ہو جاتی ہے۔ یہ بے عملی اور بے حسی اس قوم کے اندر ایسے تضادات پیدا کر دیتی ہے جن سے عہدہ برآ ہونا اس کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ ان حالات میں تحریکیں اُٹھتی ہیں اور وہ فکر و عمل کے تضاد کو دُور کر کے معاشرے کی تعمیری قوتوں کا راستہ صاف کر دیتی ہیں —"

ڈاکٹر سید اسعد گیلانی

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور راولپنڈی کراچی

969 0 01074 3

Rs. 22[illegible]